



حدیثِ زنجیر

سمیع اللہ ملک

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ
أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (عمران: 169)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، انہیں ہرگز مردہ گمان نہ
کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔

انتساب

امت کے بیٹے، جنہیں امت نے چھوڑ دیا
 اس فانی دنیا کے اُن فدائیانِ حق کے نام
 جنہوں نے نہ تاج مانگا، نہ تخت چاہا
 جن کے جسم لہو سے تر، مگر پیشانیاں سجدہ ریز رہیں
 جو کبھی غرہ کے ملبوں تلے، کبھی کشمیر کی برف میں
 کبھی یمن کی گلیوں، کبھی مسجد اقصیٰ کی محرابوں میں
 خاموشی سے شہادت کا جام پی گئے
 ان نیک بخت بچوں کے نام
 جنہوں نے روتی ماں کے آنچل سے خود کا کفن بنایا
 ان جوانوں کے نام
 جن کے ہاتھوں میں قلم ہونے تھے، مگر ہتھیار تھما دیے گئے
 ان ماؤں کے نام
 جن کے سینے قبر بن گئے، اور آنکھیں قیامت کا منظر بن گئیں
 ان بزرگوں کے نام
 جن کی تکبیر، دشمنوں کے خیے ہلا گئی
 اور اُن زخمی روحوں کے نام
 جن کی آہوں سے عرش کانپ جاتا ہے،
 مگر زمین کے فرعون کان نہیں دھرتے۔
 یہ کتاب اُن زنجیروں کا نوحہ ہے
 جنہیں ہم نے مصلحت، خوف، اور بے حسی کی چابیوں سے مقفل کر دیا
 اور اُن صداؤں کا ترجمہ
 جنہیں دنیا نے کبھی سنا گوارا نہ کیا۔
 یہ کتاب اُن کا خراج ہے،
 جنہوں نے ظلم کے اندھیروں میں، اُمید کے چراغ جلائے۔

فہرست

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ		8
2	تہذیبوں کا تصادم اور پاکستان کی آزمائش	بروز جمعرات 29 ذوالحجہ 1446ھ 26 جون 2025ء	15
3	خطرے کی گھنٹی یا حوصلے کا پرچم	بروز اتوار 3 محرم الحرام 1447ھ 29 جون 2025ء	21
4	تخیل سے حقیقت تک: پاکستان کا خاموش سفر	بروز منگل 5 محرم الحرام 1447ھ یکم جولائی 2025ء	27
5	مودی کے بیانات: خطے میں آگ یا راکھ	بروز جمعرات 7 محرم الحرام 1447ھ 3 جولائی 2025ء	32
6	نو اور ظلمت کا تصادم	بروز اتوار 10 محرم الحرام 1447ھ 6 جولائی 2025ء	39
7	خاموش لائی۔۔۔ بلند سازشیں	بروز جمعرات 14 محرم الحرام 1447ھ 10 جولائی 2025ء	45
8	سبز فائر کے پردے میں عالمی کھیل	بروز ہفتہ 16 محرم الحرام 1447ھ 12 جولائی 2025ء	51
9	یہود کی طاقت: حقیقت یا فریب نظر؟	بروز منگل 19 محرم الحرام 1447ھ 15 جولائی 2025ء	58
10	صلح یا صلہ؟	بروز جمعۃ المبارک 22 محرم	64
11	وحدت امت: خواب یا امکان؟	بروز سوموار 25 محرم الحرام 1447ھ 21 جولائی 2025ء	71
12	میدان، ایوان اور میز ان: دھوکہ، دہلی، اور پسپائی	بروز بدھ 27 محرم الحرام 1447ھ 23 جولائی 2025ء	77
13	استحصال کی قیمت: ہجرت کی لہر	بروز جمعۃ المبارک 25 محرم	82
14	امریکی آئین، مذہب اور مسلمان	بروز اتوار 2 صفر الحرام 1447ھ 27 جولائی 2025ء	86
15	امت مسلمہ: اتحاد یا تباہی	بروز بدھ 5 صفر الحرام 1447ھ 30 جولائی 2025ء	93
16	فلسطین کا سودہ؟ ایمان کا جنازہ	بروز جمعۃ المبارک 7 صفر الحرام 1447ھ یکم اگست 2025ء	99
17	جب عدل خاموش ہو جائے، تو تاریخ چیخنی ہے	بروز اتوار 9 صفر الحرام 1447ھ 3 اگست 2025ء	105
18	فلسطین: استقامت سے ریاست تک	بروز جمعرات 13 صفر الحرام 1447ھ 7 اگست 2025ء	113
19	پاکستانی اجالا..... بھارتی اندھیرا	بروز اتوار 16 صفر الحرام 1447ھ 10 اگست 2025ء	121
20	خاک وطن کا خواب رفتہ	بروز بدھ 18 صفر الحرام 1447ھ 13 اگست 2025ء	128
21	حکمت عملی، جنگ اور امن	بروز اتوار 23 صفر الحرام 1447ھ 17 اگست 2025ء	136
22	بیت المقدس کا مقدمہ	بروز بدھ 26 صفر الحرام 1447ھ 20 اگست 2025ء	142
23	وطن کی شہرہ رگ کا سودہ نہیں ہوگا	بروز ہفتہ 29 صفر الحرام 1447ھ 23 اگست 2025ء	149
24	ووٹ کا تقدس اور طاقت کا فریب	بروز منگل 2 ربیع الاول 1447ھ 26 اگست 2025ء	155
25	امت کا ابراہیم کہاں.....؟	بروز جمعۃ المبارک 5 ربیع	160
26	جہاں قربانیاں بولتی ہیں، وہی پاکستان ہے	بروز اتوار 7 ربیع الاول 1447ھ 31 اگست 2025ء	164

سیریل	عنوان	تاریخ اشاعت	صفحہ نمبر
27	عزت، انا اور عالمی سیاست: بھارت کی آزمائش	بروز منگل 9 ربیع الاول 1447ھ 2 ستمبر 2025ء	169
28	لا الہ الا اللہ کا قلعہ	بروز جمعہ المبارک 12 ربیع الاول 1447ھ 5 ستمبر 2025ء	176
29	ایک ہوں مسلم حرم کی یاسانی کیلئے	بروز منگل 16 ربیع الاول 1447ھ 9 ستمبر 2025ء	182
30	قطر سے بیت المقدس تک: تاریخ کا خونچکاں سفر	بروز ہفتہ 20 ربیع الاول 1447ھ 13 ستمبر 2025ء	188
31	مغرب کا غروب، مشرق کا ظہور	بروز سوموار 22 ربیع الاول 1447ھ 15 ستمبر 2025ء	193
32	تاریخ کی نئی کروٹ اور پاکستان کا مقام	بروز ہفتہ 27 ربیع الاول 1447ھ 20 ستمبر 2025ء	200
33	عہد نو کاسنگ میل	بروز بدھ 2 ربیع الآخر 1447ھ 24 ستمبر 2025ء	207
34	یاساں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے	بروز ہفتہ 5 ربیع الآخر 1447ھ 27 ستمبر 2025ء	214
35	مفاد کے سوداگر، اقتدار کے مسافر	بروز بدھ 9 ربیع الآخر 1447ھ یکم اکتوبر 2025ء	220
36	دو حہ اجلاس: خون، سیاست اور امت کی تاریخی	بروز جمعرات 10 ربیع الآخر 1447ھ 2 اکتوبر 2025ء	226
37	شطنج کی بساط	بروز جمعہ المبارک 11 ربیع الآخر 1447ھ 3 اکتوبر 2025ء	231
38	شطنج سیاست اور تقدیر کا فیصلہ	بروز اتوار 13 ربیع الآخر 1447ھ 5 اکتوبر 2025ء	236
39	طلوع مشرق: عالمی طاقت کا نیا محور	بروز بدھ 16 ربیع الآخر 1447ھ 8 اکتوبر 2025ء	242
40	پاکستان، امید اور نظریئے کا چراغ	بروز ہفتہ 19 ربیع الآخر 1447ھ 11 اکتوبر 2025ء	249
41	شکر کے خیمے اور احسان کی راہ	بروز سوموار 21 ربیع الآخر 1447ھ 13 اکتوبر 2025ء	254
42	ماسکوفارمیٹ: امن کے چراغ سے ایشیا کی صبح تک	بروز منگل 22 ربیع الآخر 1447ھ 14 اکتوبر 2025ء	257
43	بگرام کی بازگشت	بروز بدھ 23 ربیع الآخر 1447ھ 15 اکتوبر 2025ء	260
44	تقدیر کے قافلے: پاکستان، ایمان اور تاریخ	بروز جمعرات 24 ربیع الآخر 1447ھ 16 اکتوبر 2025ء	266
45	وفایا مفاد..... کابل اور دہلی کا ملبہ	بروز ہفتہ 26 ربیع الآخر 1447ھ 18 اکتوبر 2025ء	271
46	سرحد، ضمیر اور سیاست عہد کا المیہ	بروز اتوار 4 جمادی الاول 1447ھ 26 اکتوبر 2025ء	279
47	زخم، امید اور امن کی راہیں	بروز بدھ 7 جمادی الاول 1447ھ 29 اکتوبر 2025ء	286
48	سفاکی کے سایے	بروز ہفتہ 10 جمادی الاول 1447ھ یکم نومبر 2025ء	292
49	خاک رفاقت سے اٹھتے دھوئیں	بروز سوموار 12 جمادی الاول 1447ھ 3 نومبر 2025ء	297
50	قربانیوں کی خاک سے اٹھتے سوال	بروز بدھ 14 جمادی الاول 1447ھ 5 نومبر 2025ء	302
51	جبر سے بغاوت تک	بروز اتوار 18 جمادی الاول 1447ھ 9 نومبر 2025ء	308
52	نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے	بروز منگل 20 جمادی الاول 1447ھ 11 نومبر 2025ء	314
53	قدس کی گواہی اور پاکستان کا اصولی امتحان	بروز جمعرات 22 جمادی الاول 1447ھ 13 نومبر 2025ء	319
54	امن یا فرب؟ پاک بھارت کشیدگی اور امریکی کردار	بروز اتوار 25 جمادی الاول 1447ھ 16 نومبر 2025ء	327

صفحہ نمبر	تاریخ اشاعت	عنوان	سیریل
333	بروز منگل 27 جمادی الاول 1447ھ 18 نومبر 2025ء	اقبال اور اسلام کی نشاطِ ثانیہ۔۔۔۔	55
338	جمعۃ المبارک 30 جمادی الاول 1447ھ 20 نومبر 2025ء	سرزمین بلوچستان اور فکرِ اقبالؒ — امت کے عہدِ نو کی	56
345	بروز اتوار 2 جمادی الثانی 1447ھ 23 نومبر 2025ء	آج کے دور میں پاکستانی خواتین کے لیے علامہ اقبال کا	57
350	بروز منگل 4 جمادی الثانی 1447ھ 25 نومبر 2025ء	ہمالیہ کی گھاٹیوں سے فولادی بھائیوں تک	58
356	جمعۃ المبارک 7 جمادی الثانی 1447ھ 28 نومبر 2025ء	حرفِ اقبال اور حسِ بلوچستان — ایک ملت، ایک "	59
363	بروز سوموار 10 جمادی الثانی 1447ھ یکم دسمبر 2025ء	کابل سے کعبہ تک، ایک رشتہ، ایک آزمائش	60

پیش لفظ —

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ (سورہ ابراہیم: 42)

اور ہرگز یہ نہ سمجھ کہ اللہ ان ظالموں کے کام سے بے خبر ہے، وہ تو انہیں صرف اُس دن کے لیے مہلت دے رہا ہے جس دن آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ جائیں گی۔

کبھی جو قافلہ صداقت ظلم کے سنگلاخ رستوں پر چلتا ہے، تو تاریخ کے صفحات میں اس کی چاپ ہمیشہ سنائی دیتی ہے، چاہے حکمرانوں کے دربار میں ہو جائیں، منبر و محراب خاموش ہو جائیں، یا بازارِ مصلحت میں غیرت کا سودا ہو چکا ہو۔

زمین عدل کی پیاسی ہے، آسمان نوحہ خواں، انسانیت سسک رہی ہے، اور ضمیر زنجیروں میں جکڑے جا چکے ہیں۔ ایسے میں میری یہ کتاب "خاموش زنجیریں" ایک گواہی ہے — وقت کے اس ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش، جو خوابِ غفلت میں ڈوبا ہے۔

یہ چند سطور جو آپ کے حضور پیش ہیں، اس تصنیف کے ان غیر مرئی زخموں کی چیخ ہیں جو نہ صرف مظلومانِ فلسطین و کشمیر کے قلب و جگر پر ثبت ہو چکے ہیں بلکہ انسانی ضمیر، جو کبھی بے دار تھا، اُسے بھی جھنجھوڑ کر خاموشی کی زنجیروں میں قید کر چکے ہیں۔

"حدیث زنجیر" صرف ایک عنوان نہیں، بلکہ وہ کرب و آہ ہے جو عالمی سیاست کے مقتل میں معصوم انسانوں کی لاشوں پر دستِ خوان بچھانے والوں کے نام ایک تاریخی فردِ جرم ہے۔ یہ کتاب ان صداؤں کی یاد گار ہے جو خنجر کی نوک پر بھی حق کی صدا بلند کرتی رہیں، اور ان آنکھوں کا نوحہ ہے جو ظلم دیکھ کر بھی بند رہیں۔

یہ سطور ایک مقدمہ ہیں... انسانیت کے خلاف کیے گئے اس جرم کا مقدمہ، جس میں نہ قاتل شرمندہ ہیں نہ متاثرینوں نے آنکھیں چرائیں۔

"حدیث زنجیر" ایک سوال ہے — ہم کیا قوم تھے؟ ہم کہاں کھڑے تھے جب القدس کے در و دیوار لہو سے تر تھے؟ ہم کس سمت دیکھ رہے تھے جب کشمیر میں مائیں بیٹوں کی لاشوں پر چاندنی بچھا رہی تھیں؟

❖ فلسطین — خون کا دریچہ، صبر کا قبلہ ہمیں ہر روز پکار رہا ہے ❖

فلسطین، وہ سرزمین جہاں انبیاء نے اذانِ حق دی، آج لہو سے لالہ زار ہے۔ جہاں مسجدِ اقصیٰ کے مینار ابھی تک اذان دے رہے ہیں مگر ان کی بازگشت بمباری میں گم ہو چکی ہے۔ آج غزہ کی گلیوں میں چلتے پھرتے بچے آسمان کو دیکھتے ہیں، کہیں ڈرون ان کی نیندیں نہ چرائے۔

اہل فلسطین کے وہ نوخیز فرزند، جن کے ہاتھ میں قلم کے بجائے پتھر ہیں، اور جن کی آنکھوں میں نیند کی جگہ بارود کی چمک، ان کی شجاعت نے اہل دنیا پر عیاں کر دیا کہ جس کے پاس ایمان کا سچا ہتھیار ہو، اُسے کسی سپر پاور کے فولادی پنچے سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک ماں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بلے سے نکال رہی ہے، جب کہ عالم اسلام کی قیادت ہالوں میں بند دروازوں کے پیچھے اجلاس اور قراردادوں کی قوالیاں سن رہی ہے۔ کیا یہ قیامت کی کوئی ساعت نہیں جس پر انسانیت کو شرم سے زمین نکل لے؟

حدیث نبوی ﷺ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ (صحیح البخاری)

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔"

اے ضمیرِ امت! کہاں گئی وہ اخوت؟ کس قید میں ہیں وہ عہدِ مدینہ کے خواب؟

آج فلسطین کی مائیں بیٹوں کے کٹے ہوئے ہاتھوں کو چوم کر اللہ کی بارگاہ میں کہتی ہیں:

اے رب! تیرا شکر ہے کہ میرے بیٹے کو شہادت نصیب ہوئی، پر اے اللہ! تو ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جنہوں نے ہمارے زخموں پر خاموشی کا نمک چھڑکا۔

"وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ" (سورہ العمران: 169)

"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے، انہیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے ہاں رزق پارہے ہیں۔"

اسی فلسطین میں، جہاں غزہ کی گلیوں میں ابو بہرہ رہا ہے، وہیں کشمیر کے بادلوں سے بھی آہ و فغاں کی گرج سنائی دیتی ہے۔ ہندو فاشزم کے ننگے ناچنے جنتِ نظیر وادی کو عقوبت خانے میں بدل دیا ہے۔ آزادی کی ہر صدا کو ظلم کی گولیوں سے دبانے کی کوشش کی گئی، مگر تاریخ کے حافظے میں یہ صدائیں محفوظ ہو چکی ہیں۔

جب ہم مشرق وسطیٰ کی حالیہ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ حجاز سے شام تک، بغداد سے یمن تک، ہر گوشہ فریاد بن چکا ہے اور ہر مٹی زخم کی مانند جل رہی ہے۔ غزہ کے شہداء کے جنازوں پر جہاں آسمان سے فرشتے سلامی دیتے ہیں، وہیں کچھ سرزمینیں ہیں جو خون کے سوداگر بن چکی ہیں۔ عرب حکمرانوں کی غیر جانبداری دراصل درپردہ وفاداری ہے۔ وہ وفاداری جو مسجد اقصیٰ کی بجائے تل ابیب کے مفادات سے بندھی ہے۔

"يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ" (سورہ روم: 7)

"وہ دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں، لیکن آخرت سے غافل ہیں۔"

عرب دنیا کا زوال دیکھ کر دل سے ہوک اٹھتی ہے اور بے ساختہ یہ سوال دل و دماغ میں گونجنے لگتا ہے کہ یہ خلافت کے وارث یا اپنے اقتدار کے دوام اور مفاداتِ بازار کے سوداگر؟ عرب دنیا کا اصل زوال اسی دن شروع ہوا جب مدینہ کے وارثوں نے مکہ کے تاجروں کی سیاست کو اپنایا اور بیت المقدس کو چند معاہدوں کے عوض فروخت کر دیا۔ آج جو جنگ غزہ میں لڑی جا رہی ہے، وہ صرف میزائلوں کی جنگ نہیں، بلکہ ضمیر و غیرت کی جنگ ہے۔ اور بد قسمتی سے بیشتر عرب ممالک اس میں نیلام ہو چکے ہیں۔ ان کے محلات میں خوشبو ہے مگر بیت المقدس کی گلیوں میں بارود کی بو ہے۔ ان کے ایوانوں میں سازشوں کے نقشے ہیں، مگر امت کے زخمی سینے پر کوئی مرہم نہیں۔

"...يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ" (سورہ المائدہ: 51)

"...اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ"

کیا یہ آیت اُن کے کانوں سے نہیں ٹکراتی جو آج اسرائیل کے تاجر بن بیٹھے ہیں؟ کیا یہ وہی عرب نہیں جن کے اجداد نے لیک یا رسول اللہ کہہ کر اپنی جانیں دی تھیں؟ آج وہ لیک یا امریکا کہہ کر بیت المقدس کی قیمت لگاتے ہیں۔

❖ غزہ کے باسیوں نے بالآخر ظلم کے خلاف اذان بغاوت بلند کر کے عملاً اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کر دی ہیں ❖

غزہ کے مظلوموں کی فریاد، ابابیلوں کے حملے کی یاد دلاتی ہے۔ وہ معصوم بچے، جو راتوں کو ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ میں سوتے ہیں اور صبح بھوکے ساتھ

جاگتے ہیں۔ دنیا کی بے حسی ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہی ہے۔

من رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أَضْعَفُ " (صحیح مسلم)

"الإيمان

تم میں سے جو شخص ظلم کو دیکھے، اسے اپنے ہاتھ سے روکے؛ اگر یہ نہ ہو سکے تو زبان سے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو دل سے برا جانے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

مگر افسوس! آج دل بھی خاموش ہو چکے ہیں۔ انسانیت کے جھوٹے علمبردار اس خون ناحق پر لب نہ کھول سکے۔ اقوام متحدہ اقوام بے ضمیر میں بدل چکی ہے، اور وہ طاقتیں جو امن کی علمبردار بنیں، قتل انسانیت کی کفیل نکلیں۔

❖ سوال یہ ہے کہ ایران اب امید ہے یا پر کسی میں تبدیل ہو چکا ہے؟ ❖

ایران کا معاملہ منفرد ہے۔ جہاں ایک طرف وہ اسرائیل کی مخالفت کا دعویٰ کرتا ہے، دوسری جانب مشرق وسطیٰ میں اپنے فرقہ وارانہ مفادات کو وسعت دینے کیلئے حزب اللہ، حوثی اور دیگر پر کسی گروہوں کو استعمال کرتا ہے۔ ایران کی زبان القدس کے حق میں ہے، مگر اس کے ہاتھ بعض اوقات امت کے قلب میں خنجر بھی چھوتے ہیں۔ تاہم، یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غزہ کے تنہا باسیوں کو کچھ مدد ہم امیدیں بھی ایران کی طرف سے وابستہ رہتی ہیں، جبکہ سعودی عرب، امارات اور بحرین، اسرائیل سے معاہدوں کے بستر پر اپنے وجود کی بقاء تلاش کر رہے ہیں۔

"وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ" (البقرہ: 11)

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔"

امت مسلمہ کا نوجوان سوال کر رہا ہے کہ ایران، عرب دنیا اور مشرق وسطیٰ: حق، مصلحت اور پر کسی کی لعنت کب ختم ہوگی؟ ایران نے جہاں غزہ کے حق میں کچھ آوازیں بلند کیں، وہیں فرقہ واریت کے خاددار پودے بھی بوئے۔ جنہوں نے امت کو مزید تقسیم کر دیا ہے۔ عرب حکمران، جن کی سرزمین سے کبھی خالد بن ولید، عمر بن عبدالعزیز اور صلاح الدین ایوبی اٹھے تھے، آج صہیونی منصوبوں کے محافظ بن چکے ہیں۔

"إِذَا ضَلَّتِ الْأَمَانَةُ فَاَنْتَظِرِ السَّاعَةَ" (صحیح بخاری)

"جب امانت کو ضائع کر دیا جائے، تو قیامت کا انتظار کرو۔"

عربوں کی خاموشی دراصل رضامندی ہے۔ انتہائی دکھ سے یہ تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ جو خیمے کسی وقت حرم کی حفاظت کیلئے کھڑے تھے، آج سودے بازی کے مراکز بن چکے ہیں۔

اس کتاب میں قاری کو یاد دلایا گیا ہے کہ کیسے عالم اسلام کے قلب میں ایران و سعودی عرب کی کشمکش، اسرائیلی جارحیت کا دروازہ کھول سکتی ہے۔ حزب اللہ کی صف بندی، یمن کے حوثیوں کی للکار، اور عرب حکمرانوں کی "غیر جانبداری" درحقیقت بزدلی اور مصلحت پسندی کا مرتع ہے۔

یاد رکھیں، ظلم ایک ایسا قرض ہے جو اقوام کو تاریخ کے قبرستان میں دفن کر دیتا ہے، اور سچ وہ مشعل ہے جو اگرچہ وقتی طوفانوں میں مدھم ہو جائے، مگر کبھی بجھتی نہیں۔

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ"۔ (سورہ ہود: 113)

"اور ظالموں کی طرف ذرا بھی جھکاؤ نہ رکھو، ورنہ تمہیں بھی آگ چھولے گی۔"

یہ کتاب اُن نوجوانوں کی طرف بھی ایک پکار ہے جو مایوسی کی دھند میں اپنی پہچان کھو چکے ہیں، کہ آؤ! ہم تمہارے لیے ایک نئی صبح، ایک نیا افق، اور ایک روشن راستہ چھوڑ کر جانا چاہتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ کل تم یہ کہنے پر مجبور ہو جاؤ "ہم ان کی اولاد ہیں جو تماشائی بنے رہے جب انسانیت سولی پر لٹک رہی تھی۔"

یہ پیش لفظ نہیں، ایک عہد ہے۔ عہدِ بیداری، عہدِ مزاحمت، اور عہدِ ایمان کا۔

❖ کشمیر — گلزارِ ستم، شہیدوں کے مسکراتے چہرے بارہا یاد آرہے ہیں ❖

کشمیر، وہ دیس جہاں چنار اب سرخ نہیں، بلکہ لہو سے خضاب کیے گئے ہیں۔

جہاں بستیوں میں اذانیں اب دبے لہجے میں دی جاتی ہیں۔ جہاں آزادی کا نعرہ "لا الہ الا اللہ" کی صورت گونجتا ہے، مگر جواب میں آنسو گیس، گولیاں اور چھڑے برسائے جاتے ہیں۔ وہ جوان جن کی آنکھیں بینائی سے محروم ہوئیں، مگر دل ایمان سے روشن رہے۔

کیا ہمیں خبر ہے کہ ان اندھیروں میں بھی وہ لوگ سورۃ البین کے ورد کے ساتھ سوتے ہیں؟

کیا ہم جانتے ہیں کہ ہر کشمیری شہید کا کفن سورۃ الفتح کی آیتوں سے بھیگتا ہے؟

"...وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ" (سورہ نساء: 75)

"... اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں اور ان مظلوم مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے"

اور حیرت کی انتہا تو یہ ہے کہ ان مظالم پر اقوام عالم کی "متمدن" زبانیں گوگی، اور ضمیر مردہ ہو چکا ہے۔ ان کی خامشی، دراصل مجرمانہ شرکت ہے۔ وہ جو امن کے علمبردار تھے، آج ظلم کے سایہ دار بن چکے ہیں۔

❖ کشمیر: وہ وادی جہاں ظلم گھات لگائے بیٹھا ہے ❖

کشمیر کی برفاب وادیوں میں بہنے والا خون اب ندیوں کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

وہ نوجوان جن کے ہاتھ میں کبھی قلم ہونا چاہیے تھا، آج ان کے ہاتھ بیڑیوں سے بندھے ہیں۔

"وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ" (سورہ ابراہیم: 42)

"اور ہرگز یہ خیال نہ کرو کہ اللہ ظالموں کے کاموں سے غافل ہے۔"

کشمیریوں کے زخموں پر بھارتی میڈیا کا جھوٹ، عالمی طاقتوں کی خاموشی، اور مسلم دنیا کی بے حسی تازیانے کی مانند پڑ رہے ہیں۔ کیا ہم ان کے ساتھ کھڑے ہیں یا صفِ تماشا بیان میں شامل ہو چکے ہیں؟

❖ عالمی مجرمانہ خاموشی — ایک روحانی لعنت بن چکی ہے ❖

جب فلسطین و کشمیر کے بچوں کے جنازے اٹھتے ہیں تو انسانیت کی قبر میں ایک نئی مٹی ڈالی جاتی ہے۔ اقوام متحدہ، جو انسانیت کی محافظ بن کر کھڑی تھی، آج عالمی استعمار کی آلہ کار بن چکی ہے۔ ان کے کاغذی بیانات، صرف تماشا نیوں کے ہاتھ میں بانٹی جانے والی جھوٹی امیدیں ہیں۔

یہ خامشی محض مجرمانہ نہیں، بلکہ ایک لعنت ہے جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعَمَّى أَبْصَارَهُمْ (سورہ محمد: 23)

"یہ وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی، پھر انہیں بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔"

❖ امت مسلمہ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ غزہ کے نوجوانوں کے ایمان کی چنگاری، جو تلوار بن کر گواہی بن گئی ❖

غزہ کے نوجیز شہسوار، وہ جن کی انگلیوں میں قرآن ہے، دل میں یقین، اور لبوں پر تکبیر۔

ان کا مقابلہ اُس اسرائیل سے ہے جس کی پشت پر امریکا، یورپ، اور اب بھارت جیسی فسطائی قوتیں موجود ہیں، مگر ان کے دل "فَلَنَّا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ" (ہم نے کہا خوف نہ کرو بلاشبہ تم ہی غالب ہو۔ سورہ طہ: 68) کے عزم سے معمور ہیں۔

اور بھارت، جس نے مودیائی فریب، اسرائیلی اسلحہ، اور امریکی سرپرستی میں پاکستان کو کمزور کرنے کی ناپاک جسارت کی، اُس نے خود اپنے زوال کی بنیاد رکھ دی۔ اس خطے میں جو بیداری کی لہر اٹھی ہے، وہ فقط عسکری نہیں — یہ ایک روحانی قیام ہے، ایک امت محمدیہ کی بے دار روح کی گونج ہے۔

"حدیث زنجیر" صرف مظلوموں کی تاریخ نہیں، بلکہ ہمارے ضمیر کا آئینہ ہے، ایک آخری نوحہ ہے۔ اگر ہم اب بھی نہ جاگے تو کل تاریخ ہم سے یہی سوال کرے گی:

"تم کہاں تھے جب مسجدِ اقصیٰ جل رہی تھی؟"

"تم خاموش کیوں تھے جب کشمیری ماں اپنے بیٹے کی آنکھوں سے محروم لاش کا جنازہ اکیلی اٹھا رہی تھی؟"

اگر آج ہم قلم نہیں اٹھائیں گے، تو کل ہماری نسلیں ہمیں ظلم کے معاون کے طور پر یاد رکھیں گی۔

آئیے! اس کتاب کو فقط ایک مطالعہ نہ بنائیں، بلکہ ضمیر کی بیداری اور عمل کی دعوت بنائیں۔

یہ کتاب اُس دور کے سیاہ پردے پر ابھرتی سفید تحریر ہے، جو آنے والی نسلوں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے:

ہم وہ لوگ تھے، جنہوں نے ظالموں کی حمایت کی یا ان کے خلاف زبان بند رکھی، اور اس جرمِ خامشی کا خراج ہماری نسلیں ادا کریں گی۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ تنازع، جو ایٹمی ہولناک انجام کی دہلیز تک پہنچ گیا، اس بات کی شہادت ہے کہ دنیا بھی جنگوں کے ایندھن سے عبرت نہ پکڑ سکی۔ بھارت کی چالاکی، اسرائیل کی سرپرستی اور امریکا کی خاموش شراکت نے خطے کو جہنم بنانے کی کوشش کی۔ مگر قدرت کا نظام بھی کچھ کم حیران کن نہیں۔ پاکستانی افواج کا عزم، چینی اسلحہ کی چمک، اور عوام کا اتحاد، اس سازش کو خاک میں ملا گیا۔

یہ کتاب "خاموش زنجیریں" دراصل اُس اجتماعی ضمیر کا آئینہ ہے جسے ہم نے صدیوں سے غفلت کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ اس میں ان مکالموں کا عکس ہے جو دیواروں کے کانوں میں بھی نہ اُتر سکے۔ اس میں وہ سوالات ہیں جن کے جوابات اگر ہم نے آج نہ دیے تو کل تاریخ کے صفحے ہمیں کڑی عدالت میں لا کھڑا کریں گے۔

"حدیث زنجیر" ایک ایسا نالہ ہے جو نہ صرف ایسے کو بیان کرتی ہے بلکہ ظالم اور خاموش تماشائیوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔

❖ تاہم، امت مسلمہ کا نیا افق نمودار ہو رہا ہے۔ بیداری کی نئی امید بھی پیدا ہو رہی ہے ❖

مشرق وسطیٰ کی یہ تاریخ، جو اب تک نفاق، پر اکسی، اور خاموشی سے عبارت تھی، اب ایک بیداری کے آثار دکھا رہی ہے۔ پاکستان، ترکی، ملیشیا جیسے ممالک، چین کی حمایت اور عالمی توازن کی تبدیلی کے ساتھ ایک نئی صف بندی کا آغاز ہو چکا ہے۔ مگر سوال یہ ہے: کیا ہم فقط بیان و قرارداد تک محدود رہیں گے؟ یا امت مظلومہ کے ان سپاہیوں کا ساتھ دیں گے جو کفریہ اتحادوں کے خلاف فقط ایمان کے ہتھیار سے لڑ رہے ہیں؟

آخر میں... ایک گواہی، جو تاریخ دے گی

کتاب "حدیث زنجیر" محض الفاظ کی لڑی نہیں، بلکہ یہ ایک تاریخی شہادت ہے، جو آئندہ نسلوں کے سامنے ہم سب کی گواہی دے گی۔

"وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" (سورہ بقرہ: 143)

"... اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو"

تو آئیے... اس پیش لفظ کو تحریک کا آغاز بنائیں۔

جہاں ہم خاموش زنجیروں کو توڑنے کا عہد کریں۔

جہاں ہم مظلوموں کے وکیل، اور ظالموں کے منکر بن کر تاریخ میں زندہ ہوں، نہ کہ بے حس تماشائی بن کر کاغذی قراردادوں کے مقبرے میں دفن ہو جائیں۔

❖ وقت کا مؤرخ گواہی دے گا ❖

یہ کتاب ایک آئینہ ہے، جو ہم سب کو چہرہ دکھائے گا

"کل وہ مؤرخ جب سوال کرے گا، تم کیا جواب دو گے؟"

کیا کہو گے کہ ہم خاموشی کے شریک جرم تھے؟

کیا تمہیں یاد نہ آیا:

"وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ" (سورہ ہود: 113)
 "اور ظالموں کی طرف جھکاؤ بھی نہ کرو، ورنہ تمہیں بھی آگ چھو لے گی۔"

❖ خاموش زنجیریں۔۔۔ ایک بیدار لمحہ، ایک زندہ کتاب ہے ❖

ان زنجیروں کی علامت ہے جو بظاہر خاموش ہیں، مگر ان کی جھنکار تاریخ کے درودیوار کو ہلارہی ہے۔
 خاموش زنجیریں ان زنجیروں کی علامت ہے جو بظاہر خاموش ہیں، مگر ان کی جھنکار تاریخ کے درودیوار کو ہلارہی ہے۔

یہ کتاب اُن نوجوانوں کے نام ہے جو:
 غرہ میں پتھروں سے ٹینکوں کو لاکارتے ہیں
 کشمیر میں اذان کے ساتھ شہادت کا کلمہ پڑھتے ہیں
 اور ان مسلمانوں کیلئے جو ابھی جاگے نہیں، مگر جاگ سکتے ہیں

❖ یاد رکھیں ❖

— جب تک امت میں غیرت باقی ہے، طاغوت بے چین ہے۔
 — ظلم کے خلاف خاموش رہنا، دراصل ظلم کو بڑھاوا دینا ہے۔
 — اگر امت کی زبان پر تالے ہوں، تو دل بھی مر جاتے ہیں۔
 — ظالم کے ہاتھ سے کلمہ چھین لو، ورنہ وہ اسی کو ڈھال بنالے گا۔

❖ اس دعا کے ساتھ ❖

اے پروردگار!
 ہماری خاموش زنجیروں کو توڑ دے،
 ہمیں وہ بینائی دے جو حق کو پہچانے،
 ہمیں وہ جرأت دے جو ابابیل کے لشکر کا حصہ بننے کی اہل ہو۔
 "وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" (سورہ الاسراء: 81)
 "اور کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا، یقیناً باطل مٹنے والا ہی ہے۔"

اختتامیہ

یہ پیش لفظ قلم کی نہیں، روح کی صدا ہے۔
 میں آپ کو دعوت دیتا ہوں:
 آئیے، اس کتاب کو فقط مت پڑھئے — بلکہ اس کا پیغام بن جائیے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلْغُ الْمُبِينُ

(اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے اور بس)

تہذیبوں کا تصادم اور پاکستان کی آزمائش

تاریخ کے اوراق میں کبھی کبھی ایسے لمحے نمودار ہوتے ہیں جو سطحی نگاہوں سے محض ملاقاتیں دکھائی دیتے ہیں، مگر بصیرت کی نگاہ میں وہ تاریخ کے دھارے بدلنے والے لمحے بن جاتے ہیں۔ دنیا ایک نئے عبوری دور سے گزر رہی ہے۔ روس و یوکرین کی جنگ کے شعلے ابھی ختم نہیں ہوئے کہ مشرق وسطیٰ کا بگڑتا منظر نامہ، ایک نیا سوالیہ نشان لیے سامنے آگیا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا پرانا تصور اب محض تھیوری نہیں بلکہ حقیقت بن چکا ہے۔ ایران اور اسرائیل کے مابین بڑھتی کشیدگی نے ایک ایسا دھواں اٹھا دیا ہے جس کی لپٹیں خلیج فارس سے ہوتی ہوئی، واشنگٹن، تل ابیب، تہران، بیجنگ، ماسکو اور نئی دہلی تک پہنچ چکی ہیں۔ ایران کا حنیفہ اور تل ابیب پر حملہ، اس بات کی علامت ہے کہ مشرق وسطیٰ کے جنگی افق پر اب صرف عسکری حملے نہیں بلکہ علامتی تہذیبی وار بھی شامل ہو چکے ہیں۔

بین الاقوامی تناظر میں تہذیبی تصادم اور صف بندی کی نئی بساط بچھا کر دنیا کا نقشہ تبدیل کرنے کی سازشیں شروع ہو چکی ہیں۔ کلیدی عالمی مظاہر میں امریکا اسرائیل کا بے مثال حلیف کا کردار ادا کرتے ہوئے تمام عالمی قوانین اور اخلاقیات کو پاؤں تلے مسل رہا ہے جبکہ ایران اپنے دفاعی نظریے کو ”اسلامی مزاحمت“ کا لباس پہنا چکا ہے۔ روس، امریکا کی عسکری مداخلت کا مخالف ہے اور چین خاموشی سے اپنی موجودگی مستحکم کر رہا ہے۔ یورپی ممالک چاہنے کے باوجود اس بحران میں کھل کر کردار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

عرب ریاستیں تذبذب میں ہیں۔ سعودی عرب مصالحت پر مائل، امارات محتاط اور قطر دودھاری پالیسی پر کھڑا ایک بڑی آزمائش میں مبتلا ہے کہ اس نے عربوں ڈالر اپنی گرہ سے لگا کر ہزاروں میل دور بسنے والے قصر سفید کے مکین کو اپنی سرلیح الحُرکت افواج کو علاقہ کاسب سے بڑا بحری اڈہ بنا کر پیش کر دیا اور اب اگر اس اڈے کو نشانہ بنائے جانے کی دھمکی پر عمل ہو جاتا ہے تو قطر کی برسوں کی محنت کے بعد جاری خوشحالی خاکستر ہو سکتی ہے۔ اس سارے تناظر میں اگر کسی ملک کی ایک ”خاموش موجودگی“ عالمی حلقوں میں توجہ حاصل کر رہی ہے تو وہ پاکستان ہے۔

دنیا کے افق پر جب افلاک سیاست کے ستارے گردش میں آتے ہیں، اور تہذیبوں کے مابین کشیدگی کی بجلیاں کڑکنے لگتی ہیں، تب ایک خاموش ملاقات بھی گونج دار پیغام بن جاتی ہے۔ واشنگٹن کی سنگین فضا میں جب جنرل عاصم منیر، پاکستان کی عسکری قیادت کا پیکر و قار، وائٹ ہاؤس کی دلیز پر قدم رکھتا ہے، تو یہ محض ایک رسمی مصافحہ نہیں ہوتا بلکہ تہذیبوں کے مابین ایک خاموش مکالمہ آغاز پاتا ہے۔ پاکستان کا کردار نہایت پیچیدہ اور حساس نوعیت کا ہے۔ بطور ایک ایٹمی اسلامی ریاست، اس کی پوزیشن دنیا بھر میں منفرد ہے۔ جنرل عاصم منیر کی امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے غیر معمولی ملاقات اسی حساسیت کا مظہر ہے۔

یہ ملاقات محض ایران و اسرائیل کے تناؤ کے تناظر میں نہیں دیکھی جاسکتی، کیونکہ درحقیقت یہ مکالمہ اُس بڑے منظر نامے کا ایک جز ہے جس میں طاقت کی بساط پر نئی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ یہ اس وقت ہوا جب مشرق وسطیٰ میں آتش و آہن کے بادل چھائے ہوئے ہیں، حنیف کی بندرگاہیں جل رہی ہیں، تل ابیب دھواں دھواں ہے، اور تہران کے ایوانوں میں صدائے احتجاج گونج رہی ہے۔

حالیہ دنوں واشنگٹن میں وائٹ ہاؤس کے درودیوار ایک ایسی ہی ملاقات کے گواہ بنے جب جنرل عاصم منیر اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے مابین ایک ”غیر معمولی“ اور ”شیڈول سے طویل“ ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کو محض رسمی مصافحہ نہ سمجھا جائے، بلکہ اسے تہذیبی مکالمے، عسکری توازن، سفارتی چالاکی اور مستقبل کی عالمی سیاست کی تمہید کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

اس ملاقات کی گونج صرف پاکستان اور امریکا کے تعلقات کی فضا تک محدود نہیں، بلکہ مشرق وسطیٰ کی دھڑکتی ہوئی نبض، ایران اور اسرائیل کے درمیان سلگتا ہوا تنازع، اور مسلم دنیا کے مجموعی موقف سے مربوط ہے۔ ٹرمپ اور جنرل منیر کی ملاقات میں مشرق وسطیٰ کے حالاتِ حاضرہ، بالخصوص ایران و اسرائیل کشیدگی، پر تفصیلی تبادلہ خیال ہوا۔ یہ ملاقات محض پروٹوکول کا حصہ نہیں رہی بلکہ اسے واشنگٹن میں اسٹریٹیجک کامیابی کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ ٹرمپ نے جنرل منیر کا ”شکریہ“ ادا کیا کہ انہوں نے بھارت کے ساتھ مکمل جنگ کو روکنے میں کردار ادا کیا۔

امریکی تجزیہ نگار بار بار اس ملاقات کو ”شراکت داری میں نئی پیش رفت“ قرار دے رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر پاکستانی فوج نے خطے میں اپنی عسکری ساکھ برقرار رکھی جبکہ سفارتی سطح پر بھی امریکا کے ساتھ تعلقات مستحکم ہوئے، خاص کر اس وقت جب پاکستان توازن برقرار رکھتے ہوئے چین کے ساتھ بھی جدید دفاعی لین دین کر رہا ہے۔

صدر ٹرمپ نے ملاقات کے بعد جو جملے ادا کیے، وہ محض رسمی سفارتی جملے نہیں، بلکہ اس بات کا عندیہ تھے کہ ایران کے حوالے سے اُن کی معلومات اور تعلقات گہرے ہیں: ”وہ (جنرل عاصم منیر) ایران کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ شاید دوسروں سے بہتر“۔ یہ جملہ فقط ایک شخصیت کی معلومات کا اظہار نہیں، بلکہ امریکا کی داخلی پالیسی اور اسرائیل کی پشت پر موجود امریکی ذہنیت کی سفارتی علامت کی بھی ایک جھلک ہے۔ گویا ایران کے ساتھ اُن کی دانستہ خاموش وابستگی اب بے نقاب ہو رہی ہے۔ ایسے بیانات سفارتی چالوں میں کئی بار ”مذاکرات کے دروازے“ کھلے رکھنے کا حربہ ہوتے ہیں۔

ٹرمپ کی زبان سے نکلنے والے الفاظ، بظاہر سیاسی لطافت میں لپٹے ہوئے، درحقیقت ایک غیر معمولی فہم کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ ایران کو ”شاید دوسروں سے بہتر“ جانتے ہیں۔ ایک ایسا اعتراف جو بسا اوقات بادلوں کے پیچھے چھپے سورج کی مانند اپنی روشنی نہیں دکھاتا مگر گرمی ضرور دیتا ہے۔ ان کے یہ الفاظ کہ ”ہم اس صورتحال سے خوش نہیں“، سفارتی ادب کا وہ قرینہ ہے جس میں بیزاری کی تلقینی خوش گفتاری کی شکر میں لپیٹ دی جاتی ہے۔ پاکستان، جو ازل سے ہی تلوار کی دھار اور پل صراط پر چلنے کا عادی رہا ہے، ایک بار پھر اس تاریخ کے موڑ پر کھڑا ہے جہاں اسے اپنی پالیسی کا کمال دکھانا ہو گا۔ نہ بے نیازی کا دعویٰ، نہ بے نیازی کی ہزیمت، بلکہ حکمت کی روشنی اور خودداری کی رہنمائی۔

یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ جنرل عاصم منیر نے اس ملاقات سے محض چند روز قبل ایران کا سرکاری دورہ کیا تھا، جہاں ایرانی عسکری قیادت سے اہم مذاکرات ہوئے۔ اس پس منظر میں ٹرمپ سے ان کی گفتگو محض رسمی نوعیت کی نہیں ہو سکتی۔ پاکستان، جو اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہے، ایران اور سعودی عرب کے مابین ثالثی کا کردار ماضی میں بھی ادا کر چکا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس وقت جنگی اتحاد میں اس کی شمولیت کا کوئی اشارہ نہیں، مگر پس پردہ مذاکرات اور قیادت کی صفوں میں مشورے جاری ہیں۔ جنرل عاصم منیر کا اس وقت متحرک ہونا، بقول غالب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے میرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے

ایران کے ساتھ ان کے حالیہ روابط اسی ”خاموش توازن“ کی دلیل ہیں جو پاکستان مشرق وسطیٰ میں قائم رکھنا چاہتا ہے۔

مارکو روبریو (وزیر خارجہ) اور سٹیو ٹکوف (مشرق وسطیٰ کے ایلچی) کی شرکت اس ملاقات کو رسمی کی بجائے ’تزویراتی نشست‘ میں بدل دیتی ہے۔ گویا اس امر کی دلیل ہے کہ گفتگو کا دائرہ محض خیر سگالی کے جملوں سے کہیں آگے بڑھ کر ہے۔ پاکستانی وفد میں آئی ایس آئی کے سربراہ کی موجودگی اس بات کا عندیہ ہے کہ انٹیلی جنس شیئرنگ یا مشترکہ معلومات پر بھی تبادلہ خیال ہوا۔ ایران کا ذکر واضح، اسرائیل کا ذکر مبہم — یہ اس ملاقات کی ’سفارتی ترتیب‘ کی کلید ہے۔

وہ تمام چہرے، جن کے لب خاموش تھے، آنکھیں مگر سوال کرتی تھیں۔۔۔۔۔ کیا پاکستان، ایک اسلامی ایٹمی طاقت، اس متوقع تصادم میں ثالث کا کردار ادا کرے گا، یا محض تماشائی رہے گا؟ جنرل عاصم منیر کا ایران کا حالیہ دورہ، جسے بعض حلقے محض روایتی قرار دیتے ہیں، اس ملاقات کے پس منظر کو معنی کی نئی پرتیں عطا کرتا ہے۔ ایران کی فوجی قیادت سے ان کے تبادلہ خیال کے تناظر میں، وائٹ ہاؤس میں ان کی موجودگی محض ایک رسمی عمل نہیں، بلکہ بقول اقبال

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہو گا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہو گا

ایران اور اسرائیل کے درمیان جنگ اپنی شدت سے جاری ہے اور ایسے موقع پر جنرل عاصم منیر کا قصر سفید میں ایسا والہانہ استقبال اور ٹرمپ کا یہ کہہ کر استقبال کرنا کہ میرے لئے جنرل عاصم منیر سے ملنا ایک اعزاز ہے، اس کے بعد ان تمام دل جلوں کے ذہن میں امریکی بے وفائی کے گزشتہ تمام تاریخی مناظر ایک فلم کی طرح چلنا شروع ہو جاتے ہیں کہ بارہا پاکستان کو وفاداری کے صلہ میں دشمنوں کے ہاتھوں چر کے لگانے میں قصر سفید کے مکینوں کا بڑا عمل دخل رہا۔ اب ایک مرتبہ پھر یہ خاطر داری دیکھ کر دل گھبرا رہا ہے کہ کہیں پاکستان کو اس ممکنہ جنگ کا حصہ تو نہیں بننا چاہا؟ غالب یاد آگئے: مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ساقی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

یہ سوال بظاہر سادہ لیکن باطن میں نہایت پیچیدہ ہے۔ پاکستان کسی بھی طرح اسرائیل کے ساتھ عسکری اتحاد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نظریاتی اساس، عوامی جذبات، اور پارلیمانی تاریخ — سب اس کے خلاف ہیں۔ مگر امریکا جیسے طاقتور اتحادی کے ساتھ تعلقات کی نزاکت کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اس وقت پاکستان کی پالیسی تین نکات پر استوار ہے۔

- ☆ غیر جانبداری وہ پہلا نکتہ ہے کہ اس جنگ میں کسی فریق کی کھلی حمایت نہ کی جائے۔
- ☆ دوسرا نکتہ ثالثی کے کردار کا ہے کہ ایران و سعودی عرب کی طرح ایران و اسرائیل میں کشیدگی کو کم کرانے میں کردار ادا کرنے کیلئے کہا جائے۔
- ☆ اور تیسرا اہم نکتہ داخلی توازن کا ہے کہ ملک کے اندر کسی بھی قسم کے فرقہ وارانہ رد عمل یا نظریاتی تقسیم سے بچاؤ کیلئے خاموشی اختیار کی جائے۔



مگر سوال یہ ہے کہ کیا ”غیر جانبداری“ کی یہ تلوار دونوں دھاروں کو کاٹنے کی طاقت رکھتی ہے؟ کیا نیتین یاہو کا وہ زہر آلود بیان جس میں وہ ایران کے بعد پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس بیان کے بعد کیا اسرائیل کسی بھی ایسی کوشش پر بر ملا پہلے معافی مانگ کر بیان واپس لے سکتا ہے، اس کا جواب آنے والے ایام دیں گے۔

ان تمام واقعات میں اگر کوئی خاموش کر دار ہے، تو وہ روس ہے، جو پچھلے برس پڑھ کر شطرنج کی چالوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ ماسکو کی جانب سے امریکا کو دیا گیا یہ انتباہ—ایران اور اسرائیل کے تنازع میں مداخلت سے باز رہے، ورنہ پورا خطہ عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ روس کی موجودگی اس بات کا اظہار ہے کہ مشرق وسطیٰ کی جنگ، اگر بھڑکی، تو یوکرین یا شام کی طرح محدود نہیں رہے گی—بلکہ پوری دنیا کی طاقتیں اس میں کھینچی چلی آئیں گی۔ گویا اس عظیم جنگ کی طرف اشارہ ہے جو ”پراکسی“ سے نکل کر ”براہ راست“ میں ڈھل سکتی ہے۔

چین کی وزارت خارجہ کے ترجمان لن جیان نے واضح طور پر کہا ہے کہ چین... ایران کے خلاف اسرائیل کے حملوں سے ”گہری تشویش“ کا اظہار کرتا ہے۔ اور کسی بھی صورت میں مزید کشیدگی کو جاری نہیں دیکھنا چاہتا۔ بیجنگ نے کہا ہے کہ تنازع کا حل صرف سیاسی و سفارتی راستوں سے ہونا چاہیے، اور کسی فوجی مداخلت پر سخت تحفظات ہیں۔ چین نے اپنی ایران کے ساتھ تیل اور انفراسٹرکچر میں معاہدوں کو سامنے رکھتے ہوئے اقوام متحدہ میں ثالثی کے کردار کا عزم ظاہر کیا جیسا کہ گزشتہ صلح نامہ (ایران - سعودی) کے بعد بیلٹ اینڈ روڈ کی کامیابی کا جُز ہے۔ چین بیلٹ اینڈ روڈ کے مفادات کے تحفظ کیلئے ہر ممکن کوشش کرے گا۔

چین نے پہلی بار جنگ بندی کیلئے جامع اور متوازن چار شرائط پیش کیں، جس سے اس کا سفارتی اثر خاصا بڑھا ہے۔

1- صدر شی جن پنگ نے اسرائیل پر زور دیا ہے کہ وہ ”جلد از جلد“ فوری اور غیر مشروط جنگ بندی کو یقینی بنائے تاکہ اس خوفناک کشیدگی میں مزید اضافہ نہ ہو۔

2- چین اور روس دونوں اس نکتے پر زور دے رہے ہیں کہ ایران کے جوہری پروگرام جیسے مسائل کا حل فوجی نہیں بلکہ صرف سفارتی ڈائلاگ اور سیاسی مذاکرات کے ذریعے ممکن ہے۔

3- صدر شی نے اس امر پر بھی زور دیا کہ ایران اور اسرائیل دونوں اپنی سرزمین پر مقیم غیر ملکی شہریوں کو بلار کاوٹ نکالنے کے انتظامات کریں۔

4- صدر شی نے کہا کہ وہ اہم عالمی طاقتوں کی مثبت ثالثی، بالخصوص امریکا کو فعال کردار ادا کرنے کیلئے کہہ رہے ہیں تاکہ کشیدگی کم ہو اور امن کی راہ ہموار ہو۔

چین اور روس نے مل کر اسرائیل کے حملوں کو ”یو این چارٹر کی خلاف ورزی“ قرار دیتے ہوئے کہا کہ خطے میں فوجی مداخلت کے شدید نقصانات ہو سکتے ہیں۔ عالمی فوجی اقدامات کی صورت میں خطے میں جاری جنگ کے شعلے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتے ہیں۔ عالمی میڈیا جاری اسرائیل ایران جنگ میں چین کے کردار کو رپورٹ کرتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ بیجنگ نے خود کو ”امن کے سفارتی ضامن“ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ خود امریکی نیوز ویک نے اعتراف کیا ہے کہ چین نے امریکی توجہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سفارتی پل بڑھانے کی حکمت اپنائی ہے۔

اسی طرح الجزیرہ نے بھی رپورٹ کیا ہے کہ چین اور روس نے مشترکہ طور پر اس بات پر زور دیا کہ مسئلہ فوجی نہیں، سیاسی اور سفارتی حل طلب ہے۔ اسی طرح ٹائم اور اسٹرنز نے متنبہ کرتے ہوئے رپورٹ کیا کہ چین نے امریکی حملے کے حوالے سے خبردار کیا کہ ایسی مداخلت "عالمی عدم استحکام" کا خطرہ ہے سوال یہ ہے کہ کیا روس اور چین کی پوزیشن امریکی حملے کو مؤخر کروا سکتی ہے؟ چین اور روس کی مشترکہ مزاحمت امریکی فوجی آپشن پر ایک مضبوط توازن پیدا کرتی ہے۔ خدشہ ہے کہ ٹرمپ اگلے دو ہفتوں میں حملے کا فیصلہ کر سکتے ہیں، مگر عالمی طاقتوں کے دباؤ نے ٹرمپ کو محتاط کر دیا ہے۔ اقوام متحدہ سمیت متعدد ممالک نے بھی زور دیا ہے کہ طاقت سے مسئلہ حل نہیں، سیاسی راستے اپنانے چاہئیں۔ اس پس منظر میں امریکی مدد کے بغیر اسرائیل کا مکمل حملہ خطرناک حد تک خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

چین۔ روس مشترکہ موقف اور مغربی ممالک کے دباؤ نے ٹرمپ کے فوجی آپشن پر پابندی عائد کر دی ہے۔ اس مرحلے پر سیاسی و سفارتی حل ہی زیادہ ممکن دکھائی دیتے ہیں، اور فوجی محاذ پر کسی صورت میں بریک لگنے کے آثار نمایاں ہیں۔ چین کا مؤثر اور متوازی مقام، روس کے ساتھ مضبوطی اور عالمی میڈیا کے مشترکہ موقف نے امریکی فوجی آپشن کو دباؤ میں رکھا ہے۔ یوں امریکا کو موجودہ تناؤ میں جنگ آگے بڑھانے کیلئے سخت سوچنا پڑے گا۔ چین، جو ایران کا خاموش مگر با اثر اتحادی ہے، خاموشی سے مگر محتاط انداز میں اس پورے منظر نامے کو دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں پاکستان کو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہو گا۔

چین نے ایران۔ اسرائیل تنازع میں گہری تشویش کا اظہار کیا ہے، فوجی مداخلت کی بجائے سفارت کاری کا راستہ اپنایا، اور اپنا بین الاقوامی ثالثی کردار اجاگر کیا۔ عالمی میڈیا نے چین۔ روس موقف کو ایک نئے عالمی توازن کی نمائندگی کے طور پر رپورٹ کیا، جو امریکی فوجی آپشن پر مخصوص حدود عائد کرنا نظر آرہا ہے۔ امریکا، اگرچہ حملے کے امکانات طے کر رہا ہے، مگر چین اور روس کے مشترکہ دباؤ کی وجہ سے فی الحال اس پالیسی کو مؤخر کرنے کا امکان زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

برطانوی وزیراعظم کیرسٹار مرنے ٹرمپ کو مشورہ دیا کہ ایران کے خلاف عسکری کارروائی سے اجتناب کیا جائے۔ برطانوی وزیراعظم کا یہ مشورہ ایک نیا اشارہ دیتا ہے کہ مغرب کے اندر بھی ایران کو مکمل دشمن قرار دینے پر اتفاق رائے نہیں۔ اس طرح یورپی طاقتیں بھی چاہتی ہیں کہ خلیج فارس ایک نئی جنگ کی آگ کا شکار نہ ہو۔ یہ مشورے دراصل خفیہ سفارت کاری کی وہ جھلکیاں ہیں جو بظاہر امن کا پیغام لیے ہوئی ہیں، مگر باطن میں طاقت کے توازن کو اپنے مفاد میں موڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔

اس پوری کہانی میں بھارت بھی ایک سرگوشی کی مانند موجود ہے۔ حیف، جو کبھی نوآبادیاتی ہندوستان کی بندرگاہوں سے جڑا رہا، اب اسرائیلی اہمیت کا مرکز ہے اور ایرانی میزائلوں کا ہدف۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ تہران کی نگاہ تل ابیب سے گزرتی ہوئی دہلی کے ماضی کی گلیوں سے بھی واقف ہے۔ بھارت اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات، اور حیف کی تاریخ، اس تناظر میں ایران کا اس مقام پر حملہ محض جنگی حکمت عملی نہیں بلکہ علامتی انتقام کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ حملے صرف جغرافیہ کو نہیں، بلکہ تاریخ کو بھی نشانہ بنا رہے ہیں۔

حیف، اسرائیل کی وہ بندرگاہ ہے جس پر ایرانی حملوں کی خبریں عالمی میڈیا پر چھائی رہیں۔ مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ حیف کبھی ہندوستانی فوجیوں کی آماجگاہ بھی رہا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی افواج کے ساتھ شامل ہندوستانی سپاہی اسی شہر کی مٹی میں دفن ہوئے ہیں۔ یہود و ہندو کا خطرناک ایجنڈے

پر مبنی اتحاد کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ایک طرف گریٹر اسرائیل کا نقشہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ وہ کس طرح تمام عالم عرب کو اس کا حصہ سمجھتے ہوئے مسلمانوں کے مقدس شہر مدینہ کو بھی اس کا حصہ بنانے پر عمل پیرا ہے وہاں شدت پسند ہندو آرائیں ایس کا اکھنڈ بھارت کا منصوبہ یہ ہے کہ جس ملک کی سرحدیں بحر ہند سے ملتی ہیں، وہ اکھنڈ بھارت کا حصہ ہیں اور مودی اسی جماعت کی نمائندگی کر رہا ہے۔

ادھر کینیڈا کے وزیر اعظم مارک کارنی نے ایک گھنٹہ چال چلتے ہوئے مودی کو جی سیون میں شرکت کی دعوت دی جس پر سکھ برادری نے شدید احتجاج کے منصوبے شروع کر دیے ہیں۔ جس کے بعد کینیڈا نے ایک مرتبہ پھر مودی حکومت پر سخت موقف اختیار کرتے ہوئے سکھ رہنما ہر دیپ سنگھ نجر کے قتل کے الزام میں انٹیلی جنس ملوث ہونے کی تحقیقات پر زور دیا ہے۔ اس سے ایک مرتبہ پھر بھارت اور کینیڈا کے تعلقات تناؤ کا شکار ہو گئے ہیں، اور اگر کینیڈا نے مزید سیاسی یا سفارتی اقدامات کیے، تو مودی حکومت پر بین الاقوامی دباؤ اور سخت ہو جائے گا۔

بھارتی گودی میڈیا اور سوشل میڈیا پر مودی مخالف رجحانات میں تیزی آئی ہے۔ انڈیا ٹائمز پر شائع نیوز کے مطابق، ٹرمپ نے بھارت-پاکستان جنگ کا مذاق یہ کہتے ہوئے روکا کہ دونوں کو عالمی تباہی سے بچا لیا ہے۔ اس بیان کے ردِ عمل میں بھارت کی پرائمری میڈیا میں بھی عوامی سطح پر شدید تنقید اور طنزیہ بیانات سامنے آرہے ہیں جن میں سرنڈر مودی جیسے نعروں کا بھی آغاز ہو گیا ہے۔ سیاسی تجزیہ نگار یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ رجحان مستقبل میں کسی بڑی تحریک کی بنیاد بن سکتا ہے، اگر مخالفین اسے منظم کریں یا کوئی کرائسٹس سر اٹھائے تو مودی کو گھر بھیجنے میں آسانی ہو جائے گی۔

ان حالات میں یہ ملاقات محض دو افراد کی گفت و شنید نہیں، بلکہ تہذیبوں کے تصادم، اسلامی دنیا کے اتحاد، اور عالمی طاقتوں کے نئی صف بندیوں کا پیش خیمہ ہے۔ پاکستان اس وقت تاریخ کے ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں ہر اک قدم ہے دلیل شعور و دانش کا، ذرا سا لغزش پا بھی فنا کا پیغام دے سکتی ہے۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ پاکستان، اپنے نظریاتی اساس، سفارتی دانش، اور علاقائی ہم آہنگی کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے، ایک ایسا کردار ادا کرے جو نہ صرف جنگ سے روکے، بلکہ اسلامی دنیا کی فکری اور عملی قیادت کا نیا باب بنے۔

پاکستان اس وقت نہ صرف ایک جغرافیائی مقام پر کھڑا ہے بلکہ تاریخ کے دھارے پر نکتہ اتصال بن چکا ہے۔ اس کی خاموشی دراصل ایک صدا ہے۔ دانش کی، خودداری کی، اور حکمت عملی کی۔ کیا پاکستان اس تپتی ریت پر اپنا قدم رکھے گا؟ یا پھر حکمت، صبر، اور غیر جانبداری سے ایک نئے باب کا آغاز کرے گا؟ یہ فیصلہ صرف عسکری قیادت کا نہیں، بلکہ پوری قوم کی دانش و بینش کا امتحان ہے۔ ایک پیغام تہذیبوں کو، طاقتوں کو، اور تاریخ کو، کہ پاکستان اب صرف تماشائی نہیں، ایک فکری کردار ہے۔

یاد رکھو! یہ صرف ملاقات نہیں تھی۔۔۔ یہ ایک پیغام تھا!

خطرے کی گھنٹی یا حوصلے کا پرچم؟ پہلگام کے سائے میں ہندوپاک کی نئی داستان

جب تاریخ قلم اٹھاتی ہے، تو محض واقعات کا ردیف قافیہ مرتب نہیں کرتی، بلکہ زمانے کے دھڑکتے ہوئے نبضوں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتی ہے۔ جب تاریخ کی زلف پریشان میں خون کی مہک بسی ہو اور سیاست کی پیشانی پر بارود کی لکیر ابھر آئے، تب ایک معمولی واقعہ بھی تاریخ کا رخ موڑ دیتا ہے۔ پہلگام حملہ، جس نے دونوں ملکوں کو کشیدگی کے نازک پل پر لا کھڑا کیا، محض ایک عسکری جھڑپ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں کئی تہیں چھپی ہیں۔ پہلگام کے دھماکہ خیز لمحے نے ایک بار پھر برصغیر کے دو ایٹمی ہمسایوں — بھارت اور پاکستان — کو اس موڑ پر لا کھڑا کیا جہاں ایک لفظ، ایک گولی یا ایک پرچم کی جنبش پوری دنیا کے امن کو لرزاسکتی ہے۔ یہ صرف سرحدوں کی گرج نہیں تھی، بلکہ دلوں کے دھڑکنے، ذہنوں کے جلنے اور بیانیوں کے بننے بگڑنے کا موسم تھا۔ گزشتہ دنوں ایک ٹل جانے والی قیامت کا ہر نکتہ نہ صرف حالیہ تناظر کا احاطہ کرتا ہے بلکہ ماضی کی گواہی بھی ساتھ لیے ہوئے چیخ چیخ کر عبرت دلارہا ہے۔

مئی 2025ء کے آغاز پر ہونے والے اس چار روزہ تنازع میں پاکستانی فوج نے نہ صرف اپنے دشمن کو منہ توڑ جواب دیا بلکہ یہ یقین بھی دلادیا کہ وہ اب محض دفاعی قوت نہیں بلکہ حکمتِ عملی سے لیس ایک مربوط عسکری ادارہ ہے۔ یہ مظاہرہ پہلی بار نہیں تھا۔ 1965 اور 1999 کی جنگیں اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں کہ پاکستانی فوج، عددی لحاظ سے بڑے دشمن کے خلاف بھی مؤثر دفاع کر سکتی ہے۔

اس بار بھی، بھارت کو جس برق رفتاری، ٹیکنالوجی، اور غیر متوقع ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑا، وہ عسکری اصطلاح میں جنگی مہارت میں "حیران کن کارکردگی" ثابت ہوا ہے جس سے پاکستانی فوج کے عسکری اعتماد نے جہاں بھارت اور اسرائیل کو ناکوں چنے چبوائے وہاں اس کے اتحادیوں کیلئے بھی حیران کن ثابت ہوا ہے۔

پاکستانی عسکری قوت نے اس جھڑپ میں وہ کچھ دکھایا جو بسا اوقات عسکری نظریے کی نصابی کتابوں میں بھی صرف تصویر ہی کی حد تک موجود ہوتا ہے۔ فوجی توازن کے عالمی بیانیوں پر اگرچہ پاکستان کو عددی برتری حاصل نہیں، مگر جس جرأت، چابکدستی اور حکمتِ عملی سے اُس نے بیک وقت کئی محاذوں پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا، وہ بھارت کیلئے ناقابلِ تصور تھی۔ اس عسکری رسوخ نے داخلی طور پر بھی ایک نئی جہت کو جنم دیا۔

جنرل عاصم منیر، جو کبھی سیاسی پس منظر کی دھند میں تنقید کے نشتر سہہ رہے تھے، آج اسی فوجی کامیابی کے صدقے ایک مقبول قومی علامت کے طور پر ابھرے ہیں۔ اُن کی قیادت میں پاکستانی افواج نے نہ صرف دشمن کی عسکری پیش قدمی کو روکنے میں کامیابی حاصل کی، بلکہ عالمی سطح پر پاکستان کے موقف کو اجاگر کرنے کی مہم میں بھی پیش پیش رہی۔

ادھر دوسری طرف چین کی خارجہ پالیسی کی بنیادی روح "توسیع نہیں، تسلط" پر مرکوز ہے۔ وہ براہِ راست مداخلت کی بجائے اپنے اتحادیوں کے ذریعے طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ پاکستان اس پالیسی میں اس کا سب سے بڑا تزویراتی ہتھیار ہے۔ اس واقعہ کے جغرافیائی اثرات محض دہلی اور اسلام آباد تک محدود نہیں رہے۔ چین، جو پہلے ہی لداخ کے دُھند لکوں میں بھارت سے نبرد آزما ہے، اب پاکستان کی دفاعی کارکردگی کو اپنے حق میں ایک مضبوط دلیل

کے طور پر دیکھ رہا ہے۔ لداخ میں بھارت سے تناؤ، تائیوان میں امریکی حمایت یافتہ خود مختاری کی تحریک، اور بحیرہ جنوبی چین میں نیوی کی مشقیں۔ ان تمام محاذوں پر چین اب ایک نئی "ملٹری ٹیکنالوجیکل پاور" کے طور پر ابھر رہا ہے۔

چین، جو خطے میں اپنی بالادستی کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کیلئے کوشاں ہے، پاکستان کی عسکری مستعدی کو اپنے لیے تقویت سمجھتا ہے۔ لداخ اور گلوان میں بھارت کے ساتھ پہلے ہی اس کا تناؤ جاری ہے۔ ایسے میں پاکستانی فورسز کا حوصلہ، بہادری، تجربہ کاری کا دفاعی رد عمل چین کیلئے جہاں ایک تزویراتی اتحادی کی حیثیت رکھتا ہے وہاں چین کی قوت کو تقویت اور عالمی طاقتوں کی نئی صف بندی کے وکٹری سٹینڈ پر برتری کے درجے پر کھڑا کر دیا ہے۔ پاکستان کی دفاعی حکمت عملی، چین کے اس مفروضے کو تقویت بخشتی ہے کہ جنوبی ایشیا میں بھارت کی عسکری بالادستی اب ایک خوابِ نیم شب ہو چکی ہے۔

بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ ہو یا سپیک، چین کی سوچ معاشی راستوں سے فوجی راہداری تک جا پہنچی ہے۔ اس حالیہ تنازع میں پاکستان کی مستعدی نے چین کو ایک ایسا دفاعی "کلیموور" فراہم کیا ہے جو نہ صرف بھارت کی توسیع پسندی کو چیلنج کرتا ہے بلکہ امریکا کو بھی یہ پیغام دیتا ہے کہ ایشیا اب یک قطبی نہیں رہا۔ یہ وہی مثلث ہے جو 1971 میں امریکا، چین اور پاکستان کے درمیان دکھائی دی تھی، جب ہنری کسنجر نے پاکستان کے ذریعے چین کا دورہ کیا تھا۔ آج بھی وہی رشتہ نئی شکل میں قائم ہے۔ یوں یہ تنازع صرف دو ہمسایہ ممالک کے درمیان ایک وقتی کشیدگی نہیں، بلکہ عالمی طاقتوں کی صف بندی کا ایک آئینہ بھی ہے۔

یاد رہے کہ بھارت نے گزشتہ کئی برسوں میں پاکستان سے سفارتی فاصلہ رکھنے کی پالیسی اختیار کی تھی لیکن حالیہ کشیدگی نے اسے ایک بار پھر اس دائرے میں کھینچ لیا ہے جہاں اسے پاکستان کو براہ راست جواب دینا پڑتا ہے۔ یہ خارجہ پالیسی کی وہ لغزش ہے جس کا اندازہ نہرو کے دور میں بھی ہوا تھا جب 1962 کی چین-بھارت جنگ میں بھارت کو عالمی حمایت حاصل کرنے کیلئے غلت میں فیصلے کرنے پڑے۔

سیاست میں لفظ بھی ایک ہتھیار ہے، اور بیانیہ وہ میزائل جو دلوں اور اذہان کو نشانہ بناتا ہے۔ اس کشمکش میں جہاں بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی اپنی تقریروں میں "سندور" کی قسم کھا کر قوم پرستی کے دیوتا کو پکار رہے تھے، وہیں پاکستان نے اقوام عالم کے سامنے اپنا موقف پیش کیا کہ دہلی خود خطے کو جنگ کے دہانے پر لا رہا ہے۔ مودی کا یہ کہنا کہ "میری رگوں میں سندور بہتا ہے" ایک مذہبی علامت سے زیادہ، سیاسی اسلحہ تھا جس سے بھارت کی داخلی سیاست کو گرما یا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قومی مفادات کے محافظین کے ہاتھ میں جذبات کی شعلہ بیانی ایک محفوظ ہتھیار ہے؟

نریندر مودی کا انتخابی جلسے میں وہ بیان کہ "میری رگوں میں سندور بہتا ہے... سکھ چین سے روٹی کھاؤ ورنہ میری گولی تو ہے ہی، صرف ایک سیاسی نعرہ نہیں بلکہ خطے کی ایٹمی سلامتی کے منہ پر ایک کھلا طمانچہ ہے جس کے ذریعے مذہبی جذبات کو ہوا دے کر قوم پرستی کا پرچم بلند کیا گیا لیکن نہ تو یہ طرز خطاب تاریخ میں نیا نہیں بلکہ اس کا اثر مناک انجام بھی تاریخ نے محفوظ کر رکھا ہے تاکہ دنیا اس سے عبرت حاصل کرے۔ اس طرح کی دہمکی آمیز، بازاری اور معاندانہ زبان نہ صرف بین الاقوامی آدابِ سیاست کی توہین ہے بلکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی روح کی بھی منافی ہے۔ ایسی زبان، ایسی سنگینی، ایک ایسے وقت میں جب خطہ پہلے ہی کشیدگی کے شعلوں میں گھرا ہو، غیر معمولی تشویش کا باعث بن گئی ہے۔ عالمی میڈیا، سفارتی حلقے، اور امن پسند قویں اس طرزِ بیان پر حیران ہیں کہ ایک ایٹمی ریاست کا وزیراعظم کس بے باکی سے جنگی ترانے گاتا ہے۔

تاریخ میں اگرچہ سیاست دانوں نے جرات آمیز الفاظ کہے ہیں، مگر کبھی بھی اس حد تک شخصی انتقام کی آگ کو انتخابی ایندھن نہیں بنایا گیا۔ اندرا گاندھی نے 1971 میں مشرقی پاکستان کے خلاف جنگ سے قبل بھی اسی قسم کی تقاریر کی تھیں اور 1971 میں اندرا گاندھی نے بنگلہ دیش کے تناظر میں تلخ بیانات ضرور دیے تھے، مگر ایسی دہمکی آمیز زبان استعمال کرنے سے انہوں نے بھی گریز کیا تھا۔ مودی کی تقاریر، اس کے برعکس، ہندو تو انظریے، نفرت، اور ذاتی غرور کا پرچار بن چکی ہیں۔ انتخابات جیتنے کیلئے مودی کا یہ نیا ڈرامہ کوئی نیا نہیں، اس سے قبل بھی وہ گجرات کے قصاب کے نام سے مشہور ہے جب اس نے بطور انڈین گجرات کے وزیر اعلیٰ ہوتے ہوئے مسلمانوں کے قتل عام کا نہ صرف حکم دیا بلکہ ایک سازش کے تحت اب بھی انڈیا میں مسلمانوں کے خاتمے کیلئے کھلم کھلا بیان بازی کرتا رہتا ہے۔

مودی کی گولی والی دھمکی نہ صرف اسی سیاسی سکرپٹ کا حصہ ہے بلکہ اس کی مکاری اور ذہنی بیماری کی نشاندہی بھی کرتی ہے کہ اسٹیبلشمنٹ کے ایسے شدت پسند سربراہ سے دنیا کو کس قدر شدید خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ بھارت کے اندر کانگریس جیسی جماعتیں اس موقع پر بی جے پی کی خارجہ پالیسی کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس ساری صورت حال کو بی جے پی کی خارجہ پالیسی کی ناکامی سے تعبیر کر رہی ہیں۔ وہ یہ دعویٰ کر رہی ہیں کہ بھارت کی سفارتکاری، جو کبھی ایک عالمی مثال ہو کر تھی، آج رد عمل اور اشتعال انگیزی کی راہوں پر گامزن ہے اور بھارت کی جارحانہ پالیسی درحقیقت اس کے عالمی تنہائی کا باعث بن رہی ہے۔ یہ احتجاج اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ معاملہ صرف عسکری یا سفارتی نہیں، بلکہ داخلی سیاسی حرکیات کا بھی عکاس ہے۔ خارجہ پالیسی کا ناکام ہونا درحقیقت اندرونی سیاسی کشمکش کا اظہار ہے۔ 2002 میں گجرات فسادات کے بعد بھی بھارت کو سفارتی سطح پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اور آج تک بھارت کے چہرے کی بدترین کالک کے طور پر تاریخ میں رقم ہو چکا ہے۔



پاکستان اور انڈیا دونوں جوہری طاقتیں ہیں اور ان کے درمیان بڑھتی ہوئی کشیدگی دنیا بھر کیلئے لمحہ فکریہ ہے۔ کارگل جنگ کے دوران بھی عالمی برادری نے بروقت مداخلت کی تھی تاکہ دو ایٹمی ریاستیں کسی حماقت میں نہ پڑ جائیں۔ کیا ہم آج بھی اُسی دہلیز پر کھڑے ہیں؟ کیا برصغیر ایک بار پھر تاریخ کی بھٹی میں جھونکا جائے گا؟ رافال "بمقابلہ" بے 10 سی "کا موازنہ دراصل صرف طیاروں کا نہیں بلکہ دو نظریات کا ہے۔ فرانس سے حاصل کیے گئے رافال اور چین سے لیے گئے بے 10 سی اس بات کی علامت ہیں کہ دونوں ممالک ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنے اپنے اتحادیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جہاں ایک طرف

"رافال" بمقابلہ "بے 10 سی" کی ہوئی جھڑپوں پر دنیا کی نظریں مرکوز ہیں، وہیں سوال یہ بھی جنم لیتا ہے کہ آیا یہ سب اسٹیبلشمنٹ کے دہانے کی طرف پیش قدمی ہے؟ کیا برصغیر کی فضاؤں میں گونجتی ہوئی جنگی گرج مستقبل کی امن فاختاؤں کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دے گی؟

پاکستان میں گرائے گئے اسرائیلی ساختہ ہاروپ کامی کا ڈرون ہو یا براہموس میزائل کا راستہ بھٹک جانا—یہ سب نئی جنگی حکمت عملی کا حصہ ہیں، جہاں انسان کم اور مشینیں زیادہ بولتی ہیں۔ یہ دراصل چوتھی نسل کی جنگ (فور تھ جرنیشن وارفیر) ہے جہاں دشمن کا چہرہ دھند میں چھپا ہوتا ہے اور حملہ خاموش ہوتا ہے۔ ہاروپ ڈرون اب محض جاسوسی نہیں کرتے بلکہ وہ "لوٹیرنگ ایمونیشن" جیسے خفیہ ہتھیاروں میں تبدیل ہو چکے ہیں جو فضا میں شکار کی تلاش میں گردش کرتے ہیں۔ یہ حکمت عملی نہ صرف دفاع بلکہ نفسیاتی برتری کا بھی ایک آلہ بن چکی ہے۔ ان ڈرونز کے ناقابل تسخیر ہونے کے اسرائیلی جنگی مافیا کو شدید دھچکا پہنچا جب اس کا سارا جنگی غرور خاک میں مل گیا اور پاکستان نے نہ صرف درجنوں ڈرون مار گرائے بلکہ نصف درجن ڈرونز کو جام

کر کے زمین پر اتار لیا گیا اور اب ان کے ماتھے پر خطرات کا پسینہ خشک ہونے کا نام نہیں لے رہا کہ اس طرح ان کی یہ ٹیکنالوجی بھی پاکستان کے ہتھے لگ گئی ہے۔

اسرائیل اور بھارت تو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ڈرون دشمن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر اسے لاغر کر دیتا ہے لیکن اسرائیل کا یہ دعویٰ بھی اقوام عالم کے دفاعی تجزیہ نگاروں کیلئے مذاق کا نشانہ بن گیا ہے۔ پاکستان کی جانب سے گرائے گئے اسرائیلی ساختہ ڈرونز، براہموس میزائل کا بھٹک جانا، اور فضائی حدود کی خلاف ورزیاں صرف عسکری معاملات نہیں، بلکہ جدید ٹیکنالوجی کی اس جنگ کا حصہ ہیں جو مستقبل کے محاذوں کی نقشہ کشی کر رہی ہیں۔ عسکری سائنس میں اب یہ ممکن ہے کہ کسی فضائی حملے یا دراندازی کو الیکٹرانک سگنل پر کھاجائے۔ یہ طریقہ کار نیٹو افواج نے 1991 کی خلیجی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ پاکستان اور بھارت کے دعوے اسی جدید اصول پر رکھے جا رہے ہیں۔

یاد رہے کہ پاکستانی فضائیہ نے بالاکوٹ کی فضائی ڈاگ فائٹ کے بعد نہ صرف ایک مرتبہ پھر نئی فضائی تاریخ رقم کی، بلکہ عالمی میڈیا کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ اس سے قبل بالاکوٹ کی جھڑپ میں پاکستانی فضائیہ نے نہ صرف بھارتی فضائیہ کے دو اہم طیارے مار گرائے تھے بلکہ اپنی فضائی حدود میں واضح برتری کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ آزاد ذرائع، سیٹلائٹ فوٹیج اور آزاد مبصرین کی رپورٹس نے تصدیق کی تھی کہ بھارت کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

اب ایک مرتبہ پھر بھارت کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ مودی مسلسل اپنے گودی میڈیا پر اپنی جھوٹی فتح کے نعرے لگواتا رہا، کبھی لاہور پر مکمل فتح اور کراچی کی بندرگاہ پر قبضہ کی خبریں نشر کرواتا رہا اور کبھی بلوچستان کی علیحدگی اور پاکستانی فوج کے سربراہ سمیت موجودہ حکومت کے اہم سرکردہ سیاستدانوں کی گرفتاری کی خبریں چلائی گئیں لیکن جب اس سے اگلے دن پاکستانی حملے نے مودی کے پروپیگنڈے کے غبارے کو پھوڑ کر رکھ دیا اور رافیل سمیت دوسرے جہازوں کی ارحشی اسی کی سرزمین پر سجادی تو مودی اور اسرائیل کو اپنے آقا امریکی صدر ٹرمپ کے پاؤں پکڑنے پڑے تو تب جا کر خود رافیل کمپنی کو بھی اپنے جہازوں کی تباہی کو تسلیم کرنا پڑا۔

اس مبینہ ڈاگ فائٹ پر انڈین حکام نے تاحال کوئی تبصرہ نہیں کیا جبکہ پاکستانی فضائیہ کے ڈپٹی چیف آف ایئر آپریشنز ایئر وائس مارشل اورنگزیب کا کہنا تھا کہ "یہ ایک بی وی آر (ہیونڈویڈیول ریج) لڑائی تھی جس میں انڈیا کے 70 جنگی طیاروں اور پاکستان کے 40 جنگی طیاروں نے حصہ لیا، یعنی کل 100 سے زیادہ طیارے تھے جو کہ ہوا بازی کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے۔ پاکستانی فضائیہ کی طرف سے اس کارروائی میں جے ایف 17 اور جے 10 طیاروں نے حصہ لیا تاہم انہوں نے اس حوالے سے تبصرہ نہیں کیا کہ آیا پاکستان نے چینی ساختہ پی ایل 15 استعمال کیا۔

ان کا کہنا تھا کہ پاکستان کا فضائی دفاعی نظام بہت مؤثر ہے اور "ایک کل اسی (زمین سے فضا میں مار کرنے) کی بدولت ممکن ہوا"۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ کارروائی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ انڈین طیاروں کے رونما ہونے کے بعد پاکستانی فضائیہ نے اپنا ملٹی ڈومین آپریشن شروع کیا"۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ 6 مئی کی شب ایک گھنٹے تک جاری رہنے والی اس ڈاگ فائٹ میں انڈین فضائیہ کے 72 طیاروں میں سے 14 رفال طیاروں کی الیکٹرانک نشاندہی کی گئی تھی جبکہ پاکستان نے اس آپریشن میں 42 جنگی طیارے استعمال کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ لاہور، اسلام آباد اور دیگر فضائی حدود میں سویلین ایئر ٹریفک کی حفاظت کیلئے اس کا راستہ تبدیل کر دیا گیا۔

ایئر وائس مارشل اور نگزیب احمد کے مطابق جیسے ہی انڈین طیاروں نے اپنے ہتھیار استعمال کیے تو پاکستانی فضائیہ کے طیاروں نے "ہو امیں رولز آف دی گیم تبدیل کر لیے"۔ "انڈیانے پچھلی بار کہا تھا کہ اگر ان کے پاس رفال ہوتے تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ تو ہم نے رفال طیاروں کو نشانہ بنایا۔ ہمارے پاس مزید نمبرز ہو سکتے تھے مگر ہم نے تحمل دکھایا۔"

پاکستانی فضائیہ نے دعویٰ کیا کہ تین رفال طیارے بھٹنڈہ، جموں اور سرینگر کے قریب مار گرائے گئے جبکہ مگ 29 اور سو 30 سرینگر کے پاس مار گرایا گیا۔ بعد ازاں عالمی میڈیا پر ان کی تباہی کے ویڈیو نے انڈین گودی میڈیا کو منہ بند رکھنے پر مجبور کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ خود بھارتی ایئر چیف مارشل کی سطح پر اس نقصان کا اعتراف کیا گیا۔ ان کا کہنا تھا "ہمیں کچھ نقصانات ضرور ہوئے ہیں جن پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔" یہ اعتراف گویا اس خفت کا عکس تھا جو انڈین فضائیہ کو بالاکوٹ کے بعد پہلے ہی برداشت کرنا پڑا تھا۔ اُس وقت بھی پاکستان نے نہ صرف دو بھارتی جہاز گرائے تھے بلکہ ونگ کمانڈر ابھی نندن کو زندہ گرفتار کر کے عالمی سطح پر اخلاقی و عسکری برتری حاصل کی تھی۔

یاد رہے، بالاکوٹ کے بعد ہی انڈیانے یہ شکوہ کیا تھا کہ اگر ہمارے پاس رافیل طیارے ہوتے تو نتیجہ مختلف ہوتا مگر آج، رافیل کی موجودگی کے باوجود نتائج وہی رہے، بلکہ اس بار پاکستانی جے-10 سی طیاروں نے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ فضائی حدود میں دشمن کے عزائم کو ملیا میٹ کر دیا۔ یہ نئی کامیابی پاکستانی فضائیہ کیلئے ایک ایسا تمغہ ہے جس نے 1965 کے ایم ایم عالم کے کارنامے کی یاد تازہ کر دی۔ بین الاقوامی دفاعی جریدے "جینز ڈیفنس ویکی" اور "دی نیو یارک ٹائمز" سمیت عالمی اداروں نے تسلیم کیا کہ اس ڈاگ فائٹ میں پاکستان نے عسکری، تزویراتی اور ٹیکنالوجیکل اعتبار سے بازی اپنے نام کی۔

امریکا جنوبی ایشیا میں ہمیشہ سے ایک متذبذب نگران کا کردار ادا کرتا آیا ہے۔ امریکا کی آئندہ حکمت عملی یقیناً ہمارے سامنے ہے اور امریکا کی سلامتی کونسل میں اسرائیلی مظالم کو روکنے کیلئے سلامتی کونسل میں جو قرارداد لائی گئی، اس کو امریکا نے ویٹو کر کے مسترد کر دیا جس کی ساری دنیا میں مذمت کی جا رہی ہے اور اس وقت انڈیا کو اسرائیل کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے بلکہ دوسرے لفظوں میں وہ انڈیا میں آکر پاکستان کا ہمسایہ بن چکا ہے تاہم موجودہ حالات میں واشنگٹن کی توجہ تائیوان، یوکرین اور مشرق وسطیٰ کی جانب بھی منقسم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خطے میں اس کا کردار اب محض ثالث یا تماشائی کا نہیں رہے گا بلکہ وہ چین کے خلاف "اسٹریٹجک کنٹینمنٹ" کے تحت بھارت کو دفاعی ہتھیار، سیٹلائٹ ڈیٹا اور عسکری تعاون فراہم کرے گا اور اسرائیل بھی انڈیا کو جدید اسلحہ فروخت کر کے اپنا مال بھی بناتا رہے گا۔

یہی حکمت عملی سرد جنگ کے زمانے میں پاکستان کے ساتھ اپنائی گئی تھی، اور آج وہی نکتہ نظر بھارت کے ساتھ دہرایا جا رہا ہے۔ امریکا چین کو روکنے کیلئے بھارت کی عسکری مضبوطی کو ضروری سمجھتا ہے، مگر اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاکستان مکمل طور پر چین کے ہلاک میں چلا جائے۔ یوں خطہ ایک نئی سرد جنگ کے دہانے پر آکھڑا ہوا ہے۔

یہ سوال ہنوز قائم ہے: کیا برصغیر اپنی تاریخ کے المیوں سے کچھ سیکھ پائے گا؟ یا ماضی کی طرح پھر کوئی لمحہ، کوئی سیاست، کوئی فقرہ ایک ایسی جنگ کو جنم دے گا جس کا کوئی فاتح نہ ہو گا؟ تاریخ کی راہوں پر جب قومیں اپنے نظریات، عسکری بصیرت، اور تہذیبی شعور کے ساتھ چلتی ہیں، تو صرف جنگ نہیں جیتی جاتیں، بلکہ نسلیں محفوظ ہوتی ہیں۔ یہ تنازع ہمیں ایک بار پھر یاد دلاتا ہے کہ طاقت صرف بدوق کی گرج میں نہیں، دانش کی گہرائی اور گفتار کی بلاغت میں بھی پنہاں ہوتی ہے۔

یہ خطہ، جو کبھی شاعروں کی نغسی، صوفیوں کی نرمی اور مفکرین کی حکمت کا گوارہ رہا، کیا دوبارہ خون کی چھینٹوں سے لت پت ہو گیا امن کی امید بن کر جگمگائے گا؟ جواب ہمارے بیانے میں ہے، ہماری قیادت میں ہے، اور ہماری دعا میں ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ دشمنی کے خیمے لپیٹے جائیں اور امن کے دیئے روشن کیے جائیں۔ مودی اگر سندور میں خون گھول دے، تو امن کی ہر دعا رد ہو جاتی ہے۔

بروز اتوار 3 محرم الحرام 1447ھ 29 جون 2025ء

تخیل سے حقیقت تک: پاکستان کا خاموش سفر

جدید جنگ کا افق اب توپ و تفنگ کے دھویں سے نہیں، بلکہ نادیدہ لہروں، خاموش پروازوں، اور مصنوعی ذہانت کی خلوتوں سے روشن ہو چکا ہے۔ جب اقوام عالم زمینی حدود کے جھگڑوں سے ماوراء ہو کر افلاک کی وسعتوں میں برتری کیلئے صف آرا ہوں، تو یہ نہ صرف عسکری ترجیحات کا اشاریہ ہوتا ہے بلکہ تہذیبی، فکری اور سیاسی خود شعوری کا اعلان بھی۔ ایک دور تھا جب جنگ کا فیصلہ فوج کی تعداد پر ہوتا تھا، پھر زمانہ آیا کہ ہتھیاروں کی نوعیت نے بازی پلٹی۔ آج ہم اس عہد میں داخل ہو چکے ہیں جہاں "نظر نہ آنے والی قوت" ہی سب کچھ ہے۔ یہی فلسفہ ہے "ففتھ جزیشن سٹیلیٹھ فائٹر جیسٹس" کا۔ وہ طیارے جو خود کو چھپاتے ہیں مگر دشمن کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔

آج پاکستان اور ہندوستان کے مابین جو کچھ ہو رہا ہے، وہ تلواروں کی جھنجھاہٹ نہیں بلکہ چپ چاپ موت بانٹنے والے "خاموش قاتلوں" کی دنیا ہے۔ سٹیلیٹھ ٹیکنالوجی سے مزین ففتھ جزیشن طیاروں کی دوڑ، جو نہ صرف ریڈار کی آنکھ کو چمکے دیتے ہیں بلکہ دشمن کی نیندیں بھی چرا لیتے ہیں۔ جے-35 طیارے فقط ہتھیار نہیں، بلکہ جدید جنگی فلسفے کے عکاس ہیں، جو دشمن کو دکھائی دے بغیر مار گرانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جو خاموشی سے اپنا کام کرتی ہے، گویا سناٹا ہی اس کی آواز ہے۔ چین کی پاکستان کو جے-35 طیاروں کی پیشکش بظاہر ایک فوجی سودہ سہی مگر دراصل اس میں چھپی ہے ایک بین الاقوامی دوستی کی گونج کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، نہ صرف زمینی محاذ پر بلکہ فلک پر بھی تمہارے آزمودہ ساتھیوں کی طرح محو پرواز رہیں گے اور یہ ہے ہمسایہ چین دوست کی پیشکش جو ہمالیہ کی چوٹیوں پر سناٹی دے رہی ہے۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان چار روزہ گولہ باری فقط بارود کا دھواں نہیں تھی، بلکہ اس میں ایک غیر علانیہ پیغام پنہاں تھا۔ ہم تیار ہیں، لیکن تم بھی محتاط رہو۔ اب بات چوکوں اور مورچوں سے نکل کر دفتر خارجہ کی میز پر آچکی ہے، جہاں فائلیں ہی فصیلیں ہیں اور بیانات، میزائلوں کے متبادل۔ جنگی تبادلوں کے بعد دفاعی اپ گریڈ کی سفارتی بازگشت تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ رہی ہے۔ چین کی پاکستان کو جے-35 سٹیلیٹھ طیاروں کی پیشکش نہ صرف ایک دفاعی معاہدہ ہے بلکہ ایک سیاسی بیانیہ بھی۔ چین کا یہ پیغام صاف ہے: "ہم تمہارے دفاعی شراکت دار ہیں۔" جے-35 وہ پرندہ ہے جو دشمن کی نظر سے اوچھل رہتا ہے، مگر اس کے قلب پر کاری وار کرتا ہے۔ پاکستان کیلئے یہ پیشکش مستقبل کی فضائی حکمت عملی کی نوید ہے۔

یہ حقیقت اب آشکار ہو چکی ہے کہ چین نے پاکستان کو جے-35 ففتھ جزیشن سٹیلیٹھ جیسٹس کی پیشکش کی ہے لیکن اسے صرف عسکری سودے بازی سمجھنا، سیاسی سادہ لوحی کے سوا کچھ نہیں۔ چین کی بروقت اور اہم پیشکش، محض سوداگری نہیں، بلکہ ایک تہذیبی اشارہ ہے۔ یہ درحقیقت اُس دوستی کا عملی استعارہ ہے جسے وقت کی آزمائشوں نے "آہنی بھائی چارہ" بنا دیا۔ یہ طیارے نہ صرف جدید تکنیکی کمالات کا مظہر ہیں بلکہ پاکستان کے دفاعی نظریے میں ایک خاموش مگر گہری تبدیلی کا اشارہ بھی دیتے ہیں۔

چار روزہ جھڑپیں دراصل خاموش سفارتی چیخیں تھیں، جو ہندو کی نالی سے نکل کر اقوام عالم اور اقوام متحدہ کے بہرے کانوں میں گونجیں۔ اب دونوں ممالک جان چکے ہیں کہ جنگ جیتنے کیلئے صرف فوج نہیں، ٹیکنالوجی بھی درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب پاک و ہند کے درمیان سفارتی تناؤ کے ساتھ عسکری اپ گریڈ کے معاملات کو ہر چیز پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ بالخصوص انڈین چیف آف ڈیفنس کا ایک غیر ملکی میڈیا کے سامنے رافیل اور دیگر جہازوں کی تباہی کے جواب میں "نمبر اہم نہیں، وجوہات اہم ہیں" ایک ایسا کھلا اعتراف ہے جو دراصل شکست کے اعتراف سے کہیں بڑھ کر ہے۔

یہ بیان دراصل ایک عسکری فلسفے کی تبدیلی ہے۔ یہ کہنا کہ ”کیا غلطیاں ہوئیں“، ایک ایسی سیاسی تکبر کی شکست فاش ہے جو پاکستان کو ایک کمزور ریاست سمجھتے ہوئے ہر وقت آنکھیں دکھاتا رہتا تھا اور اب، جب انڈین چیف آف ڈیفنس سٹاف جنرل انیل چوہان نے پہلی بار طیارے گرائے جانے پر لرب کشائی کی، تو یہ محض اعتراف نہیں، بلکہ اپنے عسکری تجربے کا ایک خود احتسابی پہلو تھا۔ اہم سوال یہ ہے کہ ”وہ کیوں گرائے گئے؟“ — اور یہ سوال عددی کامیابی سے زیادہ فکری گہرائی کا طالب ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بھی کرنا ضروری ہے کہ اس جنگ سے قبل خود بھارتی اخبار ”ہندو“ میں شائع ہونے والا ایک حاضر سروس بھارتی جنرل کا موقف اب بھی ایک مضبوط فکری اور اخلاقی معیار کے طور پر یاد رکھا جا رہا ہے کہ جنگ کے مستند اثرات، سفارتی حکمت، اور ذمہ دارانہ سوچ کا ایک زندہ ثبوت ہے جس میں جنرل منوج مکند ناروانے نے جنگ کے تباہ کن اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا: جنگ کوئی رومانوی تصور نہیں، نہ ہی یہ کسی بالی ووڈ فلم کی طرح ہوتی ہے۔ یہ تباہی، اذیت، اور بے گناہ جانوں کا نقصان لاتی ہے۔ اسے ہمیشہ صرف آخری حل کے طور پر سوچا جانا چاہیے، جب تمام سفارتی و پُر امن راستے ناکام ہو چکے ہوں لیکن وائے افسوس کہ متکبر مودی طے کر چکا تھا کہ وہ پہلے گام فاس فلیگ آپریشن کو کیش کروا کے صوبہ بہار میں انتخاب جیت جائے گا لیکن پاکستانی شاہینوں اور زمینی مجاہدوں کے ایک ہی جھٹکے نے مودی گجراتی قصاب کو ساری دنیا کے سامنے ننگا کر کے اسے زمینی حقائق کی خاک چاٹنے پر مجبور کرتے ہوئے عملی دنیا کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا۔

مئی کے مہینے میں جب چار دن تک پاکستان اور بھارت ایک دوسرے کے خلاف گرجتے رہے، تب ہوا میں فقط بارود کی بو نہیں، بلکہ تاریخ کے نوے بھی بلند ہوئے۔ ایسے میں اگر کسی نے کان دھرا، تو وہ سفارتی محاذ پر گونجتی وہ گفتگو تھی جس میں محض الزامات نہیں، بلکہ اگلے معرکوں کی تیاری کا عندیہ بھی چھپا تھا۔

اب توپ کا رخ، دشمن کی چال پر نہیں، اپنی فضائی قوت کی بساط پر مرکوز ہے۔ ہر ملک چاہتا ہے کہ اس کے فضائی دستے نہ صرف محفوظ ہوں، بلکہ چوتھی نسل سے پانچویں نسل کی چھلانگ ماریں۔ ایسی چھلانگ جو دشمن کو پیچھے چھوڑ دے، اور حلیفوں کو متاثر کرے۔ اب اقوام عالم میں گفتگو کا نیا محور فضائی صلاحیتوں کی طرف مرکوز ہو گیا ہے۔ عسکری دوڑ میں تہذیبی فہم کا بھی چرچا جاری ہے۔

یہ وقت ہے جب فضاؤں کی جنگ، زمین پر قوموں کے مزاج اور فکر کی جھلک دکھا رہی ہے۔ بھارت جہاں اپنی دفاعی صلاحیتوں کو خود انحصاری کی راہ پر ڈالنے کیلئے مقامی سطح پر ففٹھ جزیں طیارے تیار کرنے کا عندیہ دے چکا ہے، وہیں امریکا یا روسی ٹیکنالوجی کی خریداری پر بھی غور جاری ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے چین کی پیشکش کو قبول کرنے کے آثار ظاہر کیے ہیں۔ یہ فقط عسکری سودا نہیں، بلکہ نئی عالمی صف بندیوں کا اعلان ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب تہذیبوں کی سمت کا تعین ہوتا ہے۔ بھارت اگر روس کی جانب جھکتا ہے تو وہ مشرقی اتحادیوں کی صف میں شامل ہوتا ہے، اور اگر امریکا کا رخ کرتا ہے، تو مغربی بلاک کی چھتری تلے آجاتا ہے۔ طیاروں کی خریداری فقط تکنیکی فیصلہ نہیں، بلکہ تہذیبی وابستگی کی علامت بھی ہے۔

خاموش قاتل، ففٹھ جزیں سٹیلٹھ طیاروں کی حقیقت آخر ہے کیا کہ پاک و ہند ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں اس طیاروں میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ دراصل یہ طیارے ”خاموش قاتل“ کہلاتے ہیں۔ نہ دکھائی دیتے ہیں، نہ آسانی سے روکے جاسکتے ہیں، اور نہ ہی ان کی نقل و حرکت کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ جدید ترین خوبیوں نے اس طیارے کو پانچویں نسل کی فضائی بالادستی کا نشان بنا دیا ہے۔ یاد رہے کہ ففٹھ جزیں اور سٹیلٹھ طیارہ اس وقت ”ففٹھ جزیں“ کہلاتا ہے جب وہ سٹیلٹھ ہو، سپر کروزر کرے، نیٹ ورکڈ ہو، ملٹی رول ہو اور ایویانکس میں ہم آہنگی ہو اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ

سٹیلتھ اس وقت معتبر ہے جب دشمن کو طیارہ دیکھنے سے پہلے مار کھا جائے۔

اس کی پہلی خوبی اس کی سٹیلتھ صلاحیت ہے جو اسے ریڈار سے اوجھل اور دشمن کے ہر قسم کے نظاموں سے چھپا دیتی ہے۔ دوسری اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی سپر کروزر پرواز ہے یعنی آواز کی رفتار سے بھی کہیں زیادہ تیز، کم ایندھن کے ساتھ طویل فاصلہ طے کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تیسری خوبی ایویانکس اور سینسر فیوژن کی ہے، تمام سسٹمز کا ہم آہنگ ہونا یعنی جیسے انسان کی پانچوں حواس ایک مرکب شعور میں ڈھل جائیں، ویسے ہی یہ طیارے اپنے تمام نظاموں کو ہم آہنگ کر کے دشمن پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ چوتھی خوبی اس کی سپر کروزر یعنی بغیر ایندھن کے ضیاع کے تیز رفتاری سے ہدف کو تباہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور پانچویں خوبی نیٹ ورکڈ وار فیئر کی ہے تمام فضائی وزینی نظام سے ربط باقی رہتا ہے جیسے ہر مشین، ہر ڈرون، ہر ریڈار کے ساتھ جڑے، گویا فضا میں ایک جال بچھا دیا ہو۔



فضائی توازن کی نئی بساط میں اس وقت دنیا میں محض پانچ اقوام کے پاس ایسے طیارے موجود ہیں۔ امریکا کے ایف 22 رپیز اور ایف 35، روس کا ایس یو 57، اور چین کے جے 20 اور جے 35 ہیں۔ ان کے بعد کی قطار میں برطانیہ، اٹلی، جاپان، ترکی، فرانس، جرمنی اور اسپین کے تیار کردہ طیارے ہیں جو ابھی تیاری کے مراحل میں ہیں۔ جیسے "ٹیمپسٹ"، "ایف سی اے ایس" اور "اے اے این" لیکن پاک چین کے اشتراک سے بنے طیاروں نے حالیہ پاک و ہند کی جنگ میں جو نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں، اس کے بعد پاکستان کی فضائی کارکردگی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی تکنیکی مہارت نے بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔

عالمی میڈیا کے مطابق پاکستان نے جہاں میدان جنگ میں فتوحات حاصل کی ہیں وہاں کامیاب سفارتی کوششوں سے میدان مار لیا ہے جس کی واضح مثال جے 35، ایچ کیو 19، کے جے 500 کے حصول اور قرضوں میں نرمی کی شرائط سے ملتی ہے۔ وزیر اعظم شہباز شریف کی زیر قیادت چین سے مؤخر ادائیگی جیسے معاملات فقط فوری عسکری فائدے نہیں بلکہ ایک طویل المیعاد حکمت عملی کی علامت ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عسکری فیصلے، اقتصادی وسعت، اور سفارتی بصیرت ایک مثالی توازن میں داخل ہو چکے ہیں۔ یہ کامیابیاں اس امر کی بھی غماز ہیں کہ پاکستان اب سفارت کاری کو فقط بیانات تک محدود نہیں بلکہ 3.7 ارب ڈالر قرض کی موخر ادائیگی بھی پاک چین دوستی تعاون کی ایک علامت ہے۔ یہ وہ کامیابیاں ہیں جو صرف مذاکراتی میز پر ممکن ہوئیں، میدان جنگ میں نہیں۔ موجودہ حکومت کے یہ سفارتی اقدام اسے معاہدات، نظام اور اس سے کہیں بڑھ کر دفاعی بندوبست تک لے گیا ہے۔ پاکستان نے اب یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وقتی ضرورت کو اہمیت دیتے ہوئے دیرپا پالیسیوں پر عملدرآمد ضروری ہے اور یہ نئی پالیسی کی پہلی قسط ہے۔ جس میں تلوار کی دھار اور قلم کی نوک، دونوں شریک ہیں۔

جب پاکستان نے چینی دفاعی سامان خریدنے کا عندیہ دیا، تو پاکستان کی چینی اسلحہ میں گہری دلچسپی نے چینی معیشت میں زبردست قسم کی جنبش پیدا کر دی بلکہ بیجنگ کی دفاعی صنعت "ایوک" میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ اقتصادی جھٹکا دراصل ایک سیاسی ارتعاش تھا۔ گویا پاکستان کی عسکری پسندیدگی نے چین کی اسٹاک مارکیٹ کے بازار حصص کو جھنجھوڑا الا بلکہ جھومنے پر مجبور کر دیا اور حالیہ پاک بھارت جنگ کے بعد اقوام عالم کے کئی ممالک نے مغربی اسلحہ سے مشرق کے اسلحہ کو خریدنے کیلئے انتہائی سنجیدگی سے دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔

جب ایوک شیمینینگ ایئر کرافٹ کمپنی کی قیمتوں میں 9.3% اضافہ ہوا، تو اس کے پیچھے فقط ایک معاشی حقیقت نہیں، بلکہ ایک عالمی اعتماد کی جھلک تھی۔ یہ سرمایہ دارانہ دنیا کا وہ لمحہ تھا جب جنگی تیاری نے معیشت کو نئی روح بخشی اور چینی اسلحہ اور جہازوں کی سٹاک ویلیو میں اضافہ دیکھنے کو ملا۔ چینی اسلحہ ساز کمپنی ایوک کے حصص میں اضافہ اس بات کی دلیل ہے کہ دفاع صرف میدان جنگ کا معاملہ نہیں، بلکہ بازارِ معیشت کی دھڑکن بھی ہے۔

اگرچہ چہ گوئیاں برسوں سے جاری تھیں، مگر پاکستان کی باضابطہ لب کشائی، جو ایک نئے دور کے آغاز کا پتہ دیتی ہے، پاکستانی حکومت کی پہلی باضابطہ تصدیق نے ان افواہوں کو ایک رسمی شکل دیتے ہوئے اپنے قومی عزم کا اعلان کرتے ہوئے فیصلہ سنا دیا کہ ہم نے خاموشی کو ترک کر کے اپنی ملکی دفاعی تیاری کو ترجیح دی ہے اور ہم وطن عزیز کیلئے ہر قسم کی جدید تیاری کو اولیت اور فوقیت دیتے ہوئے سٹیلٹھ ٹیکنالوجی کے حصول کو اپنی منزل قرار دے دیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر سٹیلٹھ ٹیکنالوجی سے مزین ان طیاروں میں خاص کیا بات ہے؟ سٹیلٹھ ٹیکنالوجی کیوں ضروری ہے؟ دنیا کی جنگیں اب میدانِ کارزار میں نہیں بلکہ اسکرینوں اور سینسرز پر لڑی جا رہی ہیں۔ سٹیلٹھ ٹیکنالوجی دشمن کی آنکھ میں دھول جھونکنے کا فن ہے۔ جس کے پاس یہ صلاحیت نہیں، وہ گویا رات کے اندھیرے میں چراغ جلائے جنگ لڑنے نکلے، بے وقت، بے فائدہ، اور خطرناک۔ یہ سوال فقط تکنیکی تجسس نہیں، بلکہ اس عہد کا استفسار ہے جس میں جنگ زمینی نہیں رہی۔ یہ طیارے دشمن کی آنکھ سے او جھل، اس کے ریڈار سے پوشیدہ، اور اس کے دماغ سے پہلے حملہ آور ہوتے ہیں۔ گویا ہوا سے باتیں کرتے ہیں، لیکن دشمن کو سننے بھی نہیں دیتے۔ جدید جنگ میں کامیابی کا راز چھپنے اور دیکھنے کی طاقت میں ہے۔ جو دکھائی دے، وہ مارا جائے۔ سٹیلٹھ اسی فلسفے کا عملی اظہار ہے۔

دنیا میں صرف تین ممالک — امریکا، روس، اور چین — ایسے ہیں جنہوں نے اس نایاب ٹیکنالوجی کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ وہ اقوام ہیں جو نہ صرف عسکری برتری رکھتی ہیں، بلکہ عالمی سیاست میں بھی اونچا بولتی ہیں۔ مستقبل میں سٹیلٹھ ٹیکنالوجی میں مہارت حاصل کرنے کیلئے برطانیہ، یورپ، اور ترکی کی کاوشیں بھی منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ برطانیہ، جاپان، اٹلی مستقبل کے طیارے "ٹیمپسٹ" کی تیاری پر کام کر رہے ہیں اور فرانس، جرمنی، اسپین مستقبل کے ایف سی اے ایس طیاروں کی تیاری کیلئے بڑی سرگرمی سے کام کر رہے ہیں اور مسلمان ملک ترکی بھی "کان" نامی طیارے کی تیاری میں آپریشن جاری رکھے ہوئے ہے۔ یاد رہے کہ ترکی واحد مسلمان ملک ہے جس کے تیار کردہ ڈرونز کی بڑی تعداد کے خریدار روس اور چین ہیں۔ گویا اس طرح مستقبل کی جنگوں کی تیاری میں آنے والی صدی کی فضائی شہنشاہی کی بنیادیں ڈالنے کا عمل جاری ہے۔

آنے والے وقتوں میں جنگ کا مطلب ہو گا فضا کی وہ خاموش آندھی جو کسی کی آنکھ کو نظر نہ آئے مگر بستی اجاڑ جائے۔ پاکستان جیسے ملک کیلئے ایسی ٹیکنالوجی کا حصول محض عسکری نہیں، بلکہ قومی سلامتی، تہذیبی وقار، اور خود انحصاری کی علامت ہے۔ جب مکار دشمن آپ کا پڑوسی ہر قسم کی جارحیت کیلئے متکبرانہ انداز میں دھمکیاں دیکر مرعوب کرنے کی احمقانہ کوششوں میں مبتلا ہو تو ان حالات میں ضروری ہو گیا ہے کہ پاکستان بھی موجودہ ففٹھ جزیشن طیاروں کے نہ صرف حصول بلکہ چین کے اشتراک سے سٹیلٹھ ٹیکنالوجی کا رخ کرے۔ اس وقت امریکا کے ایف 35 لائٹنگ، ریپڈر اور ایف 22، روس کا ایس یو 57 ففٹھ جزیشن طیاروں کی تمام خوبیوں کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن چین کا بے 35 اور بے 20 طیارے جو نسبتاً نئے ہیں، مگر انتہائی خطرناک اور قیمت میں معتدل، یعنی موزوں ہیں اور پاکستان بے 35 میں اپنی دلچسپی لے رہا ہے تاکہ مستقبل میں چین کے اشتراک سے بے ایف 17

تھنڈر کی طرح اسے بھی خود تیار کر کے خود کفالت کی طرف قدم بڑھاسکے۔

فنتھ جزیشن اسٹیلٹھ ٹیکنالوجی سے مزین طیارے یہ فقط دفاع نہیں، بلکہ نکتہ آغاز ہے جو پیشگی حملہ کی صلاحیت رکھتے ہوئے دشمن کے جہازوں کو اڑان بھرتے ہی دبوچ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ کم خرچ کے ساتھ زیادہ نفسیاتی دباؤ کی تکنیک سے دشمن کی مکمل بصارت پر پردہ ڈال کر ان کو تباہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ حالیہ پاک بھارت جنگ میں پاکستانی شاہینوں کی یہی پالیسی نے اس کے رافیل اور روسی طیاروں کو اپنے ملکی حدود سے ہی بھارتی سرزمین پر تباہ کر کے دنیا کو دنگ کر دیا تھا۔ اب اسٹیلٹھ کی ضرورت اس لئے ضروری ہو گئی ہے کہ جدید جنگ میں جو دکھائی دیا، وہ مارا گیا۔ جو چھپا رہا، وہ جیتا۔ اسٹیلٹھ ٹیکنالوجی، گویا غارِ حرا کی خلوت کی مانند، خاموشی سے اپنی تاثیر دکھاتی ہے۔

مستقبل کی فضائی جنگ گویا ایک ایسی ہولناک جنگ ہوگی جہاں پائلٹ ہو یا نہ ہو، مگر طیارہ خود اپنے ہدف کو نہ صرف تلاش کر کے مار گرانے کی صلاحیت رکھتا ہو گا بلکہ دشمن کے راڈار کو بھی چکمہ دیکر آنکھوں سے اوجھل ہو کر اپنے ٹارگٹ کو تباہ کر کے واپس اپنی منزل مقصود پر لوٹ آئے گا۔ فضائی خاموشی ہوگی، مگر زمین پر شور برپا ہوگا۔ دشمن کو پتہ بھی نہ چلے گا، اور اس کا دفاعی نظام ناکارہ ہو چکا ہوگا۔ مستقبل کی جنگ کی جھلک کا اس بات سے اندازہ لگالیں کہ مصنوعی ذہانت، بغیر پائلٹ کے جہاز، اور نیٹ ورک پر مبنی لڑائی ہوگی گویا مستقبل کی جنگ میں فضا خاموش ہوگی، مگر موت کی آہٹ تیز تر ہو جائے گی اور پتہ بھی نہ چل سکے گا کہ سارا علاقہ پلک جھپکتے ہی راکھ کا منظر پیش کر رہا ہوگا۔

پاکستان کا یہ فیصلہ کہ وہ جے 35 جیسے جدید طیارے حاصل کرے، ایک نئی دفاعی حکمت عملی کی بنیاد ہے۔ یہ فقط عسکری طاقت نہیں، بلکہ سفارتی حکمت، اقتصادی فائدے اور عالمی سیاسی نقشے پر مقام حاصل کرنے کی کاوش ہے۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ پاکستان اس فضائی دوڑ میں محض تماشائی رہے گا یا معرکہ آرائی کا علمبردار۔

یاد رکھیں جب قوموں کی فکری سطح بلند ہو جائے، تو ان کی توہیں بھی تدبیر سے گولہ داغتی ہیں۔ پس، وقت آگیا ہے کہ ہم فضاؤں کی جنگ کو محض جنگ نہ سمجھیں، بلکہ تہذیبوں کے مکالمے کا ایک باب جانیں۔

مودی کے بیانات: خطے میں آگ یا رکھ؟

دنیا کے سیاسی افق پر کچھ خطے ایسے ہوتے ہیں جو تاریخ کے ہر موڑ پر آزمائش کی بھٹی میں تپتے ہیں۔ جنوبی ایشیا انہی سرزمینوں میں سے ایک ہے، جہاں سرحدیں فقط جغرافیہ کی لکیر نہیں بلکہ نظریات، عقائد اور احساسات کی خونچاک تاریخ کا استعارہ بن چکی ہیں۔ ایسے میں جب ایک ریاست کا متعصب اور۔ ایسے میں جب ایک ریاست کا متعصب اور شدت پسند سربراہ، جس کے ہاتھ میں ایٹمی بٹن بھی ہے اور اقتدار کا زعم بھی، اپنے سیاسی جلسے میں کروڑوں پاکستانیوں کے "گولی سے اڑا دینے" کی کھلی دھمکی دے، تو سوال صرف اخلاقیات یا سفارت کا نہیں رہتا۔ بلکہ یہ انسانی تہذیب کے اجتماعی شعور، بین الاقوامی قوانین، اور عالمی اداروں کی بقا کا سوال بن جاتا ہے۔

مودی کا یہ حالیہ بیان، جو گجرات کی زمین پر گونجا، محض ایک انتخابی نعرہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی جنون کا اظہار ہے۔ ایک ایسا جنون جو اپنی ہی تاریخ کے آئینے میں شرمندہ نظر آتا ہے، مگر اپنے آس پاس کے دشمنوں پر لاکار کے ذریعے خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہ لاکار اب ہنسی میں نہیں اڑائی جاسکتی، کیونکہ یہ اس خطے میں بسنے والے دو ایٹمی طاقتوں کے کروڑوں انسانوں کے مستقبل کو جھونکنے کی ایک شعوری کوشش ہے۔

مودی کی گجرات کے ایک جلسے میں پاکستان کے شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی دھمکی نے نہ صرف بین الاقوامی سفارتی آداب کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی ہے بلکہ ایک ایسے ذہنی پس منظر کو آشکار کیا ہے جو خطے میں امن کے امکانات کو زائل کرنے میں مصروف ہے۔ یہ دھمکی، جو اخلاقیات اور انسانی حقوق کے اصولوں کے برعکس ہے، نہ صرف ایک جنگی جنون کی علامت ہے بلکہ اس سے بھارت کی داخلی سیاسی صورت حال کا بھی پتہ چلتا ہے جس میں جارحیت کو سیاسی سرمایہ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ بیان، جو انسانی اقدار کے منافی ہے، ایک ایسے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے جو جارحیت اور تفرقہ اندازی میں یقین رکھتا ہے، اور جو خطے کی سلامتی و استحکام کیلئے شدید خطرہ ہے۔

دراصل مودی کے حالیہ تشدد بیان کے پیچھے اس کا شکست خوردہ ضمیر اسے مکاری کے سفر کی طرف لے گیا جہاں وہ ووٹوں کیلئے بڑھکیں مار کر دجل و فریب سے کام لے رہا تھا کیونکہ ایک عالم جان چکا ہے کہ در دیار ہند، جہاں غرور قوم پرستی کا شعلہ ایوانوں میں بلند ہوتا ہے اور دہلی کے ایوان اقتدار میں تکبر، جاہ و منصب کا لباس پہنے بیٹھا ہے، وہاں رافیل نامی وہ پرندے، جن پر خزانہ ملت کے خزانے گئے، طیارہ تقدیر کے دوش پر پاکستان کے جواں ہمت صاعقہ برداروں کے سامنے خاک و خون میں گر گئے۔ جب رافیل کی شکست پر فرانس کی کمپنی نے تین پرندوں کی ہلاکت کا اقرار کیا، تو دہلی کی فسیل غرور پر ایسا سناٹا طاری ہوا، گویا آگرہ کے قلعہ لال پر سیاہ پرچم لہرا نہیں بلکہ آنسو بہا رہا ہو۔

وہی ایڑ مارشل اے کے بھارتی، جن کے بیانات سے پیشتر بادل گر جتے تھے، اب کہنے لگے کہ "جنگ میں نقصان معمول ہے"۔ گویا شکست کو سبکی میں ملفوف کر کے پیش کیا جائے، اور خون کے رسنے کو لفظوں کے رومال سے چھپایا جائے مگر تاریخ کی نگاہ تیز ہے، وہ زخم دیکھ لیتی ہے، وہ چیخ سن لیتی ہے۔ پاکستانی شاہین، جن کی پرواز پاک سرزمین کے افق تک محدود رہی، مگر جن کے فولادی تیر دشمن کی فضاؤں کو کاٹتے ہوئے عبرت کا نشان بنے، محض عسکری چابک دستی نہ تھے، بلکہ پاک و چین کے باہمی تدبر کا مجسمہ بنے۔ اس معرکہ کی جیت، پاکستان کی ہمت سے زیادہ، چین کی تجارتی حکمت اور عسکری فن کا غیر اعلانیہ اعلان تھی۔

دراصل مودی کے شعلہ اگلنے ہوئے بیان کی ایک وجہ یہ بھی ہے جب سیز فائر کی راکھ میں چینی حکمت نے ایک چنگاری رکھی — جب بھارت کی توجہ مغرب میں پاکستان پر تھی، بیجنگ نے مشرق میں اروناچل پردیش کے ۲ مقامات کے نام، چینی و تبتی زبان میں بدل کر یہ پیغام دیا کہ "نقشہ فقط کاغذ پر نہیں بنتے، وہ ذہنوں، دعووں اور قوت ارادہ میں نقش ہوتے ہیں"۔ یہ تبدیلی فقط زبان کی نکرار نہ تھی، بلکہ زمین کی ملکیت کا ادبی اعلان تھا اور جب بھارت نے مشرق کی جانب نظر کی، تو وہاں پہاڑوں کے نام بدلے جا چکے تھے، وادیاں بیگانہ ہو چکی تھیں، اور نقشہ، اُس کا اپنا نہ رہا تھا۔

بھارت کی تینوں سمتوں پر تین دیواریں — چین، پاکستان، نیپال — تناؤ کی تین چٹانیں، جن میں ہندوستان ایک فریب زدہ خواب کی مانند محصور ہو چکا ہے۔ نیپال، چھوٹا سہی، مگر اس کی خودداری نے بھارتی غرور کے قلعے میں دراڑیں ڈال دیں۔ پاکستان، جو اب صرف فوجی نہیں بلکہ فکری قوت بھی ہے اور چین، جس کی طاقت صرف عسکری نہیں بلکہ تمدنی بھی ہے۔ یہ ایسے ہے، جیسے ایک کمزور پروانہ تین شیروں کی کمین گاہوں میں جا گرے، اور سمجھے کہ یہ رات کا بادل ہے، جس سے سلامت گزر جائے گا۔ بس یہی شکست خوردہ مودی کی حالت ہو چکی ہے۔

مودی کے اس بیان کا پس منظر ایک نہایت پیچیدہ اور کشیدہ خطے میں ہے، جہاں بھارت اور پاکستان کے مابین فضائی جھڑپیں، سرحدی کشیدگی، اور نفسیاتی جنگ جاری ہے۔ گزشتہ دنوں بھارتی فضائیہ کے فرانسیسی ساختہ رافیل طیاروں کی تباہی، پاکستان کی عسکری حکمت عملی اور پاک چین تعاون کی بدولت، بھارت کی عسکری اور سیاسی حالت کو ایک نئے سنگ میل پر لے گئی ہے۔

مودی کی دھمکی اسی تناظر میں سامنے آئی ہے، جہاں ایک طرف بھارت نے سر تاج کی طرح اپنی عسکری طاقت کا مظاہرہ کرنے کی ناکام کوشش میں بری طرح منہ کی کھائی ہے اور جہاں عالمی طور پر شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہاں دوسری طرف، بھارت کی داخلی اور خارجی پالیسیوں میں شدید الجھن اور عدم استحکام کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

مودی کے اس جارحانہ بیان کا پس منظر ایک ایسے خطے میں ہے جہاں کشیدگی عروج پر ہے اور حالیہ دنوں میں بھارت اور پاکستان کے مابین فضائی جھڑپیں اور میزائلوں کی بازگشت سنی گئی ہے۔ بھارت نے اس دوران عام طور پر ایک خاموشی کا مظاہرہ اس لئے کیا گیا کہ مودی کو پاکستان کی طرف سے ایسے جواب کا قطعی اندازہ ہی نہیں تھا مگر مودی کی اس تازہ تقریر نے اس خاموشی کی نقاب کشائی کر دی ہے اور بے لاگ جارحانہ بیانیہ سامنے لا دیا ہے۔ یہ تضاد، خاموشی اور دھمکی کے درمیان، بین الاقوامی سیاست میں ایک پرانا المیہ ہے۔ کیا خاموشی واقعی فتح کی علامت ہے یا یہ شکست کا پردہ ہے؟

عالمی سیاست میں خاموشی کو اکثر حکمت اور صبر کی علامت سمجھا جاتا ہے، لیکن تاریخ اس بات کا بھی درس دیتی ہے کہ حکمت صرف اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ بروقت ہو، مناسب ہو اور مثبت نتائج دے۔ اگر دشمن تمہاری حدود میں گھس آئے اور تم زبان سے بھی جواب نہ دے سکو تو یہ خاموشی حکمت نہیں، بزدلی کے سوا کچھ نہیں۔ مودی کے بیان سے قبل، بھارت نے چینی فوج کی سرحدی پیش قدمیوں کے سامنے تو ہمیشہ خاموشی اختیار کی، جو حکمت عملی کی بجائے خوف اور غیر یقینی کی علامت تھی۔ اس کے برعکس، پاکستان نے اپنی عسکری کارروائیوں اور سفارتی حکمت عملیوں سے خطے میں اپنا مقام مستحکم کیا جبکہ چین نے اپنے جغرافیائی دعوؤں کو عملی جامہ پہنا کر خطے کی سیاست میں نئی جہتیں پیدا کیں۔

تاریخ نے ہمیں بارہا سکھایا ہے کہ حکمت صرف تب ہوتی ہے جب وقت کی نزاکت کو سمجھ کر جواب دیا جائے، اور وہ جواب فتح کی جانب لے جائے۔ سفارتی خاموشی کو اکثر طاقت کی علامت تصور کیا جاتا ہے، لیکن جب یہ خاموشی دشمن کے سامنے گھبراہٹ اور نااہلی کی شکل اختیار کر لے تو پھر یہ بہادری کے بجائے بزدلی کے سوا کچھ نہیں۔

بھارت کی جانب سے چین کی سرحدی پیش قدمیوں اور سرحد پار داخلوں پر جو رد عمل نظر آیا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس خاموشی کے پیچھے کمزوری حکمت کی کمی ہے۔ جبکہ پاکستان کے خلاف ہر وقت جارحانہ بیانات دینے والے بھارتی میڈیا اور عسکری حلقے چین کے خلاف مکمل طور پر خاموش اور ہیں، جو بھارتی سیاسی نظریہ اور حکمت عملی میں جہاں قدیم سیاسی مصلحتوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے وہاں چانکیہ کے اصولوں کی جھلک نمایاں ہے، جہاں طاقتور کی فوری تعظیم اور اس کو فوراً خد امان کر سجدہ کیا جاتا ہے اور کمزور کی بے دریغ تنقید شامل ہے، اور اس کو بلا توقف توڑا جاتا ہے۔ اس اصول پر چلتے ہوئے بھارت ان کے فکری الجھن اور حکمت کی کمی کو ظاہر کرتا ہے۔

اپنے خداؤں کی تعداد میں بے شمار دیوتا رکھتا ہے، جن میں چوہے اور سانپ بھی شامل ہیں، مگر جب یہ دیوتا کمزور پڑتے ہیں تو ان کے پجاری انہیں بے دردی سے توڑ پھوڑنے میں دیر نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کا مذہبی و سیاسی منظر نامہ بظاہر متضاد اور الجھا ہوا ہے۔ جہاں خداؤں کی تعداد کروڑوں میں ہے، مگر ہر وقت اپنے ہی دیوتاؤں کے پجاری ان کے خلاف بھی نکلنے کو تیار رہتے ہیں۔

مودی کی طرف سے رائیل طیاروں کی ناکامی کے باوجود ان کے دفاع میں مذہبی رسومات اور پوجا کا سہارا لینا اس مصلحت کی عکاسی کرتا ہے، جو طاقت کے خد اؤں کے سامنے جھکاؤ اور اندرونی کمزوری کی داستان سناتا ہے۔ مودی کے زیر استعمال ”رائیل“ جنگی طیاروں کی پوجا، اور ان کے جنگی ناکامیوں کے باوجود اس رسومات کو عالمی میڈیا پر دکھایا جانا، اس داخلی تضاد کا عکاس ہے جو بھارتی معاشرے میں طاقت اور کمزوری، عقل اور جہالت کے بیچ جھول رہا ہے۔

مودی کے متعصبانہ جارحانہ بیانات نہ صرف پاکستان کے ساتھ تعلقات کو زہر آلود کرتے ہیں بلکہ پورے خطے اور جنوبی ایشیا میں عدم استحکام کے اندیشے کو بڑھا دیتے ہیں۔ پاکستان اور چین کی جانب سے دکھائی جانے والی صبر و تحمل اور حکمت عملی بھارت کی جارحیت کے مقابلے میں ایک پختہ حکمت عملی کی نشاندہی کرتی ہے، جو مشرقی ایشیا میں طاقت کے توازن کو بدل رہی ہے۔ اور دوسری طرف وہ خطے میں طاقت کے توازن کو تبدیل کر رہی ہے، اور بھارت کو سیاسی اور سفارتی محاذوں پر تنہا کر رہی ہے۔ مودی کی دھمکیوں کے نتیجے میں بھارت عالمی سطح پر بھی خود کو تنہا کر رہا ہے، جہاں امن و تعاون کے تقاضے بڑھتے جا رہے ہیں۔ مودی کی دھمکیوں نے عالمی برادری میں بھارت کی ساکھ کو نقصان پہنچایا ہے، جہاں اب امن، تعاون اور معاشی ترقی کیلئے تعاون کی ضرورت بڑھ رہی ہے۔

مودی کا پاکستان کے شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی دھمکی دینا نہ صرف اخلاقی، قانونی اور سفارتی اصولوں اور آداب کی سنگین خلاف ورزی اور پامالی ہے بلکہ یہ عالمی انسانی حقوق کی تشویشناک صورت حال کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس قسم کے بیانات دنیا کے امن پسند طبقات میں گہرے خدشات کا باعث ہیں، اور اس سے خطے میں انسانی المیہ کے امکانات مزید بڑھ جاتے ہیں۔

مودی کی تقریر نے بھارت کی حکمت عملی پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ کیا یہ جارحیت واقعی حکمت کی علامت ہے یا حماقت کی؟ یا پھر یہ محض ایک غصے اور کمزوری کا اظہار ہے؟ تاریخ بتاتی ہے کہ حکمت وہی ہوتی ہے جو نہ صرف زبانی ہو بلکہ عملی طور پر مسائل کا حل نکالے اور دیر پا امن کی بنیاد رکھے۔



پاکستان اور چین نے ایک ایسی حکمت عملی اپنائی ہے جو خاموشی میں طاقتور ہے، جہاں صرف توپوں کی گڑگڑاہٹ نہیں بلکہ سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی محاذوں پر بھی کامیابی حاصل کی گئی ہے۔ اسی حکمت کی وجہ سے پاک چین تعلقات آج خطے کے امن اور استحکام کیلئے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس ساری کشیدگی میں اسرائیل کا کردار ایک نیا اور نہایت نازک موڑ ہے۔ معتبر اطلاعات کے مطابق، بھارت میں موجود اسرائیلی عسکری ماہرین نے ہاروپ ڈرونز کو آپریٹ کیا، اور پاکستانی میزائل حملے میں وہ نشانہ بنے۔ یہ پہلو اس جنگ کو صرف پاک-بھارت تنازعہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے بین الاقوامی عسکری شطرنج کا حصہ بنا دیتا ہے، جس میں امریکا، اسرائیل، اور بھارت ایک طرف ہیں— اور پاکستان، چین، اور خطے کے مقتدر امن پسند عوام دوسری طرف۔

اسرائیلی آپریٹرز کی موجودگی اور حملے کی حقیقت آشکار ہونے کے بعد—کیا اسرائیل بھی اس جنگ کا فریق بن چکا ہے؟ یہ نکتہ اس پوری کشیدگی کا سب سے اہم اور حساس پہلو ہے۔ معتبر ذرائع کے مطابق، بھارت نے اسرائیل سے "ہاروپ" خودکش ڈرون حاصل کیے جنہیں کنٹرول کرنے کیلئے درجنوں اسرائیلی عسکری ماہرین بھارتی میسر پر موجود تھے۔ پاکستان کی جوابی کارروائی میں ایک ایسا بیس نشانہ بنا جس میں ان اسرائیلی آپریٹرز کی موجودگی رپورٹ ہوئی—اور اسی حملے میں ان کی ہلاکت کی اطلاعات سامنے آئیں۔

غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق اسرائیلی آپریٹرز کی لاشیں خفیہ طور پر تابوتوں میں بھارت سے اسرائیل منتقل کی گئیں۔ اسرائیل اور بھارت دونوں نے اس خبر کو دبانے کی کوشش کی۔ جب پاکستان کی طرف سے اسرائیل کی براہ راست مداخلت کو حملے کا جواز بنا کر جوابی کارروائی کا فیصلہ کر لیا گیا جو کہ عالمی قوانین کے مطابق پاکستان کا جائز جوابی حق ہے۔ یہی وہ نکتہ تھا جس پر امریکا، جو ابتدا میں اس جنگ سے "لا تعلق" نظر آ رہا تھا، اچانک سیز فائر کیلئے متحرک ہو گیا۔ اس ساری صورتحال نے اس جنگ کو صرف بھارت اور پاکستان کے درمیان تنازعہ نہیں رہنے دیا، بلکہ اسے عالمی جنگی طاقتوں کے درمیان (پر کسی) نیابتی جنگ کا آغاز قرار دیا جانے لگا جس کو روکنا امریکا کی اپنی بقاء کیلئے ضروری ہو گیا تھا۔

ٹرمپ نے پہلے سیز فائر کی کوششوں کے تحت ایک "بظاہر غیر جانبدار" کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ تاہم ان کی خاموشی—بلکہ بے نیازی—مودی کے حالیہ جارحانہ بیانات پر جہاں کئی اہم سوالات کو جنم دیتی ہے وہاں ٹرمپ کی ثالثی اور اس پر سوالیہ نشان مزید گہرے ہو گئے ہیں۔ اگر امریکا واقعی امن کا خواہاں ہے تو کیا وہ مودی کی اس دھمکی کی مذمت کرے گا؟ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ امریکا درپردہ بھارت کو تحفظ دے رہا ہے؟

کیا یہ سچ ہے کہ سیز فائر کی آڑ میں امریکا نے بھارت اور اسرائیل کو عسکری شکست سے بچانے کی کوشش کی تھی؟ سفارتی ذرائع اور کچھ عسکری تجزیہ کاروں کے مطابق، سیز فائر سے قبل بھارتی فضائیہ اور اسرائیلی ٹیکنالوجی کو بدترین نقصان کا سامنا کرنا پڑا، اور یہ اندیشہ بڑھ گیا تھا کہ پاکستان، بھارت کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی جارحیت کا بھی جواب دے گا۔ ایسے میں امریکی مداخلت کا مقصد نہ امن تھانہ مصالحت—بلکہ بھارت اور اسرائیل کو مزید رسوائی سے بچانا تھا۔

اگر ٹرپ انتظامیہ واقعی غیر جانبدار ہوتی تو مودی کے بیانات پر نہ صرف ناراضی کا اظہار کرتی بلکہ دفاعی و سفارتی سطح پر کارروائی بھی کرتی۔ مگر اس کی خاموشی عالمی برادری میں امریکی پالیسی پر عدم اعتماد کو جنم دے رہی ہے، اور مسلمان ممالک میں یہ تاثر گہرا ہوتا جا رہا ہے کہ امریکا "امن" کے نام پر صرف اپنے اتحادیوں کو بچانے کی حکمت عملی پر گامزن ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سیز فائر کی اصل نیت بھارت اور اسرائیل کی عسکری ہزیمت پر پردہ ڈالنا تھا۔

اب جبکہ مودی ایک بار پھر دھمکیوں پر اتر آیا ہے، یہ سوال شدت سے ابھر رہا ہے کہ کیا خطے میں ایک نئی جنگ چھڑنے والی ہے؟ کیا اسرائیل ایک بار پھر بھارت کے ذریعے جنوبی ایشیا میں دخل اندازی کرے گا؟ اور کیا امریکا دوبارہ کسی "نام نہاد ثالثی" کے پردے میں اسرائیل اور بھارت کو بچانے کی کوشش کرے گا؟ مودی کی دھمکی کے بعد اگر امریکا نے اب بھی خاموشی اختیار کی تو یہ شک نہیں، بلکہ یقین میں بدل جائے گا کہ امن کی ثالثی محض سفارتی چال تھی۔ جس کا مقصد بھارت کو مزید رسوائی سے بچانا تھا۔

اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کی تنظیمیں جن کے دفتروں کی دیواروں پر انسانیت کے عظیم اصول آویزاں ہیں، وہ مودی کے ان بیانات پر یا تو خاموش ہیں یا ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے کسی ناول کے کردار جو مکالمہ نہیں، فقط تماشا کرتے ہیں۔ حالانکہ اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 2(4) واضح طور پر کسی بھی ملک کو دوسرے ملک کے خلاف طاقت یا اس کی دھمکی سے باز رہنے کا پابند بناتی ہے۔ مگر یہاں سوال اخلاقی جرات کا ہے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ طاقتور کے خلاف زبان کھولنا ہمیشہ کمزور دلوں کے بس کی بات نہیں رہی۔

اگر یہ بات دنیا کے سامنے پوری صداقت کے ساتھ لائی جاتی ہے تو یہ صرف مودی کا نہیں، بلکہ اسرائیل کے عسکری جنون اور امریکی خاموشی کا بھی پردہ چاک کرنے کا لمحہ ہو گا۔ اس سے قبل کہ اسرائیل کی مداخلت — جنگ کا نیا محاذ کھول دے تو اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی اور اس جنگ کو سنبھالنا کسی کے بس میں نہ ہو گا۔

جب دشمن کھلی دھمکی دے اور دنیا خاموش رہے، تو خاموشی کا تقاضہ یا مزاحمت کا بھرپور مظاہرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ خاموشی فقط حکمت نہیں بلکہ بزدلی کی چادر اوڑھے ہوئے ظلم کی خاموش ساتھی بن جاتی ہے۔ پاکستان، جس نے ہمیشہ امن کی بات کی، اور عالمی سطح پر سفارتی و قار کے ساتھ اپنے اصولی موقف کو اجاگر کیا۔ سوال یہ ہے کیا عالمی برادری مودی کی دھمکیوں پر نوٹس لے سکتی ہے؟

مودی کی جانب سے پاکستانی شہریوں کو گولیوں سے اڑانے کی کھلی دھمکی بین الاقوامی قوانین، اقوام متحدہ کے منشور، اور بنیادی انسانی حقوق کے تمام معیارات کی صریح خلاف ورزی ہے۔ یہ بیان کسی سیاسی اختلاف کا اظہار نہیں بلکہ ایک ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ملک کی جانب سے دوسرے ملک کے شہریوں کے خلاف نسلی و ریاستی دہشتگردی کا کھلا اعلان ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 2(4) ہر ملک کو اس بات سے روکتی ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک کے خلاف طاقت کے استعمال کی دھمکی دے۔ اسی طرح انسانی حقوق کا عالمی اعلامیہ اور جینیوا کنونشنز بھی اس قسم کے بیانات کو نسل کشی، اشتعال انگیزی اور جنگی جرائم کے زمرے میں شمار کرتے ہیں۔

تاہم سوال یہ ہے: کیا اقوام عالم ایسے بیانات پر کوئی عملی قدم اٹھائیں گی؟ ماضی کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب ایسے جارحانہ بیانات کسی بڑے تجارتی یا دفاعی اتحادی ملک کی جانب سے آتے ہیں — جیسے بھارت امریکا، اسرائیل اور یورپی طاقتوں کے ساتھ ہے — تو "عالمی ضمیر" اکثر مصلحت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے ہنگامی اجلاس میں اس معاملے کو اٹھایا جاسکتا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں اس پر پور ٹس جاری کر سکتی ہیں۔ یورپی پارلیمنٹ میں قرارداد پیش کی جاسکتی ہے۔ عالمی عدالت انصاف میں اسے جنگی نفرت انگیزی قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس سب کیلئے پاکستانی سفارت کاری، میڈیا، اور سول سوسائٹی کو فوری، متحد اور سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی تاکہ عالمی رائے عامہ کو مودی کے جنگی جنون سے آگاہ کیا جاسکے۔ عالمی میڈیا میں مودی کے بیانات کو جنگی اشتعال انگیزی کے طور پر پیش کرے اور سب سے بڑھ کر، قوم کے اندر سیاسی استحکام، یکجہتی، اور داخلی ہم آہنگی کو فروغ دے تاکہ ہر دھمکی، ہر وار، ہر حملہ — صرف قوم کی یکجہتی سے ہی پسپا ہو۔

مودی کے حالیہ بیانات محض انتخابی جلسوں کی لفاظی نہیں بلکہ خطے کے امن کو تہہ وبالا کرنے والا ذہنی و نظریاتی خاکہ ہے۔ اقوام عالم کو اگر واقعی خطے میں امن عزیز ہے، تو انہیں اس اشتعال انگیزی کا نوٹس لینا ہوگا، ورنہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ دو ممالک اگر جنگ کی جانب بڑھتے ہیں تو اس کا ایندھن صرف جنوبی ایشیا نہیں بلکہ ساری دنیا بن سکتی ہے۔

پاکستان کو چاہیے کہ سفارتی سطح پر مودی کے بیانات کو اقوام متحدہ، او آئی سی، یورپی یونین اور عالمی میڈیا کے سامنے بھرپور انداز میں اٹھائے۔ اسی طرح امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درپردہ گٹھ جوڑ کو بے نقاب کر کے دنیا کو بتایا جائے کہ یہ "امن کی ثالثی" نہیں بلکہ "جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے" کی کوشش ہے۔

مستقبل کی راہ میں جارحیت اور نفرت کی بجائے حکمت، تحمل اور سفارتی آداب کو اپنانا ضروری ہے۔ سیاسی قائدانہ صلاحیت اسی میں ہے کہ کشیدگی کو کم کیا جائے، بات چیت کے دروازے کھلے رکھے جائیں اور خطے کی بھلائی کیلئے مشترکہ حل تلاش کیے جائیں۔

مودی کے دھمکی آمیز الفاظ شاید عارضی طور پر قومی جذبے کو جلا بخشیں، مگر تاریخ انہیں یاد رکھے گی یا تو طاقت کی علامت کے طور پر یا ایک ایسی دھنک کے طور پر جو طوفان کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ خاموشی تب ہی سنہری ہوتی ہے جب وہ طاقت کی علامت ہو، ورنہ وہ زوال کی پیشگی خبر ہوتی ہے اور کسی بھی ملک کی خودداری یا سلامتی کیلئے نقصان دہ ہے۔

☆ بین الاقوامی برادری کو چاہیے کہ وہ بھارت کو سفارتی اور اخلاقی طور پر جوابدہ بنائے۔ اقوام متحدہ اور دیگر عالمی فورمز پر ایسے بیانات کی مذمت اور امن کے فروغ کیلئے مشترکہ حکمت عملی اپنائی جائے۔

☆ اب اقوام عالم کی ذمہ داری اور ایک بڑا امتحان ہے کہ وہ بھارتی قیادت کو خبردار کرے کہ آئندہ وہ ایسے تنازعہ بیانات سے گریز کرے اور خطے میں امن قائم رکھنے کی کوشش کرے۔

☆ خطے کے ممالک میں اعتماد سازی کی کوششیں تیز کی جائیں۔ بات چیت کے ذریعے اختلافات کو کم کرنے اور دیرپا امن قائم کرنے کی کوششوں کو بڑھایا جائے۔

☆ بھارت، پاکستان اور چین کے درمیان اعتماد بڑھانے کیلئے مثبت اقدامات کیے جائیں۔

☆ پاکستان اور چین کی حکمت عملی ماڈل سے استفادہ کیا جائے۔ حکمت عملی اور تحمل کے ذریعے خطے میں سیاسی استحکام اور معاشی ترقی کو ممکن بنایا جائے۔ عالمی برادری سے تعلقات بہتر بنائے جائیں تاکہ خطے میں استحکام ممکن ہو سکے۔

☆ بھارت کو چاہیے کہ وہ پاکستان اور چین کے ساتھ بات چیت کو ترجیح دے تاکہ دیر پا امن کا راستہ کھلے۔

☆ عوام میں امن اور رواداری کے فروغ کیلئے تعلیمی اور میڈیا کی سطح پر پروگرام ترتیب دیے جائیں۔ تاکہ نفرت اور جارحیت کی فضا کو کم کیا جاسکے۔

مودی کے حالیہ بیانات محض انتخابی جلسوں کی لفاظی نہیں بلکہ خطے کے امن کو تہہ وبالا کرنے والا ذہنی و نظریاتی خاکہ ہے۔ اقوام عالم کو اگر واقعی خطے میں امن عزیز ہے، تو انہیں اس اشتعال انگیزی کا نوٹس لینا ہوگا، ورنہ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یہ دو ممالک اگر جنگ کی جانب بڑھتے ہیں تو اس کا ایندھن صرف جنوبی ایشیا نہیں بلکہ ساری دنیا بن سکتی ہے۔

پاکستان کو چاہیے کہ سفارتی سطح پر مودی کے بیانات کو اقوام متحدہ، او آئی سی، یورپی یونین اور عالمی میڈیا کے سامنے بھرپور انداز میں اٹھائے۔ اس طرح امریکا، اسرائیل اور بھارت کے درپردہ گٹھ جوڑ کو بے نقاب کر کے دنیا کو بتایا جائے کہ یہ "امن کی ثالثی" نہیں بلکہ "جنگی جرائم پر پردہ ڈالنے" کی کوشش ہے۔

اور آخر میں، ایک حکایت دانش:

وقت جب بولتا ہے، تو قوموں کو تاریخ بنادیتا ہے۔ اور جو قومیں اس کی آواز کو نظر انداز کریں، وہ عبرت کا افسانہ بن جاتی ہیں۔

پاکستان اور چین نے اُس لمحے کو پہچان لیا۔ اور جو لمحے کو پہچان لے، وہ زمانے کا بادشاہ ہوتا ہے۔

بروز جمعرات 7 محرم الحرام 1447ھ 3 جولائی 2025ء

» نور اور ظلمت کا تصادم «

ہم اس عہد پر آشوب میں جی رہے ہیں جہاں تہذیبوں کا تصادم محض سیاسی یا عسکری معرکہ نہیں، بلکہ تقدیر اقوام کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ وہ معرکہ ہے جہاں اقوام عالم کی بقاء، عقائد کی سرفرازی، اور عدل و انصاف کا معیار امتحان کی سل پر رکھا گیا ہے۔ یقیناً ہم ایسے دور میں جی رہے ہیں جب تہذیبوں کا تصادم محض مفہوم اور نظریہ نہیں بلکہ میدانِ عمل کا حصہ بن چکا ہے۔ آج ہم اسی معرکہ کا حصہ ہیں، جہاں دوراہوں کا سنگم ہے، حق اور باطل، نور اور ظلمت، عدل اور جبر آمنے سامنے ہیں۔

آج ہم اس عہد کی طرف بڑھ رہے ہیں، جب تہذیبوں کا تصادم محض مفہوم یا نظریہ نہیں، بلکہ میدانِ کارزار بن چکا ہے۔ یہ تصادم محض تمدنوں کا نہیں، بلکہ اقدار، نظریات، اور ایمانی و مادی محاذوں کا معرکہ ہے۔ ہم اس عہد کا حصہ بن چکے ہیں، جہاں اسلام اور مغرب، مشرق اور یورپ، عدل اور جبر، ظلمت اور نور کا ٹکراؤ، روئے زمین کا مقدر بن چکا ہے۔

تہذیبوں کے تصادم کی اصطلاح سب سے پہلے برنارڈ لیوس اور بعد ازاں سیموئل ہنٹنگٹن کے قلم سے دنیا کے سامنے آئی۔ تہذیبوں کے تصادم کا تصور محض حال کی ایجاد نہیں۔ اس کا مآخذ تاریخی کنکاش ہے۔ برنارڈ لیوس اور سیموئل ہنٹنگٹن نے بیسویں صدی کی آخری دہائی میں اس تصور کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ "آنے والا دور تہذیبوں کی محاذ آرائی کا دور ہو گا"۔ یہودی نژاد ہنری کیسنجر نے ون ورلڈ آرڈر (ایک عالمی نظام) کا تصور پیش کیا۔ مقصد محض یہ تھا کہ اسلامی تہذیب کو نئے عہد کا مرکز خطرہ قرار دیا جائے اور اس کی آڑ میں عالمی طاقتوں کا تسلط باقی رہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے پس پردہ وہی صہیونی۔ صلیبی ایجنڈا کارفرما تھا جس کی گتھیاں ہنری کیسنجر، بریڈنسکی اور دیگر اسٹریٹیجک مفکرین نے بُنی تھیں لیکن اس کا مآخذ اس دور کی مغربی فکر ہے جب سوویت یونین کا زوال ہوا، اور مغرب نے نئے دشمن کی تلاش شروع کی۔ کیسنجر جیسے اسٹریٹیجسٹ نے ون ورلڈ آرڈر کا تصور دیا، تاکہ عالم اسلام اور دیگر تہذیبوں کو ایک نظام کا حصہ بنایا جاسکے۔

یہ تصور اس وقت ابھر جب سوویت یونین شکست کھا چکا اور مغرب کو نیا دشمن درکار تھا۔ چنانچہ اسلام کو دشمن نمبر 1 قرار دے کر ایک فکری، تہذیبی اور عسکری محاذ کھولا گیا۔ ہنری کیسنجر کا "ون ورلڈ آرڈر" دراصل ایک ایسا عالمی نظام تھا جس میں طاقت، معیشت اور وسائل پر چند ہاتھوں کی گرفت ہو۔ عالم اسلام اور دیگر تہذیبیں محض صارف اور تابع رہیں، تہذیبوں کے تنوع کو عالمی امن کی راہ میں رکاوٹ قرار دیا جائے۔

تہذیبوں کا تصادم وہ تصور ہے جو سرد جنگ کے خاتمے اور سوویت یونین کی شکست و ریخت کے فوراً بعد منظر عام پر آیا۔ اس تصور کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ سرد جنگ کی دو قطبی محاذ آرائی ختم ہو چکی، لیکن اس خلا میں نئے تہذیبی محاذ جنم لیں گے۔ یہ تصور سیموئل ہنٹنگٹن کی مشہور کتاب "کلیش آف سولائزیشن" (تہذیبوں کا تصادم) کی صورت میں دنیا بھر میں گونجا۔ تہذیبوں کا تصادم کا تصور سرد جنگ کے خاتمے پر اس لیے پیش ہوا کیونکہ اس زمانے تک محاذ آرائی کا محور محض نظریہ (کیونزم بمقابلہ سرمایہ داری) تھا۔ سرد جنگ کی راکھ سے ایک نیا تصور پھوٹا کہ مستقبل میں ساری دنیا پر کیسے حکومت کی جاسکتی ہے۔

کیسنجر اور ون ورلڈ آرڈر کا بانی، اس فکر کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ کیسنجر اور دیگر عالمی معماروں نے یہ تصور پیش کیا کہ آئندہ تنازعات سیاسی و اقتصادی

محاذوں تک محدود نہیں رہیں گے، بلکہ تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی محاذوں تک پھیل جائیں گے۔ اس تصور کا مقصد محض دانشورانہ مباحث تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کا حصہ اسٹریٹجک مقاصد اور عالمی بالادستی کا ایجنڈا تھا۔

کیسینجر اور دیگر مغربی مفکروں نے اس تصور کو اس لیے پیش کیا کیونکہ وہ اس دور کی پیش بینی کر چکے تھے جب مغرب اور عالم اسلام، نیز دیگر تہذیبی گروہ (ہندو، چینی، سلاو وغیرہ) نئی محاذ آرائی میں آئیں گے۔ "منٹنگٹن کی تھیوری محض دانشورانہ بحث نہیں تھی، بلکہ امریکی اسٹریٹجک پالیسی کا حصہ تھی۔ اس تھیوری کا مقصد عالم اسلام اور دیگر تہذیبوں کو "حریف" قرار دے کر امریکا اور مغرب کی عسکری اور اقتصادی برتری کا جواز پیش کرنا تھا اور جو نہی وہ ان مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے تو اسے کیسے صہیونیت کی جھولی میں ڈال دیا جائے گا مگر اللہ کا فرمان ہے:

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُّورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَآ أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (التوبة: ۳۲)

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کو کامل کیے بغیر رہنے والا نہیں، خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا (ظفر علی خان)

آئیے اب اس کے سیاسی پس منظر پر نگاہ ڈالتے ہیں:

کون نہیں جانتا کہ امریکا نے سوویت یونین کے خلاف پاکستان کو اگلے مورچے کی حیثیت دی، افغان مجاہدین کو اپنا "کارندہ" بنایا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست محض افغان مجاہدین کا کارنامہ نہیں تھا بلکہ اسلامی عزم و ایمانی ولولے کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ اس فتح کا مقصد خطے کو آزادی اور سکون عطا کرنا تھا مگر جیسے ہی ریپچھ کا تن مردہ (یعنی سوویت یونین) گرا، امریکی عہد شکنی کا سورج طلوع ہو گیا۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست اور اس کا چھ حصوں میں بٹ جانا امریکا کی فتح تھی لیکن اس فتح کا فوری اثر پاکستان اور افغانستان پر یہ ہوا کہ امریکا نے "استعمال کرو اور پھینک دو" کی پالیسی اپنائی۔ لیکن جیسے ہی مقصد پورا ہوا، امریکا نے وعدے توڑے۔ پاکستان اور افغانستان سے کیے گئے وعدے بھلا دیے گئے۔ یہ وہی روایت تھی جو امریکا نے دوسری جنگ عظیم میں یورپ، کوریا، ویتنام، اور مشرق وسطیٰ میں اپنائی "استعمال کرو اور پھینک دو"۔ یہ محض سفارتی بے وفائی نہیں، بلکہ امریکی سیاسی رویے کا حصہ ہے، جو اس محاورے پر مبنی ہے یعنی جو دوست بنے، انہیں مقصد تک استعمال کرو۔ مقصد نکل جائے تو بے درد مالک کی طرح چھوڑ دو۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکا کی یہ پالیسی کئی دہائیوں سے یہی چلی آرہی ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں اقتدار بچانے کیلئے ملک کو قربان کر دینے کی شرمناک مثالیں بھی موجود ہیں، مجھے امید ہے آپ میرا یہ اشارہ بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ ہم نے 1965ء کی جنگ اور سقوطِ ڈھاکہ سے کچھ نہ سیکھا اور نائن الیون میں انہوں نے ہمیں ایک مرتبہ پھر استعمال کیا اور یقیناً استعمال سے قبل ہی ان کی یہ پالیسی تیار ہو چکی تھی کہ امریکا اپنے مفادات کے حصول کے بعد کیا کاروائی کرے گا اور ہمارے ساتھ وہی ہو یعنی ابھی افغانستان سے سوویت یونین کی واپسی کو چند گھنٹے گزرے تھے کہ قصر سفید میں بیٹھے فرعون بش جو نیئر نے بھارت کے ساتھ سول نیوکلیر ٹیکنالوجی کا معاہدہ کرنے کا عندیہ دے دیا اور بالآخر 18 جولائی 2005 میں اس سے باقاعدہ معاہدہ کر لیا، یوں پاکستان کی پیٹھ میں خنجر گھونپا۔ تاکہ پاکستان کا تزویراتی توازن بگاڑا جائے، خطے میں بھارت کو چودھری بنایا جائے اور بعد ازاں بھارت کو چین کے خلاف استعمال کیا جائے۔

گویا افغانستان میں سوویت یونین کو شکست دینے کے فوراً بعد امریکانے "کل کا دوست، آج کا دشمن" والا محاورہ برتا۔ پاکستان اور افغانستان کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس خطے کی قربانیوں کا صلہ محض بے وفائی، دھوکے اور زہریلے خنجر کی صورت میں دیا گیا۔ پاکستان کی پیٹھ میں گھونپا گیا خنجر وہ "سول نیوکلیر معاہدہ" تھا جو بھارت اور امریکا کے مابین طے پایا۔ یوں پاکستان کو اس تاریخی جدوجہد کا حاصل محض زخم اور بے اعتنائی کی صورت ملا جبکہ اس ساری جنگ میں امریکا کو دنیا کا اکیلا سپر پاور بنانے میں بھارت کا کوئی حصہ نہیں تھا لیکن امریکا کا بھارت سے سول نیوکلیر معاہدہ، پاکستان کی جغرافیائی اور عسکری اہمیت کو کم کرنے کا حصہ تھا۔ اس کا مقصد خطے میں بھارت کو اسٹریٹیجک ہم پلہ بنانا اور پاکستان کو دباؤ کا شکار رکھنا تھا۔

گویا یہ تاریخ کا ایک شرمناک باب ہمیشہ آئندہ آنے والی امریکی نسلوں کو یاد دلانا رہے گا کہ ان کے آباؤ اجداد نے افغان محاذ پر مسلمانوں کو استعمال کیا۔ فتح حاصل ہوتے ہی سوویت یونین تو چھ ٹکڑوں میں بٹ گیا لیکن امریکا کا محسن بننے والا پاکستان فوراً ہند-امریکا معاہدے کا شکار بن گیا لیکن میرے لئے امریکا کی بے وفائی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ امریکا اب تک دنیا میں تین درجن سے زائد ممالک میں جارحیت کا مرتکب ہو چکا ہے اور کسی ایک ملک میں بھی فتح حاصل نہیں کر سکا اور ہر ملک سے ذلیل و رسوا ہو کر نکلا ہے لیکن ہم یہ بھول گئے کہ سامراج کا دستور ہے کہ دوستوں کا انتخاب عارضی اور دشمنیوں کا معیار دائمی ہوتا ہے۔

مئی کی پاک بھارت جنگ میں امریکانے ابتدا میں "لا تعلقی" کا رویہ اپناتے ہوئے کہا، "ہمارا اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔" مگر جیسے ہی اسرائیلی آپریشن ڈرونز نے پاکستان پر حملے کیے۔ پاکستان نے بھرپور جوابی کارروائی کی۔ پاکستانی شاہینوں نے بھارت اور اسرائیل دونوں کو پیغام دیا کہ جس مقام سے یہ حملے کئے گئے ہیں، وہ ہماری دسترس میں ہیں، اسرائیلی آپریشن مارے گئے۔ اسرائیل کی معاونت کا پردہ چاک ہوا، امریکی پالیسی میں زلزلہ آگیا۔ اسرائیلی ہاروپ ڈرونز اور آپریشنز کی ہلاکت نے واشنگٹن کو یہ احساس دلایا کہ پاکستان کی صلاحیت محض روایتی محاذ تک محدود نہیں۔ امریکانے سیز فائر کی دوا اس لیے لگائی کیونکہ پاکستان کا ممکنہ حملہ اسرائیل تک پھیل سکتا تھا۔ واشنگٹن جانتا تھا کہ پاکستان کی میزائل صلاحیت محض بھارت تک محدود نہیں۔ امریکا کو یہ بھی علم تھا کہ پاکستان اسرائیل پر ناقابل تصور تباہی مسلط کر سکتا ہے چنانچہ ٹرمپ نے فوراً سیز فائر کی دوا دھوپ شروع کی۔

مئی کی جنگ میں اسرائیلی (ہاروپ ڈرون) کا بھارت کی مدد کو آنا، امریکا کا ابتدائی طور پر غیر جانبداری کا ڈرامہ، پاکستان کی جوابی کارروائی پر سیز فائر کی بھاگ دوڑ یہ ظاہر کرتا ہے کہ تہذیبوں کا تصادم محض تصوراتی نہیں، زمینی حقیقت بن چکا ہے۔ حالیہ پاک بھارت جنگی محاذ پاکستان اور بھارت تک محدود نہیں تھا۔ اسرائیلی ڈرونز اور آپریشنز کا میدان کارزار میں شامل ہونا اس امر کا ثبوت ہے کہ تہذیبی محاذ آرائی اس خطے تک پھیل چکی ہے۔ امریکا کا اسرائیل اور بھارت کی حمایت میں دوہرا معیار اس بات کا عکاس ہے کہ امریکا اس محاذ میں محض تماشائی نہیں بلکہ حصہ دار ہے۔

حالیہ ایران اسرائیل جنگ میں امریکا کو دپر ڈالا ہے۔ فردو، نظنز اور اصفہان کی جوہری تنصیبات پر امریکی حملے جہاں اس بات کا اعلان ہیں کہ جب تک اسرائیل کی سلامتی کا ضامن امریکا ہے، اسے کوئی گزند تک نہیں پہنچا سکتا گویا تہذیبوں کا تصادم نئے باب میں داخل ہو چکا ہے۔ امریکا میں برنی سینڈرز اور دیگر سیاسی رہنماؤں نے اس جارحانہ اقدام کی سخت مذمت کی۔ سینڈرز کا کہنا تھا کہ "امریکانے آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایران پر حملہ کیا۔" گویا امریکانے ایران کی جوہری تنصیبات پر حملہ کر کے تہذیبوں کی جنگ کو مزید مہمیز دی ہے۔

امریکا کا ایران کی جوہری تنصیبات پر حملہ محض ایران کی عسکری صلاحیت کو مفلوج کرنے کا عمل نہیں تھا۔ اس کا مقصد ایران اور امریکا، اسرائیل کی

مخاذ آرائی کو نئے عروج تک پہنچانا تھا۔ یہ حملہ اس امر کا عکاس ہے کہ امریکا بیک وقت دو محاذوں (روس اور چین) پر عسکری چیلنج کا متحمل نہیں۔ اس لیے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل اور ایران کی مخاذ آرائی کو استعمال کرتے ہوئے خطے کا توازن بگاڑا جا رہا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ او آئی سی نے ایران کی حمایت کا اعلان محض 24 گھنٹے قبل کیا لیکن امریکا نے اس اجلاس کی سیاہی خشک ہونے سے قبل حملہ کر کے اسلامی ممالک کو پیغام دیا کہ تمہاری قراردادوں اور بیانات کی حیثیت صفر ہے۔ او آئی سی اجلاس اور اس کے بعد امریکا کا حملہ جہاں مسلم دنیا کی سیاسی کمزوری کا ثبوت ہے وہاں ان ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو بھی اپنی اس بے بسی کا علاج سوچنا ہو گا کہ ہم موجودہ حکمرانوں کے تسلط میں کب تک اس قعر مذلت میں اپنی غلامانہ روش پر قائم رہیں گے۔

مسلم امہ کی تزویراتی ناکامی کا یہ سب سے زیادہ بزدلانہ فعل ہے کہ وہ محض قراردادوں اور نعروں تک محدود ہے۔ ایران، پاکستان اور دیگر مسلم ریاستوں کا جغرافیائی، اقتصادی اور عسکری مرکز بننے کا تصور محض کتابی نعروں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ادھر ترکی نے اسرائیل کو امن کی راہ کا سب سے بڑا روڑا قرار دیا، اور اس حملے کو "مذاکرات کو سبوتاژ کرنے" کی سازش قرار دیا۔ یہ حملہ ایران اور امریکا مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی دانستہ کوشش ہے، حقیقت یہ ہے یہ محض بیانات کا دور ہے۔ مسلمانوں کا رویہ بے بسی اور مصلحت کا شکار ہے۔ مجھے آج عالم اسلام کے ایک عظیم مفکر مولانا مودودیؒ کا یہ قول بری طرح ستا رہا ہے کہ "جہاں طاقت اور اصول کا معرکہ ہو، وہاں محض گفتار کا حصہ کبھی تاریخ نہیں بن سکتا"۔

چین کیلئے مشرق وسطیٰ سستا تیل اور تجارتی راستوں کی ضمانت ہے۔ چین، تجارتی راہداریوں اور مصلحتوں کی سیاست میں الجھا ہوا ہے۔ کھلی جنگ چین کی معاشی راہداریوں کیلئے خطرہ ہے، اس لیے وہ محض بیانات تک محدود ہے۔ سوال یہ ہے کہ سستا تیل اور مشرق وسطیٰ کی تزویراتی راہداریاں چین کی محض اقتصادی فکر تک محدود رہیں گی، یا بیجنگ میدانِ عمل میں اترے گا؟ روس اور چین کا محض الفاظ تک محدود رہنا اس امر کا غماز ہے کہ وہ سرد جنگ جیسی مخاذ آرائی کا حصہ بننے کو تیار نہیں۔ روس اور چین کا محض بیانات تک محدود رہنا اس امر کا غماز ہے کہ طاقت کی سیاست میں محض الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں۔ یقیناً چین مشرق وسطیٰ میں سستا تیل اور تجارتی روٹس کی حفاظت کا خواہاں ہے۔ اس لیے وہ امریکا اور اسرائیل سے مخاذ آرائی کرنے کی بجائے مصالحانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ امریکا نے ایران پر حملہ کر کے چین کو یہ پیغام دیا ہے کہ اس خطے کا سیاسی، اقتصادی اور عسکری کنٹرول واشنگٹن کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان کیلئے اب سب سے بڑا چیلنج امریکا-بھارت-اسرائیل گٹھ جوڑ ہے۔ مودی، نیتن یاہو اور ٹرمپ کا ٹکون، پاکستان کو محاصرے میں لینا چاہتا ہے۔ امریکی پالیسی یہ ہے کہ اسرائیل اور بھارت کو پاکستان کی خلاف کھلی چھٹی دے دی جائے۔ پاکستان کا موقف تاریخی، سیاسی اور ایمانی تناظر میں یوں ہے کہ پاکستان، مسلم دنیا کی واحد ذمہ دار ایٹمی طاقت ہے۔ اس حالیہ پاک بھارت جنگ میں پاکستان نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ پاکستان کنونشنل جنگ میں بھی بھارت اور اسرائیل کے ساتھ نمٹ سکتا ہے اس لئے دشمن ٹرائیکا نے ایک اور اوجھوا کر کیا ہے۔

ہندوستان کے وزیر خارجہ نے سندھ طاس معاہدے کو توڑ دینے کا اعلان کر دیا ہے اور دہمکی دی ہے کہ پاکستان کو ایک قطرہ پانی بھی نہیں دیا جائے گا جبکہ پاکستان اس عمل کو اعلان جنگ قرار دے چکا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تہذیبوں کا یہ تصادم جنوبی ایشیا تک پھیلنے والا ہے۔ مودی کا ٹرمپ کی دعوت پر امریکا آنے سے معذرت، پاک امریکا تعلقات اور نئے مخاذ کی طرف اشارہ ہے۔ کیا امریکا اس نازک مرحلے پر پاکستان کا ساتھ دے گا یا

بھارت اور اسرائیل کی پشت پناہی کرتے ہوئے پاکستان کو محض مہرہ بنائے گا؟ گویا اسرائیل کا اپنی اس سازش سے پاکستان کو مفلوج کر دینا چاہتا ہے۔ حقیقت میں یہ محاذ محض سرحدی جنگ نہیں، بلکہ تہذیبوں کا معرکہ ہے۔

بھارتی وزیر خارجہ کا بیان پاکستان کی بقاء اور آزادی کا چیلنج ہے۔ بھارت کا جارحانہ رویہ پاکستان کو نئے محاذوں پر الجھانے کی کوشش ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور اس کی جغرافیائی حیثیت امریکا، انڈیا اور اسرائیل تینوں کی آنکھ کا کٹا ہے۔ نیتن یاہو کا بیان امریکا کے دہرے معیار کا عندیہ ہے۔ نیتن یاہو کا بیان کہ "ایران کے بعد پاکستان کا ایٹمی پروگرام ہمارا ہدف یہ سب اس بات کا اعلان ہے کہ پاکستان اب براہ راست ہدف پر ہے۔ جنرل عاصم منیر کی پذیرائی اور مودی کا ٹرمپ کو ملنے سے انکار اس بات کی دلیل ہے کہ امریکا بھارت اور اسرائیل کی پشت پر کھڑا ہے۔ ابھی حال ہی میں جنرل عاصم منیر کا دورہ امریکا محض روایتی عسکری سفارت کاری نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد اس بات کا اندازہ لگانا تھا کہ امریکا پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

"غزوہ ہند" کا تذکرہ کئی احادیث میں ملتا ہے۔ یہ محض ماضی کا قصہ نہیں، بلکہ حال اور مستقبل کا حصہ ہے۔ امت مسلمہ کی روایات اور احادیث میں غزوہ ہند کا تذکرہ ہے۔ احادیث میں ہے کہ امام مہدی کا خروج اور حضرت عیسیٰ کا نزول اس دور کا حصہ ہوں گے۔ یہ وہ معرکہ ہے جو مشرق کی سر زمین سے شروع ہو گا اور اسلام کا علم دوبارہ بلند کرے گا۔ روایات میں ہے کہ اس دور میں اسرائیل کا خاتمہ اور بیت المقدس کی آزادی کا باب رقم ہو گا۔ اس معرکے میں کامیابی پانے والا لشکر جنت کا حق دار ہو گا۔ امام مہدی کی آمد اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کا نزول، اسرائیل کی تباہی اور بیت المقدس کی آزادی کا پیش خیمہ ہے۔ یقیناً آخری معرکہ، حق و باطل کا ہو گا اور اس میں اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی ہے کہ دو گروہ ایسے ہیں جن کو اللہ دوزخ کی آگ سے نجات دے گا ایک گروہ ہند پر چڑھائی کرے گا اور دوسرا گروہ عیسیٰ بن مریم کے ہمراہ ہو گا۔ امام مہدی اور عیسیٰ بن مریم کی آمد کا مقصد، اسلام کا علم بلند کرنا، اسرائیل کا خاتمہ اور بالآخر اسرائیل کے ظلم کا مٹ جانا، تہذیب مغرب کا جنازہ، حضرت عیسیٰ کا شام میں نزول، دجال کا قتل اور اس کی تکمیل، اسلامی خلافت کا احیاء اور یاجوج ماجوج کا خروج، یہ سب کچھ احادیث کی کتب میں موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم کسی نئے دور کی طرف نہیں جارہے، بلکہ اس عہد کی طرف جارہے ہیں جہاں عدل اور ظلم، نور اور تاریکی کا معرکہ برپا ہے:

یہاں اللہ کا فرمان حرف آخر ہے فَأَنْصُرُنَا عَلَى الْكَافِرِينَ۔ (البقرہ: 286) پس ہماری مدد کر، اس کافر قوم پر۔

آج ہم ایسے دور تاریخ میں جی رہے ہیں جہاں محض تہذیبوں کا تصادم نہیں، حق و باطل، عدل و ظلم، نور و ظلمت کا معرکہ ہے۔ یہ محض اقوام کی محاذ آرائی نہیں، بلکہ نور اور ظلمت، عدل اور جور کا معرکہ ہے۔ تہذیبوں کا تصادم محض علمی بحث یا تاریخی پیش گوئی نہیں۔ یہ عہد حاضر کی اٹل حقیقت ہے۔ اس میں امریکا اور اس کے اتحادی اس محاذ آرائی کو اپنے تسلط اور وسائل کی حفاظت کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ مسلم امہ کی بقاء، اس محاذ آرائی کا ادراک کرنے اور اس کا توحید، عدل اور عزم کی طاقت سے سامنا کرنے میں مضمر ہے۔ پاکستان، افغانستان، ایران، ترکی اور دیگر اسلامی مملکتوں کو اس میدان کارزار میں ہمہ جہت تیاری کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ یہ دور محض بے خبری کا نہیں، بلکہ جاگنے اور جگانے کا ہے۔

یہ تصادم محض تہذیبوں کا نہیں بلکہ ایمان والحاد، عدل و جور، نور و ظلمت کا تصادم ہے۔ پاکستان اور عالم اسلام کا فرض ہے کہ فکری وحدت، عسکری تیاری،

سفارتی حکمت اور اقتصادی خود انحصاری کے ساتھ اس تصادم میں اپنی حیثیت منوائیں۔ اس لئے میری آپ سے گزارش ہے کہ اے اہل ایمان! تم وہ امت ہو جس کی پشت پر تاریخ کا قافلہ ہے اور سامنے مستقبل کے معرکے۔ تم پر لازم ہے کہ اپنے وجود کو شعلہ یقین سے روشن کرو کہ اب دنیا فیصلے کی دہلیز پر ہے۔

یہ وہ دور ہے جب امت مسلمہ کو بیدار ہو کر ایمانی، علمی، سیاسی اور عسکری محاذوں پر مضبوطی کا مظاہرہ کرنا ہو گا، توحید کی رسی مضبوطی سے تھام کر، اپنے کردار اور اسلحے کو ہمہ وقت تیار رکھنا ہو گا۔ یہ دور یہ فیصلہ کرے گا کہ ہم غلامی کی زنجیروں میں رہیں گے یا آزادی کا سورج طلوع کرنے والوں میں شامل ہوں گے۔ یاد رکھیے، تہذیبوں کا یہ تصادم محض مادی محاذ پر فتح یا شکست کا باب نہیں، بلکہ اللہ کی تقدیر کا حصہ ہے۔ جو ملت اس محاذ میں ایمانی حمیت اور تاریخی بصیرت سے ہمکنار ہوگی، وہی عروج پائے گی۔

آج کا عہد محض تماشہ بنی کا عہد نہیں۔ یہ دور مصلحت کا نہیں، مقابلے اور مزاحمت کا دور ہے۔ عزم، بصیرت اور ایمانی جدوجہد کا دامن تھام کر اپنے فیصلے کرنا ہوں گے کہ: تمہارا ماضی صلاح الدین ایوبی اور ٹیپو سلطان کی جرأت کا گواہ ہے، تمہارا حال اقبال کی بیداری، محمد علی جناح کی مستقل مزاجی اور مودودی کی فکر و جرأت کا وارث ہے، تمہارا مستقبل امام مہدی اور حضرت عیسیٰ کی بشارت کا منتظر ہے۔ ایمانی وحدت، تہذیبی بیداری، تزویراتی استقلال اور سیاسی جرأت، آج کا تقاضہ ہے۔ یاد رکھیے: **ذَلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ**۔ (محمد: 11)

یہ اس لیے کہ ایمان لانے والوں کا حامی و ناصر اللہ ہے اور کافروں کا حامی و ناصر کوئی نہیں، یعنی اللہ اہل ایمان کا کار ساز ہے۔ جہاں عزم ہو، جہاں توکل ہو، وہاں فتح ہے۔ جہاں فتح ہو، وہاں ایمانی تہذیب کی سر بلندی ہے۔

خاموش لابی..... بلند سازشیں

تاریخ کے اوراق پر جب کبھی انسانیت کے مستقبل کے حوالے سے سوالات ابھرتے ہیں، تب سیاست کی بازیگری، عسکری چالاکی اور سفارتی مکاری اپنے جو بن پر نظر آتی ہے۔ حالیہ دنوں میں مشرق وسطیٰ کے افق پر وہی کہانی ایک نئے باب کے ساتھ ابھری، جہاں امریکی بینڈنگون میں تیار کی گئی خفیہ حکمت عملی نے دنیا کی نظریں ایران کی جوہری تنصیبات سے ہٹا کر ایک گمنام جزیرے پر مرکوز کر دیں۔ گویا یہ منظر وہی تھا جسے عربی محاورے کے مطابق "چشمِ زدن میں صحراؤں کو گلستان اور گلستانوں کو ویرانہ کرنے والی" چال کہا جاسکتا ہے۔

امریکا اور اسرائیل کا تعلق محض دو ریاستوں کا دوستانہ رشتہ نہیں، بلکہ بیسویں اور اکیسویں صدی کی تاریخ کا سب سے پیچیدہ، ہمہ گیر اور ہمہ جہت باب ہے۔ یہ باب محض مادی امداد اور سیاسی حمایت تک محدود نہیں، بلکہ تاریخی، تہذیبی، اقتصادی اور اسٹریٹجک پہلوؤں کا ہمہ گیر امتزاج ہے۔ اس کی بنیاد محض "دوستی" یا "اتحاد" کی سادہ تعریف میں سمیٹ دینا تاریخ اور سیاسیات دونوں کی توہین ہوگی۔ امریکی سیاسی تاریخ میں اسرائیلی لابی کا اثر و رسوخ محض محاورہ نہیں بلکہ وہ محکم حقیقت ہے، جو وائٹ ہاؤس اور کیپیٹل ہل تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسرائیل اور امریکا کا رشتہ محض دو ریاستوں کا دوستانہ بندھن نہیں، بلکہ اس کی بنیاد گہری اسٹریٹجک ہم آہنگی، مشترکہ تہذیبی بیانیے اور سرمایہ و اثر و نفوذ کی مضبوط زنجیر پر استوار ہے۔

(اے آئی پی اے سی)، (اے ڈی ایل)، (جے آئی این ایس اے)، وہ تمام تنظیمیں ہیں جن کے مختلف کردار اور توجہ اسرائیل اور یہودی قوم سے متعلق ہے، حالانکہ وہ الگ الگ ادارے ہیں۔ اے آئی پی اے سی، امریکا میں اسرائیل نواز لابیگ گروپ ہے۔ اے ڈی ایل، (اینٹی ڈیفیمیشن لیگ) سام دشمنی اور نفرت کی دیگر اقسام کا مقابلہ کرتی ہے، جبکہ اسرائیل سے متعلق مسائل کو بھی حل کرتی ہے۔ جے آئی این ایس اے (یہودی انسٹی ٹیوٹ برائے قومی سلامتی امور) امریکی قومی سلامتی اور اسرائیل کے ساتھ اس کے تعلقات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، گویا امریکی سیاست میں اسرائیلی لابی کے اثر و رسوخ کا یہ عالم ہے کہ امریکا میں کوئی بھی جماعت ان کے تعاون کے بغیر حکومت سے قاصر رہتی ہے۔

1948ء میں اسرائیل کی تشکیل کے بعد، سرد جنگ کے سائے تلے امریکا نے اسرائیل کو محض خطے کا اتحادی نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کا "نہبانِ اقتدار" قرار دیا۔ اسرائیل کا جغرافیائی محل وقوع، اس کی جدید عسکری صلاحیت اور اس کا اسٹریٹجک محاذ پر ہمہ تن مصروف رہنا واشنگٹن کی پالیسی کا حصہ بن گیا۔ یوں اسرائیل، امریکی سامراجی پالیسی کا محوری ستون بن کر ابھر اور امریکا اور اسرائیل کے مابین حربی اور اسٹریٹجک تانے بانے لازم و ملزوم ہو گئے۔ امریکا کی سیاسی تاریخ میں اسرائیل کی لابی کا اثر و رسوخ محض خارجی پالیسی تک محدود نہیں، بلکہ انتخابی مہمات، قانون سازی اور وائٹ ہاؤس کی پالیسی ترجیحات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1948ء میں اسرائیل کی ریاست کے قیام کے فوراً بعد امریکا اس کا سب سے بڑا سفارتی و اقتصادی پشت پناہ بن کر سامنے آیا۔

امریکا اور اسرائیل کا رشتہ محض ریاستی یا اسٹریٹجک اتحاد تک محدود نہیں۔ یہ تاریخی، تہذیبی اور اقتصادی پہلوؤں کا ہمہ گیر حصہ ہے۔ امریکی صدر، خواہ ری پبلکن ہو یا ڈیموکریٹ، اس ناطے کا حصہ بننے اور اس کا تحفظ کرنے پر مجبور ہے۔ اے آئی پی اے سی اور دیگر یہودی لابی تنظیمیں امریکا کی داخلی سیاست میں اس درجہ نفوذ رکھتی ہیں کہ کسی بھی امریکی صدر کو اسرائیل کی پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے تاریخی نتائج کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ امریکی تاریخ میں اس امر کی مثالیں موجود ہیں کہ اسرائیلی لابی کا اثر و رسوخ امریکی صدر اور پالیسی سازوں پر کس طرح غالب آسکتا ہے۔

اس تناظر میں جان ایف کینیڈی، رچرڈ نکسن اور بارک اوباما تین ایسے امریکی صدور تھے، جنہوں نے اپنے دور میں اسرائیل یا اس کی پالیسیوں کو چیلنج کرنے کی جرأت کی، یا آزادی سے اقدامات کیے لیکن اس آزادی کی قیمت چکانی پڑی، کیونکہ یہودی لابیوں اور طاقتور تنظیموں نے تینوں کی سخت مخالفت کی۔

1960ء کی دہائی میں جان ایف کینیڈی اور اسرائیل کا تاریخی تناؤ اس بات کا اولین مظہر ہے۔ کینیڈی نے اسرائیل کو دیوینا نیو کلیئر ری ایکٹر پر عالمی معائنے کی شرط عائد کرنے کی کوشش کی، اور اس پالیسی نے اسرائیل اور اس کی لابی میں شدید بے چینی اور مزاحمت کو جنم دیا۔ کینیڈی نے اسرائیل پر زور دیا تھا کہ وہ اپنے جوہری پروگرام کو بین الاقوامی معائنے اور کنٹرول میں لائے۔ اس کا مقصد مشرق وسطیٰ میں جوہری اسلحے کی دوڑ کا سدباب تھا۔ اسرائیلی حکومت نے اس دباؤ کو شدید ناپسند کیا۔

کینیڈی کا کھلے عام قتل اور اس کے ارد گرد تاریخی سازشوں کا تذکرہ محض سازشی نظریہ نہیں بلکہ امریکی سیاسی ذہن میں پائے جانے والے شکوک کا حصہ بھی ہے۔ یہ واقعہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امریکی اسٹیبلشمنٹ اور اسرائیلی لابی کا تناؤ محض سیاسی نہیں، بلکہ تاریخی، اسٹریٹجک اور نفسیاتی محاذ کا حصہ ہے۔

رچرڈ نکسن (1969-1974) کا دور سرد جنگ کا حساس ترین حصہ تھا۔ اسرائیل اور عرب ریاستوں کا محاذ گرم تھا اور امریکا دونوں طرف توازن قائم کرنے کی جدوجہد میں تھا۔ 1973ء کی یوم کپور جنگ میں اسرائیل کی بقاء خطرے میں تھی۔ نکسن نے بڑے پیمانے پر اسلحہ اور ساز و سامان اسرائیل کو مہیا کیا، تاہم اس عمل میں اس کی پالیسی میں تذبذب اور دیگر عرب ریاستوں کو بھی انگیج کرنے کی خواہش اسرائیلی لابی کو ناگوار گزری۔

اس دور میں وزیر خارجہ ہینری کسنجر نے عرب۔ اسرائیل معاملے میں نسبتاً متوازن رویہ اپنایا لیکن ہینری کسنجر کا اعتماد پسند رویہ جو یہودی لابیوں اور اسرائیل کی سخت گیر قیادت کو ناپسند تھا۔ لابیوں نے نکسن کو اسرائیل کی حمایت میں "کمزور" اور "دوغلا" قرار دیا۔ مکافات عمل میں واٹر گیٹ اسکینڈل نے نکسن کو اقتدار چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ بعض مبصرین نے اس ضمن میں یہودی لابیوں اور میڈیا کا رویہ غیر معمولی سخت قرار دیا حالانکہ واٹر گیٹ کا معاملہ قانون اور احتساب کا حصہ تھا لیکن اسرائیل اور یہودی تنظیموں نے اس دوران نکسن کی پالیسیوں کو تنقید کا حصہ بناتے ہوئے اس کی ساکھ اور سیاسی طاقت کو مزید کمزور کرنے کی کوشش کی۔

واٹر گیٹ کا معاملہ محض قانون شکنی کا معاملہ نہیں رہا بلکہ اقتدار کے قبل از وقت خاتمہ کے علاوہ سیاسی محاذ پر بھی تاریخی دھبہ اور دشمنیوں کا حصہ بن گیا۔ اسرائیل اور یہودی تنظیموں نے یہ پیغام دیا کہ جو امریکی صدر اسرائیل یا اس کی پالیسیوں پر تنقید کرے گا، وہ اقتدار میں مشکلات کا شکار ہو سکتا ہے۔

بارک اوباما (2009-2017) کا دور مشرق وسطیٰ میں نئے چیلنجوں اور نئے رجحانات کا دور تھا۔ عرب اسپرنگ، ایران نیو کلیئر ڈیل اور اسرائیل کی بستیاں بسانے کی پالیسی جیسے مسائل اس دور کی نمایاں نشانیاں بنے۔ اوباما نے ایران کو نیو کلیئر میدان میں محدود کرنے اور خطے کو بڑے جنگی خطرے سے بچانے کی خاطر جوائنٹ کپری ہینسو پلان آف ایکشن تاریخی معاہدہ کیا۔ اسرائیل اور اس کی حامی یہودی لابیوں نے اس معاہدے کو اسرائیل کی سلامتی اور اور امریکی اسٹریٹجک مفاد کا "ناقابل معافی سودا" قرار دیا۔ نیتن یاہو نے امریکی کانگریس میں خطاب کرتے ہوئے اس معاہدے کی شدید مخالفت کی اور



اوباما انتظامیہ کو اسرائیل دشمن قرار دیا۔ امریکی یہودی لابی نے اوباما کی پالیسیوں کو "تاریخی غلطی" قرار دیا۔

اوباما نے فلسطین۔ اسرائیل تنازعے میں دوریاستی حل کی تائید اور مغربی کنارے میں اسرائیل کی بستیوں بسانے کی مخالفت کی۔ اس پالیسی کو امریکی یہودی لابی نے اسرائیل کی سکیورٹی اور بقاء پر حملہ تصور کیا۔ اوباما اور نیتن یاہو کی ذاتی اور سیاسی کشمکش و تناؤ اس دور کا حصہ رہی۔ اس تناؤ نے یہ تاثر مضبوط کیا کہ اوباما اسرائیل اور یہودی لابی کی روایتی حمایت سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ایران ڈیل کی حمایت کرنے والا امریکی صدر، اسرائیل اور اس کی لابی کی نظروں میں "مخالف" قرار پایا۔ نیتن یاہو اور اوباما کی سردمہری نے اسرائیل۔ امریکا تعلقات میں عارضی تناؤ پیدا کیا، تاہم روایتی امداد اور اسٹریٹجک اتحاد برقرار رہا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رچرڈ نکسن اور بارک اوباما کی مثال اس تاریخی سچائی کا حصہ ہے کہ امریکا کی داخلی سیاسی بساط پر یہودی لابیوں اور اسرائیلی اثر و رسوخ کا غیر معمولی اثر ہے۔ نکسن کا دور اس بات کی مثال ہے کہ امریکی صدر کو اسرائیل کی پالیسیوں پر آزادی یا تذبذب کی قیمت چکانی پڑ سکتی ہے۔ اوباما کا دور یہ درس دیتا ہے کہ حتیٰ کہ ایک مضبوط صدر، جو سفارت کاری اور امن کی زبان بولے، بھی لابیوں اور تنظیموں کی طاقت کا سامنا کرتے ہوئے تنقید، سیاسی دباؤ اور تاریخی جدوجہد کا حصہ بن سکتا ہے۔ نکسن اور اوباما کی مثال اس امر کا بھی اعلان ہے کہ اسرائیل کی پالیسیوں اور اس کی لابیوں کا اثر امریکی نظام سیاست اور اقتدار کی راہ گزر پر کس حد تک محیط ہے۔

امریکی سیاسی روایت گواہ ہے کہ اسرائیلی لابی کسی بھی صدر یا قانون ساز کو، جو اس کی پالیسی یا مفادات سے متصادم ہو، مختلف محاذوں پر چیلنج کر سکتی ہے۔ میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور دیگر بڑے ذرائع ابلاغ میں اسرائیل نواز بیانیے کا فروغ سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ دوسرا اسرائیلی لابی اپنے مالی اثر و رسوخ کا استعمال کرتے ہوئے انتخابی مہمات میں تمام سیاسی پارٹیوں میں چندہ اور سرمایہ کاری کا بے دریغ استعمال کرتی ہیں۔ قانون ساز محاذ میں مضبوط عمل دخل کے ساتھ سینیٹ اور ایوانِ نمائندگان میں اسرائیل حامی ارکان کا محاذ آرائی پر آمادہ ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے اور اس کے ساتھ ہی بینٹاگون اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں اسرائیل نواز بیوروکریٹس کا موثر انتظامی دباؤ بھی حکومت کو مجبور کر دیتا ہے۔ تین تاریخی مثالوں سے باآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

کینیڈی کا اسرائیلی نیوکلیر پروگرام کی بین الاقوامی نگرانی پر زور دینا محض ایک سفارتی معاملہ نہیں تھا بلکہ اس دور کی سرد جنگ کی سیاسی و تزویراتی حقیقت کا حصہ تھا۔ 1963ء میں جان ایف کینیڈی نے اسرائیل کو خطوط لکھے، جن میں دیہونا تنصیبات کا معائنہ کرنے کا سخت مطالبہ کیا۔ اسرائیلی قیادت نے امریکی دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے اس معاملے کو "قومی بقا" کا حصہ قرار دیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ اسرائیلی لابی اور کینیڈی انتظامیہ کا تناؤ محض پالیسی کا معاملہ نہیں، بلکہ اس تاریخی تناؤ نے امریکی سیاسی کلچر اور خارجہ پالیسی پر دور رس اثرات ڈالے۔

نیشنل سکیورٹی آرکائیو 2006ء میں "اسرائیل حد عبور کرتا ہے" میں ایوز کوہن اور ولیم برکی تحریریں اس کا ثبوت ہیں کہ کس طرح جان ایف کینیڈی کے ساتھ تناؤ اور مبہم حالات میں قتل، لابی اور خارجی پالیسی کی یوں سیاہ گھ جوڑ کی ایسی یادگار مثال ہمارے سامنے ہے کہ آج تک کینیڈی کی موت ایک

معہ بنی ہوئی ہے۔

2018ء میں امریکی سفارت خانے کی یروشلم منتقلی، اور گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی حاکمیت کی توثیق گویا ٹرمپ کے سابقہ دور میں اسرائیل اور امریکا کا تعلق بظاہر عروج پر دکھائی دیتا تھا تاہم حالیہ برسوں میں بعض امور پر دونوں کا نقطہ نظر متصادم دکھائی دیا لیکن ایران کے ایٹمی پلانٹ پر خوفناک حملہ کے جواب میں جب ایران نے مشرق وسطیٰ میں امریکی اڈوں کو اپنے میزائلوں کا نشانہ بنایا تو اس کے فوری بعد ایک مرتبہ پھر ٹرمپ کی طرف سے سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا اور پہلی مرتبہ ٹرمپ کے بیانات سے اسرائیل کے ساتھ تناؤ کی کیفیت کا اظہار سامنے آیا جس کی وجہ ایران پر حملے کے طریقہ کار پر اسرائیل نے اپنے تحفظات کا اظہار کیا جس کے بعد اسرائیل کی سکیورٹی پالیسی اور امریکی مفادات کا تفاوت یعنی بعض حساس خفیہ معلومات کا اسرائیل کی جانب سے مبینہ افشاء کا انکشاف بھی سامنے آیا۔

حالیہ دنوں میں، صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا رویہ بعض اسرائیلی پالیسیوں اور اقدامات پر شدید ناراضگی کا عکاس نظر آ رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب عسکری پالیسیوں میں اختلاف یعنی اسرائیل کا ایران اور دیگر ہمسایہ ممالک پر جارحانہ موقف، جو امریکی امن منصوبوں اور "ڈی-اسٹیکیشن" پالیسیوں سے ہم آہنگ نہیں۔ اسرائیل کی جانب سے بعض حساس خفیہ معلومات کا ایک ہونا یا امریکی توقعات پر پورا نہ اترنا، معاہدہ شکنی اور اعتماد کا فقدان بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ ٹرمپ کا مزاج، ذاتی سیاسی تناؤ اور اسرائیلی قیادت کا رویہ بعض مواقع پر ٹکراؤ کا باعث بن گیا۔

سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ کی حالیہ ناراضگی یہودی لابی کو متحرک کر سکتی ہے؟ امریکا میں اسرائیلی لابی روایتی طور پر ری پبلکن اور ڈیموکریٹ دونوں پارٹیوں میں ہمہ گیر اثر و رسوخ رکھتی ہے۔ حالیہ برسوں میں اس لابی نے ٹرمپ کو اسرائیل نواز پالیسیوں، جیسے امریکی سفارت خانے کی یروشلم منتقلی اور گولان کی پہاڑیوں کو اسرائیلی حصہ تسلیم کرنے جیسے اقدامات پر سراہا۔ تاہم، حالیہ ناراضگی اور تنقید اس لابی میں بے چینی کا باعث بن رہی ہے۔ اس کا ممکنہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ:

آئندہ انتخابی مہم اور دیگر سیاسی حمایت میں لابی کی جانب سے سرد مہری کے طور پر مالی امداد میں کمی ہو سکتی ہے۔ اسرائیل نواز میڈیا پلیٹ فارمز اور تھک ٹینکس کی جانب سے ٹرمپ مخالف بیانیے کا فروغ کا امکان بھی ہو سکتا ہے جس سے امریکی رائے عامہ میں ٹرمپ کے خلاف مہم شروع کی جاسکتی ہے۔

قانون ساز ایوانوں میں اسرائیل کی حمایت کرنے والے سینیٹرز اور ارکان کانگریس کی مخالفت کی شکل میں سیاسی محاذ آرائی شروع ہو سکتی ہے۔ اندرونی بیوروکریسی اور اسٹیبلشمنٹ میں لابی کا استعمال کرتے ہوئے خارجہ پالیسی میں ٹرمپ کو غیر موثر کرنے کی کوششیں اور خفیہ دباؤ کا امکان بھی ہے۔

امریکی سیاسی تاریخ شاہد ہے کہ اسرائیل کی لابی محض خارجی پالیسی کا حصہ نہیں، بلکہ امریکی سیاسی عمل کا حصہ ہے۔ ماضی میں جان ایف کینیڈی اور دیگر رہنماؤں کی مثال یہ باور کراتی ہے کہ اسرائیل کی لابی محض "مشیر" یا "حامی" نہیں، بلکہ بعض مواقع پر پالیسی سازی کی سمت اور بعض اوقات تقدیر سیاست تک متعین کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ تاہم ٹرمپ اور اسرائیل کا حالیہ تناؤ محض وقتی اختلاف رائے نہیں بلکہ امریکی داخلی سیاسی امتحان ہے۔ اسرائیلی لابی، ماضی کی روایات اور تاریخی مثالوں کی بنیاد پر، اس پوزیشن میں ہے کہ اگر ٹرمپ اسرائیل مخالف یا اس کی مرضی سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرتے ہیں تو یہ لابی محض تنقید تک محدود نہیں رہے گی۔ یہ لابی، ماضی کی مانند، سیاسی، ابلاغی اور مالی محاذوں پر متحرک ہو کر امریکی صدر کیلئے ایسے چیلنج کھڑے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، جن کا تاریخی باب جان ایف کینیڈی کی داستان کا حصہ بن چکا ہے۔

اس صورتحال میں کیا امریکا اسرائیل کی پالیسی کا یرغمال بن چکا ہے؟ محققین کی اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ آئیے دیکھتے ہیں!

جان مٹرشائمر اور اسٹیفن والٹ "دی اسرائیل لابی اور یو ایس فارن پالیسی، 2007 کی رپورٹ میں اسرائیلی لابی اور اس کی امریکی پالیسی پر گرفت کا تفصیل سے تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کو نمایاں کرتے ہیں کہ امریکا اسرائیل کی حمایت محض اسٹریٹجک ضرورتوں تک محدود نہیں بلکہ داخلی سیاسی و انتخابی مصلحتوں کا حصہ ہے۔ مشہور زمانہ نوم چومسکی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ امریکا اسرائیل کو محض امداد نہیں دیتا بلکہ اس کی دفاعی صنعت اور خطے میں جارحانہ پالیسیوں کا حصہ بن کر اس سے مادی، تزویراتی اور سیاسی فوائد سمیٹتا ہے۔

امریکا کی اسرائیل سے بے پناہ حمایت محض "ہمدردی" یا "مذہبی ہم آہنگی" کا مظہر نہیں۔ یہ تاریخی، سیاسی اور اقتصادی مصلحتوں کا مرکب ہے۔ اسرائیل، امریکی اسلحہ ساز کمپنیوں اور سیاسی لابیوں کا نقطہ اتصال بن چکا ہے۔ یوں واشنگٹن اور تل ابیب کا رشتہ محض دو ریاستوں کا معاملہ نہیں، بلکہ عالمی طاقت اور مصلحت کا معرکہ ہے۔ امریکا کی اس "مجبوری" کو محض اقتصادی یا فوجی تناظر تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ ایک ہمہ جہت، تاریخی اور تہذیبی تعلق ہے، جو حال اور مستقبل کی عالمی سیاست کی راہ متعین کرتا ہے۔

امریکا اور اسرائیل کا رشتہ محض دو ریاستوں کا سفارتی یا اقتصادی لین دین نہیں، بلکہ تاریخی، اسٹریٹجک، تہذیبی اور سیاسی مصلحتوں کا گہرا امتزاج ہے۔ مغرب میں تہذیبی ہم آہنگی اور امریکی سیاست میں عیسائی-یہودی روایت، بائبل اور "وعدہ کی گئی سرزمین" جیسے تاریخی بیانیے کا اثر غالب ہے۔ اسرائیل کو مشرق وسطیٰ کا "نا قابل تسخیر قلعہ" بناتے ہوئے امریکا نے خطے میں روس، چین اور ایران جیسے حریفوں کا راستہ روکنے کی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے۔

اسرائیل امریکی دفاعی صنعت کا سب سے بڑا گاہک ہے۔ اس لیے یہ محض "امداد" نہیں بلکہ ایک مربوط اقتصادی چکر ہے۔ اسرائیل نواز لابیوں اور دیگر گروہ امریکی انتخابی میدان اور قانون سازی پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ نوم چومسکی نے کئی دہائیوں تک امریکی پالیسی اور جارحیت پر بے لاگ تنقید کی ہے۔ چومسکی کی تحریریں امریکی سامراج، اسرائیل کی حمایت اور مڈل ایسٹ میں فوجی مداخلت کا پردہ چاک کرتے ہوئے واشنگٹن اور تل ابیب کی ہمہ گیر ہم آہنگی کو عیاں کرتی ہیں۔

چومسکی اپنی کتاب "تسلط یا بقاء" میں لکھتے ہیں: امریکا اسرائیل کو محض مشرق وسطیٰ کا گڑھ تصور نہیں کرتا بلکہ اپنی پالیسی کا حصہ بنا چکا ہے۔ اسرائیل اور امریکا کا تعلق محض دوستانہ یا اتحادی نہیں، بلکہ دونوں کا سامراجی مقصد میں شراکت کا رشتہ ہے۔ اپنی کتاب "قسمت کی تکون" میں چومسکی نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کس طرح اسرائیل اور امریکا مل کر فلسطین اور عرب خطے پر تسلط قائم کرتے ہیں۔ چومسکی نے اس رشتے کو "استعماری سہ رخی کھیل" قرار دیا۔ امریکا اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ محض خطے کی سکیورٹی کا معاملہ نہیں، بلکہ دونوں کا مقصد خطے کو اپنے تابع بنائے رکھنا ہے۔ ایک اور کتاب "مینوفیکچرنگ کی رضامندی" میں چومسکی اور ایڈورڈ ہرمن نے دکھایا ہے کہ کس طرح امریکی میڈیا اور لابی سسٹم اسرائیل کی جارحانہ پالیسیوں اور امریکی توسیع پسندانہ اقدامات کو "قومی مفاد" اور "جمہوری جدوجہد" کا رنگ چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔

نوم چومسکی اور دیگر محققین کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ امریکا اسرائیل سے تعلق محض اس لیے مضبوط نہیں کہ یہ دو جمہوری ریاستیں ہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ دونوں کا مقصد ایک ہے: خطے کو کنٹرول کرنا، اقتصادی فوائد سمیٹنا، اور اسٹریٹجک توازن کو اپنے حق میں بدلنا۔ چومسکی اس پالیسی کو جدید استعمار اور ہمہ

گیر جارحیت کا حصہ قرار دیتے ہیں۔

امریکا اسرائیل کی بے پناہ حمایت کرنا محض "دوست ریاستوں" کا معاملہ نہیں، یہ طاقت اور اسلحے کا کھیل ہے۔ اسٹریٹجک قبضے اور وسائل پر کنٹرول کی داستان ہے۔ اندرونی لابیوں اور عالمی بینکنگ سسٹمز کی کار فرمائی ہے۔ تہذیبی، تاریخی اور سیاسی ہم آہنگی کا حصہ ہے اور سب سے بڑھ کر، "عالمی بالادستی" اور "نئے سامراجی عہد" کا تسلسل ہے۔ نوم چومسکی جیسے محققین نے اس تعلق کو محض دوستانہ یا اتحادی انداز میں نہیں، بلکہ اس دور کا سب سے طاقتور "استعماری گٹھ جوڑ" قرار دیا ہے۔ چومسکی جیسے محققین کی بے لاگ تنقید اس حقیقت کا پردہ چاک کرتی ہے کہ یہ تعلق محض "امداد اور حمایت" کا نہیں بلکہ "بالادستی، توسیع اور اقتدار" کا تاریخی باب ہے۔ یہ باب ماضی، حال اور شاید مستقبل تک پھیلا ہوا ہے۔

امریکا اسرائیل کی حمایت محض اس لیے نہیں کرتا کہ اسرائیل اس کا اتحادی ہے، بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ اسرائیل عالمی سیاست اور اقتصادیات کا مرکز بن چکا ہے۔ عرب ریاستوں، ایران اور دیگر علاقائی طاقتوں کو معتدل یا محدود رکھنے کا امریکی عزم اسرائیل کی طاقت اور بقا سے جڑا ہے۔ ان دور ریاستوں کا تعلق یہ ہے کہ یہ "عالمی اقتدار، جدید استعمار اور اقتصادی جارحیت" کا حصہ ہیں۔ چومسکی جیسے محققین اس ربط کو تاریخی تناظر میں محض اتحاد یا دوستی کی صورت میں قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے اسرائیل کو اس مقصد کا محوری ستون کہتے ہیں۔

امریکا اور اسرائیل کا ربط محض فوجی یا سیاسی نہیں، بلکہ تاریخی، تہذیبی اور اقتصادی میدانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ "امداد، حمایت، اتحادی" جیسے عام الفاظ سے ماورا ہے۔ اس کا مقصد محض ریاستوں کا تحفظ یا مفادات کا تبادلہ نہیں، بلکہ عالمی طاقت اور اقتدار کا ہمہ گیر ڈھانچہ تشکیل دینا ہے۔ نوم چومسکی جیسے محققین کی بے لاگ تنقید اس تاریخی سچ کو عریاں کرتی ہے، اور اس تاریخی جبر کا پردہ چاک کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ اسرائیل محض "حمایت یافتہ ریاست" نہیں بلکہ "استعمار کا حصہ" ہے۔ امریکا اور اسرائیل کا رشتہ محض دور ریاستوں کا گٹھ جوڑ نہیں، بلکہ تاریخی، تہذیبی اور سیاسی میدانوں کا ہمہ گیر امتزاج ہے۔

یہ کہانی صرف ایران، امریکا اور اسرائیل کی نہیں، یہ دراصل طاقت، مفادات اور حکمت عملی کی اس بازیگری کا نام ہے جس میں انسانیت کی بقا بار بار سوال بن کر ابھرتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کی دھرتی پر امن کی صبح طلوع کب ہوگی، اس کا جواب فی الحال تاریخ کے اوراق منتظر ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک طاقتور اپنے مفادات کی بھیٹ کمزوروں کو چڑھاتے رہیں گے، جنگ کا شعلہ کبھی بجھ نہ پائے گا۔

یہ سارا منظر محض دو یا تین ریاستوں کا تنازعہ نہیں، بلکہ عالمی طاقت، تاریخی جدوجہد اور تہذیبی بقاء کا حصہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کی ویران بستیوں اور خستہ حال بلے میں یہ سبق بھی مضمحل ہے کہ تاریخ محض عہدوں کا نام نہیں، یہ عبرت اور بصیرت کا چراغ بھی ہے۔

سبز فائر کے پردے میں عالمی کھیل

کبھی کبھی قوموں کے افق پر ایک ایسا لمحہ ظہور پذیر ہوتا ہے جو صدیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کا نصف دوم ایک ایسا دور تھا جب سرد جنگ کی بساط پر مشرق وسطیٰ کی بساط بچھائی جا چکی تھی۔ تہران، جو کبھی صفویوں کے عہد میں فقہی اور فکری اجتہاد کا مرکز تھا، اب سرمایہ دارانہ سیاست کا سفارتی اڈہ بن چکا تھا۔ اس خطے میں امریکا نے اپنے مفادات کے تحفظ کیلئے ایران کو، بالخصوص شاہ محمد رضا پہلوی کو، ایک "علاقائی تھانیدار" کے طور پر چنا گیا کیونکہ خطے میں شاہ ایران سے بہتر کوئی بھی امریکی سامراج کیلئے بہتر سایہ دار شجر موجود نہیں تھا۔ امریکا، جو اپنے تیل کے ذخائر کیلئے مشرق وسطیٰ کو ناگزیر سمجھتا تھا، ایران کی جغرافیائی اور عسکری اہمیت کو نظر انداز نہ کر سکا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ایران، دجلہ و فرات کے کنارے نہیں بلکہ واشنگٹن کی چوکھٹ پر سجدہ ریز تھا۔ شاہ ایران، نہ صرف خطے کا سیاسی چوکیدار بلکہ امریکا کے اسٹریٹجک منصوبوں کا "پروٹوکول افسر" بن چکا تھا۔ شاہ ایران، جدیدیت کے لبادے میں مغرب کی تہذیبی غلامی کا پیکر تھا۔ اس کے دور میں ایران میں مغربی اقدار کا سیلاب اُمڈ آیا۔ ایران و اسرائیل کے مابین تعلقات محض رسمی نہیں، بلکہ گہرے دفاعی، انٹیلیجنس اور اقتصادی مفادات کے حامل تھے۔ موساد اور ساواک کے گٹھ جوڑنے خطے کے مزاحمتی عناصر کو کچلنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ ایران، اسرائیل کو تیل فراہم کرتا تھا، اور اسرائیل، ایران کو ٹیکنالوجی و تربیت دیتا تھا۔ اس وقت ایران اور اسرائیل کے تعلقات، محض سفارتی تکلفات نہیں تھے بلکہ معاشی، دفاعی اور انٹیلیجنس سطح پر گہرے مراسم کا دوسرا نام تھے۔ موساد اور ساواک (ایران کی خفیہ ایجنسی) ایک ہی میز پر بیٹھ کر مشرق وسطیٰ کے خفیہ نقشے کھینچا کرتے تھے۔ تل ابیب اور تہران کے درمیان محض فضائی مسافت نہ تھی بلکہ فکری ہم آہنگی اور سامراجی قربت کا پل بھی استوار تھا۔

1979ء کا سال ایران کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ ثابت ہوا جس نے صرف ایک حکومت کا تختہ الٹا نہیں بلکہ ایک عالمی فکر کو چیلنج کیا۔ امام خمینیؒ کی قیادت میں برپا ہونے والے اسلامی انقلاب نے مغربی استعمار کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا۔ شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا۔ امام خمینیؒ کی قیادت میں ایران میں اسلامی انقلاب کا سورج طلوع ہوا، تو صرف ایک حکومت کا تختہ نہیں الٹا، بلکہ ایک عالمی نظام کو فکری چیلنج دے دیا گیا۔

وہ ایران جو کبھی امریکی عزائم کا محور تھا، اب ایران کی فضا میں ایک انقلابی نعرہ گونجا، "نہ مشرقی، نہ مغربی، صرف اسلامی" کے نعرے کا علمبردار بن گیا۔ اس ایک جملے نے امریکی مفادات کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کر دیا۔ ایران، جو کل تک سی آئی اے کا خفیہ اڈہ تھا، اب سامراج دشمنوں کا قبلہ بن چکا تھا۔ امام خمینیؒ نے واضح طور پر اسرائیل کو "سرطانی غدہ" قرار دیا، اور امریکا کو "شیطان اکبر"۔ یہ صرف سیاسی نعرے نہ تھے، بلکہ تہذیبی اور فکری بیانات تھے جو مغربی استعمار کے مقابل ایک نئی اسلامی شناخت کا اعلان تھے۔ شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا۔

لیکن امریکا کو یہ ایرانی انقلاب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے تو ایسا سوچا بھی نہیں تھا کہ خطے کی برتری اس طرح خاک میں مل جائے گی۔ ایرانی انقلاب کا سیلاب امریکی چار دیہائیوں سے ایران پر اس کی مضبوط گرفت اور اس کے مستقبل کے ارادوں کو بہالے جائے گی، اور تیل سے مالا مال مشرق وسطیٰ جیسے خطے میں اس کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ امریکا نے اس انقلاب کو ناکام بنانے کیلئے ایران میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سازشیں شروع کر دیں جس کے جواب میں ایرانی طلباء نے تہران میں امریکی سفارتکاروں کو اغواء کر کے امریکا کے سامنے اپنے کئی ایسے مطالبات رکھ دیئے جس سے وہ ایران میں امریکی ریشہ دوانیوں کو ختم کرے۔

امریکی سفارت خانے پر قبضہ اور سفارت کاروں کا اغوا ایک ایسا واقعہ تھا جس نے عالمی سفارتی روایات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایرانی طلباء کے ہاتھوں امریکی سفارت خانے پر قبضہ اور سفارت کاروں کا اغوا، گویا واشنگٹن کے چہرے پر طمانچہ تھا۔ ایرانی طلباء نے اس اقدام کو امریکا کی سازشوں کے ردِ عمل کے طور پر پیش کیا۔ واشنگٹن میں کہرام مچ گیا، عالمی برادری میں ایران کے خلاف نفرت ابھرنے لگی۔

دنیا حیران، سامراج پریشان، صدر جی کارٹر نے "آپریشن ایگل کلا" نامی ایک خفیہ فوجی کارروائی کی گئی، جس کا مقصد مغربیوں کو رہا کرانا تھا مگر یہ کارروائی نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ امریکی عسکری وقار کا کفن بھی بن گئی۔ ریت کے طوفان میں پھنسے امریکی طیارے، ٹوٹے پرزے اور جلتی ہوئی لاشیں — سب انقلاب کے طغیانی بیانیے کے گواہ بن گئے۔ صحرائے طبس کی ریت نے امریکی عسکری غرور کو نگل لیا۔ اس واقعے نے امریکی وقار پر کاری ضرب لگائی اور ایران کی انقلابی قیادت کیلئے ایک فکری فتح کا پیغام لایا۔ جس رات امریکی آپریشن ناکام ہوا، اس سے اگلی شام امام خمینی نے اپنی قوم کے ہر فرد کو یہ پیغام دیا کہ وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑا ہو کر تین دفعہ "اللہ اکبر" اللہ کی کبریائی کا اعلان کرے کہ اس نے اپنی دو طاقتوں "اندھیرے اور آندھری" سے امریکا کے تکبر کو پاش پاش کر دیا۔

امریکا نے بالآخر اپنے اتحادیوں کو اپنے ساتھ شامل کر کے ایران پر اقتصادی پابندیاں لگا کر استعماری انتقام کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے ایران پر معاشی پابندیوں کا جال بچھا دیا۔ اقتصادی قیچی کے استعمال سے ایران کا مالیاتی نظام عالمی منڈیوں سے کاٹ دیا گیا، تیل کی برآمدات محدود کر دی گئیں، اور روزمرہ ضروریات کی اشیاء تک کی درآمد پر قدغن لگا دی گئی۔ سمندری راستوں پر پہرے بٹھادیئے گئے کہ ایران پر زندگی تنگ کر دی جائے۔

یہ سب کچھ اس امید پر کیا گیا کہ ایرانی عوام انقلابی حکومت سے مایوس ہو کر بغاوت کریں گے، مگر ایران نے استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اگرچہ معیشت کو شدید نقصان پہنچا لیکن ایرانی عوام نے انقلاب کے نظریاتی دامن کو نہ چھوڑا۔ امریکا نے اپنی ناکامیوں کا انتقام ایران کی معیشت سے لیا۔ معاشی پابندیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ ایران کو عالمی مالیاتی اداروں سے الگ کر دیا گیا، تیل کی برآمدات محدود کی گئیں، اور ہر اس دروازے پر قفل ڈال دیا گیا جہاں سے ایران کو سانس آتی تھی۔ امریکا نے صرف پابندیاں ہی نہیں لگائیں، بلکہ اپنے کرائے کے سپاہی اسرائیل کو خطے میں اپنا آلہ کار بنا کر ایران پر دباؤ میں اضافہ بھی کیا۔

ایران کے ایٹمی پروگرام کو مغربی دنیا، بالخصوص اسرائیل اور امریکا نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا۔ "ایران ایٹمی ہتھیار بنا رہا ہے جو دنیا کیلئے ایک شدید خطرہ ہے" اس بیانیے کو ہتھیار بنا کر عالمی رائے عامہ کو ایران کے خلاف ہموار کیا گیا حالانکہ ایران بارہا دعویٰ کرتا رہا کہ اس کا ایٹمی پروگرام پر امن مقاصد کیلئے ہے، تاہم اسرائیل نے اسے اپنی بقا کیلئے خطرہ قرار دیا۔ ایران کا ایٹمی پروگرام، جسے وہ قومی خود مختاری کا پرچم کہتا ہے، اسرائیل نے اسے اپنے لئے اور مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کیلئے ایک خطرہ قرار دے دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل، جو خود ایٹمی طاقت ہے مگر عالمی قوانین سے مبرا، ایران کے کسی بھی ممکنہ ایٹمی صلاحیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ امریکا اور اس کے اتحادیوں نے خاموشی سے اسرائیلی حملوں کی پشت پناہی شروع کر دی۔

ایران کا ایٹمی پروگرام ایک عرصے سے عالمی سطح پر بحث و مباحثے کا موضوع بنا ہوا ہے۔ مغربی طاقتیں، بالخصوص امریکا، اس خدشے کا اظہار کرتا آرہا ہے کہ ایران ایٹمی ہتھیار بنانے کی کوشش کر رہا ہے، جو کہ دنیا کے امن و سلامتی کیلئے ایک بڑا خطرہ ہو سکتا ہے۔ تاہم، اس بیانیے کے پیچھے کارفرما سیاسی عزائم

اور تاریخی حقائق کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ محض ایک یکطرفہ موقف نہیں بلکہ ایک گہری بین الاقوامی سیاسی چال کا حصہ ہے۔ امریکا نے "ایران ایٹمی ہتھیار بنارہا ہے" جیسے بیانیے کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے عالمی رائے عامہ کو ایران کے خلاف ہموار کرنے کی منظم کوشش کی ہے۔ یہ بیانیہ مختلف بین الاقوامی پلیٹ فارمز پر بار بار دہرایا جاتا ہے، جس کا مقصد ایران پر دباؤ بڑھانا، پابندیاں عائد کرنا اور اس کے علاقائی اثر و رسوخ کو محدود کرنا ہے۔

یہ صورتحال ماضی میں عراق کے خلاف اپنائی گئی امریکی پالیسی سے خاصی مماثلت رکھتی ہے۔ 2003ء میں امریکا اور اس کے اتحادیوں نے دعویٰ کیا کہ صدام حسین کے پاس وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار موجود ہیں۔ ان الزامات کو جواز بنا کر عراق پر حملہ کیا گیا، جس کے نتیجے میں لاکھوں افراد جاں بحق اور پورا ملک تباہ ہو گیا۔ بعد ازاں، خود امریکا نے اقوام متحدہ میں اعتراف کیا کہ ایسے ہتھیاروں کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ برطانیہ کے اس وقت کے وزیر اعظم ٹونی بلیر نے بھی اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اسے ایک "قومی سانحہ" قرار دیا۔

عالمی برادری اور مغربی طاقتیں اگر واقعی ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کی مخالف ہیں تو پھر اسرائیل کو مسلسل نظر انداز کرنا ایک کھلی منافقت ہے۔ اسرائیل ایک ایسا ملک ہے جو خود کئی دہائیوں سے ایٹمی ہتھیار رکھتا ہے، لیکن نہ تو وہ کسی عالمی معاہدے کا پابند ہے اور نہ ہی اس پر کوئی بین الاقوامی دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ یہ دوہرا معیار عالمی نظام انصاف اور اقوام متحدہ کی غیر جانبداری پر کئی سوالات اٹھاتا ہے۔

ایران کے ایٹمی پروگرام کے حوالے سے اٹھنے والے خدشات کو محض سیکورٹی یا امن کے زاویے سے نہیں، بلکہ ایک بڑے جیو پولیٹیکل کھیل کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ امریکا کی پالیسیوں، سابقہ تجربات اور اسرائیل جیسے ممالک کو دی گئی چھوٹ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایران کے خلاف بیانیہ محض سچائی پر مبنی نہیں بلکہ مخصوص مفادات کی ترجمانی بھی کرتا ہے۔ عالمی برادری کو چاہیے کہ وہ کسی بھی فیصلے سے قبل مکمل شواہد اور غیر جانبدارانہ رویہ اپنائے، تاکہ ماضی کی غلطیاں دوبارہ نہ دہرائی جائیں لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکی جن وہ طوطا ہے جس کی گردن اسرائیل کی گرفت میں ہے اور اسرائیل اپنی من مانی شرائط پر امریکا کی طرح ساری دنیا کویر غمال بنانے کا تہیہ کر چکا ہے۔

لیکن دوسری طرف انہی وجوہات کا مقابلہ کرنے کیلئے خطے میں امریکی کرائے کے سپاہی اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ کرنے کیلئے ایران نے اپنی نظریاتی بقاء اور دفاعی حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ایک وسیع البیاد پر کسی نیٹ ورک تشکیل دیا۔ شام میں بشار الاسد کی حکومت کو اپنی پشتیبانی میں لیا، لبنان میں حزب اللہ کو ایک منظم مزاحمتی قوت بنایا، اور یمن میں حوثیوں کو عسکری امداد و نظریاتی تربیت فراہم کی۔ یہ تمام قوتیں ایران کے دفاعی فلسفے میں "آگے کی خندقیں" تھیں، جن کے ذریعے ایران نے اسرائیلی خطرے کو اپنے جغرافیائی حدود سے دور رکھا۔

حزب اللہ نے 2006ء میں جب اسرائیل کے خلاف جرات مندانہ مزاحمت کی، تو اسرائیلی فوج کو تاریخی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسرائیل جو چند دنوں میں بیروت پہنچنے کے خواب دیکھ رہا تھا، جنوبی لبنان سے بھی پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ اس ذلت آمیز شکست کے بعد اسرائیل نے میدان جنگ سے ہٹ کر خفیہ محاذ پر چالیں چلیں۔ موساد کو فعال کیا گیا، جس نے مختلف سازشوں اور سامبر حملوں کے ذریعے ان تمام پراسیز کو کمزور کرنے کی منظم کوششیں

کیں۔ حزب اللہ کے مواصلاتی نظام (واکی ٹاکی نیٹ ورک) میں مداخلت کی گئی، قیادت کے اندر دراڑیں ڈالنے کی کوشش کی گئی، اور یمن میں حوثیوں پر مسلسل فضائی حملے جاری رکھے گئے۔

شام میں بشار الاسد کی حکومت، اگرچہ رسمی طور پر قائم رہی، لیکن کئی علاقوں میں اس کی رٹ ختم ہو گئی۔ روس کی مدد سے وہ جزوی طور پر اقتدار سنبھال سکا لیکن اسرائیلی حملے و قناوتاً جاری رہے۔ بالآخر وہ وقت بھی آن پہنچا اور شامی فوج کے ہاتھوں ان لاکھوں شہداء کی قربانیاں کامیاب ہوئیں اور بشار الاسد کو فرار ہو کر روس کی گود میں پناہ لینی پڑ گئی اور نئی شامی حکومت کے خوف سے ایرانی پر آکسیز کو وہاں سے فرار ہونا پڑا لیکن اس کا براہ راست فائدہ بھی اسرائیل کو پہنچا اور سعودی ولی عہد نے ٹرمپ کے سعودی عرب کے دورے کے دوران نئے شامی سربراہ کی ملاقات کا اہتمام کیا جس کے بعد شام سے امریکی پابندیاں ہٹانے کا اعلان ہو گیا ہے۔ گویا اسرائیل کو شام کی طرف سے بھی مکمل تحفظ حاصل ہو گیا ہے۔

اسی دوران اسرائیل نے غزہ پر جو قیامت ڈھائی، جو آج بھی جاری ہے، وہ تاریخ انسانی کے المیہ بابوں میں رقم ہو چکی ہے۔ غزہ کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔ 60 ہزار سے زائد فلسطینی شہید کیے گئے، جن میں اکثریت عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی تھی۔ لاکھوں زخمی اور بے گھر ہو گئے۔ امریکا، اسرائیل کا عسکری اور سفارتی محافظ بن کر اس ظلم پر خاموشی سے نہیں بلکہ کھلے عام پشت پناہی کرتا رہا۔ ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ امریکا نے غزہ میں جنگ بندی کی قرار داد کو 18 مرتبہ مسترد کرتے ہوئے اسرائیل کو کھلے عام بے گناہ فلسطینیوں کے قتل عام کا لائسنس دے رکھا جبکہ یہی ٹرمپ اپنی انتخابی مہم میں جنگوں کو بند کرانے کا نعرہ لگا رہا تھا۔



ابھی غزہ میں امریکی پشت پناہی سے اسرائیلی ظلم و ستم کا طوفان تھا کہ اسرائیل نے 13 جون 2025 کو اسرائیل نے "آپریشن رائزننگ لائن" کے تحت ایران کے متعدد ایٹمی و عسکری تنصیبات کو نشانہ بنایا، جن میں فورڈو، نظرز اور اصفہان کے مقامات شامل تھے۔ بعد ازاں اسرائیل نے ایران کے سائنسدانوں کو نشانہ بنایا، ساہر حملے کیے، اور پھر کھلم کھلا حملوں کی طرف آگیا۔ ایران نے 14 جون 2025 کے صحرائی وقت میں مسلسل 12 دنوں تک اسرائیلی علاقوں پر میزائل و ڈرون حملے کیے۔ ایران کی سپریم نیشنل سیکورٹی کونسل نے انہیں قابلِ عبرت طاقت کا مظاہرہ قرار دیا۔

یہاں یہ بتانا بھی انتہائی ضروری ہے کہ اس خطے میں یہود و ہنود کا خفیہ اشتراک بھی اپنے منظر عام پر آچکا ہے۔ اسرائیل اور ایران کے درمیان کشیدگی کئی دہائیوں پر محیط ہے، تاہم حالیہ برسوں میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی ایران کے اندر بڑھتی ہوئی سرگرمیوں نے اس تنازعے کو ایک نئے، خفیہ محاذ پر منتقل کر دیا ہے۔ ایران اور اسرائیل کے مابین طویل عرصے سے جاری کشیدگی حالیہ برسوں میں خفیہ جنگ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موساد نے ایران کے اندر متعدد کارروائیاں کیں، جن میں اہم ایرانی شخصیات کو نشانہ بنایا گیا۔

ایران کے سیکورٹی اداروں کے مطابق، اسرائیل نے ایران پر ممکنہ حملے سے قبل ایک فعال خفیہ نیٹ ورک قائم کیا، جس کی منصوبہ بندی اور نگرانی موساد نے کی، جو مقامی و غیر ملکی افراد پر مشتمل تھا۔ اس نیٹ ورک نے حساس سیکورٹی مقامات، ایرانی فوج، ایٹمی سائنسدانوں اور سیاسی شخصیات کو نشانہ

بنایا۔ موساد کے اسی نیٹ ورک کے ذریعے غزہ کی مزاحمتی تنظیم حماس کے اعلیٰ رہنما اسماعیل ہنیہ کو ایک حملے میں شہید کیا گیا۔ اس حملے کی اہم بات یہ تھی کہ اسماعیل ہنیہ ایرانی صدر کی حلف برداری کی تقریب میں خصوصی مہمان کے طور پر مدعو تھے، جو واضح کرتا ہے کہ یہ ایک پیغام اور اشتعال انگیزی پر مبنی کارروائی تھی۔ یہ حملہ اسرائیل کا ایک واضح پیغام تھا کہ وہ ایران کے علاقائی اتحادیوں کو بھی بخشے والا نہیں۔ اس نیٹ ورک نے ماضی میں ایران کے کئی ممتاز جوہری سائنسدانوں اور فوجی قیادت کو بھی نشانہ بنایا۔ خاص طور پر ڈاکٹر محسن فخری زادہ اور پاسداران انقلاب کے اعلیٰ افسران شامل ہیں کی ہلاکت ایک بڑا دھچکہ تصور کی گئی، جو ایران کے ایٹمی پروگرام کی علامت مانے جاتے تھے۔

ایرانی ایٹمی جنس اداروں نے بعد ازاں ایک بڑی کارروائی میں موساد سے وابستہ اس نیٹ ورک کو بے نقاب کیا۔ گرفتار افراد میں نہ صرف ایرانی بلکہ افغانی اور بھارتی شہری بھی شامل تھے، جو ایران میں موساد کیلئے کام کر رہے تھے۔ تحقیقات کے بعد کئی افغانیوں کو سزائے موت سنائی گئی جبکہ دیگر افراد کے خلاف کارروائی جاری ہے۔ یہ عدالتی کارروائی ایران کے اس موقف کو تقویت دیتی ہے کہ اس کی سرزمین پر غیر ملکی خفیہ نیٹ ورکس فعال رہے ہیں۔ اس سے قبل قطر میں بھی بھارتی بحریہ کے افسران اسرائیل کے لیے جاسوسی کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ قطری عدالت نے ان افراد کو سزائے موت سنائی، تاہم بعد میں زبیدر مودی کی ذاتی منت سماجت اور سفارتی مداخلت کے بعد یہ سزا معاف کر دی گئی۔ یہ واقعہ بین الاقوامی سطح پر بھارت کی سہاکہ پر سوالیہ نشان بن گیا اور یہ ثابت ہوا کہ یہود و ہندو کے مشترکہ ایجنڈے کے تحت مودی باقاعدہ طور پر اسرائیل کے خفیہ مقاصد کیلئے مکمل معاونت فراہم کر رہا ہے۔ یہ تمام واقعات نہ صرف ایران اور اسرائیل کے تعلقات کو مزید کشیدہ کر رہے ہیں، بلکہ خطے میں افغانستان اور بھارت کے تعلقات پر بھی سوالات اٹھا رہے ہیں، کیونکہ ان ممالک کے شہری موساد کیلئے کام کرتے ہوئے پائے گئے۔

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ بھارت، بالخصوص مودی حکومت، اسرائیل کے قربانی اتحادی کے طور پر خطے میں ایک فعال کردار ادا کر رہی ہے۔ خفیہ تعاون، معلومات کی ترسیل اور دشمن ممالک میں جاسوسی جیسے اقدامات اسرائیلی ایجنڈے کا حصہ بن چکے ہیں جن میں بھارتی ریاستی ادارے براہ راست شامل ہو چکے ہیں۔

اسرائیل، موساد اور بھارت کی یہ مشترکہ سرگرمیاں نہ صرف ایران کی خود مختاری بلکہ خطے کی مجموعی سلامتی کیلئے ایک بڑا خطرہ بنتی جا رہی ہیں بلکہ یہ عمل خطے میں پرکسی وار، عدم استحکام اور بین الاقوامی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ایران میں اسرائیلی نیٹ ورک، موساد کی کارروائیاں اور بھارت کا کردار اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہود و ہندو مشترکہ طور پر مسلم دشمنی میں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے ہیں اور پاکستان کا بیانیہ سچ ثابت ہو گیا ہے کہ دنیا کے امن کو سب سے بڑا خطرہ یہود و ہندو کا الائنس ہے۔

موجودہ منظر نامے میں اسرائیل نے امریکا کی مکمل حمایت سے ایران کے ایٹمی مراکز کو نشانہ بنایا لیکن ایران نے جوابی حملے کے ذریعے پہلی بار اسرائیل کے اندر حقیقی نقصان پہنچایا۔ ایران کے میزائل اسرائیلی حدود میں داخل ہوئے، مضبوط آئرن ڈوم سسٹم نے اکثر حملوں کو روکا مگر کئی میزائل اتنے طاقتور تھے کہ فوری اثرات کے باعث کئی اسرائیلی مضبوط چوکیاں متاثر ہوئیں۔ بعض میزائل تل ابیب کے فوجی ہیڈ کوارٹرز کے نزدیک گرے، جس سے انفراسٹرکچر کو شدید نقصان پہنچا۔ ایران نے مجموعی طور پر 550 سے زائد سیلینک میزائل، ڈرون اور کروزمیزائل داغے جن میں سے متعدد تل ابیب، حیفہ، بیئر شمع، اور عسقلان کو نشانہ بنانے میں کامیاب رہے۔ اسرائیل کا دفاعی نظام آئرن ڈوم بعض مقامات پر موثر ثابت ہوا مگر کئی میزائل اس

سے بچ نکلے اور انہی میزائل نے تل ابیب کے شمالی سیکٹر میں فوجی ہدف پر براہ راست حملے نے جہاں شدید نقصان پہنچایا وہاں حیفہ کی ایک گیس پائپ لائن میں شدید آتشزدگی نے اسرائیل کو خاصہ نقصان پہنچایا۔

یہ واقعہ نہ صرف اسرائیل کے دفاعی غرور کی شکست تھی بلکہ ایران کی جوابی طاقت کا واضح اعلان بھی۔ لیکن وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ اسرائیل کا بڑھتا ہوا نقصان اور اس کی بے بسی کو ختم کرنے کیلئے امریکا بھی اس جنگ میں کود پڑا۔ 21 جون کو امریکی بی-2 بمبار طیاروں اور ٹام ہاک میزائلوں سے ایران کے تین بنیادی ایٹمی مراکز پر حملہ کر دیا۔

حالیہ برسوں میں پہلی مرتبہ ایران کے ایٹمی تنصیبات پر امریکی حملوں کے بعد ایران نے مشرق وسطیٰ میں امریکی اڈوں کو نشانہ بنایا۔ ایران کی طرف سے نہ صرف مزاحمت بلکہ مشرق وسطیٰ میں امریکی اڈوں پر حملے گویا ایک نیا مرحلہ تھا۔ جب ایران کی جوابی کارروائیوں نے امریکی اڈوں کو ہدف بنایا اور خطے میں جنگ کے بادل گہرے ہونے لگے، تو براہ راست تصادم کی صورت میں جیسے ہی امریکا کو اپنے مفادات کے چکناچور ہونے کا خدشہ ہوا، فوراً سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا۔ یقیناً اس سیز فائر میں خطے کے ممالک کی کوششیں بھی شامل ہیں۔ 24 جون 2025 کو ٹرمپ کی ثالثی میں، ایران اور اسرائیل نے 12 روزہ تباہ کن جھڑپوں کے بعد جنگ بندی منظور کی۔ دونوں ممالک نے عہد کیا کہ پہلے ایران میزائل حملے روکیں گے اور 12 گھنٹوں کے بعد اسرائیل بھی کارروائیاں بند کرے گا۔

سیز فائر کا اعلان دراصل ایک سیاسی تدبیر تھی تاکہ خطے میں امریکی مفادات مزید خطرے میں نہ پڑیں۔ یہ سیز فائر اس حقیقت کا بھی مظہر ہے کہ طاقت کا استعمال ہمیشہ حل نہیں ہوتا۔ جیسے ہی امریکا کو اپنے مفادات کے چکناچور ہونے کا خدشہ ہوا، فوراً سیز فائر کا اعلان کر دیا گیا۔ جیسے کوئی آگ لگانے کے بعد پانی کے بہانے سے خود کو معصوم ثابت کرنا چاہے۔

حالیہ رپورٹس کے مطابق، امریکا نے ایران کے ایٹمی مراکز پر حملے کیلئے اپنے اسٹریٹجک بی ٹو سیٹلٹھ بمبار کو مشن پر بھیجا تو مبینہ طور پر یہ طیارے بھارت کے راستے یا بھارتی فضائی حدود و سہولیات استعمال کر کے ایران تک پہنچے۔ اس خبر پر تاحال بھارت کی طرف سے کوئی باضابطہ تردید سامنے نہیں آئی، جو سفارتی اصطلاح میں اکثر "خاموش تائید" سمجھی جاتی ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، تو بھارت نے امریکا اور اسرائیل کے ساتھ مل کر ایران کے خلاف ایک عملی جنگی کارروائی میں سہولت فراہم کی ہے۔

اگر بھارت واقعی امریکی حملے میں شریک رہا یا سہولت کار بنا، تو یہ بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزی ہے۔ ساتھ ہی، اس بھارتی کردار کے علاقائی سلامتی پر خطرناک اثرات مرتب ہوئے ہیں، یہ جنوبی ایشیاء اور مشرق وسطیٰ میں ایک نئے سرد جنگی ماحول اور اعتماد کے ٹوٹنے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اسرائیل، امریکا اور بھارت کے مابین یہ خفیہ تعلقات اور کارروائیاں صرف سیکورٹی یا عسکری مسئلہ نہیں، بلکہ عالمی سفارت کاری، مسلم دنیا کے اتحاد، اور خطے کے توازن کیلئے ایک شدید خطرہ بن چکے ہیں۔

یاد رکھیں جب نظریہ مضبوط ہو، جب قوم فکری بلوغت رکھتی ہو، تو اس کا سامنا صرف بموں سے نہیں، فہم و فراست سے بھی نہیں کیا جاسکتا۔ سیز فائر کے بعد اب اسرائیل کے جانی و مالی نقصانات کی تفصیلات بھی سامنے آرہی ہیں۔ تقریباً 172 مقامات پر ایرانی میزائلوں نے نقصان پہنچایا جس میں 28 سے زائد ہلاکتیں ہوئیں اور ہزاروں افراد کے زخمی ہونے کی بھی اطلاع ہے۔ نصف درجن سے زائد عمارات شدید متاثر ہوئیں، اسپتال زخموں سے

اور متعدد مسافر و شہری محفوظ ٹھکانوں میں منتقل ہوئے۔ ایرانی میزائل نے 19 جون کو بیڑ شہ کے ہسپتال اور "سورو کا میڈیکل سینٹر" کو نشانہ بھر گئے، بنایا، جس میں 50 سے زائد زخمی ہوئے ہیں۔ اسپتال کے ایک حصے میں کیمیائی مواد کا اخراج بھی ہوا مگر مریضوں کی بروقت منتقلی نے بڑے انسانی جانی نقصان کو روکا۔

ایران اسرائیل جنگ کے دوران ایک مرتبہ پھر عالمی رد عمل میں واضح دوغلے پیلانے اور ڈھٹائی کو ایک مرتبہ پھر دیکھا گیا۔ امریکا نے اسرائیل کی پشت پناہی جاری رکھی، اپنے بحری بیڑے مشرق وسطیٰ روانہ کیے اور ایران پر مزید پابندیوں کی دھمکی دی۔ یورپ نے امن کی اپیل کی مگر اسرائیل کے ایران کے ایٹمی پلانٹ پر حملے پر خاموشی اختیار کی لیکن اس کے برعکس چین و روس نے ایران کی مزاحمت کو جائز قرار دیا اور اسرائیل پر تنقید کی جبکہ اقوام متحدہ نے صرف "تخل" اور "مذاکرات" کی اپیل پر اکتفا کیا، کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور ہمیشہ کی طرح امریکا اور مغرب کی لونڈی کے کردار کو برقرار رکھا۔

دوسری طرف امریکی و یورپی میڈیا اسرائیل کے مظالم کو یا تو چھپاتا ہے یا ان کا جواز گھڑتا ہے۔ اسرائیل کا ظلم، فلسطینیوں کی شہادت، اور انسانی حقوق کی پامالی، عالمی میڈیا میں محض عدد بن کر رہ جاتے ہیں۔ ایران کا موقف، مزاحمت کی آواز، عالمی میڈیا میں دبائی جاتی ہے یا مسخ کر کے پیش کی جاتی ہے۔

انقلاب صرف جغرافیہ نہیں، نظریہ بھی ہوتا ہے۔ آج ایران تنہا نہیں، بلکہ وہ ایک بیانیہ ہے؛ ایک انکار ہے؛ ایک مزاحمت ہے۔ اگرچہ وہ معاشی و عسکری لحاظ سے امریکا یا اسرائیل کا ہم پلہ نہیں، لیکن عزمِ صمیم، فکری خودداری اور دینی بالادستی کا علم بلند کیے ہوئے ہے۔ جس انقلاب نے ایک سفارت خانے سے امریکا کو نکالا، وہ آج بھی عالمی طاقتوں کو اپنی زبان پر قابو رکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ طاقت کا پلڑا ہمیشہ اس کے پاس نہیں رہتا جو تلوار رکھتا ہے، بلکہ اس کے پاس ہوتا ہے جو نظریہ رکھتا ہے۔ یہ جنگ بارود اور میزائلوں کی نہیں، افکار، تہذیب اور نظریات کی جنگ ہے۔ ایک طرف سامراجی سرمایہ دارانہ نظام ہے جو طاقت کو حق کی بنیاد سمجھتا ہے، دوسری طرف مزاحمت کی وہ شعوری طاقت جو امام خمینیؑ، مودودیؒ، اور حسن نصر اللہ جیسے مفکرین کی رہنمائی میں آزادی کا نعرہ بن چکی ہے۔

ایران و امریکا و اسرائیل کی یہ کشمکش صرف تیل، اسلحے یا ایٹمی پلانٹس کی جنگ نہیں — یہ فکر و تہذیب کی جنگ ہے۔ یہ جنگ استقلال اور استعمار کے درمیان ہے۔ ایران و اسرائیل و امریکا کی یہ کشمکش محض فوجی یا معاشی نہیں، بلکہ تہذیبی اور فکری جنگ ہے۔ ایک طرف مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ سوچ ہے، اور دوسری طرف ایران کا انقلابی، اسلامی، اور مزاحمتی بیانیہ۔ ایران آج بھی معاشی مشکلات، عالمی تنہائی، اور عسکری دباؤ کے باوجود اپنے نظریاتی موقف پر ڈٹا ہوا ہے۔

ایران اپنی معاشی، عسکری اور سیاسی تنہائی کے باوجود جس فکری صلابت اور نظریاتی عزم کا مظاہرہ کر رہا ہے، وہ محض حکمتِ عملی نہیں بلکہ ایک تہذیبی نظریہ ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو صداقت، استقامت اور آزادی کے نام پر وقت کی سپر پاورز کو لاکار رہا ہے۔ اگر حق و باطل کی کشمکش نہ ہو، تو تاریخ کا وجود بے معنی ہو جائے۔ یاد رہے کہ قومیں زندہ رہتی ہیں عقیدے سے، اسلحے سے نہیں۔ یہ دنیا ایک دارالامتحان ہے، یہاں ظاہری کامیابی اصل کامیابی نہیں — اصل کامیابی نظریہ کی بقا ہے۔

یہودی طاقت: حقیقت یا فریبِ نظر؟

یہ سوچ بہت عام ہے کہ یہودی یا اسرائیلی اس قدر چالاک اور ذہین قوم ہے کہ امریکا جو اس وقت دنیا کی واحد سپر پاور ہے بظاہر اسرائیل کی مرضی کے کچھ بھی نہیں کرتا یا کر سکتا۔ پوری دنیا کی معیشت پر یہودیوں کا قبضہ ہے۔ میڈیا پر کوئی موضوع یا خبر ان کی مرضی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ امریکا میں کوئی شخص کانگریس کا ممبر یا امریکا کا صدر یہودی لابی کے پیسے اور سیاسی مدد کے بغیر نہیں بن سکتا، یہ تاثرات اس وقت اور مضبوط ہو جاتے ہیں جب امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کی حمایت میں نہ تو کسی مخالفت کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو توڑنے میں شرم محسوس کرتا ہے۔ اس کے علاوہ فری میسنز کی کہانیاں، اسرائیل کی خفیہ ایجنسیوں، فوج اور کمانڈوز کی طاقت کے قصے ایسا تاثر پیدا کر دیتے ہیں کہ یہ یقین ہونے لگتا ہے جیسے دنیا کی اصل طاقت تو ایک چھوٹی سی قوم یہود ہے جس نے امریکا یورپ اور دنیا کی تمام بڑی قوموں کو قابو کر رکھا ہے۔ دنیا میں جو بھی فساد ہوتا ہے اس کے پیچھے یہود کا ہاتھ ہوتا ہے اور مسلمانوں پر ہونے والے تمام مظالم کے ذمہ دار یہودی ہیں۔ اس تاثر کے نتیجے میں مسلمانوں میں یہ خیال جڑ پکڑ لیتا ہے کہ اصل برائی امریکا یا اس کا استعماری نظام سرمایہ داریت نہیں بلکہ اسرائیل یا یہودی ہیں۔ اگر ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا جائے تو مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ دوبارہ بحال کر لیں گے۔

مسلمان پر اللہ نے یہ لازم کیا ہے کہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان پر غالب کریں، **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَالْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ طَوْفًا بِاللَّهِ شَهِيدًا (الفتح: 28)** "وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے"۔ اس عمل کی انجام دہی کیلئے ضروری ہے کہ ہم دنیا کی سیاست کو سمجھیں، طاقت کے مراکز اور مسائل کی جڑ کی صحیح نشاندہی کریں۔ اگر ہم نے اپنے دشمن کا صحیح تعین نہ کیا تو ہماری توانائی غلط ہدف پر ضائع ہو جائے گی اور حقیقی دشمن مزید طاقتور ہو جائے گا۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ سپر پاور اس ملک کو کہا جاتا ہے جس کی مرضی کے مطابق دنیا کے تمام یا بیشتر معاملات چلتے ہوں۔ اس وقت امریکا کو دنیا کی واحد سپر پاور اس لیے کہا جاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی معاملے میں اس کی مرضی کو چیلنج کرنے والی کوئی دوسری طاقت موجود نہیں ہے۔ امریکا کی معیشت دنیا کی معیشت کا 17 فیصد ہے۔ امریکا کا دفاعی بجٹ روس چین، برطانیہ اور فرانس کے کل دفاعی بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اسرائیل جو کہ سپر پاور نہیں اپنا تحفظ امریکی فوجی اور سیاسی مدد کے بغیر کر نہیں سکتا، جس کی معیشت ہر سال امریکی امداد کی محتاج ہو وہ کس طرح امریکا کو اپنے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ یا پھر یہ کہ اسرائیل کی طاقت کے تمام قصے بے بنیاد ہیں۔

عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ امریکا کی مشرق وسطیٰ سے متعلق پالیسی اسرائیل کی مرضی کے تابع ہوتی ہے۔ امریکا مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کو مضبوط کرنے یا اپنے مفادات حاصل کرنے کیلئے فوجی بغاوتوں اور آمر حکمرانوں کی حمایت کرتا ہے اور کبھی جمہوری قوتوں کی، کسی ملک کے خلاف پابندیاں لگاتا ہے تو کسی ملک کو امداد دیتا ہے، کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین نافذ کروانے کیلئے سیاسی اور فوجی اثر و سوخ استعمال کرتا ہے تو کبھی اقوام متحدہ اور بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے، اب امریکا کے ان اعمال کا یہ جواز پیش کرنا کہ ایسا وہ صرف اور صرف اسرائیل کے دباؤ کی وجہ سے کرتا ہے، غلط ہو گا۔ ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ امریکا افریقی ممالک لاطینی امریکا اور مشرق بعید میں بھی اپنے مفادات کے حصول کیلئے ایسے ہی تمام اقدامات اٹھاتا ہے جیسا کہ وہ مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں کرتا ہے۔ اگر امریکا مشرق وسطیٰ کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی

اقدامات کرتا ہے جہاں کوئی اسرائیلی مفاد نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکا اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنی من مانی مرضی سے پالیسیاں بناتا ہے چاہے جن سے دوسرے اتفاق نہ کرتے ہوں۔

اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکا کئی بین الاقوامی امور میں جن کا اسرائیل کی سلامتی یا مفادات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، پوری دنیا کی رائے کی مخالفت کرتا ہے چاہے اس وجہ سے اس کو پوری دنیا میں شدید تنقید کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔ پوری دنیا نے زیر زمین بارودی سرنگوں کے خاتمے بین الاقوامی عدالت برائے جنگی جرائم کے قیام اور دنیا میں بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کو روکنے کیلئے ان پر دستخط کیے لیکن امریکا نے ان معاہدوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس تجربے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ امریکا مشرق وسطیٰ میں بھی ایسے اقدامات اس لیے کرتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر یہ اس کے مفاد میں ہوتے ہیں نہ کہ اس وجہ سے کہ اس پر اسرائیل کا کوئی دباؤ ہوتا ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ امریکا میں موجود تمام یہودی اسرائیل کی حمایت میں ایک ہو کر امریکا پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ یہ تصور معلومات کی کمی کا نتیجہ ہے جہاں امریکا میں یہودیوں کی ایک بڑی تنظیم ”امریکا اسرائیل پبلک افیئرز کمیٹی“ اور اس سے منسلک درجنوں ایسی یہودی تنظیمیں ہیں، ان میں ایسی معروف تنظیمیں (امریکنز فار پیس ناؤ، اسرائیل پالیسی فورم، برٹ زڈک وی، شیڈو) ہیں جو امریکی کانگریس پر اسرائیل کے حق میں پالیسیاں بنانے کیلئے دباؤ ڈالتی ہیں جو بظاہر اسرائیل کے وجود کے خلاف تو نہیں ہیں لیکن اسرائیل کی یہودی آبادکاروں کے حوالے سے پالیسی، نئے علاقوں پر قبضہ کرنے، دیوار کھڑی کرنے اور امریکا کی اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی شدید مخالفت بھی کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کانگریس کے اراکین کی بہت بڑی اکثریت کو اپنے حلقوں سے جیتنے کیلئے نہ تو یہودی ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پیسوں کی۔

ایسے تمام اراکین کانگریس جو کہ اسرائیلی پالیسیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں ان کا تعلق ان علاقوں سے ہوتا ہے جو ان کے محفوظ ترین حلقے ہوتے ہیں اور وہ وہاں سے کئی دہائیوں سے جیتتے آ رہے ہوتے ہیں مثلاً امریکی اسپیکر کانگریس نینسی پلوسی جو کہ اسرائیل کی کھل کر حمایت کرتی تھی، ہر دفعہ 80 فیصد سے زائد ووٹ لے کر منتخب ہو جاتی تھیں۔ یہ کہنا کہ یہودی لابی بہت مالدار ہے اور پیسے استعمال کر کے امریکی اراکین کانگریس پر دباؤ ڈالتے ہیں، بالکل غلط مفروضہ ہے پیسوں کے لحاظ سے سب سے طاقتور لابی امریکا میں دفاعی یا اسلحہ بنانے والے اداروں، تیل کی کمپنیوں اور ادویات بنانے والے اداروں کی ہے صرف ”اے آئی پی اے سی“ اور ”لاک ہیڈ مارٹن“ اپنے اداروں کی لابیگ پر ”نار تھ گرومین اور ”جنرل الیکٹرک بوننگ“ کے مقابلے میں بالترتیب سات اور پانچ گنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی طرح کی لابیگ کا خرچہ اور دوسرے ایسے کئی اداروں سے بہت کم ہے جو دفاعی صنعت سے منسلک ہیں۔

امریکا میں یہودیوں کی آبادی 5 فیصد سے بھی کم ہے اس میں سے بھی جب ایک معقول تعداد اسرائیل کی ہر حال میں حمایت کی مخالفت کرتی ہو۔ یہودی ووٹ امریکا کے 99 فیصد سے زیادہ حلقوں میں کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں، دولت کی بنیاد پر یہودیوں سے زیادہ مضبوط لابیہز موجود ہوں تو ہم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ دو یا تین فیصد یہودی امریکا انتظامیہ پر کتنا زور ڈال سکتے ہیں؟ ان تمام حقائق کے باوجود اگر ہم اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ امریکا اسرائیل کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتا تو میں یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں تاکہ یہ بھی خیال ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے۔

کسی بھی امریکی صدر نے جب یہ دیکھا کہ اسرائیل لابی کی طرف سے جس پالیسی کو اپنانے کیلئے دباؤ ڈالا جا رہا ہے وہ امریکی مفاد میں نہیں تو امریکی صدر نے ہمیشہ اسرائیل کو مجبور کر دیا کہ وہ امریکی پالیسی کو اختیار کرے۔ 1956ء میں جب اسرائیل برطانیہ اور فرانس نے نہر سوئز پر قبضہ کرنے کیلئے جنگ

کا آغاز کیا تو اس وقت کے امریکی صدر آئزن ہاور نے اس جنگ پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور اسرائیل کو دھمکی دی کہ اگر اس نے مصری علاقوں سے قبضہ ختم نہ کیا تو امریکا میں اسرائیلی بونڈز اور نجی طور پر اسرائیل بھجوائی جانے والی، رقوم پر ٹیکس کی چھوٹ ختم کر دی جائے گی۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے اسرائیل کو یہ دھمکی اس وقت دی تھی جب صرف چند ہفتوں بعد امریکا میں صدارتی انتخابات ہونے جارہے تھے۔ امریکی صدر آئزن ہاور کی اس دھمکی کے نتیجے میں اسرائیل نے چند مہینوں میں تمام مصری علاقے خالی کر دیئے۔

اسی طرح جب 1978ء میں جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا اور دریائے لیتانی تک آگیا تو امریکی صدر جی کارٹر نے اسرائیل کو امداد بند کرنے کی دھمکی دیکر مجبور کر دیا کہ وہ لبنان کی سرحد میں چند کلو میٹر تک محدود رہے۔ اس کے بعد اگلے امریکی صدر رونالڈ ریگن نے 1981ء میں ”اے آئی پی اے سی“ کے بھرپور دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے فوکس طیارے سعودی عرب کو بیچے۔ اس کے 10 سال بعد بش سنئیر نے ”اے آئی پی اے سی“ کے بھرپور دباؤ کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور اسرائیل کی ناک رگڑتے ہوئے 10 ارب کا قرضہ جاری نہیں کیا جب تک مشرق وسطیٰ میں امریکی امن منصوبے کی راہ میں رکاوٹ ”یژٹاک شمیر“ کو شکست نہیں ہوگئی کیونکہ یہ امریکی منصوبے میں رکاوٹ تھا۔



2004ء میں بش جونیئر نے اسرائیل کو نہ صرف چین سے اس معاہدے کو توڑنے پر مجبور کر دیا جس کے تحت اسرائیل نے طیاروں کو جدید بنایا تھا بلکہ اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائریکٹر جنرل ”آموس یارون“ کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اسی طرح اسرائیل پچھلے کئی سالوں سے امریکا کو ایران پر حملے کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ امریکا اس کی اس خواہش کو پورا نہیں کر رہا بلکہ امریکا نے اسرائیل کو بھی سختی سے ایران پر کسی بھی قسم کے حملے سے روک دیا ہے۔

ان تمام حقائق کے باوجود آخر امریکا کیوں اسرائیل کی اس قدر حمایت کرتا ہے۔ سب سے پہلے تو اس بات کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ امریکا ایک نظریاتی ریاست اور دنیا کی واحد سپر پاور ہے۔ امریکا جو بھی فیصلے کرتا ہے اپنی ضرورت اور مفادات کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ کا علاقہ کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام تجارتی بحری قافلے اس کے بحری علاقوں سے گزرتے ہیں، دنیا کے 66 فیصد سے زائد تیل و گیس کے ذخائر اس علاقے میں موجود ہیں اور ان تمام باتوں سے بڑھ کر یہ علاقے مسلم اکثریتی آبادی رکھتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی اہمیت کو واضح کرنے کیلئے سابق برطانوی وزیر اعظم ہنری کیمل ہل (بیرمین) کا ایک ہی تبصرہ کافی ہے:

”یہاں پر وہ لوگ (مسلمان) رہتے ہیں جو اس زبردست علاقے اور اس زمین میں موجود ذخائر کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ان کی زمین انسانی تہذیب اور مذاہب کا گہوارہ ہے، ان لوگوں کا عقیدہ زبان، تاریخ اور جذبات ایک سے ہیں۔ کوئی قدرتی رکاوٹ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی اور اگر کبھی جدا ہو بھی جائیں تو یہ دوبارہ ایک مملکت میں ضم ہو جائیں گے۔ پھر یہ دنیا کی قسمت کو اپنے ہاتھ میں لے لیں گے اور یورپ کو باقی دنیا سے کاٹ دیں گے۔ ان وجوہات کو سنجیدگی سے لیا جائے تو ضروری ہے کہ ایک بیرونی اکائی کو اس قوم کے دل میں پیوست کر دیا جائے تاکہ اس قوم کی صلاحیتوں

کو کبھی نہ ختم ہونے والی جنگوں میں ضائع کر دیا جائے۔ یہ بیرونی اکائی مغرب کیلئے ایک ایسے پلیٹ فارم کا کام بھی کرے گی جہاں سے وہ اپنے خفیہ منصوبوں کو انجام دے سکے گا۔

یہ ہیں وہ بنیادی وجوہات جن کی بنا پر پہلی جنگ عظیم کے بعد اس وقت کی سپر پاور برطانیہ نے مشرق وسطیٰ کے علاقے میں یہودی مملکت کی کوششوں کا آغاز کیا اور پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکا سپر پاور بن گیا تو اس کے مفاد کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اسرائیل کی ریاست قائم کی جائے اور اس کو مضبوط بنایا جائے۔ اسرائیلی ریاست کے ذریعے اس علاقے کو مسلسل جنگوں میں مبتلا رکھا جاتا ہے جس سے ایک طرف امریکی اسلحے کی فیکٹریاں چلتی رہتی ہیں تو دوسری طرف ان ممالک کی کمزوری کے سبب امریکا ان ممالک میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھاتا اور برقرار رکھتا ہے۔

دنیا کی واحد سپر پاور امریکا ہے جو سرمایہ داریت کے نظریے کا علم بردار ہے۔ مسلمانوں اور اسلام کا حقیقی دشمن یہودی اسرائیلی ریاست نہیں بلکہ امریکا اور سرمایہ داریت کا نظام ہے، اسرائیل تو محض امریکی مفادات کو پورا کرنے والا ایک کھلاڑی ہے۔ اس کھلاڑی کی یہ جرات اور طاقت نہیں ہو سکتی کہ وہ وقت کی واحد طاقت کو اپنے مفادات کے مطابق چلا سکے۔ اسرائیل کی اس حقیقت کو ایک اسرائیل استاد اور امن کیلئے کام کرنے والے کارکن نے اس طرح سے بیان کیا ہے: اسرائیل اپنے قبضوں کو اس لیے برقرار رکھتا ہے کیونکہ وہ مغرب خصوصاً امریکا کے استعماری مفادات کو پورا کرنے کیلئے تیار رہتا ہے اور حقیقت میں اب اسرائیل امریکا کا ایک آزمودہ سپاہی بن چکا ہے۔ سابق امریکی وزیر خارجہ الیگزینڈر ہیگ نے اسرائیل کے متعلق بڑا اہم بیان دیا تھا: اسرائیل امریکا کا واحد سب سے بڑا بحری و ہوائی بیڑہ ہے جو ڈوب نہیں سکتا۔

تاریخی اعتبار سے یہود اپنی سازشوں، مال و اسباب اور سیاسی اثر و رسوخ کے باوجود کبھی بھی اپنے سیاسی اہداف بغیر کسی بیرونی طاقت کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کر سکے۔ پچھلے چودہ سو سال میں یہود عباسی خلافت، عثمانی خلافت، اسپین کی اموی حکومت، یورپ اور امریکا میں معاشی لحاظ سے ہمیشہ خوش حال رہے ہیں لیکن کبھی بھی کسی علاقے میں یہود کوئی قابل ذکر سیاسی مقام نہیں بنا سکے۔ ریاست مدینہ میں بنو قریظہ، بنو ناصر، بنو قینقہ اور خیبر کے یہود اپنی معاشی سیاسی اور فوجی قوت کے باوجود کبھی بھی مدینہ کی ریاست کو براہ راست چیلنج نہیں کر سکے بلکہ ہمیشہ قریش کے کی مدد کا انتظار کرتے تھے اور آخر میں اپنی سازشوں اور وعدہ خلافیوں کی بناء پر ان کو بے دخل ہونا پڑا۔

یہود یورپ میں ہمیشہ دوسرے درجہ کے شہری رہے اور جب کسی حکمران نے ان پر ظلم و ستم کرنا چاہا تو ان کی معاشی طاقت کبھی کام نہ آئی۔ جب عثمانی خلافت اپنے کمزور ترین دور سے گزر رہی تھی تو یہودیوں نے خلیفہ عبدالحمید دوم کو اس بات کی پیش کش کی کہ اگر انہیں فلسطین کی زمین دے دی جائے تو خلافت عثمانیہ کے تمام قرض وہ ادا کر دیں گے لیکن اپنی معاشی قوت اور خلافت کی کمزوری کے باوجود یہود اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

وہ قوم جو پچھلے ڈھائی ہزار سال سے اپنی تمام تر سازشی ذہنیت اور مال و اسباب کے باوجود در بدر تھی، بالآخر برطانوی وزیر اعظم ہنری کیمپبل کی وفات کے چالیس سال بعد اس کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے برطانیہ عربوں کے سینے میں خنجر گھونپ کر فلسطین میں اسرائیل مملکت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ خطے میں اسرائیل کا قیام اس وجہ سے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے منقسم رکھنے اور خطے میں اپنے مفادات کے مستقل حصول کیلئے یہ ضروری ہے کہ یہود کو ایک ریاست کی شکل میں طاقت دی جائے۔ اللہ سورہ آل عمران میں یہود کیلئے فرماتے ہیں۔

لَنْ يَضُرُّوَكُمْ إِلَّا أَدَىٰ ط وَ إِنْ يُقَاتِلُوكُمْ يُؤْلُوكُمْ إِلَّا دَبَارَ ط ثُمَّ لَا يَنْصَرُونَ، ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا تَفَقَّوْا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَ حَبْلٌ مِّنَ النَّاسِ وَ بَاءَوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ط ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَ يَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ط ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَ كَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿111-112﴾

"یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ ﴿111-112﴾

اللہ نے قوم یہود پر ہمیشہ کی ذلت مسلط کر دی ہے۔ یہود سیاسی، معاشی اور فوجی لحاظ سے کبھی بھی مسلمانوں کے ہم پلہ نہیں رہے، آج اگر یہود مسلمانوں پر غالب ہیں تو صرف اپنے استعماری آقا امریکا کی قوت کی وجہ سے۔ ہم مسلمانوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ امریکا دانستہ اس نظریے کو فروغ دیتا ہے کہ یہودی لابی اس قدر طاقتور ہے کہ امریکا جیسی طاقت بھی اس کے آگے مجبور ہو جاتی ہے، اس بات کو فروغ دینے سے امریکا دو فائدے حاصل کرتا ہے۔

- 1- وہ مسلمانوں کی امریکا سے نفرت کا رخ یہود کی طرف موڑ دیتا ہے۔
- 2- مسلمان اسرائیل کو اپنا اصل دشمن سمجھ کر صرف اسرائیلی قوت کو ختم کرنے کی کوششوں میں لگ جاتے ہیں، اس طرح نہ تو امریکا ختم ہوتا ہے اور نہ ہی اسرائیل، امریکا غدار مسلم حکمرانوں کے ذریعے اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ اسرائیل کے مقابلے میں مسلمانوں کی فوجی قوت منتشر رہے اور پھر یہ مسلم افواج آپس میں بھی قومیت اور وطنیت کی کفریہ بنیادوں پر لڑتی رہیں، مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ جب تک وہ اپنی گردنوں پر مسلط غدار امریکی ایجنٹ حکمرانوں سے نجات حاصل نہیں کرتے امریکا اور اس کے سرمایہ داری نظام سے چھٹکارا نہیں پاسکتے۔

یہاں یہ بتانا بھی بہت ضروری ہے کہ یہاں امریکا اور اسرائیل حکومتوں کی طرف اشارہ ہے۔ جس طرح اسلامی حکومتیں مسلم عوام کی خواہشات کی علمبردار نہیں بلکہ اسی طرح مغرب اور امریکا کی حکومتیں بھی یہاں کے عوام کی مکمل خواہشات کی آئینہ دار نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ جب امریکا، برطانیہ اور ان کے دیگر اتحادیوں نے عراق پر حملہ کرنے کا اعلان کیا تو یورپ کی تاریخ کا سب سے بڑا "ملین افراد" کا مظاہرہ برطانیہ میں ہوا جہاں ہر مکتبہ فکر کے افراد نے اس حملے کی بھرپور مخالفت کی اور آج بھی آئے دن برطانیہ، یورپ اور امریکا میں ہزاروں افراد سڑکوں پر بے گناہ فلسطینیوں کے قتل عام روکنے کیلئے سراپا احتجاج ہیں لیکن یہاں بھی سب سے بڑی رکاوٹ اس سرمایہ داری نظام کی پیدا کردہ جمہوری نظام ہے جس کیلئے ضروری ہے کہ دنیا میں جاری اس ظلم و ستم کے خلاف جو ادراک پیدا ہو رہا ہے، اس کو فوری طور پر بہتر اور جاری جمہوری انداز میں حاصل کرنے کیلئے یہاں کی تمام سیاسی جماعتوں میں عملاً شمولیت اختیار کی جائے اور سیاسی سفر میں قانون ساز اداروں میں پہنچ کر حق و صداقت کیلئے قانون سازی میں اپنا کردار ادا کیا جائے۔

یقیناً ایک دن ضرور آئے گا کہ جب مظلوم کو انصاف ملے گا اور یہی افراد جو آج سڑک پر دنیا میں ہونے والے اسرائیلی، امریکی جارحیت کے خلاف اپنا احتجاج ریکارڈ کروا رہے ہیں، وہ آئندہ انتخابات میں اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر امیدوار سے یہ وعدہ ضرور لیں گے کہ وہ پارلیمنٹ میں جا کر ایسی قانون سازی کریں جن کی بنیاد پر ہر ظالم کو لگام ڈالی جاسکے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کی وہ پیش گوئی بھی پوری ہوگی جس کے تحت مسلمان بیت المقدس پر قابض یہودیوں کو چن چن کر جہنم رسید کریں گے اور وہ ان یہودیوں کے ظلم و ستم کا آخری دن ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قال رسول الله ﷺ لا تقوم الساعة حتى يقاتل المسلمون اليهود فيقتلهم المسلمون حتى يختبئ اليهودي من وراء الحجر والشجر فيقول الحجر والشجر يا مسلم يا عبد الله هذا يهودي خلفي فتعال فاقتله إلا الغرقد فإنه من شجر اليهود (مشکوٰۃ المصابيح حدیث: 5318)

مسلمان یہودیوں سے لڑیں گے اور پھر ان کو قتل کریں گے یہاں تک کہ ایک یہودی کسی پتھر یا درخت کے پیچھے پناہ لے گا تو وہ پتھر یا درخت پکارے گا، اے مسلم اے اللہ کے بندے یہ یہودی میرے پیچھے ہے، آؤ اور اسے قتل کرو۔

کچھ بھی تو نہیں رہے گا، کچھ بھی تو نہیں، بس نام رہے گا اللہ کا!

بروز منگل 19 محرم الحرام 1447ھ 15 جولائی 2025ء

صلح یا صلہ؟

جب مشرق کی پیشانی پر اذان کی صدا اولین بار ابھری تھی، تو اُس نغمے میں وحدت کی بازگشت تھی۔ وہ صدا، جو بیت المقدس سے لے کر خانہ کعبہ تک فضاؤں میں گونجتی رہی، اہل زمین کو ایک ایسے معبودِ برحق کی طرف بلاتی رہی جس کے حضور نہ کوئی فرعون سر اٹھا سکتا تھا، نہ کوئی نمرود، مگر آج، اسی صدا کے وارثوں کے درمیان ایسی دستاویز گردش میں ہے جسے "ابراہیمی معاہدہ" کہا جاتا ہے۔ اور جس کی روح سے زیادہ اس کا سایہ سنگین ہے۔

یہ معاہدہ فقط سیاہی سے لکھی ہوئی چند سطریں نہیں، یہ تاریخ کے دامن پر ایک ایسا تازہ دھبہ ہے جو ماضی کے زخموں کو پھر سے ہرا کر دیتا ہے۔ صلح کے پردے میں تحقیر، امن کے خول میں نفاق، اور بھائی چارے کی زبان میں تابعداری کا وہ زہر چھپا ہے جو قوموں کی غیرت کو سرنگوں کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے۔ فلسطین کی مٹی اب بھی اپنے شہید بیٹوں کی خوشبو سنبھالے کھڑی ہے، اور قدس اب بھی قید ہے، مگر اسیر ہونے سے انکار پر قائم۔

وہ لوگ جو ایک وقت میں قبلہ اول کی بازیابی کی دعا مانگا کرتے تھے، آج بیت المقدس کے درودیوار کے سامنے اسرائیل کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ، جو کبھی شہید کی میت پر بلند ہوتے تھے، آج اسرائیل سے تجارتی معاہدے کرتے وقت جھکے نظر آتے ہیں۔ تاریخ حیران ہے، امت خاموش، اور عالم اسلام خوابِ غفلت میں ڈوبا ہوا۔

یہ تحریر اس خاموشی میں ایک صدا ہے۔ صدائے احتجاج، صدائے بیداری، صدائے تحقیق۔ اس میں ہم فقط ابراہیمی معاہدے کی سفارتی پیچیدگیوں کو نہیں چھیڑتے، بلکہ اس کے تہہ در تہہ مفاہیم کی پرتیں کھولتے ہیں، اس کے محرکات کی گہرائییں سلجھاتے ہیں، اور اس کے پس منظر میں جاری تہذیبی یلغار کا تجزیہ کرتے ہیں۔ یہ معاہدہ کس کیلئے "صلح" ہے اور کس کیلئے "صلہ"؟ کس کیلئے ترقی کا دروازہ اور کس کیلئے غلامی کی زنجیر؟

تاریخ کا قلم ابھی تھا نہیں، وقت کے صفحات ابھی مکمل نہیں ہوئے لیکن وہ قومیں جو اپنی تاریخ خود نہیں لکھتیں، ان کیلئے فاتح ہی تاریخ لکھتے ہیں۔ اور پھر وہ تاریخ "معاہدات" کے روپ میں ان کے سروں پر تھوپ دی جاتی ہے۔ پس یہ تحقیق فقط ایک تجزیہ نہیں، یہ صدائے ضمیر ہے؛ یہ نوحہ قدس بھی ہے، اور اذانِ بیداری بھی۔ آئیں، ابراہیمی معاہدے کو اس کی اصلی روشنی میں دیکھیں۔ وہ روشنی جو آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتی، دلوں کو جھنجھوڑتی ہے۔

جب تاریخ اپنے دامن سے گرد جھاڑتی ہے، تو وہ فقط واقعات کی ترتیب نہیں، بلکہ تہذیبوں کی باہمی کشاکش اور حکمتوں کے جال کی پرتیں بھی دکھاتی ہے۔ ابراہیمی معاہدہ اسی تاریخ کا ایک ایسا باب ہے، جہاں الفاظِ سفارتی معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے پیچھے تہذیبی بالادستی، جغرافیائی سیاست اور مذہبی تانے بانے کی گہری گتھیاں پنہاں ہیں۔

2020ء میں امریکی صدارت کے سگھاسن پر براجمان ڈونلڈ ٹرمپ کے دور میں خطہ عرب کی سیاسی افق پر ایک ایسی دستاویز نے جنم لیا جسے "ابراہیمی معاہدہ" کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو یہودی نژاد ہنری کیسینجر کے ون ورلڈ آرڈر کے عین مطابق 2020ء میں واشنگٹن ڈی سی میں امریکی صدارتِ ٹرمپ کے دور میں "ابراہیمی معاہدے" کے نام سے طے پایا، جس میں متحدہ عرب امارات اور بحرین نے اسرائیل کو رسمی طور پر تسلیم کیا، اور بعد ازاں مراکش بھی اس فہرست میں شامل ہوا۔ یہ معاہدہ محض ایک رسمی اعلان نہیں، بلکہ صدیوں پر محیط عرب-اسرائیل دشمنی کے بیچ ایک ایسا خاکہ ہے جس میں اسرائیل کو تسلیم کرنے والے عرب ممالک نے اپنے سیاسی قبلہ کو یکایک مغرب کی سمت موڑ دیا۔ اس معاہدے کو "ابراہیمی" اس نسبت

سے کہا گیا کہ تینوں توحیدی ادیان — یہودیت، عیسائیت اور اسلام — کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روحانی نسبت سے جوڑا گیا، حالانکہ زمینی حقیقتیں اس "روحانیت" سے زیادہ زمام اقتدار کی گرفت میں نظر آتی ہیں۔ یہ محض قانوناً دونوں اطراف کی سفارتی قبولیت نہیں بلکہ ایک نیا عصر جغرافیائی و سیاسی نقشہ ہے جو تین ابراہیمی ادیان کی "سامی ہم آہنگی" کے فلسفے کے نام پر امریکا کی ڈپلومیسی کی چھتری تلے پیش کیا گیا۔

اگر کہیں "صلح" اور کہیں "شطرنج کی بساط" ہو تو یہ سازشیں واضح ہوتی ہیں کہ فلسطینی مسئلے کو پس پشت ڈال کر اسرائیل کو عرب دنیا کا ایک مستند عنصر بنانا مقصود ہے تاکہ اسرائیلی ریاست کو سفارتی طور پر قبولیت کا درجہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ایران مخالف محاذ کی تکمیل کیلئے خلیجی ملکوں کے ساتھ اتحاد جو امن کے نام پر ایران مخالف ایک بند گھیر تشکیل دیا جائے۔ سب سے خطرناک امر یہ کہ واشنگٹن کے سامنے عرب دنیا کا منہ جھکانا جس سے امریکی خارجہ پالیسی کا استحکام یقینی ہو جائے اور اپنے ان مذموم ارادوں کی تکمیل کیلئے عوامی رد عمل کو نظر انداز کرتے ہوئے سیاسی نرم دباؤ کے ذریعے عرب عوام کی دبی آواز کو سماجی قبولیت کیلئے یقینی بنایا جائے۔

گویا یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امریکا یہودی اثر و نفوذ کے تحت ابراہیمی معاہدہ کی سطح پر "امن" کا پرچم لہراتا ہے، لیکن اس کے نیچے طاقت کی وہی پرانی بساط بچھی ہے جس پر قومیں اپنے مفادات کی شطرنج کھیلتی ہیں۔ اس معاہدے کا مقصد مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے وجود کو تسلیم کروا کر اسے "ریاستی جواز" فراہم کرنا ہے تاکہ فلسطینی مزاحمت کو بین الاقوامی حمایت سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ایران کے خلاف ایک متحد محاذ بنانا بھی امریکی۔ اسرائیلی ایجنڈے کا مرکز ستون ہے جس کا عملی مظاہرہ حالیہ ایران اسرائیل کی جنگ میں امریکی جارحیت کی شکل میں اقوام عالم دیکھ چکی ہے۔ دراصل ابراہیمی معاہدے کے پس پردہ مقاصد تہذیبی سرنگ کے ذریعے چالاک سفارت کاری سے مقاصد کا حصول ہے۔

2008ء میں اسپین کے شہر میڈرڈ میں سعودی فرمانروا شاہ عبداللہ نے تاریخ میں پہلی بار بین المذاہب کانفرنس میں شرکت کی اور ایک ہمہ گیر خطاب کیا۔ شاہ عبداللہ کے اس یادگار خطاب کو مہذب پیرائے میں مذہبی تفاوت کو تعمیری مکالمہ کی شروعات قرار دیا گیا جس میں ان کے خطاب کا لب لباب "امن، بقائے باہمی، اور بین المذاہب ہم آہنگی" تھا۔ تاہم، اس کانفرنس کو بعض تجربہ نگاروں نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کی نظریاتی تمہید قرار دیا تھا۔ انہوں نے عالمی مذاہب کے علماء کو مخاطب کیا کہ "خدا نے انسانوں کو مختلف بنایا تاکہ وہ ایک دوسرے کو جانیں، نہ کہ جھگڑیں۔ اختلاف کی بجائے امتِ انسانی پر توجہ اسرائیل کی موجودہ سیاسی سچائی کیلئے پیش خیمہ تسلیم کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تعارف اور مخلص کو شش بالآخر "تسلیم" کی دہلیز پر لے آیا؟ موجودہ حالات اس کی کھلی نفی کر رہے ہیں۔

ٹرمپ کے داماد، جیرالد کشر، جنہیں سیاسی سفارت کاری کا کم عمر مگر نہایت چالاک مہرہ کہا جاسکتا ہے، اس پورے معاہدے کے معمار کہلائے جاسکتے ہیں۔ پس پردہ خفیہ بیک ڈور چینلز کے ذریعے اسرائیل اور خلیجی عرب ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کی راہ ہموار کی گئی۔ متحدہ عرب امارات، بحرین اور مراکش نے نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کیا بلکہ تجارتی، سیکورٹی اور ٹیکنالوجی میں بھی معاہدات طے کیے۔ یہ پیش رفت "امن" کے پردے میں وہی "مفادات" کی سیاست ہے جس کی جڑیں واشنگٹن سے لے کر تل ابیب تک پھیلی ہوئی ہیں۔

شطرنج کے پس پردہ ہاتھ میں نئے دور کے یہودی نژاد لارنس آف عربیہ جیرالد کشر کی خفیہ سفارت کاری اور ولی عہد محمد بن سلمان کی باہمی قربت اور رفاقت کی داستان کو سمجھنا از حد ضروری ہے جس نے شاہی درباروں اور سفارتی کتب خانوں کی تہہ میں ایک نئی روشنی چھوکی۔ رپورٹس کے مطابق محمد بن

سلمان نے اپنے قریبی حلقوں میں فخر سے کہا کہ کسٹمر میرے پاؤں کا طواف کرتا ہے۔ وہ میرے "پاکٹ" میں ہے۔ اصلاً یہ متنازعہ استعارہ اس رفاقت کی سطح بتاتا ہے جو دو طاقتوں کے مابین محض پیشہ ورانہ نہیں بلکہ ذاتی بنیادوں پر قائم تھی کہ اس رفاقت یا سیاسی حلیف کے سارے کھیل میں کس کی پاکٹ میں کون تھا، حالات نے سب آشکار کر دیا ہے۔

اس دوستی کو مضبوط کرنے کیلئے جیرالڈ کسٹنر نے اطلاعات کی رازداری اور طاقت کے تبادلے ساتھ محمد بن سلمان کے ساتھ اس وقت گہرا رشتہ قائم کر لیا جب اس نے انٹر سپٹ کی رپورٹس کے مطابق، کسٹنر نے اپنے پاس موجود "ڈیلی بریف" سے رازداری میں شاہی قریبی شخصیات کے نام ولی عہد محمد بن سلمان کو بتائے، جس کے ہفتوں کے اندر ہی ایک طاقتور ضد کرپشن مہم کے نام پر چند سو سعودی شہزادوں اور تاجروں کو گرفتار کر کے ریٹرکارلٹن میں محصور کیا گیا یہ اقدامات مغربی اطلاعات کے اشتراک اور اندرونی سیاسی صف بندی کی سنگین پیچیدگی کی عکاس تھے۔ 2017-2019ء کی سعودی "ضد کرپشن" مہم میں تقریباً 381 / افراد گرفتار ہوئے اور حکومت نے 100 ارب سے 400 ارب ڈالر ز کے اثاثے ضبط کیے۔ معمول کے زیر جرم گرفتاریاں توسنائی دیتی رہتی ہیں، مگر تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ محمد بن سلمان نے یہ مہم اپنے اقتدار کو کنٹرول کرنے، منافقانہ شاہی دھڑوں کو الگ کرنے اور اثاثے اکٹھے کرنے کیلئے استعمال کی۔ اس میں کسٹنر کے ذریعے پہنچنے والی چونکا دینے والی معلومات نے کلیدی کردار ادا کیا۔ گویا اقتدار کے سودے میں رعونتِ شیطانی کے پیچھے جیرالڈ کسٹنر کا یہودی دماغ کار فرما تھا۔

کسٹنر کے دورِ صدارت کے بعد، سعودیہ کے پبلک انویسٹمنٹ فنڈ نے ان کی نجی انویسٹمنٹ فرم "ایف ٹی پارٹنرز" میں دو ارب ڈالر سرمایہ کاری کی۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ پبلک انویسٹمنٹ فنڈ کے ماہرین نے اس معاہدے کو "تمام پہلوؤں میں غیر اطمینان بخش" قرار دیا۔ مگر ولی عہد نے اپنی بادشاہی اتھارٹی استعمال کر کے سرے محل کی اس ادائیگی کو منظور کر لیا۔ گویا سرمایہ کاری کی یہ خوفناک واقعہ دوستی سے معاہدے تک کی صورت حال ایک سفارتی سودے کا عکاس ہے۔ جو سلطان سعودی اور امریکی "توجہ دلانے" والوں کے مابین انجام پاتا ہے۔

جب امریکی کانگریس نے تفتیش کا دائرہ کار بڑھاتے ہوئے سوال اٹھایا کہ کیا کسٹنر نے غیر رجسٹرڈ فارن ایجنٹ کے طور پر سعودی مفادات پیش کیے؟ تو کسٹنر نے تمام الزامات کو بے بنیاد قرار دے دیا اور کہا کہ میں نے ہر قانون اور اخلاقیات کی پیروی کی ہے۔ یہ دفاع کم از کم سفارتی پیچیدگیوں کے فریبوں سے ضرور پردہ اٹھاتا ہے؛ مگر ان شبہات کی گونج اب بھی باقی ہے۔ یہ سب سلسلہ محض دوستی کا ثمر نہیں، بلکہ ایک شہنشاہانہ منصوبہ ہے جہاں سعودی ولی عہد نے اپنے عہد کی مضبوطی کیلئے قدم بڑھایا اور کسٹنر نے اسے عالمی سطح پر فروغ دینے اور مالیاتی حمایت حاصل کرنے میں مدد دی۔ یہ نہ صرف سعودیہ میں طاقت کے توازن کو قائم کرتا ہے، بلکہ خطے میں سیاسی و فوجی معاہدات اور امن معاہدوں کے منظر نامے کو بھی تبدیل کرتا ہے۔ اس سے سعودی شاہی اقتدار یا جغرافیائی توازن کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ٹرمپ کے داماد، جیرالڈ کسٹنر، نے تہہ خانے میں خفیہ چینلز کے ذریعے اسرائیل اور خلیجی ممالک کو ایک پلٹ فارم پر لانے کے نتیجے میں متحدہ عرب امارات، بحرین اور مراکش نے جلد ہی اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ کسٹنر نے خود تسلیم کیا کہ سعودی عرب کی شمولیت سے ابھرتے ہوئے دس دیگر ممالک، جن میں پاکستان و انڈونیشیا شامل تھے، کا سفر شروع ہو گا۔ ٹرمپ کے داماد جیرالڈ کسٹنر نے پاکستان کو "نارملائزیشن امکان" کے ماحول میں نامزد کیا، جسے دفاعی وزیر خواجہ آصف نے تسلیم کیا۔ اگرچہ پاکستان نے فی الحال اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا، مگر بالآخر "داؤ کھیل کے اس میدان کی کھیل" میں دباؤ کے باعث "رائے کی سیاست" ملک کے سفارتی افق پر نمودار ہو سکتی ہے۔

کشنر نے گزشتہ دنوں ایک روایتی فورم میں واضح کیا کہ سعودی عرب اور پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرنے کی سمت بڑھ رہے ہیں۔ یہ بیان پاکستانی عوام کیلئے ایک شدید جذباتی جھٹکا ہے، جس میں داخلی انتشار کی خبریں چھپی ہوئی ہیں۔ جیرالڈ کشر کا ایک بین الاقوامی فورم پر یہ بیان نہ صرف سیاسی طور پر حساس ہے بلکہ پاکستان کے داخلی ماحول میں ایک تہلکہ خیز ہجّان کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بیان محض ایک سفارتی تجزیہ تھا یا ایک چالاک انداز میں داخلی انتشار کو بھڑکانے کی کوشش؟

اب سب سے بڑا سوال یہی ہے کہ کیا پاکستان بھی اسرائیل کو تسلیم کرے گا؟ وطن عزیز، جسے نظریہ اسلام کی بنیاد پر دنیا کے نقشے پر جگہ ملی، اس کیلئے اسرائیل کو تسلیم کرنا صرف ایک خارجی پالیسی کا سوال نہیں، بلکہ قومی خودی، عوامی حساسیت، اور دینی بنیادوں پر کھڑا ایک نظریاتی بحران ہے۔ تاحال ریاست پاکستان نے باضابطہ طور پر اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا، لیکن بین الاقوامی دباؤ میں یہ سوال اب ایک "مکنہ حقیقت" کے طور پر زیر بحث ہے۔ اگر پاکستان اسرائیل کو تسلیم کرتا ہے، تو عوام میں شدید احتجاج اور ایک "ملکی بحران" جنم لے سکتا ہے۔ کیا کشنر نے جان بوجھ کر پاکستان کو نام دیکر داخلی عدم استحکام کا بیج نہیں بویا؟ یہ تشویش کشیدگی کے درجن شمار مسائل کو جنم دے سکتی ہے۔

پاکستانی عوام کے دل میں فلسطین کیلئے ایک جذباتی وابستگی ہمیشہ سے رہی ہے۔ اسرائیل کو تسلیم کرنا عوامی جذبات کی شدید توہین تصور کی جائے گی، اور ممکن ہے کہ اس کے خلاف ملک گیر مظاہرے، سول نافرمانی اور سیاسی بحران کا طوفان اُٹھ آئے۔ کیا کشنر نے پاکستان کا نام لیکر دانستہ طور پر داخلی خلفشار کی چنگاری سلگائی ہے؟

پاکستان واحد اسلامی ایٹمی طاقت ہے۔ اسرائیلی وزیراعظم نے اپنے ٹی وی پروگرامز میں پاکستان کو ایران کے بعد ایک بڑا خطرہ قرار دیا۔ نیتن یاہو کا پاکستان کی ایٹمی دسترس کو "غیر مستحکم" قرار دینا — بے شک ایک جنگی اشارہ ہے۔ اسرائیلی قیادت بارہا اس کا برملا اظہار کر چکی ہے کہ ایک "دوسرا ایران" قابل قبول نہیں۔ نیتن یاہو نے ٹی وی پر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو بھی ممکنہ خطرہ قرار دیا۔ یہ بیان اس بات کا غماز ہے کہ خطے میں طاقت کا توازن اسرائیل کو گوارا نہیں، اور وہ اس طاقت کو ختم کرنا چاہتا ہے جو اس کی بالادستی کو چیلنج کرے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودی دہنود کا حالیہ اتحاد مل کر پاکستان کی ایٹمی قوت کو نشانہ بنانے کی کھلی دہمکیاں دیتا رہتا ہے۔

ہمارے جدید دور کے مصائب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حالیہ پاک-بھارت کشیدگی کے دوران، اسرائیل نے بھارت کو نہ صرف جدید ڈرونز (ہاروپ) فراہم کیے بلکہ ان کے ساتھ اپنے آپریٹرز بھی بھیجے۔ پاکستانی افواج کی جوابی کارروائی میں انیس اسرائیلی اہلکار مارے گئے، جن کے تابوت رات کی تاریکی میں تل ابیب منتقل کیے گئے۔ اس واقعے کے فوری بعد پاکستان نے اسرائیل کو بطور ممکنہ ہدف لینے کا جو نہیں عنندیہ دیا، جس پر امریکی سفارتی محاذ حرکت میں آیا اور ٹرمپ کو خود سیز فائر کروانا پڑا۔ انڈین وزیر خارجہ نے بعد ازاں تسلیم کیا کہ اگر یہ سیز فائر نہ ہوتا، تو بھارت تباہ کن انجام سے دوچار ہوتا۔

انڈین فوج کے ڈپٹی چیف نے بھی اس جنگ میں پاکستانی افواج کی عسکری برتری کو تسلیم کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا امریکا اور اسرائیل اس شکست کا بدلہ لینے کیلئے بھارت کو دوبارہ اکسا سکتے ہیں؟ اگر ایسا ہوا، تو مقصد صرف پاکستان کی عسکری طاقت کو نیست و نابود کرنا نہیں ہوگا، بلکہ اس کی ایٹمی صلاحیت کو ختم کرنا اصل ہدف ہوگا اور اس کے پس منظر میں ایک عالمی صف بندی ہوگی جس میں ابراہیمی معاہدہ کی روح پوری طرح جھلکے گی — کہ

جو اسرائیل کو تحفظ دے، وہی معاہدہ "امن" کہلاتا ہے، اور جو اس کی بالادستی کو چیلنج کرے، وہ "دہشتگرد" کہلاتا ہے۔ اس لئے وہ جوابدہی معاہدے کو امن کی ضمانت سمجھنے کی خوش گمانی میں مبتلا ہیں، وہ ایک لمحہ اس شیطانی مثلث کے بھیانک کردار کو اپنے ذہن میں تازہ رکھیں۔

جو نہی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی تو شیطانی مثلث کے بڑے کردار نے شدید تمسخر سے اپنی لا تعلقی کا اظہار کیا لیکن پاکستانی جواب پر فوری طور پر سیز فائر کی بھاگ دوڑ شروع ہو گئی۔ یہود و ہندو تو پہلے اس پسپائی کو ماننے پر تیار نہ تھے لیکن حقیقت کب مستور رہتی ہے اور سنائے میں لپٹی صدا ایں ایک خاموش اعتراف کی شکل میں سامنے آگیا۔

تاریخ کے اوراق کبھی کبھی ایسے دھبے اپنے دامن پر سجالیتے ہیں جو محض داغ نہیں بلکہ عہد کی علامت بن جاتے ہیں۔ کچھ زخم بولتے نہیں، مگر ان کی خامشی صدا ابن جاتی ہے۔ جنوبی ایشیا کا خطہ، جسے برصغیر کی تہذیب و تمدن کی نگری کہا جاتا ہے، آج بھی سیاسی طوفانوں اور عسکری سرگوشیوں کی زد میں ہے۔ حالیہ انٹرویوز، بیانات اور عسکری پریزنٹیشنز نے جو عقدہ کھولا ہے، وہ محض الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ ایک قوم کے ذہنی اور اخلاقی بحران کا پردہ چاک ہو گیا۔

نیوزویک کے ساتھ ایک انٹرویو میں جب انڈیا کے وزیر خارجہ نے یہ انکشاف کیا کہ ”اگر ہم نے کچھ باتیں تسلیم نہ کیں تو پاکستان انڈیا پر بہت بڑا حملہ کرے گا“، تو یہ جملہ محض ایک سفارتی بیان نہ تھا بلکہ وہ ناقوس تھا جو جنگ کے ممکنہ الارم کو بجایا۔ اس اعتراف میں نہ صرف خارجہ پالیسی کی کمزوری جھلکتی ہے بلکہ یہ سفارتی بھرم کی وہ دراڑ ہے جس سے سچائی چھلک کر باہر آگئی۔

دوسری طرف، جب انڈین دفاعی اتاشی نے نہایت سپاٹ لہجے میں ”سیاسی رکاوٹوں“ کی وجہ سے ”چند طیارے کھونے“ کا اعتراف کیا، تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کمانڈر اپنے ہی قلعے کی دیواروں میں شکاف دکھا رہا ہو۔ وہ شکاف جواب اپوزیشن کے نعرے نہیں، خود حکومت کے منصب داروں کے لبوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ کانگریس کے رہنما بے رام رمیش کا الزام کہ ”بی جے پی حکومت نے قوم کو گمراہ کیا“، محض ایک سیاسی نعرہ نہیں، بلکہ وہ آئینہ ہے جس میں سچائی اپنا چہرہ دکھا رہی ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل رابل سنگھ کا اعتراف کہ چار روزہ معرکہ آرائی میں انڈین فوج کو خاصا نقصان اٹھانا پڑا، اس سچائی کی گویا مہر ہے جو طویل عرصے سے پس پردہ رکھی گئی تھی۔ گویا وہی چراغ جل اٹھا جسے بجھانے کی ہزار کوششیں کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی جب انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ ”ہمیں الیکٹرانک وارفیئر کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے“، تو دراصل یہ ایک ایسا عسکری تجزیہ تھا جس میں ایک قومی کمزوری کا کھلا اعتراف چھپا ہوا تھا۔

جب سوال پوچھا گیا کہ پاکستانی فضائیہ کی جانب سے جو بریفنگز دی گئیں، ان میں بارہا ذکر آیا کہ انڈین طیاروں کی ”جیمنگ“ ہوئی۔ یعنی وہ جدید ٹیکنالوجی جس کا دعویٰ بھارت نے اپنی عسکری برتری کے ثبوت کے طور پر کیا تھا، وہی ٹیکنالوجی اُس کے اپنے ہتھیاروں کو گم کر دیتی رہی۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں تاریخ، سیاست اور عسکریت ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہے ہیں۔ کیا یہ وہی بھارت ہے جو اپنے عوام کو شائنگ انڈیا کے خواب دکھاتا رہا؟ کیا یہ وہی حکومت ہے جو انتخابات سے قبل قومی غرور کو چمکانے کیلئے جنگی تماشیل پیش کرتی رہی؟ آج جب اندر سے آواز آرہی ہے کہ ”ہمیں بہت کچھ کھونا پڑا“، تو کیا یہ اعتراف نہیں کہ قومی فخر کو محض انتخابی سیاست کی بھٹی میں جھونک دیا گیا؟

یہ وقت ہے جب حقائق کی روشنی کو چھپانے والے پردے چاک ہو چکے ہیں۔ اب نہ تو سفارتی الفاظ کی ملمع کاری کچھ چھپا سکتی ہے، نہ عسکری بیانات کی گرد اس سچائی کو دھندلا سکتی ہے۔ برصغیر کے اس خطے میں، جہاں ایک زخم بھی صدیوں کا نوحہ بن جاتا ہے، یہاں یہ اعترافات کل کی تاریخ کا عنوان اور آنے والے کل کے سبق بن چکے ہیں۔

زمانے کے آئینے میں ہم عکس ابراہیم ڈھونڈتے ہیں، مگر ہر طرف نمرود کی مسکراہٹیں ہیں، کبھی ہم نے آسمان کی طرف دیکھا تھا اور ستاروں میں توحید کی چمک تلاش کی تھی، مگر آج زمین پر معاہدے طے ہو رہے ہیں جن کی روشنائی میں فلسطین کے یتیموں کے آنسو اور یروشلم کے زخمی پتھر اپنا نوحہ لکھ رہے ہیں۔ یہ ابراہیمی معاہدہ نہیں، یہ ابراہیم کی نسبت کا استحصال ہے۔ یہ کعبے کے وارثوں کا وہ دست خط ہے جو قبلہ اڈل کی تنہائی پر ثبت کیا گیا ہے۔ کہاں گئے وہ مردانِ صفا؟ جن کی آنکھیں قدس کے میناروں میں اذان کی صورت جگمگاتی تھیں؟ کہاں گئے وہ لب جو لبیک یا قصیٰ کا ورد کرتے تھے؟

قرآن پکار رہا ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور تفرقہ نہ ڈالو (العمران: 103)

مگر آج ہم نے اُس رسی کو چھوڑ کر تل ابیب کے ریشمی جال تھام لیے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ، جن کے قدموں کے نشان صفا پر آج بھی موجود ہیں، ان کی سیرت کا مرکز "لا الہ الا اللہ" تھا اور آج انہی کے نام پر معاہدہ ابراہیم کے سائے میں بیت المقدس کی نیلامی ہو رہی ہے۔

اے اہل قلم! اے اربابِ ضمیر کیا وقت نہیں آیا کہ تم اپنی تحریروں سے قافلوں کو روک دو جو طاغوت کے سنگ چپ چاپ گزر رہے ہیں؟

اے اہل مشرق! کیا تم نے تاریخ کے اس منظر کو بھلا دیا جب صلاح الدین ایوبی کی تلوار نے مسجد اقصیٰ کی مٹی سے صلیب کی زنجیر توڑی تھی؟ آج وہی مسجد، وہی محراب، وہی قبلہ، اکیلا کھڑا ہے، اور اس کے وارث... معاہدوں کی میز پر گردن جھکائے بیٹھے ہیں۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ:

"وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مَلَّتُهُمْ" (البقرہ: 120)

(یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک کہ تم ان کے دین کی پیروی نہ کرو)

پھر تم نے رضامندی کے سند کیلئے کن دروازوں پر دستک دی؟ کیا صلح کی تمنا میں تم نے اپنی غیرت کا خراج ادا نہیں کیا؟ کیا یہ معاہدہ تمہیں امن دے گا؟ یا پھر اسی امن کی آڑ میں تمہارے وجود کو مسخ کر دے گا؟

کیا آپ کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت محمد ﷺ نے معراج کی شب انبیاء کی امامت فرمائی تھی، یہ وہی خطہ ہے جہاں حضرت عمر بن خطابؓ اپنے نعلین ہاتھ میں لیے، قدس کی مٹی پر ننگے پاؤں داخل ہوئے تھے، یہ وہی زمین ہے جہاں سجدہ کیا گیا تو زمین مقدس ہو گئی اور آج اسی سرزمین کو سفارتی دسترخوان پر سجایا گیا ہے۔ کیا عمر بن خطابؓ کا یہ قول بھول گئے کہ عمر جب فرات کے کنارے ایک کتاب بھی پیا سا مر جائے تو — امیر المومنین سے سوال ہو گا۔ تو کیا آج مسجد اقصیٰ کی آہوں پر امت مسلمہ کی قیادت کا سوال نہ ہو گا؟

یہ تحریر فقط ایک مقالہ نہیں، یہ ضمیر کی دستک ہے۔ یہ وہ اذانِ سحر ہے جو شبِ غفلت میں لپٹی ہوئی قوموں کو جگانے آتی ہے۔ یہ وہ "لبیک" ہے زبان پر نہیں، مگر قلبِ مومن کے اندر کہیں گونج رہی ہے۔ آئیے! اس گونج کو صدائے احتجاج بنائیں، اس احتجاج کو تحقیق و یقین کا لباس پہنائیں جو ابھی اور ابراہیمی معاہدے کی تہہ میں چھپے سیاسی، مذہبی، اور تہذیبی جبر کا پردہ چاک کریں کہ ابراہیمی معاہدہ ایک نیا جغرافیائی عمرانی معاہدہ ہے، جس میں مسلمانوں کی سیاسی کمزوری، مذہبی انتشار، اور معاشی بے وزنی کو خوب خوب استعمال کیا جا رہا ہے لیکن اگر تاریخ ہمیں کچھ سکھاتی ہے، تو وہ یہ ہے کہ جبر

سے بندے بدلتے ہیں تو میں نہیں۔ اور فلسطین کی سر زمین، تاریخ کے ماتھے پر وہ زخم ہے جو ہر نئی صلح کے ساتھ زیادہ تازہ ہو جاتا ہے۔

یاد رکھیں! تو میں اپنے ماضی سے آنکھ چرانے لگیں تو ان کا حال ان پر انتقام بن کر ٹوٹتا ہے۔ آج اگر سچائی کا سامنا نہ کیا گیا تو یہ اعترافات آئندہ نسلوں کے ماتھے پر سوال بن کر چمکتے رہیں گے۔

بروز جمعۃ المبارک 22 محرم الحرام 1447ھ 18 جولائی 2025ء

وحدتِ امت: خواب یا امکان؟

الحمد لله الذي جعل كلمة الحق علياء، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء، وعلى آله وأصحابه النجباء. أما بعد: تمام تعریف اللہ کے لیے ہے، جس نے حق کے کلمے کو بلند فرمایا، اور درود و سلام ہو انبیاء کے سردار (حضرت محمد ﷺ) پر، اور آپ کے آل و اصحاب پر، جو نیک اور برگزیدہ ہیں۔ اما بعد۔۔۔

حضراتِ محترم

آج کی یہ اسپیس جس کا عنوان ہے یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے، محض ایک اجتماع نہیں بلکہ ایک فکری صداقت، ایک روحانی لٹکار، اور ایک اجتماعی محاسبہ ہے۔ آج جب ہم امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر گفت و شنید کیلئے جمع ہیں، تو دراصل ہم اس قوم کی حالت زار پر ماتم کرنے نہیں، بلکہ اس کے درد کا درماں ڈھونڈنے آئے ہیں۔ آج کی اس فکری نشست، یہ علمی محفل، یہ بیداری کی شبِ دعا میں صرف اس لئے اکٹھے نہیں ہوئے ہیں کہ امت کی زبوں حالی کا تذکرہ کریں کیونکہ ہم سب کو عملاً اس کا علم ہے لیکن ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ یہ محض ایک رسمی اجتماع نہیں، بلکہ تاریخ کے زندہ سوالات کا جواب ہے، اور امت کی آہوں اور سسکیوں کا ترجمان ہے۔ آج جب ہم امتِ مسلمہ کی زبوں حالی پر بات کرنے آئے ہیں، تو ہماری زبان فقط الفاظ ادا نہیں کرے گی، بلکہ دل کی دھڑکنوں کا بیاں دے گی۔ آج ہمارا موضوع فقط تجزیہ نہیں، بلکہ تجدیدِ عہد ہے۔ ہمیں کہنا ہو گا، ہمیں سننا ہو گا، ہمیں رونا ہو گا اور پھر اٹھنا ہو گا کہ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو رونا نہ پڑے۔

حضراتِ محترم!

جب تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں، تو اسلام کا سورج افقِ عالم پر یوں طلوع ہوتا نظر آتا ہے کہ جہالت کے اندھیرے چھٹنے لگتے ہیں، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جب اسی تاریخ کے اوراق مزید پلٹتے ہیں، جب ماضی کی خزاں دیدہ شاخوں میں بہار کی صدائیں سننے کو جی چاہتا ہے، جب ماضی کی سنہری ریتیں حال کے خزاں رسیدہ دامن میں رنگ بھرنے کی تمنا کرتی ہیں، تو دل بے ساختہ اس درد کو محسوس کرتا ہے جو امتِ مسلمہ کے حال پر روتا ہے، اور عقل سوال کرتی ہے کہ آخر وہ کون سے عوامل ہیں جنہوں نے اس عروج یافتہ قافلہ نور کو ذلت کی تاریکیوں میں دھکیل دیا؟

یاد کیجیے! وہ دور جب اہل عرب کی سرزمین سے اٹھنے والی صدا نے توحید نے قیصر و کسریٰ کے محل لرزادیے، جب روم و ایران کے جباروں کو جھکنا پڑا، ان کی طاقت کا گھمنڈ اور تکبر زمین بوس ہوا، جب بیت المقدس کے در و دیوار نے بھی اسلام کے قدموں کی چاپ سنی، جب غرناطہ کی فضائیں علم و حکمت کی صداؤں سے گونجتی تھیں، جب بغداد کا قلم تلوار سے بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ یاد کریں! وہ دور جب

عُاٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

حضراتِ گرامی یاد کریں وہ لمحے جب

عُا ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔

جب کعبہ گواہی دیتا تھا کہ یہ قوم وحدت کی علمبردار ہے، جب اذان کی صدا صرف مسجد تک محدود نہ تھی بلکہ تہذیبوں کا تعارف تھی۔ مگر آج؟ آج وہی قوم:

خاں بدر ٹھوکر کھا رہی ہے، وہی جو کل کی امام تھی

چمن کو جن کے خون سے ملی تھی باد بہار

مدینہ کی گلیوں سے نکلنے والی وہ آواز جس نے قیصر و کسریٰ کو لرزادیا۔ وہ پیغام جس نے غلامی کو توڑا، ظلم کو مٹایا، جہالت کو علم سے بدلا اور پتھروں کے پجاریوں کو وحدتِ ربانی کا پرستار بنایا۔ اندلس سے بغداد تک، قاہرہ سے سمرقند و بخارا تک، امت کے علم و عمل نے دنیا کو علم، عدل، روحانیت، اور تہذیب کے نئے معیارات دیے۔ مگر آج؟ وہی امت، جسے "خیر امت" کہا گیا، پستی کے گڑھوں میں گر چکی ہے۔

مگر آج امت کا موجودہ حال کیا ہے؟ وہ قوم جو کل مکہ و مدینہ کی خاک سے اٹھ کر قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کو زیر کر گئی، آج اس حال کو پہنچی ہے کہ اس کی قیادت مفقوج، اس کا معاشرہ پرآگندہ، اس کی تہذیب مغرب زدہ، اور اس کا دین محض رسوم و رواج میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ آج وہی امت ٹکڑوں میں بٹی، گروہوں میں تقسیم، مفادات میں گرفتار، قیادت سے محروم، فکر سے بے بہرہ، اور وحدت سے عاری نظر آتی ہے۔ سیاست کی بساط پر مہرے بن چکی قوم، جن کے فیصلے واشنگٹن، لندن اور پیرس کے ایوانوں میں ہوتے ہیں۔

آج جب ہم "امتِ مسلمہ کی زبوں حالی" پر گفتگو کرتے ہیں، تو ہمیں فقط آنکھوں سے بہتے آنسو نہیں، دل سے اٹھتی سسکیاں سننی ہوں گی۔ ہمیں تاریخ کی عدالت میں گواہی دینی ہوگی، اور وہ بھی سچائی کی۔ امت کا یہ زوال اچانک نہیں آیا، یہ صدیوں کی غفلت، فکری جمود، اخلاقی زوال، علمی انحطاط، اور روحانی بے حسی کا نتیجہ ہے۔

اے اہل مجلس! یہ زوال نہ تو آسمان سے نازل ہوا، نہ ہی کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے۔ یہ صدیوں کی کوتاہی، غفلت اور خود فراموشی کا ثمر ہے۔ وہی امت جو "افترؤ" کی صدا پر اٹھی تھی، آج علم سے محروم ہے۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا:

خاں وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

حضراتِ گرامی قدر!

ہمیں اعتراف کرنا ہو گا کہ ہمارا زوال اندرونی ہے، بیرونی سازشوں کا اثر ثانوی ہے۔ ہم نے قرآن کو صرف تعویذ بنایا، سیرتِ رسول کو صرف میلاد تک محدود کیا، اجتہاد کا در بند کیا، اور تقلیدِ جامد کو شعار بنایا۔ غور کریں کہ فکری جمود اور اجتہادی جرأت کی کمی کی وجہ سے ہم کہاں پہنچ گئے ہیں۔ امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا المیہ اس وقت فکری جمود ہے۔

خاں جمودِ فکر و نظر ہے فساد کی جڑ

یہی ہے امتِ مسلمہ کی فکری ندالت

ہم نے اجتہاد کے دروازے بند کر دیے، سوال اٹھانے کو جرم بنادیا، اور تقلید جامد کو دین کا لبادہ پہنادیا۔ کون نہیں جانتا کہ اسلام کی روح اجتہاد، غور و فکر، اور عقلی توازن میں پنہاں ہے، مگر آج ہم نے فتاویٰ کی مشینیں تو بنالیں، مگر اجتہاد کے در بند کر دیئے۔ نئی نسل سوال کرے تو گستاخ ٹھہرے، سوچے تو بے دین۔ آج ہم نے نہ فقط اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو تعلیم سے محروم کر دیا، بلکہ اپنی تہذیبی اساس سے بھی کاٹ دیا، رہی بات اپنے بچوں کی تو آج کل بچے کی پیدائش پر ہی اس کا نام کسی مغربی طرزِ تعلیم کے اسکول میں رجسٹر کروانے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ اسکول کی عمر تک پہنچنے ہی اس کا نام بھی اسکول داخلہ کی فہرست میں آجائے۔

عاجزہ فکر و عمل، موت ہے زندگی کیلئے
چراغ بجھنے لگے تو ہوا سے شکوہ نہ کر

آج ہماری درس گاہوں میں علم ہے، مگر ہدایت نہیں۔ ڈگری ہے، مگر دانش نہیں۔ تربیت ہے، مگر مقصدیت کا فقدان۔ آج ہمارے تعلیمی ادارے کردار سازی کی بجائے محض ڈگری سازی کے مراکز بن چکے ہیں۔ ہمارے دینی مدارس میں منقولات کا طوفان ہے، مگر معقولات کی پیاس باقی ہے۔ ہمارے جامعات میں جدید سائنس کا شور ہے، مگر روحانیت کی خاموشی ہے۔ ہمارے تعلیمی ادارے صرف ملازمت کے حصول کی فیکٹریاں بن چکے



ہیں۔ ہمیں ایسے ادارے چاہئیں جہاں سے غزالی، ابن خلدون، اور اقبال پیدا ہوں۔ یونیورسٹیوں میں نصاب موجود ہے، مگر نظریہ ندارد۔ علم ہے، مگر بصیرت غائب۔ اسکولوں میں مغربی فلسفے پڑھائے جاتے ہیں، مگر اپنی تہذیب اجنبی ہے۔ مدارس میں حافظ و قاری تو نکل رہے ہیں، مگر امت کو فقیہ، مفکر، اور قائد کی بھی ضرورت ہے۔ یاد رکھیں:

عاجزہ علم وہ جو روشنی بخشے دلوں کو
ورنہ ہر جاہل، کتابوں کا بھی حافظ ہو گیا

امت مسلمہ کی سیاسی قیادت؟ وہ تو بکھرے ہوئے پتوں کی مانند ہے، جنہیں ہوا جدھر چاہے اڑالے جائے۔ کہیں بادشاہت ہے تو کہیں جمہوریت کا لبادہ اوڑھے آمریت مسکرا رہی ہے۔ کہیں خلافت کا نعرہ ہے مگر عمل میں استبداد۔ اور اتحاد؟ وہ خواب بن چکا ہے۔ او آئی سی کے اجلاسوں میں قراردادیں تو بہت منظور ہوتی ہیں، مگر عملاً کوئی اقدام نہیں۔ غزہ، مقبوضہ کشمیر، میانمار، سوڈان — ہر جگہ مظلوم مسلمان لہو کی قسطیں دے رہے ہیں، اور امت مسلمہ خاموش تماشائی بنی بیٹھی ہے۔ یاد رکھئے!

عاجزہ علم اگر تجھ کو نہ دے اپنے عمل کی دولت
تو فقیر کیلئے زہر ہے، سلطان کیلئے بھی

اسلام کا سیاسی نظام شوریٰ، عدل، مساوات اور احتساب پر مبنی تھا۔ مگر آج؟ ہر ملک اپنی ریاست، ہر ریاست اپنے مفاد میں گم۔ قومیں قومی مفادات میں الجھی ہیں، اور امت کے تصور کا جنازہ نکل چکا ہے اور امت مسلمہ اجتماعی سیاسی انتشار میں مبتلا ہے۔

عاجزہ کوئی سعد بن معاذ، نہ کوئی عمر باقی
ہے قیادت کی جگہ، دولت بے کار فقط

اخلاقی زوال اور روحانی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ امتِ کردار سے خالی ہو گئی ہے۔ ہمارے بازار جھوٹ سے لبریز، عدالتیں انصاف سے خالی، اور معاشرے فحاشی و مادہ پرستی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ سر سے لیکر پاؤں تک علمی انحطاط اور تعلیمی زوال میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن اقتدار کیلئے غیرت اور حمیت تک کو گروی رکھ دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔

عائنہ دیانت نہ شرافت، نہ محبت باقی

یہی ہے امتِ مسلمہ کی سب سے بڑی محرومی

آج امتِ سیاسی تقسیم اور قیادت کے بحران میں غرق ہے۔ اس کے پاس نہ ابو بکر، عمر، عثمان و علی تو کیا صلاح الدین ایوبی، محمد بن قاسم اور ٹیپو سلطان بھی تو نہیں رہے۔ ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل، اپنی علیحدہ شناخت میں قید ہے۔ قیادتیں یا تو کرپشن کی آلودہ ہیں یا مغرب کی غلام۔

عائنہ ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغتِ تعلیم

کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

اوائسی ہو یا عرب لیگ، سب بے جان ادارے ہیں۔ صرف رسمی اجتماعات ہیں۔ قراردادیں پاس ہوتی ہیں، تصاویر لی جاتی ہیں، مگر نہ عمل ہوتا ہے نہ نتیجہ۔ وحدتِ امت کا فقدان ایک عذاب کی طرح ہم پر طاری ہے۔ ہر مظلوم مسلمان تنہا ہے۔ فلسطین جل رہا ہے، کشمیر سلگ رہا ہے، شام اجڑ چکا ہے، اور ہم فقط قراردادیں پاس کر رہے ہیں:

عائنہ اقبال بھی رویا تھا اس حالِ زبوں پر

امت ہے کہ خوابِ غفلت میں ہے مدہوش ابھی تک

پھر اب سوال یہ ہے کہ حل کیا ہے؟ اس امت کے درد کا مداوا اور راہِ نجات اسی وقت ممکن ہے جب ہم قرآن سے عملی وابستگی اختیار کریں۔ سیرتِ رسول کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کریں۔ علم کو مقصدِ حیات بنائیں نہ کہ محض روزگار کا ذریعہ۔ اپنے کردار کو پیغمبرانہ شان دیں۔ امت کے تصور کو قومی تعصب پر مقدم رکھیں۔ امت کو اپنے تعلق کو رب سے جوڑنا ہو گا۔ نماز کو روح بنانا ہو گا، قرآن کو ہدایت، اور سیرتِ طیبہ کو رہنمائی کا مرکز۔ یاد رکھیں: جب امت اپنی شناخت کھو بیٹھے، تو اللہ اسے ذلت میں مبتلا کر دیتا ہے، تاکہ وہ پھر سے اپنی اصل کو تلاش کرے۔

ہمارے نصاب میں قرآن و سنت، جدید سائنس، تاریخ، اور تہذیب کا توازن ہو۔ ہمیں غزالی اور نیوٹن، دونوں کے وارث بنانے ہوں گے۔ یونیورسٹیاں صرف ڈگری نہیں، شخصیت سازی کا مرکز ہوں۔ مدارس میں سائنسی بصیرت اور جامعات میں روحانی تربیت ہو۔ فکر کی قیدیں توڑنی ہوں گی۔ ہمیں قرآن کو وقت کی زبان میں پڑھنا ہو گا۔ ہمیں اختلاف کو نعمت سمجھنا ہو گا، اور اجتہاد کو علم کا شعور دینا ہو گا۔ تجدیدِ ایمان اور تعلق باللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنا ہو گا۔ ہر فرد کو صادق، امین، محسن اور نیکو کار بننا ہو گا۔ گھر سے معاشرہ بنتا ہے اور معاشرے سے قوم۔ ہمیں صبر، حلم، تواضع، سخاوت، اور عدل کو اپنی شناخت بنانا ہو گا۔

عائد کردار کے غازی بنیں، نہ کہ گفتار کے بادشاہ

یاد رکھیے! وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو علم و عمل کی راہوں پر چلتی ہیں، جو وقت کی نبض پہ ہاتھ رکھتی ہیں، جو اپنے ماضی سے سبق سیکھتی اور حال کو تعمیر کرتی ہیں۔ میری یہ بات یاد رکھیں کہ قومیں مر جاتی ہیں، جب ان کے دلوں میں زندگی کی تمنا ختم ہو جائے، جب ان کے دماغ سوچنے سے انکار کر دیں اور ان کی

روحیں جمود کا شکار ہو جائیں۔ لیکن جو قومیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سیکھ لیں تو یہ زندگی جو موت ہی کی امانت ہے، وہ سراٹھا کر جینے کا سلیقہ سکھا دیتی ہے۔

یہ دنیا ایمان، علم اور جہاد سے بدلتی ہے، مگر جب امت ان تینوں کو چھوڑ دے، تو دنیا اُسے بدل دیتی ہے۔ آج ہمیں از سر نو تعمیرِ امت کا بیڑا اٹھانا ہو گا۔ یہ کام فرد سے شروع ہو گا، دل کی اصلاح سے، نیت کی پاکیزگی سے، کردار کی مضبوطی سے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ زبان کا حسن قوم کے باطن کا آئینہ ہوتا ہے۔ آج ہماری زبانوں سے محبت، اتحاد اور خیر کی بجائے نفرت، تفرقہ اور تعصب کی بو آتی ہے۔ ہمیں اب وہی زبان درکار ہے جو دلوں کو جوڑ دے، وہی قلم درکار ہے جو امت کے خوابوں کو تعبیر دے، وہی فکر درکار ہے جو زمانے کا رخ بدل دے۔ پھر مجھے اپنے مرشد اقبال یاد آگئے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر

نیاز مانہ نئے صبح و شام پیدا کر

میرا طریقِ امیری نہیں فقیری ہے

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

سیاسی بیداری اور قیادت کی اصلاح کیلئے امت کو باشعور و ووٹر بنانا ہو گا۔ ہمیں ایسی قیادت کو لانا ہو گا جو قرآن سے جڑی، سنت سے روشن، اور امت کی خدمت سے مزین ہو۔ وحدتِ امت اور بین الاقوامی شعور اجاگر کرنے کیلئے قومیت، رنگ، نسل، زبان — سب بعد میں، امت پہلے۔ ہمیں ایک پرچم تلے جمع ہونا ہے، جو لا الہ الا اللہ کا ہے۔

عاشبِ تاریک سہمی، مگر چراغِ جلا نالازم ہے

اب جو رکے وہ خسارہ، جو بڑھے وہی مقدر

آئیے! ہم ایک ایسا انقلاب برپا کریں جو پہلے دلوں کو بدلے، پھر معاشروں کو، پھر دنیا کو۔ ایسا انقلاب جو علم سے ہو، عدل سے ہو، اخلاق سے ہو۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو صرف ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کی فکر نہ کریں، بلکہ انہیں ابنِ سینا، ابنِ رشد، امام غزالی، اور ابنِ تیمیہ جیسا بنادیں۔ انہیں علم کا پیاسا اور کردار کا پیکر بنائیں۔

یاد رکھیے! امت کا زوال عارضی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ہم خود کو بدلنے کا ارادہ کریں۔ قرآن کہتا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔"

(بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔)

آئیے ہم اپنے آپ کو بدل لیں تاکہ ہماری قوم بدلے۔ اور یہ دنیا پھر سے اسلام کی روشنی سے جگمگائے۔ آج ہم یہاں صرف خطاب سننے نہیں، بلکہ تاریخ میں اپنے کردار کی تجدید کیلئے جمع ہیں۔ ہمیں خود وہ ابراہیم بننا ہو گا جو باطل کے بت توڑے، وہ محمد بن قاسم بننا ہو گا جو حق کیلئے سر زمینوں کو تسخیر کرے، وہ صلاح الدین بننا ہو گا جو بیت المقدس کو آزاد کرائے، وہ طارق بن زیاد بننا ہو گا جو منزل کے حصول کیلئے اپنی کشتیاں جلا کر اپنے لشکر کو پیغام دے کہ موت کے اندر ہی وہ زندگی ہے جو فتح کا پیام لیکر آئے۔ تو آئیے، ہم آج یہ عہد کریں کہ: ہم خود کو بدل لیں گے۔ ہم قرآن سے جڑیں گے۔ ہم علم کو ہتھیار بنائیں گے۔ ہم کردار کو اپنا زیور بنائیں گے۔ اور ہم امت کو ایک بار پھر "خیر امت" بنانے کا عزم کریں گے۔

لہذا ہمیں اب وہ قوم بننا ہے جو قرآن سے وابستہ ہو، سیرت سے روشنی لے، علم سے آشنا ہو، اخلاق سے مزین ہو، اور کردار میں ممتاز ہو۔ وقت کی یہ صدا ہمیں پکار رہی ہے: اٹھو! وہ ابراہیم بنو جو باطل کے ایوانوں میں توحید کی مشعل روشن کرے۔ وہ محمد بن قاسم بنو جو ظلم کی سرزمین پر عدل کا پرچم لہرائے۔ وہ صلاح الدین بنو جو قبلہ اول کو آزاد کرائے۔ یہ دور، صاحبو، اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے۔ کیا ہم وہ چراغ جلانے کو تیار ہیں؟ کیا ہم وہ آگ برداشت کرنے کو تیار ہیں؟ کیا ہم اپنی راحت چھوڑ کر، امت کا درد اپنا سکتے ہیں؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو یاد رکھو!

شبِ تاریک ہے، لیکن چراغِ جلانا ہو گا

لہو سے اپنے، یہ دیوارِ ظلم گرانا ہو گا

پس آئیے، ہر فرد ایک چراغ بنے۔ ہر دل میں ایمان کی آگ ہو، ہر ہاتھ میں علم کا پرچم، اور ہر قدم میں کردار کا وزن ہو۔ تب جا کر امت کی قسمت بدلے گی، اور ہمارا کل سنورے گا۔ امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کا شکوہ کرنے کے بجائے اب ہمیں اصلاحِ امت کا آغاز کرنا ہو گا۔ ہر فرد اپنے حصے کی شمع جلانے۔ شکوہِ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

ہر ماں محمد بن قاسم پیدا کرے، ہر باپ صلاح الدین ایوبی کی تربیت کرے، ہر استاد امام مالک جیسا علم دے، اور ہر قائد عمر بن خطاب جیسا عدل کرے۔ تب جا کر ہم کہہ سکیں گے، ہم وہ امت ہیں جسے اللہ نے خیر امت بنایا، جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض ادا کرتی ہے۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے، جب امتِ مسلمہ کا سورج پھر سے طلوع ہو، اور دنیا ایک بار پھر اسلام کی روشنی سے جگمگا اٹھے اور امتِ مسلمہ کی جاری زبوں حالی کا خاتمہ ہو۔ آمین

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میدان، ایوان اور میزبان: دھوکہ، دہلی، اور پسپائی

جب قومیں تاریخ کے دریا میں اپنی کشتی کو بہاؤ کے سہارے چھوڑ دیتی ہیں، تو کوئی بھی لہر انہیں غرق کر سکتی ہے۔ اور جب قوموں کے افق پر بادل صرف بر سے نہیں، گرجے بھی لگیں، تو اہل دانش کو خواب سے جاگ جانا چاہیے۔ ہم جس برِ صغیر میں سانس لیتے ہیں، وہ صرف جغرافیہ نہیں، تہذیبوں کا مرکب ہے۔ جہاں تاریخ دشمنوں کو بھی دوست بنانے کی تعلیم دیتی ہے اور جہاں دوستی کو دشمنی میں بدلنے کیلئے فقط چند سیاسی کوتاہیاں کافی ہوتی ہیں۔ آج بھارت کے خلاف جو فصولِ خطرہ مشرق، مغرب اور شمال سے بلند ہو رہی ہے، وہ دراصل کئی دہائیوں کی غیر تدبیرانہ پالیسیوں کا خمیازہ ہے۔

تاریخ کے صفحات پر وہ قومیں سنہری حرفوں سے لکھی جاتی ہیں جو وقت کی نزاکتوں کو تقدیر کے سپرد کرنے کی بجائے، تدبیر کے ذریعے حالات کا رخ موڑنے کا ہنر رکھتی ہیں۔ اگرچہ تقدیر ایک ازلی قوت ہے، مگر تدبیر انسان کا وہ شعور ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف اپنے حال کو سنوارتا ہے بلکہ مستقبل کی سمت متعین کرتا ہے۔ تقدیر پر ایمان ایک روحانی تسکین ضرور ہے، مگر اگر اسے عمل کی نفی، کوشش کی توہین، یا ذمہ داری سے فرار کا جواز بنالیا جائے، تو یہی عقیدہ زوال کا زینہ بن جاتا ہے۔ برِ صغیر کی تاریخ میں بہت سی مسلم ریاستیں محض اس لیے مٹ گئیں کہ ان کے سلاطین نے حالات کو "قسمت کا لکھا" سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے کو کافی جانا مگر تقدیر اُس وقت ایک روشن باب بن جاتی ہے جب اُسے تدبیر کی مشعل سے پڑھا جائے۔

تدبیر محض ایک لفظ نہیں، یہ وہ شعوری کاوش ہے جس کے بغیر اقوام کی کشتیاں وقت کے طوفانوں میں بھٹک جاتی ہیں۔ یہ وہ ہنر ہے جو دشمن کے ارادوں کو پہلے ہی بھانپ لیتا ہے، اور ایسی راہیں نکالتا ہے جن پر چل کر قومیں نہ صرف محفوظ رہتی ہیں بلکہ ترقی کے زینے طے کرتی ہیں۔

حال ہی میں جنرل انیل چوہان کی تشویش، راہول بیدی کی خبروں میں چھپی ہزیمت، اور بنگلہ دیش و چین کا بڑھتا ہوا عسکری و سیاسی گٹھ جوڑ—یہ سب کچھ تقدیر نہیں، تدبیر کا تقاضا کر رہے ہیں۔ اب فیصلہ بھارت کے پالیسی سازوں کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ان خبروں کو "نصیب کا لکھا" سمجھ کر بھلا دیں یا انہیں مستقبل کی روشنی میں بدلنے کا منصوبہ بنائیں لیکن مودی کی سازشی ذہنیت سے بالکل امید نہیں۔

تدبیر صرف توپ و تفنگ کے ہنر کا نام نہیں، یہ قوموں کی اندرونی وحدت، سیاسی بلوغت، سفارتی مہارت، تعلیمی بیداری اور عوامی شعور کا مجموعہ ہے۔ جب تک قومیں اپنی داخلی سمت کو درست نہیں کرتیں، بیرونی خطرات کے سامنے بے برباد ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ تاریخ نے سکھایا ہے کہ دشمن کے مقابلے میں صرف ہتھیار نہیں، کردار بھی اہم ہوتا ہے۔ جو قوم اپنے فکری محاذ پر کمزور ہو، وہ کسی بھی محاذ پر پائیدار فتح حاصل نہیں کر سکتی۔

تقدیر کا مفہوم اگر بے عملی کا جواز بن جائے، تو تدبیر اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے، اور قومیں تقدیر کو بد دعا سمجھنے لگتی ہیں۔ اب بھارت کے سامنے دورِ اہیں ہیں، تقدیر کا سہارا لے کر خاموشی سے بکھرتے حالات کو تکتا رہے، یا تدبیر کے ساتھ ایک نیابانیہ، نئی حکمتِ عملی، اور ایک مضبوط قومی وحدت تشکیل دے۔ یاد رہے کہ قومیں جب تدبیر سے منہ موڑتی ہیں، تو تقدیر ان کے ہاتھ سے وقت کی لگام چھین لیتی ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہم تقدیر کا رونا رونے کی بجائے، تدبیر کی مشعل تھامیں کیونکہ اندھیری راتوں میں راستہ تلاش کرنے والوں کیلئے ستارے بھی حرکت میں آ جاتے ہیں۔

آج، بھارت جس صورتِ حال سے دوچار ہے، وہ صرف جغرافیائی نہیں، بلکہ تہذیبی، عسکری اور فکری محاصرے کی ایک نئی داستان ہے۔ ایک ایسی داستان جو محض عسکری خطوط پر نہیں لکھی جا رہی، بلکہ اس کے پس منظر میں سیاسی ناچنگی، سفارتی بے بسی، علاقائی لاپرواہی، اور داخلی انتشار کی وہ گہری

لہریں رواں ہیں، جن کی آواز نہ صرف سرحدوں سے پرے گونج رہی ہے بلکہ خود ملک کے اندر بھی اضطراب کا باعث بن رہی ہے۔ یہ مکارانہ سازش کی داستان صرف سرحدوں پر نہیں لکھی جا رہی، بلکہ سیٹلائٹ کے مداروں، سفارتی ڈرائنگ رومز، اور افواج کے نچلے کیمپوں تک پھیل چکی ہے۔

جزل انیل چوہان کی تشویش محض ایک عسکری کمانڈر کی اضطرابی کیفیت نہیں بلکہ یہ اُس اندیشے کی بازگشت ہے جسے تاریخ کئی بار دہرا چکی ہے۔ جب اقوام نے خطرے کو آنکھوں سے نہیں، دل سے دیکھا تو فتوحات ہاتھ سے چھن گئیں۔ چین، پاکستان اور اب بنگلہ دیش کا ابھرتا ہوا مثلثی اتحاد، بھارت کیلئے اُس چکر ویوہ کی مانند ہوتا جا رہا ہے، جس میں پھنس کر ابھیمنیو کی طرح نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دیتی یعنی شمال میں چین، مغرب میں پاکستان، اور اب مشرق میں بنگلہ دیش کے مشترکہ اتحاد نے انڈیا کی رات کی نیندیں بھی حرام کر دی ہیں۔

کل تک مودی جنہیں اپنے جگر کا ٹکڑا کہتا تھا، وہی اگر خنجر لیے سامنے آکھڑا ہو تو دل پر لگنے والے زخم زبان سے بیان نہیں کیے جاسکتے۔ بنگلہ دیش، جو جغرافیائی لحاظ سے 'انڈیا لاکڈ' ہے، جس کی 94 فیصد سرحد بھارت سے منسلک ہے، اب اسی بھارت کے خلاف صف بندی کر تاد دکھائی دے رہا ہے۔ جس ملک کو انڈیا نے تجارت، ٹرانزٹ، پانی اور وفا کی راہوں پر ہم رکاب کیا، وہی اب اس کے دشمنوں کی صف میں کھڑا ہو تو یہ محض سیاسی موڑ نہیں، تہذیبی سانحہ ہے۔ 4,367 کلو میٹر کی طویل سرحد کا اگر دشمنی کے ارادے سے استعمال ہو، تو صرف بندوق نہیں، بستیوں تک ہلنے لگتی ہیں۔ جو سرحدیں کبھی اشتراک اور تعاون کا استعارہ تھیں، وہی اب اندیشوں کی خاردار باڑ میں بدل رہی ہیں۔

یاد رہے کہ بنگلہ دیش، جسے کبھی بھارت کی اسٹریٹجک فتح کا مظہر سمجھا گیا، آج چین اور پاکستان کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے کھڑا ہے۔ کیا یہ بنگلہ دیش کا بدلتا مزاج مشرق سے اٹھتا ہوا خطرہ، صرف معاشی مجبوریوں کا نتیجہ ہے؟ یا پھر بھارت کی غیر دوستانہ رویے نے اسے نئی پناہ گاہوں کی تلاش پر مجبور کیا ہے؟

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بنگلہ دیش کی 94 فیصد سرحد بھارت سے منسلک ہے۔ ایسے میں اس کی طرف سے سرد مہری کا اظہار، یا بھارت مخالف بیانیے کی قبولیت، محض سفارتی ناکامی نہیں بلکہ ایک تہذیبی زوال کا پتہ دیتی ہے۔ جب رشتے اعتماد کے بغیر قائم ہوں تو سرحدیں صرف فاصلے نہیں بڑھاتیں، فاصلے دلوں میں اتر جاتے ہیں۔

آج دنیا ایک نئے جغرافیائی شطرنج پر کھڑی ہے۔ چین، پاکستان اور بنگلہ دیش کا مجوزہ اتحاد صرف عسکری اتحاد نہیں، بلکہ عالمی تناظر میں ایشیا میں ابھرتا ہوا ایک ایسا نیا کھیل ہے جو سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی محاذ پر ایک گہری چال بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ بھارت اگر اس حقیقت سے غافل رہا، تو صرف بھارتی سرحدیں نہیں ٹوٹیں گی، تاریخ کے صفحات سے بھی بھارت کا وقار محو ہو سکتا ہے۔

چین کے ساتھ سرحدی جھڑپیں، درحقیقت ایک طویل المدت منصوبہ بندی کا حصہ ہیں۔ چین نہ صرف لداخ کے پہاڑوں میں موجود ہے، بلکہ بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا اور پاکستان کے ساتھ اپنے رشتوں کو ایک اسٹریٹجک نیٹ ورک میں تبدیل کر رہا ہے۔ بھارت جسے اپنی جغرافیائی برتری سمجھتا تھا، آج وہی اس کے گرد تنگ ہوتا دائرہ بن چکا ہے۔

چین کا اقتصادی دباؤ، عسکری برتری، اور پاکستان و بنگلہ دیش جیسے ممالک کے ساتھ ہم آہنگی، ایک نئی سرد جنگ کا پیش خیمہ بن رہی ہے۔ جس میں بھارت باوجود اپنی فوجی تیاریوں کے خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے۔ مودی اقتدار کی لالچ اور انتخابی مہم کیلئے ایک مرتبہ پھر جنگی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کرے گا اور یہی وہ موقع ہو گا جب امریکا بھارت اور انڈیا کی مجبوری کو کیش کر دیتے ہوئے مودی کو سیاسی خودکشی پر مجبور کر دے گا۔

انڈین نائب آرمی چیف کی شکایت — کہ پاکستان کو چین سے انڈیا کی "لایو" معلومات دستیاب تھیں — ایک ایسا انکشاف ہے جو عسکری اخلاقیات کے پردے چاک کرتا ہے۔ اگر دشمن کو ہمارے لشکر کی حرکات و سکنات لمحہ بہ لمحہ معلوم ہوں، تو یہ نہ صرف بھارتی دفاعی پالیسی کی شکست ہے، بلکہ ہندو مہاشے کی سفارتی تنہائی کا بھی اعلان ہے۔

پاکستان نے حسبِ روایت اس الزام کو مسترد کیا ہے، اور عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کا بھی یہ ماننا ہے کہ چین کے مشورے تو میسر ہو سکتے ہیں لیکن جنگ میں شرکت کیلئے پاکستانی افواج کی باکمال مہارت نے ایک عالم کو مبہوت کر کے رکھ دیا ہے۔ لیکن سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ اتنی گہرائی تک انٹیلیجنس کی رسائی ممکن کیسے ہوئی؟ کیا یہ داخلی دراڑوں کا نتیجہ ہے یا ٹیکنالوجی کے محاذ پر ہمارا پسماندہ پن؟ اس کیلئے بھی سارا کریڈٹ پاکستان کے ان سپوتوں کو جاتا ہے کہ ان کی شب و روز محنت کا نتیجہ اس حالیہ جنگ میں سب نے دیکھ لیا کہ ایک ہی وار میں انڈیا کے 70٪ گریڈ بیکار کر کے "شاننگ انڈیا" کو ایک لمحے میں تاریک کر دیا۔



لیکن سوال یہ ہے کہ کیوں جنرل انیل چوہان جیسے حساس منصب پر بیٹھے شخص کو ٹی وی پر اعترافِ شکست کا لہجہ اپنانا پڑا؟ اگر الزام بے بنیاد ہوتا تو اسے عالمی میڈیا کی زینت بنانے سے روکا کیوں نہ گیا؟ راہول بیدی کے مطابق پاکستان کو جو کچھ چین سے مل رہا ہے — دفاعی سازو سامان، سیٹلائٹ سے حاصل شدہ تصاویر، انٹیلیجنس کی پوشیدہ لہریں — وہ سب کچھ اس خطرے کی صورت گری کر رہا ہے، جو اب بھارت کے تینوں محاذوں پر سایہ فگن ہے لیکن

کیا وجہ ہے کہ یہ اعتراف اس قدر تاخیر سے کیوں سامنے آرہے ہیں؟ کیا بھارتی فوج کے شکست خوردہ مورال کو چھپانے کی کوشش تو نہیں ہو رہی؟

پاکستانی فضائیہ نے جس ہروپ ڈرون کو مار گرایا، وہ محض ایک پرزہ نہیں، بلکہ ٹیکنالوجی کی وہ شطرنج ہے جس میں صرف چال نظر نہیں آتی، صرف نتیجہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ ڈرون دشمن کے ریڈار کو دھوکہ دے کر ہدف تک خاموشی سے پہنچنے والا ایک مہلک ہتھیار ہے اور جس کے متعلق اسرائیل نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس ڈرون کو دنیا کی کوئی ٹیکنالوجی بشمول امریکا بھی ناکام کرنے کی سکت نہیں رکھتا اور چند ڈرون ہی پاکستان کے سارے دفاعی نظام کو پل بھر میں مفلوج کر سکتے ہیں۔ بھارت نے اسرائیل کے اس دعوے کو تکنیکی طور پر اپنے ہاں آزمائشی استعمال کے بعد تکبر اور فتح کے گھمنڈ میں ان کو استعمال کرنے کیلئے اسرائیلی آپریٹرز کو اپنے ہاں بلا کر اس جنگ میں شریک کر لیا لیکن اگر بھارت کے دفاعی نظام اس کے وجود کو بھی نہ پہچان پائیں، تو یہ صرف تکنیکی مسئلہ نہیں بلکہ قومی سلامتی کی گھنٹی ہے۔

شیطانِ مثلث (امریکا، اسرائیل، انڈیا) کا ماننا ہے کہ اسرائیلی ہاروپ، جنگ کا وہ خاموش کردار ہے جو نہ صرف معلومات لاتا ہے بلکہ خود ہدف بھی بناتا ہے۔ اسرائیل کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ پاکستان کیلئے صرف چند ہاروپ ڈرون ہی کافی ہیں لیکن پاکستان نے نہ صرف 79 ہاروپ ڈرون کا تباہ کیا بلکہ چند ڈرونز کو جام

کر کے زمین پر بحفاظت اتار بھی لیا جس کے بعد اسرائیل جو کبھی اس ڈرون کی ٹیکنالوجی کو شئیر کرنے کیلئے تیار نہیں تھا، اب وہ تمام تکنیکی معلومات طشت ازبام ہو چکی ہیں اور یہ ہی اسرائیل کی ٹیکنالوجی کی سب سے بڑی شکست ہے کیونکہ اس نے اپنے ان ڈرونز کو کامی کار کا نام دے رکھا تھا کہ دشمن کے ہاتھ آنے سے پہلے یہ خود کو تباہ کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پاکستان برسوں سے عسکری محاذ پر بھارت کو آزماتا آرہا ہے، لیکن اب جو فرق آیا ہے، وہ ہے چین کے ساتھ مشترکہ ٹیکنیکل شراکت اور جدید جنگی حکمت عملی کی پشت پناہی، جدید ٹیکنالوجی اور متحدہ محاذ۔ ہاروپ ڈرونز ہوں یا براہموس میزائل کا جواب، پاکستان اب محض جوابی کاروائی نہیں کر رہا، وہ منصوبہ بندی کے ساتھ چالیں چل رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بھارت کی داخلی سیاست، بیرونی پالیسی کو کمزور کر رہی ہے۔ قومی اتحاد کے بغیر، کوئی بھی دشمن کمزور نہیں پڑتا، بلکہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

سوال یہ بھی ہے کہ بھارت کی جانب سے دانغے گئے میزائلوں کو پاکستان کیوں نہ روک پایا؟ اگرچہ میزائل ہدف سے بھٹک گئے، مگر ان کا سفر خطرناک سوالات چھوڑ گیا۔ پاکستان نے دعویٰ کیا کہ اس نے انڈین براہموس میزائل کو ہدف سے بھٹکایا، لیکن کیا یہ سچ ہے یا فقط ایک تکنیکی حادثے کا دعویٰ؟ رفتار میں برق، مگر نگاہ سے اندھے۔ کیا تیز رفتار میزائلوں کو اندھا کیا جاسکتا ہے؟ جدید جنگی سافٹ ویئر میں اس امکان کی گنجائش ضرور ہے، مگر حقیقت بہر حال میدانِ جنگ طے کرتا ہے۔

اس تمام کاروائی کے بعد سوال یہ ہے کہ کیا روایتی دفاع اب کافی ہے؟ اور پھر سوال یہ بھی ہے کہ بھارت کی جانب سے دانغے گئے کچھ میزائلوں کو پاکستان کیوں نہ روک پایا؟ اور یہی معاملہ انڈیا کے ساتھ بھی پیش آیا۔ کیا وجہ تھی کہ انڈیا جس کی پشت پر امریکا اور یورپی ممالک کے سول ایئر ٹیکنالوجی کے معاہدے اپنی پوری طاقت کے ساتھ ہم پلہ تھے اور ان سب طاقتوں کا تعاون بھی بھارت کو پاکستان کے ان آہنی پرندوں کے نشانے سے بچانہ سکے، بلکہ دشمن کے دل میں بیہوش ہو کر انہوں نے تاریخ میں اپنا نام لکھوایا۔ اسرائیلی ڈرون کے 21 کے قریب ہاروپ ڈرونز آپریٹر ز آدم پور میں پاکستان پر حملے کرنے میں مصروف تھے لیکن پاکستان نے خود پر شدید دباؤ کے باوجود جب جواب دیا تو آدم پور میں کے پرچے اڑ گئے اور انڈیا نے جب رات کے اندھیرے میں 18 اسرائیلیوں کے تابوت تل ابیب پہنچائے تو اسرائیل کے ہاں کہرام مچ گیا لیکن مودی کی ڈھٹائی اپنی جگہ پر اب بھی قائم ہے کہ وہ اعترافِ شکست کی بجائے اپنے سندور آپریشن کو جاری رکھنے کی دہمکیاں دے رہا ہے۔

مودی حکومت پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اس نے قومی نقصان کو چھپانے کی دانستہ کوشش کی۔ انڈین دفاعی اتاشی کا یہ اعتراف — کہ "چند طیارے کھوئے گئے" — محض عسکری اعداد و شمار کا انکشاف نہیں بلکہ سیاسی ننگا پن ہے۔ اگر بلومبرگ ٹی وی پر نقصانات کا اعتراف ممکن ہے، تو اپنے ملک میں سچ کیوں چھپایا گیا؟ خود انڈین عوام مودی سے سوال کر رہی ہے کہ اگر غیر ملکی میڈیا جیسے بلومبرگ پر لب کشائی ممکن ہے، تو دہلی کے ایوانوں میں خاموشی کیوں؟ جہاں حکمت، سیاست پر غالب آتی ہے، وہاں رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ قوم کو فقط جھوٹے فخر کی افیون سے نہ بہلائیں، بلکہ حقیقت کا آئینہ بھی دکھائیں۔ کیونکہ شیشے کا محاذ لکڑی کی ڈھال سے نہیں روکا جاسکتا۔ یہی وہ نکتہ ہے جو مودی حکومت کے بیانے کو مشکوک بناتا ہے۔ کیا قومی فخر کا مطلب سچائی کو دفن کرنا ہے؟ تو میں سچائی سے بنتی ہیں، پروپیگنڈے سے نہیں۔

پاکستانی جے 10 سی اور انڈین رافال کے درمیان متوقع ڈاگ فائٹ صرف ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہیں تھا بلکہ عسکری نظریات اور قومی اعتماد کا امتحان بھی ثابت

ہوا۔ یہ "ڈاگ فائٹ" صرف دو جہازوں کی ٹکر نہیں، بلکہ دو نظریات، دو ریاستی فکر، اور دو عسکری ماڈلز کا تصادم تھا۔ دنیا کی نظریں اس معرکے پر اسی لیے تھیں کیونکہ جو جیتے گا، وہ صرف جنگ نہیں جیتے گا۔ وہ اگلی دہائی کا عسکری بیانیہ لکھے گا۔ رفال کی قیمت، رفتار اور اسٹائل، بمقابلہ جے 10 سی کی سادگی، پاک چین کی مشترکہ کاوش اور مہارت۔ اس جنگ کی گواہی صرف آسمان نے نہیں دی بلکہ اس کے واضح اثرات زمین پر بھی محسوس کئے گئے۔

انڈین وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے یہ اعتراف کیا کہ 9 مئی کی رات امریکی نائب وزیر خارجہ نے وزیر اعظم مودی سے کہا کہ اگر ہم نے کچھ شرائط تسلیم نہیں کیں تو پاکستان انڈیا پر بہت بڑا حملہ کرے گا۔ یہ بیان محض سفارتی چال نہیں بلکہ عالمی طاقتوں کی بدلتی ترجیحات کا عکس ہے۔ سوال یہ ہے کہ امریکا کو اس حد تک تشویش کیوں ہوئی؟ کیا برصغیر میں کوئی نیا عسکری توازن بن رہا ہے؟ یا پھر، بھارت کو اس کی محدود حیثیت کا شعور دلایا جا رہا ہے؟

انڈیا اور پاکستان کے درمیان حالیہ کشیدگی صرف توپوں اور ٹینکوں کی گھن گرج نہیں تھی، بلکہ ایک ذہنی جنگ بھی تھی۔ 88 گھنٹے پر محیط یہ تنازعہ سفارتی دباؤ، عسکری چالاک، اور میڈیا کے بیانیے کا ایسا امتزاج تھا، جو شاید آنے والے دنوں میں برصغیر کی سیاست کا رخ موڑ دے گا۔ انڈیا، پاکستان کے درمیان حالیہ کشیدگی نے ایک مرتبہ پھر ہمیں یہ یاد دلایا ہے کہ برصغیر کی تاریخ محض نصاب کی عبارت نہیں، بلکہ خون سے لکھی گئی تحریر ہے۔ ان 88 گھنٹوں میں جو کچھ گزرا، وہ محض واقعات نہیں، آئندہ کی تیاری کا پیش لفظ ہے۔

سنا تھا کہ جو بادل گرجتے ہیں، وہ برستے نہیں ہیں لیکن کبھی کبھار گرج چمک کے ساتھ آنے والا طوفان زمینی حقائق کے ساتھ کئی عبرت کے اسباق بھی ساتھ لاتا ہے۔ یہ وقت بیداری کا ہے، تصادم سے پہلے تدبر کا۔ اگر بھارت اپنی داخلہ سیاست کی مصنوعی چمک میں بین الاقوامی سچائیوں کو نظر انداز کرتا رہا، تو آنے والا وقت شاید اپنے ساتھ صرف سوال نہیں، پچھتاوے بھی لائے گا۔

یہ محض ابتدائیہ نہیں، ایک گھنٹی ہے، وہ گھنٹی جو یا تو جاگنے کی صدا ہے، یا زوال کی آخری گونج۔ قومیں اپنی غلطیوں سے نہیں، اپنے غرور سے مٹی ہیں۔ آج اگر بھارت کو تاریخ سے کوئی سبق سیکھنا ہے تو وہ یہی ہونا چاہیے کہ تدبیر سے پہلے تقدیر کا انتظار تباہی کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔ اگر ہم نے تاریخ کو نظر انداز کیا، تو تاریخ ہمیں بھی نظر انداز کر دے گی۔

استحصا کی قیمت: ہجرت کی لہر

یورپ نے نقل مکانی روکنے کیلئے طاقت کا استعمال کیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ معاشی استحصا کی پالیسی پر عمل روکنے کی ضرورت ہے۔ افریقا سے نقل مکانی کا رجحان اس لیے پروان چڑھا ہے کہ اس براعظم کے وسائل کا بلا درلغ استحصا کیا جا رہا ہے۔ لازم ہو گیا ہے کہ یہ رجحان روکا جائے۔

۷۷ء جنوری کو اطالوی پارلیمنٹ نے ۷۰ فوجی افریقی ملک نائیجر میں تعینات کرنے کی منظوری دی۔ اس اقدام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نائیجر کے باشندوں کو لیبیا جانے سے روکا جاسکے۔ لیبیا سے یہ لوگ یورپ کی راہ لیتے ہیں۔ فرانس، جرمنی اور اسپین نے بھی ایسے ہی اقدامات کیے ہیں۔ افریقا سے یورپ کی طرف نقل مکانی روکنے کیلئے ان یورپی طاقتوں کو اور کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا۔

افریقا سے نقل مکانی روکنے کیلئے طاقت کا استعمال انوکھا یا راتوں رات رونما ہونے والا واقعہ نہیں۔ یورپ میں اس حوالے سے بہت سوچا گیا ہے۔ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تھنک ٹینک کی سطح پر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ فی الحال طاقت کے ذریعے افریقی آبادی کو یورپ کی طرف آنے سے روکا جائے۔ حکومتوں نے اہل دانش کی آراء کی روشنی میں چند ایک اقدامات کیے ہیں۔ اور ان اقدامات کے ملے جلے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

افریقا سے یورپ کی طرف نقل مکانی میں ایک طرف تو این جی اوز کا کردار ہے اور دوسری طرف منظم جرائم کے گروہ بھی فعال ہیں۔ یہ سب کچھ ایک منظم نیٹ ورک کے ذریعے ہو رہا ہے۔ یورپ نے افریقیوں کو ان کے گھروں تک محدود رکھنے کے حوالے سے اب تک جو اقدامات کیے ہیں وہ ان کی دانست میں درست ہی ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے دور رس اور مثبت اثرات رونما ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ افریقی ممالک میں معیشت کا ڈھانچا کچھ اس طرح کا ہے کہ لوگ مجبور ہو کر دیگر ترقی یافتہ خطوں کی طرف دیکھتے اور لپکتے ہیں۔ قدرتی وسائل کو بہتر انداز سے بروئے کار لانے کا قاعدہ نظام موجود نہیں۔ سیاسی استحکام برائے نام ہے۔ سیاسی تبدیلیوں کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم رہتا ہے۔ ایسے میں لوگ ملک سے نکل بھاگنے کو بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔

یورپی طاقتیں افریقا سے نقل مکانی روکنے کیلئے جو کچھ کر رہی ہیں وہ قلیل المیعاد بنیاد پر تو چند ایک اثرات کا حامل ہو سکتا ہے مگر طویل مدتی بنیاد پر ایسا کرنے کے فوائد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ افریقا میں موجودہ اور آنے والی نسلوں کو معیشتی، سیاسی اور معاشرتی ساخت کے اعتبار سے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ایسا کچھ نہیں کیا جا رہا اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہیں ہو گا مرضی کے نتائج بھی برآمد نہیں ہوں گے۔ افریقا کے کئی ممالک تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان میں نائیجیر یا سب سے نمایاں ہے۔ نائیجیر یا میں تیل کے ایک بڑے بلاک میں مجموعی طور پر کم و بیش ۹۷ ارب بیرل تیل موجود ہے، یہ بلاک ساحلی علاقے میں ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے پندرہویں صدی عیسوی میں ایک کروڑ بیس لاکھ غلاموں کو امریکالے جایا گیا تھا اور یہیں سے سب سے زیادہ لوگوں نے ۲۰۱۶ء میں نقل مکانی کر کے اٹلی کی سر زمین پر قدم رکھا۔ نائیجیر یا افریقا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے۔

یورپ سے تعلق رکھنے والی تیل اور گیس کی کمپنیوں نے نائیجیر یا سے تیل اور گیس کے حصول کیلئے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ نائیجیر یا میں صحت عامہ کے حوالے سے بہت سے مسائل ہیں۔ اگر یورپی طاقتیں تیل حاصل کرنے کیلئے خرچ کی جانے والی رقم کا بہت تھوڑا سا حصہ بھی صحت عامہ پر خرچ

کریں تو نائیجیریا میں لوگ سکون کا سانس لیں اور انہیں اپنی ہی سر زمین پر زندگی بسر کرنے میں کچھ زیادہ قباححت محسوس نہ ہو۔ باضابطہ ریاستی ڈھانچا اور شفافیت نہ ہونے کے باعث تیل اور گیس کے سودوں سے عوام کو کچھ نہیں ملتا۔ یورپی آئل کمپنیاں جو ڈیل کرتی ہیں ان کے نتیجے میں چند بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ چند ایک منی لانڈرز بھی اس سیٹ اپ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نائیجیریا کے عوام کی زندگی میں ان سودوں سے کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ بڑے ممالک کے ادارے غریب ممالک کے قدرتی وسائل کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ اپریل ۲۰۲۵ (نائیجیریا) آئل بلاک ہے، یعنی وہ علاقہ جہاں تیل مرتکز ہے۔ پاناما پیپرز سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ امریکا اور یورپ کے بڑے اداروں کیلئے کام کرنے والے بہت سے اداروں نے افریقا اور بحیرہ روم کے کنارے آباد غریب ممالک کے قدرتی وسائل کی بندربانٹ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایندھن، سونا اور گیس اس طور نکالا گیا ہے گویا لوٹا جا رہا ہو۔

عام تصور یہ ہے کہ یورپ بہت فراخ دل ہے اور بہت سے غریب اور تباہ حال ممالک کے لوگوں کو پناہ گزینوں کی حیثیت سے قبول کر رہا ہے۔ یہ تاثر یا تصور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ یورپ اگر لاکھوں پناہ گزینوں کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے کہ اس مسئلے کو پروان چڑھانے میں خود یورپ ہی نے کلیدی کردار بھی ادا کیا ہے۔ چند دیگر مسائل سے نمٹنے کیلئے بھی توجہ درکار ہے۔

یورپ کو افریقا کے غریب ممالک کی بھرپور مدد کیلئے آگے آنا ہو گا۔ ایک طرف تو یورپی یونین کو اپنی منڈیاں افریقی مال کیلئے کھولنا ہوں گی اور دوسری طرف افریقا کے خام مال کو بٹورنے سے گریز کرنا ہو گا۔ افریقا سے جو فوائد یورپ نے بٹورے ہیں، ان کے فوائد افریقی آبادیوں کو دینا ہوں گے۔ کروڑوں افراد انتہائی پس ماندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ معیشتوں کی ساخت تبدیل کر کے ترقی کی راہ ہموار کرنا ہو گی تاکہ عمومی معیار زندگی بلند ہو اور لوگ بہتر انداز سے جینے کے قابل ہو سکیں۔ افریقا کے انتہائی پسماندہ ممالک کی پائیدار ترقی یقینی بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔

افریقا اور بالخصوص شمالی افریقا کے عوام کو بہتر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں متمول عرب ریاستیں بھی اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اس حوالے سے سعودی عرب، قطر، کویت، متحدہ عرب امارات اور بحرین وغیرہ کو اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔

شام اور یمن میں جاری لڑائی کو سلسلہ اب رک گیا ہے۔ شام ایک مرتبہ پھر اقوام عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کیلئے اپنی تنگ دود میں مصروف ہے۔ یمن میں بھی جنگ کا سلسلہ تھم گیا ہے لیکن ابھی تک گروہوں کی تفریق باقی ہے۔ ان دونوں ممالک کے حالات کی بہتری کیلئے عرب ممالک کو اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنا ہو گا۔ یورپ سے اسلحے کی کھپیسیں اس خطے میں بھیجی جا رہی ہیں۔ بلقان کا خطہ اس حوالے سے نمایاں ہے۔ اگر شام اور یمن سمیت خطے کو حقیقی معنوں میں پر امن بنانا ہے تو لازم ہے کہ سعودی عرب، کویت اور دیگر متمول اور بااثر ممالک اپنا کردار ادا کریں۔ جب تک ان دونوں ممالک میں لڑائی ختم نہیں ہوگی تب تک نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں بھی کمی واقع نہیں ہوگی۔ نائن الیون کے بعد جارج بش جو نیوز نے انتہائی نا انصافی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان اور عراق کو نشانہ بنایا اور دونوں ممالک کو تباہی سے دوچار کر دیا۔ تب سے اب تک دونوں ممالک میں دہشت گردی کا سلسلہ تھما نہیں ہے۔

افغانستان پہلے ہی تباہ حال تھا۔ نائن الیون کے بعد اس کی تباہی کا دائرہ پھیل گیا۔ دوسری طرف عراق مجموعی طور پر پرسکون ملک تھا مگر جارج بش جو نیوز نے یورپ کے ساتھ مل کر اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہنستا کھیلتا ملک کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا۔ عراق کی تباہی سے لیبیا کی تباہی کی راہ بھی ہموار ہوئی اور یوں مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام کا دائرہ پھیل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ شمالی افریقہ میں بھی خرابیوں کا آغاز ہوا۔

افریقہ میں پسماندگی اور خرابی بہت زیادہ ہے۔ یورپ چونکہ جڑا ہوا خطہ ہے اس لیے آنے والے برسوں میں نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس وقت افریقہ کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے۔ 2050ء تک افریقہ کی آبادی ڈھائی ارب تک پہنچے گی۔ اگر پسماندگی دور نہ کی گئی اور معیشتوں کو مستحکم کرنے پر توجہ نہ دی گئی تو افریقہ سے یورپ کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یوں انسانی المیے جنم لیتے رہیں گے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ یورپ میں شرح پیدائش گھٹتی جا رہی ہے۔

بیشتر یورپی اقوام کو گھٹتی ہوئی آبادی کے مسئلے کا سامنا ہے۔ شمالی افریقہ سے آنے والوں کو روکنے کیلئے یورپ کو زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کرنا ہوگی۔ یہ سب کچھ ایسا آسان نہیں جیسا سوچا اور کہا جا رہا ہے۔ یورپ کو سب سے پہلے تو افریقہ کے قدرتی وسائل کی بندر بانٹ روکنا ہوگی۔ اس وقت یورپ کے بہت سے ادارے افریقی قدرتی وسائل کو آنکھ بند کر کے بٹور رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں افریقہ کے لوگوں میں یہ احساس جنم لے رہا ہے کہ جنہوں نے ہمارا برا حال کیا ہے انہی کی طرف نقل مکانی کی جانی چاہیے۔ یورپ کو افریقہ میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کرنی چاہیے اور دوسری طرف یورپی منڈیاں افریقی مال کیلئے کھولنی چاہئیں تاکہ افریقی معیشتیں خاطر خواہ حد تک پنپ سکیں۔ جب افریقہ میں معیشتیں مضبوط ہوں گی اور لوگوں کو بہتر زندگی بسر کرنے کے مواقع ملیں گے تو وہ کہیں بھی جانے سے گریز کریں گے۔

ساتھ ہی ساتھ یورپ کو یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں جنگ سے تباہ حال ممالک میں اسلحے کی فراہمی جاری نہ رہے۔ بالخصوص یمن میں متحارب دھڑوں کو اسلحے کی فراہمی روکنا ہوگی۔ افریقہ سے ہر سال لاکھوں افراد موسم کی تبدیلی کے باعث بھی یورپ کی طرف نقل مکانی کرتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کیلئے ۶۱ ارب یورو مختص کیے گئے ہیں۔ یہ فنڈ قانونی طریقے تلاش کرنے پر خرچ کیے جانے چاہئیں۔ معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی ضرورت ہے اور یہ کہ معاملہ کرائسز مینجمنٹ سے ایک قدم آگے بڑھ کر کرائسز پریوینشن کا ہے۔ افریقہ سے آنے والوں کو روکنے کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ یورپ کی طرف نہ آئیں۔ یعنی انہیں ان کے گھر میں بہترین امکانات سے ہمکنار کیا جائے۔

ایک بڑا اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یورپ کے مقابلے میں مشرق وسطیٰ اور افریقہ کو انتہائی پسماندہ اور وحشی معاشرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ اگر کوئی خطہ پیچھے رہ گیا ہے تو اسے پسماندگی کا طعنہ دینے کے بجائے اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ انہیں وحشی اور جاہل قرار دینے سے



معاملات صرف بگڑیں گے۔ اس حوالے سے سوچ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ باصلاحیت خطوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جانی چاہیے تاکہ وہ بھی عالمی سطح پر ترقی کے عمل کا حصہ بن سکیں اور اس دنیا کو زیادہ سے زیادہ قابل سکونت بنانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

یورپ کو الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی ترک کی جانی چاہیے۔ یورپ نے فقید

المثال ترقی کی ہے تو بہت کچھ بھلا بھی دیا گیا ہے۔ یہ تاثر دیا جا رہا ہے جیسے یورپ ہزاروں سال سے ایسا ہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ اور افریقا کے متعدد ممالک بھی علم و فن میں آگے رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور مشرق وسطیٰ علم و فن کے حوالے سے منور تھا۔ اس حقیقت کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پانچ سو سال پہلے یورپ بھی جہل کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپ کو اپنا رویہ بدلنا ہو گا۔ انہیں یہ سوچتے رہنے سے گریز کرنا ہو گا کہ وہ بہت برتر ہیں اور باقی سب کمتر اور جاہل ہیں۔ کمزور خطوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے وقت انہیں یاد رہنا چاہیے کہ وہ خود بھی کسی زمانے میں ایسے ہی تھے۔ اور یہ کہ اُس زمانے کو گزرے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔

بروز جمعۃ المبارک 25 محرم الحرام 1447ھ 25 جولائی 2025ء

امریکی آئین، مذہب اور مسلمان

تیسرے امریکی صدر اور اعلان آزادی کے خالق تھامس جیفرسن کے پاس نہ صرف یہ کہ قرآن کا نسخہ تھا بلکہ انہوں نے اسلام کو امریکی معاشرے کی تصویر کے ایک ممکنہ رنگ کے طور پر دیکھا اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ یقینی بنانے کی کوشش بھی کی۔ تھامس جیفرسن نے مسلمانوں کو نئی ابھرتی ہوئی امریکی ریاست کے ممکنہ شہریوں کے روپ میں دیکھا۔ امریکا کا اعلان آزادی تحریر کرنے سے گیارہ سال قبل انہوں نے قرآن کا نسخہ خریدا تھا۔ تھامس جیفرسن کا قرآن کا وہ نسخہ آج بھی کانگریس کی لائبریری میں محفوظ ہے اور امریکیوں کے اجداد اور اسلام کے تعلقات کی علامت ہے۔ امریکی راست گودانشوروں کیلئے یہ تعلقات آج بھی غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

تھامس جیفرسن کے پاس قرآن کے نسخے کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لیتے تھے مگر اس امر کی وضاحت نہیں ہوتی کہ وہ مسلمانوں کے مسائل کا حل بھی چاہتے تھے۔ تھامس جیفرسن نے بنیادی حقوق پر اسلامی تصور سے پہلی شناسائی سترہویں صدی کے انگریز فلسفی جان لاک کی تحریروں سے حاصل کی۔ جان لاک نے یورپی معاشروں پر زور دیا تھا کہ وہ مسلمانوں اور یہودیوں کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کریں۔ جان لاک نے ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی تھی جنہوں نے یہ نکتہ ایک صدی قبل سمجھ لیا تھا۔ مسلمانوں کے حقوق سے متعلق تھامس جیفرسن کا تصور بحیرہ اوقیانوس کے آر پار سولہویں سے انیسویں صدی عیسوی تک کے فکری ارتقا کی روشنی میں زیادہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

جب یورپ میں عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان لڑائی شروع ہوئی تب بہت سے عیسائیوں نے مسلمانوں کو اس امر کی نشانی کے طور پر آزمایا کہ نظریاتی معاملات میں تمام مذاہب کے پیروکاروں کے حوالے سے تحمل اور رواداری کی حد کیا ہو سکتی ہے۔ یورپ میں قائم ہونے والی نظیروں کی بنیاد پر امریکا میں بھی مسلمان، ”شہریت کی حدود اور رواداری“ کے حوالے سے بحث کا موضوع بن گئے۔ نئی حکومت کی تیاریوں کے دوران جب امریکا کے بانیان نے (جو تمام کے تمام پروٹسٹنٹ تھے) مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والوں کو دی جانے والی مذہبی آزادی کے بارے میں غور کیا تو اس حوالے سے اسلامی دنیا میں پائی جانے والی نظیروں کے حوالے دیے۔

امریکا کی بانی نسل نے اس نکتے پر خصوصی بحث کی کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا کو مذہبی اعتبار سے پروٹسٹنٹ ہونا چاہیے یا تمام مذاہب کے پیروکاروں کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہیے۔ اس نکتے پر بھی پورے اہتمام سے بحث کی گئی کہ اگر تمام مذاہب کے پیروکاروں کو قبول ہی کرنا ہے تو کیا کسی بھی غیر پروٹسٹنٹ کو صدر کے منصب تک پہنچنے کی اجازت دی جانی چاہیے؟ اس سے انہیں مذہبی آزادی سے متعلق امور پر غور کرنے کی تحریک ملی۔ انہوں نے کئی باتیں سوچیں۔ مثلاً یہ کہ کیا امریکا میں کوئی ایسی اسٹیبلشمنٹ قائم ہونی چاہیے، جو پروٹسٹنٹ فرقے کو تحفظ فراہم کرتی ہو۔ اس کا بنیادی مقصد مذہب کو ریاست سے الگ رکھنے کا انتظام یقینی بنانا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ آئین میں مذہب سے متعلق ٹیسٹ کا معاملہ بھی شامل کیا جانا تھا، جیسا کہ انیسویں صدی تک ریاستوں میں رہا۔

مسلمانوں کی شہریت کے خلاف مزاحمت کا تصور اٹھارہویں صدی تک حیرت انگیز نہ تھا۔ امریکیوں کو یورپ سے مذہب کے پیشوا یا نہ اور سیاسی کردار پر کم و بیش ایک ہزار سال کے منفی خیالات ترکے میں ملے تھے۔ مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے منفی تاثر کے باوجود یہ بات حیرت انگیز ہے کہ امریکا کے ابتدائی دور کی چند اہم ترین شخصیات نے اس تصور کو مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کو امریکا کے متوقع شہریوں کی حیثیت سے سوچا ہی نہ جائے۔

بانیانِ امریکا نے مسلمانوں کا ایسے شہریوں کے روپ میں تصور کیا جنہیں تمام حقوق میسر ہوں۔ مسلمانوں کے حقوق کے دفاع سے متعلق بانیانِ امریکا یہ حیرت انگیز موقف دراصل یورپ میں سیاسی فکر کے ہزار سالہ ارتقا کا منطقی نتیجہ اور اس کی توسیع کے مترادف تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شدید مخالفت کی فضا میں بھی مسلمانوں کو تمام حقوق کے ساتھ شہری بنانے کا تصور امریکا میں کیوں کر محفوظ رہا؟ اور اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ اس تصور کا اکیسویں صدی میں مستقبل کیا ہے؟

یہ کتاب ہمیں امریکا کے قیام کے ابتدائی دور میں چند نمایاں شخصیات کے ان تصورات سے آگاہ کرتی ہے، جو وہ اسلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں پائی جانے والی منفی آرا کو جوں کا توں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یورپ نے انہیں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں برداشت کا رویہ نہ اپنانے کی غیر محسوس تعلیم دی تھی، مگر انہوں نے اس تعلیم کو قبول نہ کیا۔

امریکا کے بیشتر پروٹسٹنٹ باشندے یہ تصور رکھتے تھے کہ مسلمانوں کے خیالات کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے ایک طرف تو پروٹسٹنٹس میں "اسٹیٹس کو" کی راہ ہموار ہوئی اور دوسری طرف امریکا کے دیگر باشندے یہ سوچنے پر مائل ہوئے کہ دوسروں کی بات سننے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایک طرف اگر مسلمانوں کو قبول نہ کرنے کی سوچ پروان چڑھی تو دوسری طرف امریکیوں کی اکثریت نے یہ سوچنا شروع کیا کہ دیگر مذاہب کے لوگوں کو بھی قبول کرنا چاہیے تاکہ معاشرے میں امتیازی رویہ نہ پایا جائے۔ اس صورت میں مسلمانوں کو بھی اپنانے کا شعور پیدا ہوا۔

یہ سب کچھ اس وقت سوچا جا رہا تھا جب مسلمان ابھی امریکا میں آئے نہ تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہی انہیں قبول کرنے کی سوچ پروان چڑھائی جا رہی تھی۔ تھامس جیفرسن اور ان کے قریبی رفقاء بخوبی جانتے اور سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں سوچنے اور بحث کرنے سے امریکا میں حقوق کے حوالے سے آفاقیت کی راہ ہموار ہوگی۔ اور پھر یہ ہوا کہ امریکا میں اقلیتوں (کیتھولک عیسائی اور یہودی) کو قبول کرنے اور معاشرے کے مرکزی دھارے میں شامل کرنے کے حوالے سے فکر آگے بڑھی۔ مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث نے امریکا میں یہ تصور پیدا کیا کہ سب کو کھلے دل سے قبول کیا جائے۔

امریکا کو برطانیہ سے حقیقی آزادی 1783ء میں ملی۔ اس سال جارج واشنگٹن نے نیویارک میں سکونت پذیر آئرش کیتھولک عیسائیوں کو خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف 25 ہزار کیتھولک عیسائی تھے، جن کے حقوق خاصے محدود تھے۔ انہیں نیویارک میں کسی بھی طرح کی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے کی اجازت بھی نہیں دی گئی تھی۔ جارج واشنگٹن نے اس نکتے پر زور دیا کہ امریکا کو ہر مذہب اور فرقے سے تعلق رکھنے والے ان لوگوں کو قبول کرنا چاہیے جن پر مظالم ڈھائے گئے ہوں اور جنہیں مستقل دباؤ میں رکھا گیا ہو۔ انہوں نے یہودیوں کو بھی خط لکھا۔ تب تک امریکا میں صرف دو ہزار یہودی تھے۔ جارج واشنگٹن چاہتے تھے کہ امریکی سرزمین پر دنیا بھر کے کچلے ہوئے لوگوں، بالخصوص مذہب کے نام پر نشانہ بنائے جانے والوں کو پناہ ملے۔

1784ء میں جارج واشنگٹن نے ماؤنٹ ورنن کے مقام پر اپنے گھر پر مسلمانوں کے حوالے سے اپنے خیالات کو پوری طرح کھول کر رکھ دیا۔ ورجینیا سے کسی دوست نے جارج واشنگٹن کو لکھا کہ اسے اپنا گھر بنانے کیلئے ایک بڑھئی اور ایک مستری (معمار) کی ضرورت ہے۔ جارج واشنگٹن نے اسے لکھا کہ کسی بھی مکان کی تعمیر یا فرنیچر کی تیاری میں اس امر کی کوئی اہمیت نہیں کہ کاریگر کس مذہب، فرقے، رنگ یا نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا کاریگر ایشیا، افریقا یا یورپ کا ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان، عیسائی یا یہودی ہو۔ یا پھر یہ کہ وہ کسی مذہب پر یقین ہی نہ رکھتا ہو۔ اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ جارج

واشنگٹن کے فکری دھاروں میں مسلمان بھی بہتے تھے۔ انہوں نے ”امریکا سب کیلئے“ کے تصور میں مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا ہے جارج واشنگٹن کو اندازہ ہو کہ کسی بھی شعبے میں کوئی کردار ادا کرنے کیلئے ابھی بہت دنوں تک مسلمان نمودار نہیں ہوں گے۔

ہمیں مختلف ذرائع سے معلوم ہو چکا ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں بھی امریکا میں مسلمان سکونت پذیر تھے مگر تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں کو بہر حال ان کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ تھامس جیفرسن اور ان کے ساتھیوں نے مسلمانوں کو مستقبل کے امریکی شہری تصور کرتے ہوئے ان کا ذکر کیا تھا۔ جارج واشنگٹن اور تھامس جیفرسن کی تحریروں اور تقاریر میں مسلمانوں کا ذکر بلا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں عظیم شخصیات مسلمانوں کے حوالے سے پائے جانے والے دو متضاد یورپی رویوں اور تصورات کی وارث تھیں۔

ایک تصویر یہ تھا کہ اسلام کی تعلیمات پروٹسٹنٹ عیسائیت کی تعلیمات کے یکسر منافی بلکہ اس سے متضاد ہیں اور یہ کہ جابرانہ حکومتوں کے قیام میں بھی اسلامی نظریات نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ مسلمانوں کو امریکا کے پروٹسٹنٹ معاشرے میں قبول کرنے کا مطلب ایک ایسی برادری کو قبول کرنا تھا جس کے مذہب اور اس سے متعلق تصورات کو یورپ نے غلط، اجنبی اور خطرناک قرار دیا تھا۔ معاملہ مسلمانوں تک محدود نہ تھا۔ امریکی پروٹسٹنٹ تو کیتھولک عیسائیوں کے نظریات کو بھی اسی طرح اجنبی اور خطرناک قرار دیتے تھے۔ کیتھولک کو بھی آزادی کے امریکی تصورات اور وسیع النظری کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔

جیفرسن اور نان پروٹسٹنٹ شہریت کی حامی دیگر شخصیات نے آئین کے بنیادی ڈھانچے کے ساتھ ساتھ ایک اور فکری دھارے کو پروان چڑھانے میں معاونت کی، جس کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں کو قبول کرنے کی راہ بھی ہموار ہوتی تھی۔ سولہویں صدی کے جن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے اپنے اپنے نظریات کی تبلیغ کی تھی، انہوں نے ان کیلئے جان بھی دی تھی۔

سترہویں صدی عیسوی میں یورپ کے جن لوگوں نے تمام مذاہب کو قبول کرنے اور تمام ثقافتوں اور نسلوں کے لوگوں کو اپنے ہاں قابل قبول قرار دینے کی بات کی تھی انہیں سزائے موت یا پھر قید یا مشقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہتوں کو ان نظریات کی بنیاد پر ملک سے نکال دیا گیا۔ اس معاملے میں امیر و غریب اور بے کس و طاقتور کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اشرافیہ میں سے بھی جن لوگوں نے تمام مذاہب کے لوگوں کو اپنانے کی بات کی، انہیں شدید مخالفت اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ یورپ میں رومن کیتھولک چرچ سے متضاد نظریات رکھنے والے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کسان تھے، سیاسیات سمیت مختلف علوم کے ماہرین تھے یا پھر اول اول انگریز میپسٹ۔ ان میں کوئی بھی سیاسی قوت رکھنے والا یا اعلیٰ معاشرتی حیثیت کا حامل شخص نہ تھا۔ مذہب کے لگے

بندھے نظریات سے ہم آہنگی نہ رکھنے والے اگرچہ منظم نہ تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے منظم فکر رکھنے والے مسلمانوں کو عیسائی ریاستوں میں ایذاؤں سے بچانے کیلئے خاصی وسیع جدوجہد کی۔



اٹھارہویں صدی کی پہلی تہائی میں سٹیبلشمنٹ کے رکن اور ورجینیا کے ایک اعلیٰ سیاست دان کی حیثیت سے تھامس جیفرسن نے وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ میں اپنے پیش کرنے والوں پر شدید لعن

طعن کا سبب بنے تھے اور بہتوں کو تو سزائے موت کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ تھامس جیفرسن چونکہ خود اسٹیبلشمنٹ سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے مسلمانوں کے حقوق سے متعلق ان کا موقف ورچینیا میں پوری توجہ سے سنا گیا۔ چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر تھامس جیفرسن نے نوزائیدہ ریاست ہائے متحدہ امریکا میں وہ تصورات پیش کیے، جو اس سے قبل یورپ کے مرکزی دھارے سے بہت دور جو ہڑکی شکل میں اپنی وقعت کھو بیٹھے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ تھامس جیفرسن نے تمام مذاہب کے لوگوں کو قبول کرنے اور ہر مذہب کے پیروکاروں کے حقوق کو سرکاری مداخلت سے مبرا رکھنے کا تصور پیش کیا اور ان پر مبارک باد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ مخالفین نے ہر قدم پر ان کیلئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے حلقوں میں جیفرسن کو غیر معمولی وقعت ملی۔ پریسبٹیرینز اور میٹھسٹس سمیت بہت سی ایسی برادریوں نے جیفرسن کی بات پر مسرت کا اظہار کیا جو پروٹسٹنٹس کی جانب سے جبر کا سامنا کرتے رہے تھے۔ ویسے تو خیر امریکی معاشرے کا کوئی بھی طبقہ غیر پروٹسٹنٹس کو جامع امریکی شہریت دینے کے حق میں نہ تھا، مگر پھر بھی مسلمانوں کیلئے ان کے دلوں میں نرم گوشہ ضرور تھا۔

مسلمانوں کے حقوق کے حوالے سے بحث شروع کرنے والے جو کچھ کہہ رہے تھے، وہ اٹھارہویں صدی کے معاشرے میں محض فکری یا نظری سطح پر بھی خاصا اجنبی اور ناقابل قبول تھا۔ تب تک امریکی شہریت کا حقدار وہی سمجھا جاتا تھا جو پروٹسٹنٹ، سفید فام اور مرد ہو۔ شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنا لازم تھا۔ ورچینیا میں اس حوالے سے قانون سازی تو ایک بڑے سفر کی محض ابتدا تھی۔ تھامس جیفرسن، جارج واشنگٹن اور جیمز میڈیسن نے شہریت کے معاملے کو مذہب سے الگ کرنے کا عمل شروع کیا تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ انہوں نے اپنی سیاسی کیریئر کے دوران اس آدرش کے حصول کیلئے غیر معمولی محنت کی مگر مکمل کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ وہ اپنا دھور اکام بعد میں آنے والوں کیلئے فریضے کے طور پر چھوڑ گئے۔ یہ کتاب پہلی بار اس امر پر بحث کرتی ہے کہ کس طور جیفرسن اور ان کے ساتھی، اسلام کے بارے میں اپنے نامکمل اور مبہم تصورات کے باوجود، مسلمانوں سمیت تمام نان پروٹسٹنٹ افراد کے شہری حقوق کیلئے متحرک رہے۔

جارج واشنگٹن نے جب ۱۷۸۷ء میں مسلمانوں کو محنت کشوں کی حیثیت سے امریکا آنے کی اجازت دینے کی وکالت کی، اس سے ایک عشرہ قبل انہوں نے اپنی محصول پذیر املاک میں افریقی نسل کی دو عورتوں کا ذکر بھی کیا تھا، جو ماں بیٹی تھیں۔ ایک کا نام فاطمہ اور دوسری کا فاطمہ صغیرہ تھا۔ جارج واشنگٹن نے مسلمانوں کو امریکی شہریت دینے کی وکالت کی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو غلام کی حیثیت سے خرید کر انہوں نے خود ہی ان کے بنیادی حقوق کی راہ مسدود کی تھی۔ واضح رہے کہ تب تک غلام مسلمانوں کو اپنے مذہب پر کاربند رہنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جیفرسن اور میڈیسن کی جاگیروں اور زرعی اراضی پر بھی یہی حقیقت پائی گئی ہو۔

مگر خیر، ان کے غلاموں کے مذہب کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں مغربی افریقا سے محنت کشوں کے طور پر لائے گئے مسلم غلاموں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ یہ تعداد امریکا میں آباد کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں سے کہیں زیادہ رہی ہوگی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے سابق مسلم غلاموں نے کانٹی نینٹل آرمی میں بھی خدمات انجام دی ہوں۔ مگر خیر، اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ اپنے مذہب پر کاربند رہے ہوں اور یہ بھی ثابت نہیں کیا جاسکا ہے کہ امریکا کے بانیوں کو ان کی موجودگی کا علم تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں کے شہری یا شہریتی حقوق سے متعلق بحث پر یہ سابق مسلم غلام اثر انداز نہیں ہوئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکا میں مسلمان (پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی طرح) سترہویں صدی سے موجود تھے مگر نسل اور غلامی کے عوامل اس قدر مضبوط تھے کہ ان کے مذہب کا معاملہ سات پردوں میں لپیٹا رہا۔ امریکا کے بانیان نے جب مستقبل کے امریکی مسلمانوں کے حقوق کا سوچا تھا تو ان کے ذہن میں سفید فام مسلم ہی رہے ہوں گے کیونکہ ۱۷۹۰ء کے عشرے تک کسی بھی نسل یا مذہب ہی پس منظر کا حامل سفید فام شخص امریکا میں شہریت کیلئے درخواست دے سکتا تھا۔ جیفرسن نے صرف دو مسلمانوں سے ملاقات کی تھی اور وہ دونوں ترک نسل کے شمالی افریقی سفیر تھے۔ جیفرسن نے ان کی رنگت کے بارے میں کچھ کہا، نہ لکھا۔ دونوں بہت حد تک سفید فام تھے۔ ان دونوں میں رنگ یا مذہب کے اعتبار سے جیفرسن کیلئے کوئی کشش نہ تھی۔ اس نے ان دونوں سے ملاقات کی اور انہیں اہمیت دی تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ سیاسی و سفارتی اعتبار سے بہت مضبوط تھے۔ اس سے قبل تھامس جیفرسن نے سفیر، وزیر خارجہ اور نائب صدر کی حیثیت سے شمالی افریقا کی ریاستوں سے امریکا کے تنازع کو مذہب کے نقطہ نظر سے کبھی نہیں دیکھا۔ بحیرہ روم اور مشرقی بحر اوقیانوس امریکی جہاز رانی کو قزاقوں سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ جیفرسن نے ٹریپولی اور تیونس کے حکمرانوں پر واضح کیا کہ ان کا ملک اسلام مخالف جذبات یا تعصب نہیں رکھتا اور ایک مرحلے پر تو وہ یہاں تک گئے کہ انہوں نے دونوں حکمرانوں سے کہا کہ ہم بھی اُسی خدا کی عبادت کرتے ہیں، جس کے عبادت گزار آپ ہیں!

جیفرسن مذہب کو سیاست یا حکومت سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے بیرون ملک جن خیالات کو رواج دیا، ملک میں انہی خیالات کو اہمیت دی۔ اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جیفرسن کے تصورات بنیادی طور پر شمالی افریقا کی ریاستوں سے تعلق کی بنیاد پر پروان چڑھے ہوں گے۔ یہی شمالی افریقا سے متعلق ان کی خارجہ پالیسی کی بنیاد بھی تھی۔ یہ نکتہ بھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ جیفرسن نے ذاتی طور پر موحد ہونے کی بنیاد پر اسلامی دنیا سے اپنے تعلق کو زیادہ اہمیت دی ہوگی۔

جیفرسن کے زمانے تک اسلام کے بارے میں بہت سے منفی تاثرات اور تصورات بھی پائے جاتے تھے اور یقینی طور پر وہ ان سے پوری طرح محفوظ یا لا تعلق تو نہیں رہے ہوں گے۔ عین ممکن ہے کہ اسلام اور اسلامی دنیا سے متعلق یورپ سے ترکے میں ملنے والے چند تصورات اور مثالوں کو انہوں نے ور جینیا میں مذہب کو ریاستی یا حکومتی امور سے الگ رکھنے کی بحث میں مضبوط بنیاد کے طور پر استعمال کیا ہو۔

جیفرسن نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اصول اور تعصب کی جس جنگ میں فتح پائی تھی، وہ اب بھی، اکیسویں صدی میں، بحر ان کی صورت امریکیوں کے سامنے کھڑی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر سے اب تک امریکا میں مسلمانوں کی تعداد نمایاں رفتار سے بڑھی ہے اور اب امریکا میں آباد مسلمان نسلی تنوع اور تحریک سے متصف ہیں۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکا میں مسلمانوں کو کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا گیا۔

جیفرسن کے زمانے میں مسلمانوں کی ایک تصوراتی آبادی کو تعصب کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ آج کے امریکا میں ان مسلمانوں پر سیاسی حملے ہو رہے ہیں، جو ایک حقیقت کی حیثیت سے امریکی معاشرے کا حصہ ہیں۔ نائن الیون کے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر امریکا میں مسلمانوں کے خلاف ایسی فضائیاں کر دی گئی ہیں، جس میں سبھی اس بات کے حق میں دکھائی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے تمام بنیادی و شہری حقوق نہ دیے جائیں۔

اب امریکا میں یہ بحث بھی زور پکڑ گئی ہے کہ کوئی مسلمان امریکی صدر بننے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ بارک اوباما کے حوالے سے یہی سوال اٹھا تھا۔ مگر یہ سوال نیا نہیں۔ امریکی سیاسی تاریخ میں جیفرسن پہلی شخصیت تھے جن پر مسلمان ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا۔ کوئی امریکی مسلمان صدر بن سکتا ہے یا

نہیں، یا اسے صدر بننے دینا چاہیے یا نہیں۔ اس نکتے پر بحث سے ہمیں یہ اندازہ لگانے میں بھی مدد ملتی ہے کہ امریکی شعورِ عامہ میں مسلمان کس طور داخل ہو چکا ہے اور یہ کہ مسلمانوں کے حقوق کس طرح ابتدائی مرحلے میں قومی آدرش کی حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ یوں آج کے امریکا میں مسلمانوں کی شہریت کے مسئلے کو سمجھنے کیلئے اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کے حقوق سے متعلق چھڑنے والی بحث کو سمجھنا لازم ہے۔

امریکی مسلمانوں کے حقوق نے نظری سطح پر تو بہت پہلے قبولیت پالی، مگر عملی دنیا میں انہیں سخت آزمائش سے گزرنا پڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی مسلمانوں کو حقوق کے حوالے سے یومیہ بنیاد پر آزمائش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کے امریکا میں اسلام کے معروف مورخ جان ایسپوزیٹو کو بھی مجبور ہو تھا مس ”کر کہنا پڑا ہے کہ ”امریکی مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مغربی وسیع النظری اور رواداری یعنی کلیت پسندی کی حدود کیا ہیں؟“ ہمیں جیفرسن کا قرآن ”کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کو امریکی آدرشوں کا حصہ کب، کہاں اور کس طرح بنایا گیا۔

مورخین نے اب تک یہ ثابت کرنے پر توانائی صرف کی ہے کہ مسلمان مکمل طور پر امریکی آدرشوں کے خلاف ہیں۔ اور یہی لوگ اس نکتے پر بھی زور دیتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ امریکیوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو فطری طور پر غیر امریکی قرار دے کر مسترد کیا ہے۔ بعض مورخین نے تو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ امریکا دراصل اٹھارہویں صدی میں اسلام کی شدید مخالفت اور اس کے جابرانہ طرز حکومت کے مآخذ کے خلاف رد عمل کے نتیجے میں معرض وجود میں آیا تھا۔ یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ امریکا کی ابتدائی پالیسیوں اور حکمت عملی سے متعلق دستاویزات میں اس حوالے سے بہت کچھ مل بھی جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں نمایاں حد تک مثبت تصورات بھی ملتے ہیں، جیسا کہ ”مستقبل کے امریکی مسلم شہریوں کے حقوق“ سے متعلق بحث ہے۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تمام پروٹسٹنٹس نے اسلام کو یکسر اجنبی مذہب کی حیثیت سے نہیں دیکھا تھا۔

یہ کتاب اس نکتے پر روشنی ڈالتی ہے کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ غیر امریکی نہیں تھے بلکہ ملک کے قیام کے وقت ہی سے ان کی مکمل شہریت اور متوقع حقوق پر بحث بھی ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بہت سے آئیڈیلز کو اس وقت کے امریکیوں کی اکثریت نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اسلام اور اسلامی دنیا کے حوالے سے جیفرسن کے نظریات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کتاب جان ایڈمز اور جیمز میڈیسن کے خیالات کو بھی عمادگی سے بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کی بحث ملک کے بانیان تک محدود نہ تھی۔ ورجینیا میں میپسٹ اور پریسبٹیرینز کی جدوجہد اور مذہبی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ان کی معرکہ آرائی کا احوال بھی اس کتاب میں ہے اور کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھنے والے مشہور وکیل جیمز آئرڈیل اور سیموئل جانسن کا مسلمانوں کے حقوق کیلئے آواز اٹھانا بھی اسی کتاب سے ثابت ہے۔ ایونجیلکلیک میپسٹ جان لیلینڈ نے، جو جیفرسن اور میڈیسن کے ساتھیوں میں سے تھے، مسلمانوں کے حقوق کیلئے کنیکٹیکٹ اور میساچوسٹس میں آواز اٹھائی۔ ساتھ ہی انہوں نے آئین میں پائی جانے والی خامیوں، پہلی آئینی ترمیم کے نقائص اور ریاستی سطح پر مذہب کے کردار کے خلاف بھی احتجاج کیا۔

اس کتاب میں مغربی افریقا سے تعلق رکھنے والے دو مسلم غلاموں ابراہیم عبد الرحمن اور عمر ابن سعید کا تذکرہ ملتا ہے۔ عمر ابن سعید عربی جانتا تھا اور اس نے عربی میں آپ بیتی بھی لکھی تھی۔ ان دو مسلمانوں کے تذکرے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت امریکا میں ہزاروں مسلمان تھے مگر انہیں مذہب پر کاربند رہنے سمیت بہت سے حقوق حاصل نہ تھے۔ انہیں شہریت کے حق سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔

کیتھولک عیسائیوں اور یہودیوں نے بیسویں صدی میں بھی اپنے حقوق کیلئے جدوجہد جاری رکھی۔ انہیں جو حقوق ملے وہ آئین سے مکمل ہم آہنگ نہ تھے۔ یہ حقیقت البتہ انتہائی تلخ ہے کہ آج بھی امریکا میں مسلمان واحد برادری ہے جسے مکمل طور پر قبول نہیں کیا گیا اور آج بھی اس کے اثرات کا دائرہ محدود رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

بروز اتوار 2 صفر الحرام 1447ھ 27 جولائی 2025ء

امتِ مسلمہ: اتحاد یا تباہی

جب تاریخ کی مسلسل گردش لیل و نہار پر نگاہ ڈالیں تو ایک ہی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے "وَاَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا"۔ افسوس کہ حبلِ الہی کو تھامنے کی بجائے ہم نے ریشمِ اخوت ہی کو بننے سے انکار کر دیا۔ آج کے معرکہ ارض و سما میں مسلم امت کی یہی تفرقہ آرائی اُس تلوار کا بَرّاق سا پھل بن چکی ہے جو انہی کے سینوں کو چھید رہی ہے۔

اگر مسلم ممالک متحد نہ ہوئے تو سب کی باری آئے گی۔ ایک سفارتی بیان نہیں، بلکہ تاریخی صداقت بن کر ہمارے حفاظتی دروازوں پر آن کھڑا ہوا ہے۔ یہ جملہ — ایک چیخا ہوا جملہ یا تاریخ کا کڑا فیصلہ اور پیٹھ پر برسنے والا کوڑہ ہے — یقیناً یہ نہ کوئی جذباتی نعرہ ہے، نہ محض خطیبانہ فقرہ، بلکہ تاریخ کے قبرستان سے اٹھتی ہوئی وہ آہ ہے جو سقوطِ غرناطہ سے سقوطِ بغداد تک ہر مسلم سلطنت کی بربادی کا مرثیہ بن کر گونجتی ہے۔ یہ ہماری اس تاریخ کا آئینہ ہے جو ہمیں ہمارے آئندہ انجام کی جھلک دکھا رہا ہے۔ یہ محض مستقبل کا اندیشہ نہیں، حال کا ننگا سچ ہے۔ ایک ایسا سچ جسے ہر مسلم ملک اپنی کمزور سفارتی چادر میں چھپانے کی کوشش کرتا رہا ہے، لیکن اب وقت آن پہنچا ہے کہ اس سچ کا — کھلے ماتھے اور بیدار شعور کے ساتھ سامنا کیا جائے۔

آج ایران نشانے پر ہے، کل پاکستان یا سعودی عرب بھی ہو سکتا ہے۔ تاریخ شاید ہے کہ جب امتِ مسلمہ بکھری، تو اندلس سے بغداد تک سب کچھ راکھ ہو گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے تاریخ سے کچھ سیکھا؟ یا پھر ہم وہ مسافر ہیں جو ہر بار اسی راہ میں بھٹکتے ہیں جس سے پہلے برباد ہو چکے؟

مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے عظیم زوال صرف عسکری کمزوری سے نہیں آیا، بلکہ وحدت کے شیرازے کے بکھرنے سے آیا۔ اندلس میں مسلمان علم، تہذیب اور فن کے امام تھے، مگر جب عرب، بربر اور اسپینی مسلمان آپس میں دست و گریبان ہوئے، تو عیسائی افواج نے اُن کے علمی مراکز کو شعلوں میں لپیٹ دیا۔ بغداد، جہاں الفارابی، ابن سینا، اور ابن رشد کے اذہان چمکتے تھے، جب خلیفہ نے عالم اسلام سے اتحاد کی اپیل کی، تو کوئی نہ آیا، اور ہلاکو خان نے دریائے دجلہ کو صرف سیاہی علم سے نہیں، بلکہ خونِ عالم سے سیاہ کر دیا۔ تاریخ چیخ چیخ کر ہمیں بتاتی ہے جب مسلم امت وحدت سے دور ہوتی ہے، تو وہ قوتِ جذب سے نہیں، قوتِ ضرب سے پہچانی جاتی ہے۔

تاریخ کے آئینے میں جب جھانک کر دیکھتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جب وحدت ٹوٹی، پھر عزت بھی تار تار ہو گئی۔ دشمن نے یہ نسخہ ایک بار پھر ہماری آنکھوں کے سامنے استعمال کیا۔ 2006ء میں حزب اللہ جیسے ایک چھوٹے گروپ نے اپنی شجاعت کے ساتھ صرف اسرائیل کے ہی نہیں بلکہ اس کے تمام مریبوں کو بھی شرمندہ کر کے رکھ دیا اور وہ اسرائیل جس کو اپنی ایئر فورس پر ایسا ناز تھا کہ خود امریکی فوجی سربراہ اپنے خطاب میں اسرائیلی فوج کی شجاعت کو امریکی فوج کیلئے ایک ماڈل قرار دیا کرتے تھے، وہ تمام دشمن مہبوت ہو کر رہ گئے لیکن دشمن نے ایک باقاعدہ ایک پلاننگ کر کے خطے کے مسلمان ملکوں کے درمیان ایک مضبوط دشمنی کی لکیر کھینچ کر اپنے مقاصد کی منزل کا سفر شروع کیا اور بالآخر ایران کی طرف سے کھڑی کی گئی آہنی فسیل کو باری باری نہ صرف کمزور کیا بلکہ تباہ کر کے خطے کے تمام ممالک کو یہ پیغام بھیجا کہ خطے میں اسرائیل کے سامنے سر جھکا کر احکام کی اطاعت کرنا ہوگی۔

مشرق وسطیٰ کے تازہ الاؤ کی تپش اب تک فضا میں موجود اپنے وجود کا احساس دلارہی ہے۔ گزشتہ ماہ کی تاریک شب کو اسرائیلی لڑاکا طیاروں نے اصفہان کی اُس جوہری تنصیب پر کاری وار کیا جو ایرانی قومی غیرت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ عمارتیں لمبے کاڈھیر بنیں، سینکڑوں جانیں لقمہ اجل ہوئیں، اور

تہران کے دانشور حلقوں میں قیامتِ صغریٰ کا نقشہ کھینچ گیا۔ ایران نے بھی خاموشی کو شکست دی اور سو سے زائد ڈرون و میزائل، عراق، شام اور اردن کی فضاؤں میں تیرتے ہوئے اسرائیلی حدود تک لے گیا۔

وہی مسلم سرزمینیں جو قبلہ اول کی آزادی کے لیے صفِ اول میں ہونی چاہئیں، آج اُن پر سے اسرائیلی میزائل گزر رہے تھے، اور جواب میں ایران کے ہتھیار مسلم ممالک کی فضاؤں سے گزر کر اسرائیل تک پہنچ رہے تھے اور ان کی خاموشی یا رضامندی دشمن کی تقویت کا سبب بن رہی تھی۔ یہ ہتھیار جب مسلم ممالک کی سرحدیں چیرتے ہوئے گزرتے ہیں تو دل سوال کرتا ہے کہ اپنی سرزمین اعمیاری کی عسکری گزرگاہ کیوں بنے؟ اس خاموش رضامندی میں کہیں سفارتی، مصلحت ”ہے، کہیں مالی“ معاونت ”، اور کہیں عسکری اڈوں کا وہ جال جو امریکہ نے ریاض سے دوحہ، انقرہ سے دیگر مسلم ممالک تک بچھا رکھا ہے۔ نتیجہ یہ کہ مسلم دنیا کے دارالحکومت اپنی ہی فضاؤں میں پرانی جنگ کا شور سننے پر مجبور ہیں۔ یہ فقرے صرف جغرافیائی حقیقت نہیں، بلکہ عبرت کا ایک لمحہ ہیں۔ یاد کیجیے جب میدانِ جنگ صرف خاک کا نہیں، وفاداری کا میدان بن جائے اور پرانی سرزمین اور اپنوں کی مصلحت پر خاموشی بھی گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔

امریکی بندوق کبھی اسرائیل کے کاندھے پر سچی نظر آتی ہے، کبھی امریکی سایہ عاطفت — ایک تلوار، ایک ڈھال، اس کے گرد حفاظتی ڈھال بن جاتی ہے۔ اصفہان کے بعد تہران کے جوابی میزائل داغے گئے تو مشرقی بحر روم میں امریکی جنگی جہازوں کے انٹر سپر میزائلوں نے اسرائیلی آسمان کو فوادی قبہ عطا کر دیا۔ اسی دوہرے معیار کی بدولت اسرائیلی جارحیت ”دفاع“ اور ایرانی ردِ عمل ”دہشت گردی“ قرار ٹھہرا دیا گیا۔ یہ متفرد بیانیہ مغربی میڈیا کی چالوسی، اور مسلم میڈیا کی کم مائیگی کے بغیر ممکن نہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ اسرائیل کی قوت کا راز اس کے پشت پناہ میں ہے کہ اسرائیل کو ہر طرح کی امریکی مدد حاصل ہے اور امریکا کی پشت پر اس کے مغربی اتحادی احکام کے منتظر رہتے ہیں — امریکی دفاعی میزائل ہو، ساہروار ہو، جاسوسی ڈرون ہو یا اقوام متحدہ میں ویٹو پاور — یہ سب اسرائیل کو اس لیے میسر ہیں کہ اس کی رگوں میں امریکہ کا سرمایہ اور عسکری خون دوڑ رہا ہے۔ غزہ کی بربادی ہو یا ایران پر حملہ — امریکہ نے ہمیشہ اسرائیل کو نہ صرف دفاع دیا بلکہ جارحیت کی اجازت بھی دی۔

عالمی قوانین — جو ایک وقت میں اقوام کا اخلاقی معیار سمجھے جاتے تھے — اب فقط طاقتور کے مفاد کی حفاظت کا دستاویز بن چکے ہیں۔ عالمی ادارے اور قوانین صرف کاغذی دعوے بن چکے ہیں اسرائیل بار بار بین الاقوامی حدود پامال کرتا ہے، مگر نہ کوئی پابندی، نہ کوئی مذمت، نہ کوئی کارروائی۔ یہ وہ دور ہے جہاں اقوام متحدہ کا انصاف صرف فٹ نوٹ کی حد تک باقی رہ گیا ہے۔ عدل اگر زر کے ترازو میں تو لا جائے، تو مظلوم ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے۔

اقوام متحدہ کی ہالِ نماعرالتِ خموشاں میں قراردادیں جوں ہی اسرائیلی اقدام کے خلاف میز پر آتی ہیں، ویٹو کی قینچی انہیں کاٹ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی ہے۔ اقوام متحدہ، آئی اے ای اے، انسانی حقوق کی تنظیمیں — سب وہ منجمد مجسمے ہیں جن کے چہروں پر انصاف کی مسکراہٹ تو ہے، مگر لبِ سلسلے ہوئے ہیں۔ عالمی اداروں کی گونگی عدالت آئی اے ای اے کی فائلیں، انسانی حقوق کونسل کی رپورٹیں — سب بے بس۔ یہ وہی منہ زور اسرائیل ہے جسے عالمی قانون کی زریں لکیر نہیں، بلکہ واشنگٹن کی سرخ بتی روکتی یا آگے بڑھنے کو کہتی ہے۔

ان اداروں کا انصاف طاقتوروں کے قدموں میں بچھا ہے۔ فلسطین ہو یا لبنان، شام ہو یا ایران، جب بھی مظلوم نے فریاد کی، ان اداروں نے سنا ضرور، مگر لبیک نہ کہا۔ گویا یہ عدالتیں ہیں جہاں انصاف کی کرسی تو ہے، مگر جج غیر حاضر ہے۔ یہ عالمی ادارے خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہے ہیں۔

امریکہ، جو خود کو "جمہوریت کا علمبردار" کہلاتا ہے، جب فلسطین یا ایران کی حمایت کی بات آتی ہے تو جمہوریت کی دہلیز پر آمریت کا طوق ڈال لیتا ہے۔ مسلم دنیا کے حکمرانوں کو یا تو قرض کی مار ہے، یا پابندیوں کا خوف۔ گویا امریکی دباؤ کی وجہ سے موثر پالیسی کا فقدان ہے۔ ایسی حکمرانی جو حق کا علم بلند کرنے سے پہلے خزانے کا توازن دیکھے، وہ حکمرانی نہیں، منافع بخش ملازمت ہے۔

یہ کوئی راز نہیں کہ اسرائیل، بھارت، امریکا، اور ان کے اتحادی مسلم دنیا کو اجتماعی وجود کے بجائے ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھتے ہیں۔ دشمن کی حکمت عملی یہ ہے کہ ایک ایک کر کے نشانہ بنایا جائے۔ افغانستان پر امریکا نے اکیلے حملہ کیا۔ عراق پر اتحادی افواج نے چڑھائی کی۔ لیبیا کو اکیلا کر کے معمر قذافی کا خاتمہ کیا۔ شام کو خانہ جنگی میں دھکیل کر ایران، ترکی اور عرب دنیا کو ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کیا۔ یہ سب کچھ اسی منصوبے کا حصہ ہے کہ مسلمانوں کو کبھی اجتماعی طور پر لگا کر نہ جائے، بلکہ ایک ایک کر کے توڑا جائے۔



ریاض، کویت، قطر، یو اے ای، اردن اور دیگر مسلم ممالک میں امریکی اڈے اور انٹیلی جنس نیٹ ورک کی فسیلیں اور فوجی اڈے موجود ہیں۔ یہ صرف عسکری موجودگی نہیں، بلکہ سیاست، معیشت، اور میڈیا کی غلامی کا کڑوا نشان ہے۔ جب کسی قوم کی فضاء میں دوسرا ملک اپنی فوجیں رکھ دے، تو وہ ملک خود مختار نہیں، رہن شدہ زمین بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حکمران اسرائیل کے خلاف آواز بلند کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔

اسرائیلی جارحیت دفاع، ایرانی رد عمل دہشت گردی قرار دیا جاتا ہے، یہ وہ بیانیہ ہے جسے مغربی ذرائع ابلاغ نے بڑی چالاکی سے قائم کیا۔ جس اسرائیل نے درجنوں ممالک کی خود مختاری پامال کی، اسے "دفاعی ریاست" قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو ممالک جواب دیتے ہیں، انہیں "ریاستی دہشت گرد" کہا جاتا ہے۔ یہ زبان کی جادوگری نہیں تو اور کیا ہے، جہاں لفظوں سے ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو قاتل بنا دیا جاتا ہے؟ اس فریب بیانی کا توڑ صرف اس وقت ممکن ہے جب مسلم دنیا اپنی قلمی صف بندی کرے۔

آج اگر الجزیرہ، ٹی آر ٹی ورلڈ، اور پی ٹی ورلڈ جیسے ادارے عالمی بیانیہ میں مؤثر کردار ادا نہیں کر پارہے، تو اس کی وجہ وسائل کی قلت نہیں، حکمت عملی کی کمزوری ہے۔ ہمیں صرف خبری ادارے نہیں، فکری محاذ درکار ہیں۔ ایسا میڈیا جو فقط تصاویر اور ویڈیو نہ دکھائے، بلکہ وہ بیانیہ تخلیق کرے جو مظلوم کا وکیل اور ظالم کا قاضی بنے۔

ذرائع بصیرت سے دیکھیے، رقبے میں چھوٹا سا اسرائیل، آبادی میں آپ کی مجموعی تعداد کا عشرِ عشر، اور پھر بھی طاقت کا محور۔۔۔ وجہ صرف ایک کہ ہمارے ہاں وحدت مقصد نفاق اور دشمنی میں کہیں گم ہو گیا ہے۔ خود احتسابی کے لحوں کو آواز دیں تو جواب ملتا ہے کہ ریاض اور تہران مسلکی کشمکش، انقرہ و قاہرہ کے بیچ قیادت کی کشمکش، اسلام آباد کو عالمی مالیاتی اداروں کا دباؤ، یہ بکھراؤ ہی اسرائیل کی قوتِ ضارب بن چکا ہے۔ لیکن اگر آپ غور کریں

کہ اللہ نے اس معجزاتی ریاست پاکستان سے کیا کام لیا ہے۔

دورِ حاضر کے ”برق رفتار“ معرکوں میں مئی 2025ء کی وہ چار خونی راتیں بھلائے نہیں جاسکتیں جب جنوبی ایشیا کے افق پر ڈرونوں کی شاہراہیں روشن ہوئیں اور راجپوتانے سے لے کر پنجاب پاکستان تک فضاؤں میں آتشیں بارود کی خونخوار بو پھیل گئی۔ بظاہر یہ دوپڑوسی ایٹمی طاقتوں کا ٹکراؤ تھا، مگر پس پردہ اسرائیلی حربی ساز و سامان، امریکی سفارتی انگلیاں اور یورپی حاشیہ برداری نے اس کشمکش کو ایک ہمہ جہت اسکرپٹ کارنگ دے دیا تھا۔

بھارت نے آپریشن سندور میں اسرائیلی ساختہ ہاروپ لوٹرنگ ڈرونوں کی یلغار کو پاکستان کے فضائی دفاع پر آزمائش آہن بناتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے یہ کامی کار چار ڈرون ہی پاکستان کیلئے کافی ہیں لیکن پاکستانی دفاع کی کاری ضرب نے صرف تین دنوں میں اس کے نہ صرف 69 کے قریب ڈرون مار گرائے اور 9 کی تمام صلاحیتیں جام کر کے انہیں زمین پر اتار لیا اور گرے ہوئے ڈرونز کے بکھرے پڑے ملے کراچی سے لیکر لاہور اور آزاد کشمیر تک دنیا بھر کے میڈیا کو دکھا کر اسرائیل کے اس تکبر اور گھمنڈ کو ریزہ ریزہ کر دیا الحمد للہ۔

اس کامیاب روک تھام نے نہ صرف بھارتی عسکری حکمتِ عملی کو جھنجھوڑا بلکہ اسرائیلی عسکری انجینئروں کے لیے بھی لمحہ حیرت پیدا کیا۔ کچھ غیر مصدقہ مقامی رپورٹس میں دعویٰ ہوا کہ اسرائیلی کنٹرول ٹیموں کو بھی جانی نقصان اٹھانا پڑا، اور جب تل ابیب میں راتوں رات خاموش جنازے اٹھے، اسرائیل تک یہ اطلاع پہنچ گئی کہ انڈیا میں ہماری موجودگی کے بعد پاکستان جوابی طور پر تل ابیب اور حیفہ کا رخ کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ ہی جب فضائی جھڑپوں میں انڈیا کے پانچ لڑاکا طیارے بشمول ”رافیل“ مار گرائے جانے کی خبروں کی تصدیق ہو گئی، ایک ہی لمحے میں شائنگ انڈیا کے 70 فیصد بھارتی گرڈ منہ کے بل گر گئے اور انڈیا تاریکی میں ڈوب گیا تو وہی امریکا جس نے اس جنگ کی ابتداء میں بڑی لا پرواہی اور کھلنڈرا انداز اپنایا تھا، اسے سیز فائر یاد آ گیا۔

امریکی سفارت کاری نے فوری طور پر اپنی آخری انگلڑ کا آغاز کرتے ہوئے دونوں دارالحکومتوں پر تجارتی و مالی دباؤ کے تازیانے برسائے اور ۱۰ مئی کو جنگ بندی کا خاکہ تیار کر لیا۔ امریکی صدر نے بڑے فخر سے اسے اپنی ”ثالثی نجات“ کہا۔ وہی متکبر مودی اور اس کا میڈیا جو آدھے پاکستان پر اپنے قبضے کی خبریں چلا رہا تھا اور اپنے کسی نقصان کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا، دھیرے دھیرے عالمی میڈیا کے سامنے ننگا ہونا شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے بلومبرگ میڈیا کے سامنے اس کے فوجی جنرل نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے اس کا ذمہ دار اپنی سیاسی حکومت کو ٹھہرایا اور اس کے بعد بھارتی وزیر خارجہ سبرامنیم بے شکرنے پارلیمانی کمیٹی کو بتایا کہ واشنگٹن نے انہیں خفیہ اٹلی جنس شیمز کی کہ پاکستان تباہ کن حملے کے قریب ہے۔ انڈین وزیر خارجہ کا یہ بیان بھی عالمی میڈیا میں مودی کے منہ پر کالک ملنے کیلئے چلنے لگا تو پھر جا کر بھارتی عوام کو گودی میڈیا کے جھوٹ کا پتہ چلا۔

اس 88 گھنٹے کی اس جنگ میں یوں محسوس ہوا کہ بڑی و بھری قوتوں سے کہیں بڑھ کر اب ڈرون اور الیکٹرانک وارفیئر فیصلہ کن ہتھیار ہیں — لیکن ان کی پشت پر کھڑا سفارتی اور مالی اکٹھا اصل طاقت ہے۔ پاکستان نے ثابت کیا کہ جب عسکری صلاحیت میں اعتمادِ کامل ہو تو عالمی طاقتیں بھی سیز فائر پر آمادہ ہو جاتی ہیں؛ اس میں پیغامِ عبرت یہ ہے کہ طاقت ہی وہ زبان ہے جسے اقوامِ عالم بہ خوبی سمجھتی ہیں۔

یہ معرکہ چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اگر ایک سنگل ونگ ریاست اسرائیل اپنی ٹیکنالوجی سے ہندوستانی میدانِ جنگ کو نئی جہت بخش سکتی ہے، تو پانچ درجن مسلم ممالک کیوں کر مشترکہ دفاعی و اقتصادی منظر نامہ نہیں رقم کر سکتے؟ اگر آج پاکستان نے ڈرونوں کا سیلاب روکا ہے، تو کل ایران یا ترکی کو بھی یہی کمال

دکھانا پڑے گا۔ لہذا امت واحدہ کے تصور کو محض تقریری آرائش نہیں، عملی معاہدوں، مشترکہ ریسرچ سنٹروں اور متحدہ میڈیاوائس کی صورت اختیار کرنی ہوگی۔ ورنہ تاریخ کے لکھنے والے ہمارے لیے پھر کوئی اور نوحہ محفوظ رکھ چکے ہیں۔

یاد رکھیں کہ آج ایران ہے، کل ہم ہو سکتے ہیں۔ یہ لمحہ فکریہ اور بیداری کی آخری صدا ہے۔ جس طرح ایک ایک کر کے فلسطین، شام، لیبیا، عراق، افغانستان، اب ایران نشانہ بنے، تو کون باقی رہ گیا؟ ایک ایک پٹا ٹوٹتا جا رہا ہے، اور ہم درخت کی جڑ سے لپٹے خود کو محفوظ سمجھ رہے ہیں۔ اگر آج بھی مسلم امہ نہ جاگی، تو تاریخ پھر دہرائے گی وہی سانحے جن پر ہم نے صرف قراردادیں اور تعزیتیں جاری کیں وہ ہماری آنے والی نسلوں کیلئے ایک لعنت بن کر رہ جائیں گی۔

آج امت مسلمہ 57 ممالک پر مشتمل ہے، جن کے پاس بے شمار قدرتی وسائل، لاکھوں کی افواج، اور کروڑوں نوجوان ذہن موجود ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود وہ دنیا میں مظلوم کہلاتی ہے، کیوں؟ اس لیے کہ امت کی یہ قوت بکھری ہوئی ہے، منتشر ہے، اور ہر ملک اپنی کرسی، اپنی تجارت، اور اپنی بقا کے محدود خول میں بند ہے۔ فلسطین صہیونی جارحیت کا شکار ہے، اور بعض عرب ممالک اس جارحیت کے ساتھ تجارتی معاہدے کر رہے ہیں۔ ایران پر حملہ ہوتا ہے، اور مسلمان ممالک خاموش تماشا بنے رہتے ہیں۔ پاکستان پر بھارت کی زبان درازی ہو یا اسرائیلی پشت پناہی سے حملے، اکثر مسلم ریاستیں غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل پیرا ہوتی ہیں۔ ترکی میں خانہ جنگی کے سائے ہوں، یا لیبیا، شام اور یمن کی بربادی، مسلم دنیا کے باہمی اختلافات دشمن کی حکمت عملی کو تقویت دیتے ہیں۔ انہی وجوہات کی بناء پر پھر ابوا دشمن مسلم امہ کو ختم کرنے کیلئے ہر قسم کے حملے کر رہا ہے۔

ایران پر اسرائیلی حملے، جوہری تنصیبات کی تباہی، سائنس دانوں کی ٹارگٹ کلنگ۔ یہ سب اس عالمی پیغام کا حصہ ہیں جو ہر مسلم ریاست کو دیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے خود کو مغرب کے سامنے تسلیم نہ کیا، تو تمہاری باری بھی آئے گی اور یہ کوئی دور کی کوڑی نہیں۔ کل کو یہی حربے پاکستان، ترکی، یا سعودی عرب کے خلاف بھی آزمائے جاسکتے ہیں۔ دشمن کے پاس کوئی اخلاقی، قانونی یا تہذیبی حد باقی نہیں رہی۔ ان کا ایک ہی پیمانہ ہے کہ مکمل طاقت کے ساتھ مسلمانوں کو فنا کر دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ اب ہم ان مصائب سے کیسے نجات حاصل کریں کہ مسلم ممالک کے اتحاد میں جاری رکاوٹیں دور کر کے ہمیں ایسی کامیابی نصیب ہو جو ہمیں جاری ذلت و رسوائی کے قعر مذلت سے نکال سکے۔ اس کیلئے سب سے اہم سوچ یہ ہونی چاہئے کہ ہمیں اپنے وجود اور وسائل پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنی اس گم گشتہ منزل کے حصول کی تلاش کرنا ہوگی۔ جو سمتیں ہمیں اس گھیرے سے نکال سکتی ہیں، وہ کوئی طلسمی دروازے نہیں بلکہ واضح خطوط ہیں۔

حل کی طرف فقط ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اتحاد، خود انحصاری، اور مشترکہ دفاع۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ:

☆ او آئی سی کو محض اعلامیوں سے نکال کر عملی اتحاد کی طرف بڑھایا جائے۔

☆ ہمیں سب سے پہلے دفاعی خود کفالت کی طرف بڑھنا ہو گا جس کیلئے ترکی، پاکستان، ایران، ملائیشیا مشترکہ تحقیق اور سٹریٹیجک ٹیکنالوجی میں دست تعاون بڑھائیں۔ اور انٹیلی جنس اشتراک کو ایک نظام میں ڈھالیں۔

☆ اقتصادی اتحاد جس سے مغربی مالیاتی دباؤ کا توڑ ممکن ہو۔ اسلامی بینکاری اور مقامی کرنسیوں پر تجارت اس کی بنیاد ہو سکتی ہے۔

☆ میڈیا کا عالمی متبادل، تاکہ مسلمانوں کی آواز عالمی سطح پر سنائی دے اور مغربی بیانیے کو چیلنج کیا جاسکے۔

☆ عالمی میڈیا کے متبادل میں الجزیرہ، ٹی آر ٹی ورلڈ، بی ٹی وی ورلڈ کو تحقیقی صحافت اور عالمی لسانی تنوع سے لیس کیا جائے، تاکہ آوازِ مظلوم صدا بہ صحرا نہ ہو۔

☆ حکمرانوں کو ایوانوں میں یہی پیغام پہنچے کہ غزہ، کشمیر و اصفہان کی طفلانِ مسلم کی چیخیں ہماری بھی ہیں، اور ہمارے زخم مشترک ہیں۔ یہ عوامی دباؤ اس قدر شدید ہو کہ حکمرانوں کے ایوانوں میں اس زلزلے کا خوف موجود رہے کہ اب ان کی کوئی سستی ان کو بچا نہیں سکے گی۔

یاد رکھئے! آج اصفہان لہورنگ ہے تو کل کراچی، ریاض یا کوالالمپور کا مقدّر بھی ویسا ہو سکتا ہے۔ دشمن اپنی یلغار میں اخلاق کی آخری لکیر روند چکا؛ اور ہم اب بھی دل کے کواڑ پر دستکِ اتحاد سننے کو تیار نہیں۔ اگر ہم نے اپنے دفاع کو فریاد پر چھوڑا تو موعے ہی نوے رہ جائیں گے، اور تہذیبِ مسلم کے کھنڈر پر تاریخ ایک اور موحش باب رقم کر دے گی۔

یہ وقت ہے جب مسلمان صرف امتِ خطبہ نہ بنیں، بلکہ امتِ عمل بنیں۔ جب ان کے فیصلے واشنگٹن اور لندن میں نہ ہوں، بلکہ مکہ و مدینہ، استنبول و تہران، لاہور و کوالالمپور میں ہوں۔ اتحاد ہی وہ نکتہ ہے جس پر سیرتِ نبویؐ سے لے کر خلافتِ راشدہ تک، تاریخ نے اپنی عظمت کی بنیاد رکھی۔ اگر ہم متحد نہ ہوئے، تو نہ رہے گابانس، نہ بچے گی بانسری؛ اور جب ہوش آئے گا، تو تاریخ ہمارے ہاتھوں میں نہیں، ہمارے خلاف لکھی جا چکی ہوگی۔

مسلم دنیا اب اُس موڑ پر کھڑی ہے جہاں مزید تاخیر صرف تباہی کی گارنٹی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم نے اتحاد، خودداری، اور مشترکہ حکمتِ عملی کی طرف قدم نہ بڑھایا، تو ہمارے بعد اذانیں تو رہ جائیں گی، لیکن صفِ نمازی خالی ہوگی۔ آج ایران نشانے پر ہے، کل شاید ہم ہوں۔ اور اگر ہم نے صرف قراردادوں، مذمتی بیانات، اور سفارتی ”افسوس“ تک خود کو محدود رکھا، تو ہم تاریخ کے اُن کرداروں میں شامل ہو جائیں گے جنہوں نے دشمن کی یلغار کو صرف آنکھوں سے دیکھا، ہاتھ سے روکا نہیں۔

حضرات! وقت کم ہے، چاندنی ڈھل رہی ہے، اور افقِ مشرق سے ایک نئی سُرخ پرتو جھلک رہی ہے۔ یہ یا تو صبحِ حیات کی نوید ہے، یا شفقِ خونچکاں کا اذانِ آغاز۔ تاریخ کا نوشتہ ہمیں جھنجھوڑ کر مطالبہ کر رہا ہے کہ مسلمانوں کی بقا اب صرف ایمان سے نہیں، اتحاد، فہم، اور عمل سے مشروط ہو چکی ہے۔ فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حکمتِ لقمان، عزمِ حیدر اور بصیرتِ عطا فرمائے، تاکہ ہم تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنی راہ خود متعین کر سکیں۔

فلسطین کا سودہ؟ ایمان کا جنازہ

آج میرے دل کے نہاں خانوں میں ایک عجیب سی بے چینی ہے، ایسا لگتا ہے جیسے تاریخ زور رہی ہو، وقت سسکیاں لے رہا ہو، اور ملت کا ضمیر چیخ چیخ کر ہمیں پکار رہا ہو: اے غافلواے بے حسی کے خول میں بند عاشقانِ رسول ﷺ کیا تمہیں وہ لہو یاد نہیں جو مسجد اقصیٰ کی سیڑھیوں پر بہا؟ آج جب ہم اس منبر پر کھڑے ہیں، تو ہمارے گرد نہ خالی الفاظ ہیں، نہ محض سیاسی بیانات بلکہ ہمارے گرد بیت المقدس کی وہ فضائیں ہیں جو اب بھی اذانِ بلالی کو ترس رہی ہیں۔ ہمارے چاروں طرف غزہ کے شہید بچوں کی آہیں، یتیموں کی سسکیاں، ماؤں کی بیوگی اور فلسطینی باپوں کے کٹے ہوئے بازوؤں کی خاموش گواہیاں گونج رہی ہیں۔

آج ہم جس معاہدہ ابراہیمی پر گفتگو کرنے جا رہے ہیں، وہ کوئی معمولی معاہدہ نہیں یہ ایک امت کے شعور کا امتحان ہے، یہ تاریخ کے کٹہرے میں ہمارا مقدمہ ہے۔ آج فیصلہ یہ ہونا ہے کہ ہم فلسطین کے ساتھ کھڑے ہیں یا اس کے قاتلوں کے ساتھ؟ ہم اقصیٰ کے وارث ہیں یا اس کے غاصبوں کے ہمنوا؟ ہم قرآن کے پیروکار ہیں یا صیہونی سرمایہ داری کے غلام؟ اگر آج ہم خاموش رہے، تو کل ہمارے بچے پوچھیں گے آپ نے اسرائیل کو تسلیم کیوں کیا؟ کیا ہم ان کی آنکھوں میں جھانک سکیں گے؟

آج جب تاریخ کی سانس بھی تیز چل رہی ہے اور وقت کی رگوں میں اضطراب کی بجلیاں دوڑ رہی ہیں، ہمیں ایک ایسے معاہدے کا سامنا ہے، جسے دنیائے "معاہدہ ابراہیمی" کا نام دیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ معاہدہ ابراہیمی ہے یا ابلیسی منصوبہ؟ یہ عہدِ امن ہے یا خنجرِ نفاق؟ یہ مژدہٴ محبت ہے یا محرابِ مسجد اقصیٰ پر لرزتا ہوا طعنہ؟

معاہدہ ابراہیمی 2020ء میں شروع ہوا تھا۔ دراصل ایک سفارتی معاہدہ ہے جس کے تحت چند عرب ریاستوں نے اسرائیل سے تعلقات معمول پر لانے کی راہ اپنائی۔ متحدہ عرب امارات اور بحرین نے اسرائیل کو باقاعدہ تسلیم کر کے سفارتی تعلقات قائم کیے۔ بعد ازاں سوڈان اور مراکش بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔ کہا گیا کہ یہ معاہدہ "امن کی بنیاد" ہے۔ لیکن قرآن نے ہمیں سکھایا ہے

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ، أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ

جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔۔۔ یہ وہی لوگ ہیں جو فساد کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو امن کے علمبردار ہیں اے اہل ایمان غور کرو کیا معاہدہ ابراہیمی کے پس پردہ وہی تاریخ نہیں چھپی جو بیت المقدس کی محرابوں سے لہو چھینتی رہی؟ (البقرہ: 11-12)

یہ معاہدہ اس وقت سامنے آیا جب فلسطینی مزاحمت عالمی حمایت حاصل کر رہی تھی، اور اسرائیل عالمی سطح پر دباؤ میں تھا۔ ایسے وقت میں عرب حکمرانوں نے اسرائیل سے رفاقت کا ہاتھ بڑھا کر ایک تاریخی خیانت کی۔ یہ معاہدہ نہ صرف فلسطینی ریاست کے تصور کی نفی ہے بلکہ بیت المقدس پر صیہونی قبضے کو عملاً تسلیم کرنے کی راہ بھی ہموار کرتا ہے۔

"...يُزِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَهِهِمْ" (الصف 8) یہ لوگ اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں مگر اللہ اپنے نور کو مکمل کرے گا۔ یہ معاہدہ ایک سیاسی جال ہے، جس کے بنے گئے دھاگے تل ایب سے نہیں، واشنگٹن، لندن اور بعض عرب دارالحکومتوں سے کھینچتے ہیں۔ یہ فلسطین کے مقدس زمنوں پر نمک پاشی ہے، یہ اسرائیل کے وجود کو دائمی بنانے کا حربہ ہے، جس کے نیچے الاقصیٰ کی آہ و بکا دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ معاہدہ محض ایک دستاویز نہیں، یہ تاریخ کے ساتھ خیانت ہے، یہ ملت اسلامیہ کے مقدسات کی نیلامی ہے۔

یہ کہہ کر بھی خوفزدہ کیا جا رہا ہے کہ آج آئی ایم ایف اور دیگر عالمی مالیاتی ادارے نئے جنگیزی لشکر کی صورت میں ملت اسلامیہ پر معاشی بمباری کر رہے ہیں قرض کے کوڑے، پابندیوں کی زنجیریں، ترقی کے نام پر غلامی کے معاہدے، اور اب اسرائیل کو تسلیم کرو، ورنہ امداد بند کا نیا ہتھیار ہم پر مسلط کئے جانے کا خطرہ ہے؟ کیا ہماری خودی اتنی ارزاں ہو چکی ہے؟ کیا ہم سودی قرضوں کے سوداگر بن کر ایمان کا سودا کریں گے؟

آج کچھ لوگ ایک نئی بات لے کر آتے ہیں وہ کہتے ہیں، جب عرب ممالک اسرائیل کو تسلیم کر رہے ہیں۔ جب فلسطینی اتھارٹی کا ایک گروہ اس سے امن کی بات کر رہا ہے، جب ترکی، مصر، اردن، حتیٰ کہ چین جیسے غیر مسلم دوست ممالک بھی اسرائیل سے تعلقات رکھتے ہیں تو پھر پاکستان کیوں تنہا کھڑا ہے؟ کیا ہم باقی دنیا سے زیادہ مسلمان ہیں؟ کیا ہم عربوں سے زیادہ فلسطینی ہیں؟ میں ان سب سوالوں کا صرف ایک جملے میں جواب دینا چاہتا ہوں "ہم اصولوں کے غلام ہیں، حالات کے نہیں۔"

یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ پاکستان سعودی عرب کے اشارے کا منتظر ہے؟ سعودی عرب فی الحال اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتا، مگر بعض غیر رسمی تعلقات کے آثار موجود ہیں۔ امریکی دباؤ کے تحت معاملات چل رہے ہیں۔ پاکستان اگر اس معاملے پر سعودی عرب کی پیروی کرے گا تو یہ اپنی خارجہ پالیسی کو گروہ رکھنے کے مترادف ہو گا۔ قائد اعظم نے تو صراحتاً یہ فرمایا تھا ہم کسی ایسی ریاست کو تسلیم نہیں کر سکتے جو ظلم و غصب کی بنیاد پر قائم ہو اسرائیل کو جبر کے ساتھ فلسطینی زمین پر قائم کیا گیا ہے اور ہم اسے ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔

پاکستان ہمیشہ امت مسلمہ کی وحدت کے نام پر اپنے موقف کو مؤخر کرتا رہا ہے۔ مگر کیا غیرت ملی کسی دوسرے کے فتوے کی محتاج ہے؟ ہم نے قیام پاکستان کے وقت بھی خلافت عثمانیہ کی لاش پر جشن نہیں منایا تھا، ہم نے فلسطین کی حمایت میں قائد اعظم کے لبوں سے اسرائیل کو غاصب کہا تھا، قائد اعظم محمد علی جناح کا بیان یاد کروادوں کہ یہودیوں کو فلسطین میں بسانا ایسی ہی ناانصافی ہے جیسے ہندوستان میں مسلمانوں کو اقلیت میں بدل دینا۔ اگر عرب حکمرانوں نے سیاسی مصلحت سے سمجھو تا کیا، تو کیا ہم بھی غیرت ایمانی کا جنازہ نکال دیں؟ اگر فلسطینی قیادت کا ایک دھڑا غلامی کی راہ پر مائل ہوا، تو کیا ہم بھی کعبے کے بجائے تل ایب کی طرف منہ کر لیں؟ کیا ہم سعودی اشارے کے منتظر رہ کر اپنے اصول قربان کریں؟ یا اسلامی اخوت کے نام پر اپنے عقائد بیچ ڈالیں؟

یاد رکھیں ہم عربوں کے تابع نہیں، ہم قرآن کے تابع ہیں، ہم کسی حکومت کے فیصلے کے قائل نہیں، ہم شہداء کے خون کے وارث ہیں۔ اگر ہم سب کچھ دیکھ کر بھی خاموش رہیں، تو ہم صرف فلسطین کے نہیں، اپنے ایمان کے بھی مجرم ہوں گے۔ رہا مسئلہ چین کا تو کیا چین نے اسرائیل کو امت کے مقدسات تسلیم کر کے مانا ہے؟ نہیں، چین کا تعلق صرف معاشی اور تکنیکی بنیادوں پر ہے، نہ وہ القدس کا وارث ہے، نہ قبلہ اول کی حفاظت کا دعویدار۔ اور ترکی اگرچہ اس نے سفارتی تعلقات رکھے، لیکن صدر اردوغان کی زبان آج بھی فلسطینیوں کے حق میں شعلہ بیاں ہے، ترکی کے عوام آج بھی بیت

المقدس کے سپاہی ہیں۔ تو ہم کیوں ان تعلقات کو ایمان کا معیار بنائیں؟

پاکستان اس وقت مغربی مالیاتی نظام کی زنجیروں میں پھنسا ہوا ہے۔ آئی ایم ایف اور فیٹف کی شرائط میں جکڑا ہوا ہے اور یقیناً پاکستان اس چنگل سے نکلنے کیلئے تگ و دو میں مصروف ہے لیکن یہ بھی عین ممکن ہے کہ عالمی مالیاتی ادارے اپنے سامراجی آقاؤں کے اشارے پر معاشی چابک استعمال کرتے ہوئے اسرائیل کو تسلیم کروانے کے لیے مزید قرضوں کی شرائط، مالی بحرانون کی آڑ میں امداد کی بندش کی دھمکیاں استعمال کریں اور اگر ایسا ہو تو یہ ہماری خودداری کا جنازہ ہوگا۔

دور نہ جائیں، ابھی کل ہی کی بات ہے کہ پاکستان کا ازلی دشمن بھارت اسرائیلی معاونت سے خاکم بدہن پاکستان کو نیست و نابود کرنے نکلا تھا، شیطان صفت ٹرائیکا کا دعویٰ تھا کہ پاکستان چند گھنٹوں میں گھٹنے ٹیک کر سرخم کر دے گا لیکن اس کے نتیجے میں کیا ہوا؟ 2024ء کے اواخر میں پاک-بھارت لائن آف کنٹرول پر جب کشیدگی بڑھی، تو بھارتی میڈیا اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے اعتراف کیا کہ اسرائیل نے بھارت کو ڈرون ٹیکنالوجی، لیزر گائیڈڈ میزائل، اور ساہر جاسوسی سہولیات فراہم کیں۔ بھارت نے اپنے اتحادیوں کی مکمل مدد کے ساتھ 6 مئی 2025ء کو پاکستان کے چھ مقامات پر میزائل فائر کر کے جنگ کا آغاز کر دیا اور یہ بھی سننے کو ملا کہ اسرائیل نے اپنے کامی کاروپ ڈرون کے ساتھ اس کے آپریٹر بھی یہ کہہ کر انڈیا روانہ کر دیئے کہ صرف 4 ڈرون ہی پاکستان کیلئے کافی ہیں۔ پاکستان نے نہ صرف 69 ہاروپ ڈرون تباہ کئے بلکہ 9 ڈرونز کو ان کی ساری ٹیکنالوجی پر سبقت حاصل کر کے انہیں بحفاظت نیچے اتار لیا گیا۔ بھارت کی جانب سے بعض میزائل حملوں میں اسرائیلی ساختہ اسلحہ استعمال ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ اسرائیل نہ صرف پاکستان کا دشمن ہے بلکہ اسلام دشمنی میں بھارت کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہے۔

سب سے پہلے عراق کے اسٹیٹ پلانٹ پر حملہ کر کے اسے تباہ کرنا، اس کے بعد عرب ممالک پر اسرائیلی حملے، لبنان پر حزب اللہ کے خلاف بمباری، غزہ پر روزانہ فضائی حملے، یمن میں آئے دن وحشیانہ حملے، کیا یہ سب اقدامات بین الاقوامی قانون کی صریح خلاف ورزی نہیں ہیں؟ کیا یہ خطے میں کشیدگی کی آگ بھڑکانے کی سازش نہیں ہیں؟ 2025ء کے آغاز میں اسرائیل نے شام اور عراق میں ایرانی تنصیبات کو نشانہ بنایا، اور ایران کے اندر خفیہ کارروائیوں کا اعتراف بھی کیا لیکن اس کے بعد حالیہ حملوں میں اسرائیل اور اس کے اتحادیوں نے مل کر اس خطے میں جو تباہی مچائی ہے، کیا وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے؟ اس وقت ایک ملین سے زائد انڈین اسرائیل کے کرایہ کے سپاہیوں کے طور پر غزہ اور دیگر مسلمان ملکوں پر حملوں کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر لڑ رہے ہیں اور ہمارے غلیبی ممالک اب بھی آنکھیں بند کر کے ان کی سرپرستی میں مصروف ہیں۔ کیا ان شرمناک عمل کے بعد ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم ان کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں کے ازلی دشمنوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے سامنے سر جھکا دیں؟ یہ فیصلہ ہم نے کرنا ہے! میں پورے یقین کے ساتھ یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ابراہیمی معاہدے کی آڑ میں مسلم امہ کی تقسیم ایک اور خطرناک ہتھکنڈہ ہے جس کا مطلب نہ صرف مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنا بلکہ یہود ہنود کے ایجنڈے کو مسلط کرنا ہے؟

کیا ہمیں قرآن اور شہداء کی زبان کافی نہیں؟ وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَنَمَسْكُمُ النَّارُ۔ ظالموں کی طرف جھکنا بھی آگ کو دعوت دینا ہے۔ (ہود: 113)

کیا اسرائیل کو تسلیم کرنا لازم ہو گیا؟ نہیں ہرگز نہیں تاریخ کے ضمیر پر، قرآن کے حکم پر، اور ملت کی غیرت پر یہ فرض عین ہے کہ اسرائیل کو تسلیم کرنا، ظلم کی تائید، ناجائز قبضے کی سند اور شہداء کے خون کی توہین ہے۔

یاد رکھیں کہ پاکستانی عوام کے دل بیت المقدس کی گلیوں میں دھڑکتے ہیں۔ فلسطینی بچے ہمارے خوابوں میں آتے ہیں۔ اور اگر حکومت نے کسی بین الاقوامی دباؤ کے تحت اسرائیل کو تسلیم کرنے کی کوشش کی، تو عوامی بیداری ایک طوفان بن جائے گی۔

آئیے قرآن کی روشنی میں دیکھتے ہیں کہ اسرائیل کو تسلیم کرنا دینی، اخلاقی، اور سیاسی لحاظ سے کیا درست ہے؟
لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ۔۔ (المائدہ: 51) اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔
یہ آیت ایک فکری اصول ہے۔ سیاسی لحاظ سے اسرائیل ایک جارح ریاست ہے جو اقوام متحدہ کی درجنوں قراردادوں کی خلاف ورزی کر چکی، جنہوں نے تمہارے قبلہ اول پر قبضہ کیا، تم ان سے دوستی کیسے کر سکتے ہو؟ بچوں، عورتوں، اور بے گناہوں کا قاتل ہے۔ نسل پرستی، دہشتگردی اور فسطائیت کی علامت بن چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا حکومت پاکستان عوامی دباؤ کا مقابلہ کر پائے گی؟ جبکہ پاکستانی عوام بیت المقدس کی آزادی کو ایمان کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اسرائیل کے خلاف ہر سطح پر نفرت رکھتے ہیں۔ فلسطینیوں کے ساتھ قلبی و روحانی رشتہ رکھتے ہیں۔ اگر حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اشارہ بھی دیا تو عوامی مزاحمت، تحریکوں، جلسوں، اور دھرنوں کا طوفان آئے گا۔ سیاسی جماعتیں اس مسئلے کو انتخابی نعرہ بنا دیں گی۔ علمائے کرام، مدارس، اور دینی تنظیمیں سڑکوں پر آئیں گی اور یہی ہمارا دشمن چاہتا ہے کہ پاکستان کے اندرونی انتشار کو اس قدر بڑھا دیا جائے کہ ان کے اندر یکجہتی کو ختم کر کے خانہ جنگی کا آغاز کر دیا جائے اور اسی کی آرمیں خاکم بدہن یہ کہہ کر پاکستان کے اسٹیٹ اثاثہ جات کی حفاظت کیلئے مداخلت ضروری ہو گئی ہے کہ یہ اثاثہ جات کسی دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ بھلا ان سے بڑھ کر پاکستان کا اور کون دشمن ہو سکتا ہے؟

یاد رکھیے! جس طرح ہم ایک لاکھ سے زائد مظلوم کشمیریوں کی شہادتوں کو نہیں بھولے اور نہ ہی اس پر خاموش ہیں، اسی طرح ہم فلسطین پر بھی سوداگری نہیں کریں گے۔ ہم وہ امت ہیں جسے قرآن نے خیر امت کہا ہے:
"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (العمران: 110)

اے اہل ایمان! کیا آپ کو بیت المقدس کی مٹی یاد ہے؟ وہی مٹی... جس پر نبیوں کے قدموں کے نشان ہیں؟ کیا آپ کو وہ درودیو یاد نہیں، جن پر اذان عمر کی گونج نقش ہے؟ کیا آپ بھول گئے وہ قبلہ اول... جس کی طرف ہمارے محبوب نبی ﷺ نے ہجرت کے بعد سجدہ کیا تھا؟ بتائیں کیا وہی سر زمین آج صیہونی ظلم کے بوٹوں تلے روندی نہیں جا رہی؟ کیا ہم نے غزہ میں معصوم بچوں کی لاشیں نہیں دیکھیں؟ کیا ہم نے ایک باپ کو اپنے بیٹے کا کٹا ہوا بازو اٹھاتے نہیں دیکھا؟ کیا ہم نے ان کے ہاتھوں پر بچوں کے خون آلودہ لاشے نہیں دیکھے؟



کیا ہم نے ماؤں کو اپنے شہید بیٹوں کے کفن چومتے ہوئے نہیں سنا، وہ کہہ رہی ہوتی ہیں، اے میرے لعل تجھے تو میں نے حافظہ قرآن بنایا تھا... تو تو مسجد اقصیٰ کا امام بننے والا تھا؟ آپ ہی بتائیں کہ کیا ہم اب بھی اسرائیل کو دوست کہیں؟ کیا معاہدہ ابراہیمی میں امن ہے؟ یا فلسطین کی روح کا قاتلانہ سودا؟ یاد رہے پاکستان کا مقام امت مسلمہ کی غیرت کے مینار جیسا ہے، اور وہ مینار جو پھرتے سمندروں کی لہروں میں بڑے بڑے جہازوں کے راستے کی رہنمائی کرتا ہے کہ وہ راستہ نہ بھولیں۔ پاکستان وہ ملک ہے جس کا نقشہ بیت المقدس کے لیے بھی کھینچا گیا تھا، وہ قوم ہے جس نے اقوام متحدہ میں اسرائیل کے خلاف پہلا ووٹ دیا، پاکستان وہ ریاست ہے جس کے

پاس ایمان، ایٹم، اور امت کی امیدتوں ہیں۔ اگر پاکستان جھک جائے، تو صرف ایک ریاست نہیں، پورا عالم اسلام زمین بوس ہو جائے گا۔

آج وقت کا تقاضا ہے کہ ہم حق و باطل کی سرحد پہ ڈٹ جائیں۔ ہمیں معاہدہ ابراہیمی کے نقاب میں چھپے صیہونی فریب کو بے نقاب کرنا ہو گا۔ ہمیں اپنی نسلوں کو ایمان، غیرت، اور اخوت کیلئے وہ چراغ بنانا ہو گا جو ظلم کی ہر آندھی کو شکست دے دے۔ یاد رکھیے اگر ہم خاموش رہے، تو تاریخ کے صفحے ہمارے ضمیر کی لاش سے بھرے ہوں گے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔۔۔ (العمران: 85)
اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہو گا۔ گویا اسرائیل کو تسلیم کرنا، دنیا و آخرت کا خسارہ ہے۔ یہ دینی خیانت ہو گی، تاریخی بد عہدی ہو گی، اور سیاسی خود کشی ہو گی۔

آج ہم تاریخ کی اُس گھڑی میں کھڑے ہیں، جہاں خاموشی — خیانت بن جائے گی، جہاں مصلحت — بے غیرتی کہلائے گی، اور جہاں "دباؤ" کا مطلب — "ضمیر کا قتل" ہو گا۔ اب یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کیا ہم اسرائیل کو تسلیم کریں؟ کیا ہم مسجد اقصیٰ کے غاصبوں سے دوستی کریں؟ کیا ہم قائد اعظم، علامہ اقبال اور اس کیلئے ملین سے زائد شہداء کے پاکستان کو صیہونیت کے قدموں میں ڈال دیں؟ کیا ہم قبلہ اول کی غیرت کا سودا کریں گے؟ تو پھر یاد رکھیں، آج جو ہم کہہ رہے ہیں، وہ صرف الفاظ نہیں یہ امت کا عہد ہے کہ فلسطین کی آزادی تک ہم خاموش نہیں بیٹھیں گے، اسرائیل کو تسلیم کرنا ہمیں منظور نہیں، ہم اپنے بچوں کو کشمیر و فلسطین کی محبت کے ساتھ زندہ رکھیں گے:

یہ لا الہ الا اللہ کا وعدہ ہے، یہ کربلا کے وارثوں کی پکار ہے، نہ بیت المقدس بھولیں گے، نہ فلسطین چھوڑیں گے، نہ اسرائیل کو مانیں گے، نہ کشمیر کو فراموش کریں گے اور نہ کسی قرض کے بدلے ایمان بیچیں گے۔ آج ہم اس منبر سے ایک صد بلند کرتے ہیں وہ صد اوجو علیٰ کے لہجے میں غیرت، خالدؓ کے تیور میں جرأت، اور عمرؓ کی نگاہ میں عدل بن کر گونجتی ہے اور وہ گونج ہے کہ نہ جھکیں گے، نہ بکیں گے، نہ اسرائیل کو تسلیم کریں گے، اور نہ فلسطین کو فراموش کریں گے کیونکہ ہمیں قرآن نے سکھایا ہے

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (العمران: 139) کمزور نہ پڑو، غم نہ کرو، تم ہی غالب ہو اگر تم مؤمن ہو وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاءُ الْمُبِينُ



اختتامی دعا بیت المقدس کا چراغ بجھنے نہ پائے

اللَّهُمَّ انصُرِ الْمُسْتَضْعَفِينَ فِي فَلَسْطِينَ، وَارْزُقْنَا النَّبَاتَ فِي دِينِكَ، وَاهْدِنَا سُبُلَ الرِّشَادِ اللَّهُمَّ اَنْبِرْ لِهَذِهِ الْأُمَّةِ أَمْرَ رُشْدٍ، يُعَزِّزُ فِيهِ أَهْلُ طَاعَتِكَ، وَيُذِلُّ فِيهِ أَهْلُ مَعْصِيَتِكَ۔ اے اللہ! فلسطین کے مظلوم اور کمزور

مسلمانوں کی مدد فرما، ہمیں اپنے دین پر ثابت قدمی عطا فرما، اور ہمیں ہدایت دے سیدھے اور کامیاب راستوں کی طرف۔ جس میں تیرے فرمانبرداروں کو عزت حاصل ہو۔۔۔ اور تیرے نافرمان ذلیل و رسوا ہوں۔ اے اللہ! اس امت کے لیے ایسا صالح نظام قائم فرما جس کی منزل دنیا و آخرت کی کامیابی ہو۔ اے اللہ! ہم تیرے عاجز بندے ہیں، ہم نہ بادشاہ ہیں، نہ جر نیل، ہم تو صرف تیرے نبی ﷺ کے امتی ہیں، جن کی آنکھوں کا نور اقصیٰ ہے، جن کے دل کا سکون کعبہ ہے، اور جن کے خون میں فلسطین کی خاک گھلی ہوئی ہے۔ یا اللہ جو مسجد اقصیٰ کو غاصبوں سے بچانے نکلے، ان کی راہ آسان فرما، جو بیت المقدس کی طرف نظریں بلند رکھے، اسے دنیا و آخرت میں سرفراز فرما۔ اور جو اسرائیل کو تسلیم کرنے کی سازش میں شریک ہو، اسے ہدایت

ہم نے ایمان "دے... یا پھر عبرت بنا دے۔۔۔ یا رب ہمیں غیرت دے، ہمیں جرات دے، ہمیں استقامت دے، تاکہ ہم آنے والی نسلوں کو کہہ سکیں، بچایا، ہم نے فلسطین نہیں بچا۔۔۔ آمین یا رب العالمین

بروز جمعۃ المبارک 7 صفر الحرام 1447ھ یکم جولائی 2025ء

جب عدل خاموش ہو جائے، تو تاریخ چیختی ہے

جب تاریخ کے اوراق پلٹے جائیں تو غزہ اور کشمیر کے ایسے ایسے باب ملتے ہیں جہاں انسانیت کی روح پر کاری ضرب لگتی ہے اور انصاف کے ترازو کے دونوں پیمانے بگڑ جاتے ہیں۔ غزہ و کشمیر کا وہ معصوم خون، جو آج برسوں سے نہ تھمنے والا بارشِ بلا ہے، نہ صرف فلسطینیوں و کشمیریوں کی دہلیز پر بلکہ عالم انسانیت کی ضمیر پر گہرا سوالیہ نشان بن چکا ہے۔ تاریخ کا سینہ جب لہو سے تر ہو جائے، اور عالمی ضمیر اپنے ہی اصولوں کا ماتم کرتا دکھائی دے، تو سمجھ لیجیے کہ کوئی بہت بڑا ظلم روار کھا گیا ہے۔

غزہ کی سر زمین اس وقت انسانیت کی سب سے بڑی آزمائش گاہ بن چکی ہے۔ غزہ کی سر زمین آج بھی بے گناہ انسانی خون سے تر ہو رہی ہے، جہاں نہتے فلسطینی بچوں، خواتین اور بزرگوں کو جدید ترین اسلحہ اور بارود سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ معصوم بچوں کی لاشیں، تباہ شدہ عمارتیں، اور چیختے بلکتے زندہ انسان، ایک ایسی خاموش چیخ بن چکے ہیں جسے صرف وہی سن سکتا ہے جس کا دل اور ضمیر زندہ ہو۔ اس ظلم کی داستان محض اسرائیلی جارحیت تک محدود نہیں، بلکہ اس میں عالمی قوتوں کے علاوہ بھارت کی مکار مودی سرکار کا بھی واضح اور مجرمانہ کردار سامنے آیا ہے۔

اس ستم ظریفی میں مکار مودی کا شرمناک کردار جسے نظر انداز کرنا، تاریخ کے منصفوں کیلئے ممکن نہیں۔ ایک طرف جہاں اسرائیل فلسطینیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہا ہے، وہیں بھارتی حکومت کی خاموش یا گاہے گاہے شریعت نہامیت نے اس دوزخ کو مزید بھڑکانے کا کام کیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق، بھارت نے اسرائیل کو ایک ملین کے قریب افراد بھرتی کر کے دیے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر فلسطینی عوام کے قتل عام میں شریک ہو رہے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے بلکہ بین الاقوامی ضمیر کیلئے ایک کھلا چیلنج بھی ہے۔ ان مظالم کی سنگینی میں مودی سرکار کا کردار تاریخ کے صفحات میں شرمندگی کی سیاہی سے رقم ہو گا۔

مسلمان دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور عسکری افق پر جہاں ایک طرف اندرونی چیلنجز سے نبرد آزما ہے، وہیں دوسری طرف بیرونی محاذوں پر ایک منظم، باہم مربوط اور خفیہ گٹھ جوڑ اس کے مفادات، نظریات اور سرحدات کو مسلسل نشانہ بنا رہا ہے۔ یہودیوں کی روز افزوں قربت اور مشترکہ عسکری عزائم اسی بڑی سازش کا حصہ ہیں، جسے اگر وقت پر نہ سمجھا گیا تو امت مسلمہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

بھارت اور اسرائیل کے تعلقات، جو ابتدا میں محتاط تھے، اور ان کا آغاز بھی اگرچہ سرد مہری سے ہوا، لیکن 1990ء کی دہائی سے بتدریج مضبوط ہوتے چلے گئے، یہ رشتہ صرف سفارتی بوس و کنار تک محدود نہیں رہا بلکہ ایک گہری، جڑیں پکڑتی ہوئی دوستی میں بدل گیا ہے، جس کا محور ہندو تو ا کے نظریے اور صیہونیت کے سیاسی مفادات کی ہم آہنگی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان میں گرجوشی در آئی۔ یہ تعلقات محض تجارتی یا دفاعی نوعیت کے نہیں، بلکہ ایک نظریاتی ہم آہنگی پر بھی قائم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔

اسرائیل کی صیہونیت اور بھارت کی ہندو تو ا ایک دوسرے کی آئینہ دار بن چکی ہیں۔ دونوں اقلیت دشمنی، مذہبی عصبیت، اور عسکری طاقت کے زعم میں مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں ممالک کے تعلقات میں روز بہ روز وسعت اور شدت آرہی ہے۔ مودی حکومت نے ان روابط کو نئی جہت دی۔ دفاعی معاہدات، مشترکہ فوجی مشقیں، خفیہ معلومات کا تبادلہ اور اسرائیلی اسلحے کی خریداری نے دونوں ملکوں کو اسٹریٹیجک پارٹنرز میں بدل دیا۔ تاریخ

کا چراغ بتاتا ہے کہ مودی کے اقتدار میں اس تعلق نے نہ صرف عسکری بلکہ ثقافتی اور خفیہ محاذ پر بھی گہرائی اختیار کی ہے اور اب ایک مضبوط عسکری محاذ کی صورت اختیار کر چکے ہیں لیکن اس اتحاد کی اصل قیمت انسانیت ادا کر رہی ہے، خاص طور پر فلسطین اور کشمیر کے مظلوم عوام۔

اسرائیل کی جانب سے غزہ پر ڈھائے جانے والے مظالم میں بھارت کی معاونت کئی سطحوں پر واضح ہے۔ ہتھیاروں کی فراہمی، انٹیلیجنس کا تبادلہ، اور اسرائیلی اقدامات کی سفارتی حمایت اس معاونت کی نمایاں صورتیں ہیں۔ بھارت اور اسرائیل ایک دوسرے کو نہ صرف تکنیکی معاونت فراہم کر رہی ہے بلکہ اقوام متحدہ میں فلسطینیوں کے خلاف قراردادوں پر خاموش حمایت یا رائے شماری سے اجتناب کا راستہ اپنا کر اس کی پشت پناہی بھی کر رہی ہے۔ یہ سب ایک بڑے سازشی جال کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔

جب غزہ پر آسمان سے بم برسائے جاتے ہیں، اور زمین پر معصوم جانوں کی ہلاکت کا بازار گرم ہوتا ہے، تب بھارت کی خاموشی یا پھر بعض مواقع پر کھل کر اسرائیل کی مدد، انسانی روایات کا ایک بہیمانہ اور مکروہ عمل ہے۔ 2023-2024 کی اسرائیلی جارحیت کے دوران جب دنیا بھر میں انسانی حقوق کی تنظیمیں چیخ چیخ کر مظالم کی گواہی دے رہی تھیں، بھارت کی مودی سرکار نے اسرائیل کی نہ صرف اخلاقی بلکہ عملی حمایت کی بھارتی فوج اور خفیہ ایجنسیاں اسرائیل کو فوجی اور اطلاعاتی خدمات مہیا کرتی ہیں، جو نہ صرف ان مظالم میں معاون ثابت ہوتی ہیں بلکہ اس تشویش ناک رشتے کی ایک تلخ حقیقت ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، لاکھوں بھارتی شہری اسرائیل کے مختلف اداروں، خاص طور پر سکیورٹی اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض افراد براہ راست ان آپریشنز کا حصہ ہیں جو فلسطینی علاقوں میں کیے جاتے ہیں۔ اس شمولیت سے نہ صرف بھارتی حکومت کی اسرائیل نوا پالیسی کی تصدیق ہوتی ہے بلکہ یہ امر بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بھارت کی طرف سے فلسطینی مسلمانوں کے قتل عام میں غیر اعلانیہ شرکت بھی موجود ہے۔ یہ ایک اخلاقی دیوالیہ پن کی بدترین مثال ہے۔

اطلاعات کے مطابق، اسرائیلی افواج کو تکنیکی ماہرین، سکیورٹی کنٹرولرز، اور دیگر معاون عملہ فراہم کرنے کیلئے بھارت نے ایک ملین کے قریب افراد کی بھرتی کی، جنہیں اسرائیل روانہ کیا گیا۔ ان میں سے کئی افراد نیم عسکری تربیت یافتہ یا ریٹائرڈ سکیورٹی اہلکار تھے جو نجی عسکری کمپنیوں کے ذریعے اسرائیل کی مدد کر رہے ہیں۔

یہ ایک تلخ اور دردناک حقیقت ہے کہ اسرائیلی فوج اور دیگر اداروں میں لاکھوں بھارتی شہری مختلف درجوں میں شامل ہیں۔ اس جنگی میکانزم میں ان کی خدمات نہایت گہری اور سنگین نوعیت کی ہیں، جس کا خونی رنگ انسانی حقوق کے خلاف ایک بدترین جرم ہے۔ یہاں قتل انسانیت کے جرم کے ساتھ ساتھ انسانی ضمیر کی موت بھی درپیش ہے۔ ایک ملین بھارتی افراد کا اسرائیلی فوج اور دیگر اداروں میں باقاعدہ خدمات، جس میں مسلمانوں کو قتل کرنا شامل ہے، اب کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں رہا۔ ہندوستان کی جانب سے اسرائیل کو دفاعی اور سکیورٹی شعبے میں ایک ملین کارکنوں کی فراہمی، ایک معمولی تجارتی معاہدہ نہیں بلکہ ایک عسکری اتحاد کی پیش بندی ہے، جس پر امت مسلمہ میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔

خلیجی ممالک کی سرزمین پر کروڑوں بھارتی ورکرز کی موجودگی اور اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری اب ایک شدید اضطراب کا باعث بن چکی ہے۔ مسلمانوں کا اجتماعی شعور یہ سوال اٹھا رہا ہے کہ کیا امت مسلمہ اپنے اندر پلنے والے ان عناصر سے بے خبر ہے جو درحقیقت اس کے خلاف صف آراء ہو چکے ہیں؟ کیا صرف سفارتی مصلحتیں اور وقتی اقتصادی مفادات ہمیں ان دشمنان اسلام کے خلاف آواز بلند کرنے سے روکتے رہیں گے؟

یہ تمام واقعات محض اتفاقات نہیں بلکہ ایک واضح اور منظم حکمت عملی کا حصہ ہیں، جس میں یہود و ہندو کا گٹھ جوڑ مسلمانوں کے وجود، نظریات اور خود مختاری کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ہندوستان کی جانب سے اسرائیل کو ایک ملین افرادی قوت کی پیشکش، اسرائیلی ڈرونز اور آپریٹرز کی پاک بھارت جنگ میں شمولیت، قطر اور ایران میں بھارتیوں کی اسرائیلی نیٹ ورکس میں گرفتاری — یہ تمام شواہد ایک وسیع تر سازش کی نشاندہی کرتے ہیں جو امت مسلمہ کے خلاف بروئے کار لائی جا رہی ہے۔

اسرائیلی "ہاروپ کامی کا ڈرونز" اور ان کے آپریٹرز کی بھارت میں موجودگی اور پاکستان کے خلاف آپریشنز میں شمولیت ایک کھلی مداخلت ہے، جو اسرائیل کی جارحانہ پالیسی اور ہندوستان کے ساتھ اس کے فوجی تعاون کی شدت کو ظاہر کرتی ہے۔ قطر میں 18 بھارتی نیوی اہلکار جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہوئے، جنہیں سزائے موت سنائی گئی لیکن مودی حکومت کی پس پردہ معافی تلافی کے نتیجے میں ان کی رہائی ظاہر کرتی ہے کہ یہ جاسوس بھارت و اسرائیل کے مشترکہ مفادات کیلئے کام کر رہے تھے۔ ایران میں موساد کے نیٹ ورک سے وابستہ بھارتی ایجنٹس کی گرفتاری اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارت نہ صرف اسرائیل کیلئے عسکری پارٹنر ہے بلکہ اس کا جاسوسی نیٹ ورک بھی اب عالم اسلام کے قلب تک سرایت کر چکا ہے۔

افسوس کا مقام یہ ہے کہ عالمی سطح پر، خصوصاً مسلم ممالک کی قیادت نے ان خطرناک پیش رفتوں پر کوئی مضبوط موقف اختیار نہیں کیا۔ خلیجی ممالک، جہاں 25 ملین سے زائد بھارتی شہری مقیم ہیں اور جہاں انڈیا میں اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری موجود ہے، وہاں سے بھی صرف سفارتی خاموشی سننے کو مل رہی ہے۔ اس خاموشی کو عوام بے حسی سے تعبیر کر رہے ہیں، اور سوشل میڈیا و عوامی حلقوں میں خلیجی قیادت سے شدید سوالات اٹھائے جا رہے ہیں کہ کب تک مفادات کے نام پر دشمن کو گلے لگایا جائے گا؟

آج امت مسلمہ ایک دور ہے پر کھڑی ہے۔ ایک طرف قومی مفادات، وقتی معاہدے اور اقتصادی وابستگیاں ہیں، تو دوسری طرف امت کا اجتماعی ضمیر، عقیدہ، نظریہ اور بقا۔ اگر اب بھی ہم نے خاموشی اختیار کی، تو کل ہمارے شہروں میں وہی دشمن ہماری ہی صفوں سے ہماری بنیادوں کو کھوکھلا کر تاد کھائی دے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ عالم اسلام، خاص طور پر خلیجی قیادت، اس گٹھ جوڑ کے خلاف ایک واضح، دو ٹوک اور متحد موقف اختیار کرے۔

یہود و ہندو کی اس باہمی رفاقت کا مقابلہ صرف اس وقت ممکن ہے جب مسلمان ممالک معاشی، عسکری اور سفارتی محاذ پر بھی اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔ قرآن ہمیں خبردار کرتا ہے:

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ. (البقرہ: 120)

"یہود و نصاریٰ تم سے ہر گز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلے لگو۔"

یہ آیت آج کے عالمی منظر نامے میں ایک ناقوسِ خطر بن کر گونج رہی ہے۔ اگر اب بھی امت مسلمہ خوابِ غفلت میں رہی، تو وہ دن دور نہیں جب دشمن ہمارے گھروں کے اندر تک آکر ہمیں کمزور کر دے گا۔

اسلامی تعلیمات دشمن کی پہچان، اس سے محتاط رویہ، اور امت کے مفادات کی حفاظت پر زور دیتی ہیں۔ جب دشمن کھلے عام مسلمانوں کے خلاف عسکری اور جاسوسی اقدامات کرے تو اس سے تعلقات جاری رکھنا صریح منافقت اور امت کے مفاد سے خیانت ہے۔ اسلام دشمن کے ساتھ تعلقات میں نرمی کی اجازت دیتا ہے جب تک وہ ظلم نہ کرے۔ لیکن جب دشمن کھلے طور پر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہو، تو خاموشی خیانت کے مترادف ہو جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۚ الْمَائِدَةُ: 51

اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے تو وہ ان میں سے ہے اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔ یہ آیت ہمیں خبردار کرتی ہے کہ مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں، خصوصاً جب وہ مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی پر اتر آئیں۔ اسلامی اصول واضح ہیں: امت کے مفاد کو ہر قومی و تجارتی مفاد پر ترجیح حاصل ہے۔ جب دشمن مسلمانوں کے خلاف کھلی جنگ میں مصروف ہو، تو ان سے اتحاد حرام کے درجے میں پہنچ جاتا ہے۔

آج امت مسلمہ ایک دوراہے پر کھڑی ہے: ایک طرف قومی مفادات، وقتی معاہدے اور اقتصادی وابستگی ہیں، تو دوسری طرف امت کا اجتماعی ضمیر، عقیدہ، نظریہ اور بقا۔ اگر اب بھی ہم نے خاموشی اختیار کی، تو کل ہمارے شہروں میں وہی دشمن ہماری ہی صفوں سے ہماری بنیادوں کو کھوکھلا کر تاد کھائی دے گا۔ وقت آگیا ہے کہ مسلمان قیادت عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہود و ہنود کے اس ناپاک اتحاد کے خلاف ایک جرأت مندانہ اور دو ٹوک موقف اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَكُونُوا أَقْوَمَ لِمَنِ لِلَّهِ شَهَادَةُ الْفَسْطِطِ ۚ (المائدہ: 8) اے ایمان والو! عدل پر قائم رہو، اللہ کیلئے گواہی دینے والے بنو۔

☆ خلیجی قیادت کو چاہیے کہ وہ بھارتی ورکرز، بھارتی سکیورٹی کمپنیز، اور بھارتی اداروں کے کردار کا از سر نو جائزہ لے اور غیر جانبدارانہ انٹیلیجنس رپورٹنگ کے تحت پالیسیاں مرتب کرے۔

☆ خلیجی ممالک کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنی سرمایہ کاری کی حکمت عملی پر نظر ثانی کرتے ہوئے جن بھارتی کمپنیوں کا اسرائیل یا دشمن طاقتوں سے براہ راست تعلق ہے، ان پر پابندیاں عائد کی جائیں یا ان سے وابستگی کو ختم کیا جائے۔

☆ عوامی دباؤ کو موثر پالیسی میں بدلنے کیلئے سوشل میڈیا، عوامی فورمز اور خطبہ جمعہ جیسے ذرائع سے عوامی شعور کو بیدار رکھا جائے تاکہ حکومتیں بھی اپنی روش بدلنے پر مجبور ہوں۔

☆ اسلامی ممالک کی تنظیم کو فوری طور پر ان معاملات پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کرنا چاہیے تاکہ اجتماعی موقف اور مشترکہ لائحہ عمل اختیار کیا جاسکے۔

اقوام متحدہ اور یورپی یونین کے بیانات اگرچہ بظاہر مظلوموں کے حق میں دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان کا عملی رویہ اکثر منافقانہ ہوتا ہے۔ اقوام متحدہ ہو یا یورپی یونین، بیشتر عالمی ادارے محض بیانات پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اقوام متحدہ اور یورپی یونین کی طرف سے غزہ کے معاملے پر جو بیان بازی ہوتی ہے، وہ اکثر منافقت کی حدوں کو چھوتی ہے۔ عالمی سطح پر انسانی حقوق کے علمبردار ادارے کبھی کبھار اس تشدد کو صرف لفظی مذمت میں محصور کر دیتے ہیں، جس سے اسرائیل کو اپنی نرغے بازی جاری رکھنے کی جرات ملتی ہے۔ حقائق یہ ہیں کہ یہ عالمی ادارے ایک ایسے کھیل کا حصہ ہیں جہاں طاقتوروں کے مفادات کی آڑ میں مظلوم کی دادرسی پس پشت ڈال دی جاتی ہے۔

اسرائیل کو مہلک ہتھیار فراہم کرنے والے بھی یہی ہیں اور امن کی قراردادیں پیش کرنے والے بھی۔ اس دوغلی پالیسی نے بین الاقوامی نظام انصاف کو مذاق بنادیا ہے۔ ایسے میں فلسطینیوں کی دادرسی کی بجائے، انہیں صرف 'تشویش' یا 'اگہری نظر' جیسے کھوکھلے الفاظ کے سہارے تسلی دی جاتی ہے۔ مغربی دنیا، جو یوکرین میں انسانی حقوق کی دہائی دیتی ہے، فلسطینی عوام کے حق میں کھل کر بولنے سے گریزاں ہے۔ بھارت کا اسرائیل کے ساتھ فوجی

تعاون نہ صرف بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے بلکہ انسانی ضمیر پر ایک بدترین داغ بھی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی چیمپئن بھارت کی اس شمولیت پر خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔

مودی حکومت کی خارجہ پالیسی میں ایک نمایاں رجحان اسرائیل نوازی ہے۔ یہ اتحاد محض عسکری یا معاشی بنیادوں پر نہیں بلکہ نظریاتی ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ ہندو تو اور صیہونیت دونوں ایک ہی سوچ کو فروغ دیتے ہیں۔ مودی حکومت کی پالیسیاں نہ صرف ہندو تو کے نظریے سے مکمل طور پر سرشار ہیں بلکہ مودی سرکار کی حکمت عملی درحقیقت ہندو تو اور صیہونیت کے اتحاد کی ایک سنگین مثال ہے۔ جہاں ایک طرف وہ بھارتی قوم پرستی کو بنیاد بناتے ہوئے مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی میدان میں تنہا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہیں اسرائیل کے ساتھ تعلقات کو گہرائی دیکر عالمی سطح پر ایک مشترکہ نظریاتی اور عملی اتحاد قائم کر رہا ہے۔ یہ گٹھ جوڑ نہ صرف بھارت کے اندر فرقہ وارانہ خلیج کو بڑھا رہا ہے بلکہ خطے کی سلامتی کیلئے بھی خطرے کی گھنٹی ہے۔

یہی وہ نظریہ ہے جو بھارت کو ایک ہندو ریاست میں بدلنے کا خواب دیکھتا ہے۔ اسی خواب کی تکمیل کیلئے اسرائیل کی صیہونی ریاست سے گہری ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے۔ دونوں حکومتیں اپنے اپنے اقلیتوں کے خلاف ریاستی طاقت کا استعمال، میڈیا کنٹرول، اور نفرت انگیز نظریات کی ترویج میں مصروف ہیں۔ مذہبی برتری، اقلیت دشمنی اور طاقت کے ذریعے تسلط۔ غزہ میں جاری نسل کشی پر بھارتی خاموشی بلکہ عملی شرکت اسی سوچ کا عملی مظہر ہے۔ یہود و ہندو کا یہ گٹھ جوڑ نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ مشرق وسطیٰ کی سیاست میں بھی نیا عدم توازن پیدا کر رہا ہے۔

آج جب دنیا مختلف تنازعات سے دوچار ہے، فلسطین کا مسئلہ ایک ایسا آئینہ بن چکا ہے جس میں ہر ملک کا اصل چہرہ نمایاں ہو رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ظلم کے سامنے خاموشی کبھی انصاف کی راہ ہموار نہیں کرتی۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ عالمی برادری، اقوام متحدہ، اور ہر آزاد ضمیر والے فرد کو اس انسانی ایسے کے خلاف کھڑا ہونا چاہیے۔ مظلوم فلسطینیوں کی حمایت کرنا صرف ایک سیاسی موقف نہیں، بلکہ ایک اخلاقی اور دینی فرض ہے۔ جسے نظر انداز کرنا انسانی ضمیر کی موت کے مترادف ہے۔

یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں۔ غزہ میں بہتا خون، فلسطینی بچوں کی چیخیں، اور دنیا کی بے بسی، ہمیں جھنجھوڑ رہی ہیں۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم مظلوموں کا ساتھ دیں، انصاف کے حق میں آواز بلند کریں، اور ظالموں کے خلاف ہر سطح پر مخالفت کریں۔ یہ فقط فلسطین کی جنگ نہیں، بلکہ انسانیت کے وقار اور ضمیر کی بقا کی جنگ ہے۔ بھارت، جو خود کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتا ہے، اس ظلم میں شریک ہو کر نہ صرف اپنے آئینی اصولوں کی توہین کر رہا ہے بلکہ عالمی امن کیلئے بھی خطرہ بن چکا ہے۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ دنیا بھارت کے اس کردار کو بے نقاب کرے اور فلسطینی عوام کے حق میں کھل کر آواز بلند کرے۔



یوں تاریخ کا وہ کارواں جو ظلم و ستم کی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے، ایک دن ضرور انصاف کی بلندیوں کو چھوئے گا۔ غزہ کی زمیں پر بہتا خون رائیگاں نہیں جائے گا، اور مودی سرکار کی صیہونی گٹھ جوڑ کی سازشیں دنیا کی روشن آنکھوں سے پوشیدہ نہیں رہیں گی۔ اس قصے کا انجام وہی ہو گا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ ظالموں کو عبرت کی نظر سے دیکھا جائے گا اور مظلوموں کو ان کا حق ملے گا۔ یہ وقت ہے کہ ہم سب اپنے

ضمیر کی آواز سنیں اور اس صدی کے اس ظلم کے خلاف بلند آواز میں اعلان کریں کہ جو ظلم کرے گا، تاریخ اسے معاف نہیں کرے گی۔

تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ ظلم ہمیشہ وقتی جیت حاصل کرتا ہے، مگر ہمیشہ ہزیمت اس کا مقدر بنتی ہے۔ آج اگر ہم نے خاموشی اختیار کی تو کل شاید ہماری نسلیں ہمارے اس جرم عظیم پر شرمندہ ہوں گی۔ غزہ کا خون پکار رہا ہے، اور مودی سرکار کا کردار ہر حساس دل کیلئے باعثِ اذیت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہم صرف تماشائی نہ رہیں بلکہ مظلوموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں، ورنہ یہ خامشی ہمارے ضمیر کی موت کا اعلان ہوگی۔

امت مسلمہ اس وقت تاریخ کے ایک نازک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ جہاں اندرونی کمزوریوں، فرقہ واریت اور سیاسی بے سمتی نے اس کے اتحاد کو متزلزل کر رکھا ہے، وہیں بیرونی دشمن ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت مسلمانوں کے خلاف خفیہ اور اعلانیہ اقدامات میں مصروف ہیں۔ ہندوستان اور اسرائیل کا حالیہ فوجی، انتہیلیجنس اور معاشی اتحاد اسی وسیع تر سامراجی منصوبے کا حصہ ہے، جو امت مسلمہ کی وحدت، سلامتی اور خود مختاری کو چیلنج کر رہا ہے۔ لہذا، اب صرف تماشائی بن کر بیٹھنے کا وقت نہیں رہا۔ اب وقت ہے ایک فعال اور بیدار امت کا، جو ظالموں کو لاکارے، مظلوموں کا سہارا بنے، اور اپنی سرزمینوں پر دشمن کے ہر خفیہ وار کاڈٹ کر مقابلہ کرے۔ مسلمان عوام کا اضطراب صرف جذبات کا طوفان نہیں، بلکہ عمل، احتساب اور بیداری کا ایک صریح مطالبہ ہے۔

یہود و ہنود کا یہ گٹھ جوڑ اب کسی راز کی شکل میں نہیں بلکہ کھلے الفاظ میں سامنے آچکا ہے۔ ان کے درمیان بڑھتی ہوئی عسکری ہم آہنگی، جاسوسی نیٹ ورکس، اور مشترکہ دشمنی صرف ایک قوم یار یاست کے خلاف نہیں، بلکہ اسلام اور امت محمدیہ ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اگر امت آج بھی خاموش رہی، تو وہ دن دور نہیں جب دشمن ہمارے گھروں کے اندر بیٹھ کر ہمارے مستقبل کے فیصلے کرے گا۔

قرآن کا پیغام واضح ہے: **وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال: 60)** اور ان سے لڑنے کیلئے جو کچھ (سپاہیانہ) قوت سے پہلے ہوئے گھوڑوں سے جمع کر سکو سو تیار رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر جنہیں تم نہیں جانتے اللہ انہیں جانتا ہے، ہیبت پڑے۔

غزہ کا بہتا ہوا خون صرف اسرائیل کے ہاتھوں کا قصور نہیں، بلکہ ان تمام قوتوں کی مجرمانہ خاموشی اور عملی شمولیت کا نتیجہ ہے جو ظالم کے ساتھ کھڑی ہیں۔ مودی سرکار کی جانب سے اسرائیل کو ملین افراد کی عسکری مدد فراہم کرنا ایک ایسا "جرم عظیم" ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ لہذا، وقت آگیا ہے کہ ہم بیدار ہوں، ہم باہم متحد ہوں، اور نہ صرف ہم اپنے دشمنوں کو پہچان کر ان کی سازشوں کا مؤثر جواب دیں بلکہ اقوام عالم اور باضمیر افراد کو بھی ظلم کے خلاف اپنا ہمنوا بنائیں کہ فلسطین کے مظلوم عوام کا ساتھ دیں قبل اس کے کہ انسانیت مکمل طور پر شرمندہ ہو جائے۔ یہ وقت ہے فیصلہ کرنے کا، عمل کرنے کا اور امت کی حفاظت کا۔ اگر ہم نے آج اقدام نہ کیا، تو کل صرف پچھتاوا باقی رہے گا۔

جب زمین کی خامشی چیخ میں ڈھل جائے، اور آسمان کی نیلاہٹ بارود کے دھوئیں سے سیاہ ہو جائے، تو یہ محض ایک انسانی سانحہ نہیں ہوتا، بلکہ تہذیبوں کے زوال کی نوحہ گری ہوتی ہے۔ غزہ کے زخم خوردہ درودیوار، اور ان کے سائے میں سسکتی زندگی، ایک سوالیہ نشان بن چکی ہے۔ ایسا سوال جو اقوام عالم کی پیشانی پر کلنک کے داغ کی مانند ثبت ہو چکا ہے۔ یہ ظلم محض چند میز انکوں، چند عمارتوں، یا چند لاشوں کا احاطہ نہیں کرتا؛ یہ اس پورے عالمی نظام انصاف کی چیر پھاڑ ہے، جو طاقتوروں کے مفاد پرست عزائم کے سامنے بے بس ہو چکا ہے۔ مودی، جو آج ہندوستانی سیاست میں فسطائیت کا ننگا مجسمہ بن کر کھڑا ہے، صرف غزہ کے قاتلوں کا حلیف نہیں بلکہ خود ایک ایسا جابر ہے جس کے دامن پر گجرات کے مسلمانوں کا لہوا بھی تک خشک نہیں ہوا۔ وہ

جب اسرائیل کو ایک ملین انسانی قوت فراہم کرتا ہے، تو یہ محض عددی معاونت نہیں بلکہ ایک مشترکہ نظریاتی ہم آہنگی ہے، جو انسانی اقدار کو روند کر "ہندو توا" اور "صہیونیت" جیسے تنگ نظر تصورات کو عالمی طاقت بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔

اور جب اس ظلم پر امریکا جیسے مدعیان تہذیب و تمدن خاموش رہیں، بلکہ اپنے اسلحہ و اثر سے اس ظلم کی آبیاری کریں، اور جب اس ظلم پر امریکا خاموش نہیں بلکہ سرگرم تعاون ہو، اسلحہ مہیا کرے، دفاعی قراردادوں کو ویٹو کرے، اور اسرائیل کی ہر درندگی کو "حق دفاع" کا نقاب پہنا کر عالمی ضمیر کو دھوکہ دے، تو پھر یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا اب دو واضح یکپہلوں میں بٹ چکی ہے تو وقت کا مورخ سوال کرتا ہے کہ یہ عالمی ضمیر کس خواب خرگوش میں مدہوش ہے؟ کیا یہی وہ عالمی اقدار ہیں جن کے نام پر دنیا کو ماضی میں درس انسانیت دیا جاتا رہا؟ کیا یہی وہ "جمہوریت" ہے جو فلسطینی بچوں کی لاشوں پر اپنے جھنڈے گاڑ کر جشن مناتی ہے؟ ایک طرف وہ جو مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہیں، اور دوسری طرف وہ جو ظالموں کی پشت پر نیزہ بردار ہیں، اپنی آئندہ نسلوں کیلئے کیا پیغام چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

یاد رکھیں! جب تاریخ کے اوراق گرد آلود ہو کر پلٹتے ہیں، تو خون کی روشنائی سے لکھی گئی سطریں صدیوں تک چیختی رہتی ہیں۔ غزہ کی اجڑی ہوئی گلیاں، یتیم بچوں کی آہیں، اور چھتوں سے بے نیاز، دھوپ اور بارود میں لپٹی مائیں، گواہ ہیں اس ظلم کی جسے مودی جیسے نسل پرست حکمرانوں کی سیاسی قہقہوں نے نہ صرف روا رکھا بلکہ تنگ انسانیت کے منصب پر فائز ہو کر اس کی پشت پر ایک ملین ہندوانہ فوجی مظالم کا اضافہ کیا۔ ایسا اضافہ جسے انسانیت کا کوئی دستور، عقل کا کوئی پیمانہ، اور شرافت کا کوئی اصول تسلیم نہیں کرتا۔

خلیجی ریاستوں کی خاموشی، ان کا سفارتی بے حسی سے لبریز سکوت، اور مجرمانہ چشم پوشی اس مقام پر آپہنچی ہے جہاں امت مسلمہ کے قلوب و اذہان میں اضطراب کی چنگاریاں بھڑکنے لگی ہیں۔ عوامی بیداری کی صدا سوشل میڈیا کے دجلہ و فرات میں بہتی ہوئی، اب کسی طوفان کی تمہید بنتی جا رہی ہے۔ ایک ایسا طوفان، جس نے شاہی خیموں کی ریتلی بنیادوں کو لرزادیا ہے، اور جس کو مجرمانہ سیاسی مصلحتوں کی کالی چادروں نے ڈھانپ رکھا ہے۔

خلیجی ممالک، جنہیں حریمین کی نسبت، امت کی قیادت، اور تیل کی دولت نے ایک اخلاقی و سیاسی ذمہ داری عطا کی تھی، وہ جب غزہ کے بچوں کے نوے سن کر بھی لب کشائی نہ کریں، اور اسرائیلی مظالم پر ایک مذمتی بیان دینا بھی گوارا نہ کریں، تو وہ صرف اپنی حکومتی چادریں داغدار نہیں کرتے، بلکہ امت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کو بھی زخمی کرتے ہیں۔ ان کی یہ خاموشی اس مجرمانہ غفلت کی مظہر ہے جسے تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔ آج ان ممالک کی عوام سوشل میڈیا کے دروہام پر سوالات کی بارش کر رہی ہے، اور اگر یہ سوالات دیر تک ان سروں کے اوپر منڈلاتے رہے، تو کل یہ بارش طوفان بن کر محلات کی بنیادوں کو بہالے جائے گی۔

مگر مکافات عمل کی راہ میں کوئی دربان نہیں ہوتا۔ یورپ، جسے ہم اکثر مصلحت پسند اور منافق کہتے آئے ہیں، وہاں کی جامعات، طلبہ اور باضمیر افراد نے وہ اخلاقی جرات دکھائی ہے جس کی امید ہمیں اہل قبلہ سے تھی۔ فرانس جیسے ممالک کا فلسطین کو تسلیم کرنے کا فیصلہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ عوام کا اجتماعی ضمیر اگر بیدار ہو جائے، تو ایوان اقتدار کے ستون لرزنے لگتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جسے ہم بیداری کی ابتدا کہہ سکتے ہیں، اگر ہم نے اس کی قدر نہ کی، تو یہ شعلہ بجھ کر صرف راکھ چھوڑ جائے گا۔

آنے والی نسلیں، جب ان ظلم و تشدد کے پیر ہن میں ملبوس ان لمحات پر نظر ڈالیں گی، تو تاریخ کا ترازو ہاتھ میں لیے سوال کریں گی:
اے عالمی راہبرو! تم نے ظلم کے خلاف کیا کیا؟

اے مسلم حکمرانو! تم نے مظلوموں کا ساتھ دیا یا قاتلوں کی میزبانی؟

اے اہل علم و دانش! تمہارے قلم، تمہاری تقریریں، اور تمہارے فتویٰ کہاں دفن ہو گئے تھے؟

یہ سوالات ہم سے بھی ہوں گے۔ ہم، جو آج قلم تھامے بیٹھے ہیں، جو زبان رکھتے ہیں، جو احتجاج کی رفق رکھتے ہیں۔ ہم اگر خاموش رہے تو ہم بھی اسی صف میں کھڑے تصور کیے جائیں گے جہاں مصلحت کے نام پر غیرت بیچ دی جاتی ہے، اور خاموشی کو عقلمندی کا نام دیا جاتا ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم تاریخ کی سمت بدلنے والے کرداروں میں اپنا نام درج کروائیں۔ یہ صرف غرہ کا مقدمہ نہیں، یہ انسانیت کی بقا، تہذیب کا مستقبل، اور امت مسلمہ کی عزت و ناموس کا سوال ہے۔ جو آج خیمہ ظلم کے سائے میں خاموش کھڑا ہے، کل وہ عدل کے ایوان میں مجرموں کی صف میں کھڑا ہو گا۔

مگر مکافات عمل اپنے خداداد توازن سے کبھی غافل نہیں ہوتا۔ فرانس، آئرلینڈ، اور دیگر یورپی ممالک کے وہ طلبہ و طالبات، جنہوں نے اپنی جامعات کو احتجاج کا قبلہ بنا دیا، وہی اس تبدیلی کا استعارہ بن گئے جس نے بالآخر ان کی حکومتوں کو فلسطین کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ گویا مغرب کے ضمیر کی خاکستر میں اب بھی کچھ چنگاریاں سلگتی ہیں، جو عدل و حق کی شمع روشن کرنے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔

آنے والی نسلیں جب اس عہد ستم پر نظر ڈالیں گی، تو مودی، نیتن یاہو، اور ان کے عالمی پشت پناہوں کے نام تاریخ کے اس اوراق میں ہوں گے جہاں یزید، ہلاکو، اور چنگیز جیسے استبدادی سائے منہ چھپائے کھڑے ہوں گے۔ اور وہ نسلیں یہ سوال ضرور کریں گی کہ جب انسانیت کا گلا گھونٹا جا رہا تھا، تم کہاں تھے؟ جب پلٹ کر تاریخ کا جواب میں ان کے آباؤ اجداد کا نام لے گی تو وہ ندامت کے کس سمندر میں غرق ہوں گے۔

اور اگر ہم نے آج بھی اپنی آواز بلند نہ کی، تو کل ہماری خاموشی ہماری شناخت بن جائے گی۔ ایک ایسی شناخت جو شرمندگی سے بھرپور، تاریخ کے ہاشیوں میں محو ماتم ہو گی۔

فلسطین: استقامت سے ریاست تک

غزہ کی مٹی آج بھی جل رہی ہے۔ وہاں کی ہوائیں بارود کی بو سے آلودہ ہیں، آسمان بچوں کی سسکیوں سے بوجھل ہے، اور زمین ماں کے آنسوؤں سے شرمندہ۔ اسرائیلی بمباری نے جسموں کو نہیں، انسانیت کو چیر دیا ہے۔ غزہ میں ایک ماں اپنے بچے کی لاش کو دیکھ کر خاموش ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں، کیونکہ آنسو ختم ہو چکے ہیں۔ اس کے چہرے پر چیخ بھی نہیں، کیونکہ چیخیں اب کسی کو جھنجھوڑتی نہیں۔ غزہ کی تباہ حال گلیوں میں آج بھی معصوم بچوں کی لاشیں بلے تلے دبی ہیں، ان ماؤں کے بچے گونجتے ہیں جنہوں نے صرف اپنے بچوں کے کھلونے دفن کیے۔ ساری دنیا کے کیمرے، رپورٹر، سربراہان مملکت اور اقوام متحدہ کے اجلاس سب یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔ مگر جو نہیں دیکھ پایا وہ ہے فلسطینی سرزمین پر بہتا خون، تباہ شدہ مکانات، زخمی بچے، سسکتی عورتیں اور دھوئیں میں لپٹا آسمان۔ یہ کوئی اتفاقی سانحہ نہیں، بلکہ ایک منظم نسل پرستی، دانستہ امتیاز اور سفارتی منافقت کا نتیجہ ہے۔ بلکہ یہ انسانیت کا وہ جنازہ ہے جو ایک منظم نسل پرستی، دانستہ امتیاز اور سفارتی منافقت کے نتیجہ میں ساری دنیا کے کندھوں پر لا دیا گیا ہے۔

غزہ کی سرزمین جو آج بھی بے گناہ انسانی خون سے تر ہو رہی ہے، جہاں نہتے فلسطینی بچوں، خواتین اور بزرگوں کو جدید ترین اسلحہ اور بارود سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ گارڈین اخبار کے مطابق 64،260 فلسطینی شہید ہو چکے ہیں اور طویل المدتی اثرات (بیماری، غذائی قلت وغیرہ) کے باعث ہلاکتیں چار گنا تک 186،000 تک پہنچ سکتی ہیں۔ ان شہداء میں 19 ہزار سے کہیں زیادہ بچے، 500،12 خواتین اور باقی مرد شامل ہیں۔ "ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن اور لانسٹ" کے مطابق اسرائیل کے ہاتھوں مجموعی ہلاکتیں کہیں زیادہ ہو سکتی ہیں، خاص طور پر جب غیر منقسم اموات (بیماری، غذائی قلت، صحت کی سہولیات کی تباہی وغیرہ) کو شامل کیا جائے۔ اس جنگ نے صرف فوری مارپیٹ سے انسان کا نقصان نہیں کیا، بلکہ گھنٹوں تک جاری بھوک، بیماری اور بنیادی ڈھانچے کی تباہی نے بھی ایک کل وقتی انسانی بحران پیدا کیا ہے۔

اس ظلم کی داستان محض اسرائیلی جارحیت تک محدود نہیں، بلکہ اس میں عالمی قوتوں کے علاوہ بھارت کی مودی سرکار کا بھی واضح اور مجرمانہ کردار سامنے آیا ہے۔ اطلاعات کے مطابق، بھارت نے اسرائیل کو ایک ملین کے قریب افراد بھرتی کر کے دیے ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر فلسطینی عوام کے قتل عام میں شریک ہو رہے ہیں۔ یہ عمل نہ صرف انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے بلکہ بین الاقوامی ضمیر کیلئے ایک کھلا چیلنج بھی ہے۔ ایسے میں مودی حکومت کا اسرائیل کے ساتھ اس سطح کا عسکری اشتراک اس "جرم عظیم" کا ناقابل انکار حصہ بن جاتا ہے، جس میں انسانیت سسک رہی ہے اور انصاف خاموش ہے۔

اسرائیل نے نسل پرستی کو جس ڈھنگ سے اپنایا ہے، وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ وہی روش ہے جو جنوبی افریقا کی سفید فام اقلیت نے سیاہ فام اکثریت کے خلاف اختیار کی تھی۔ جس طرح جنوبی افریقا میں سوویٹو ظلم کے خلاف علامت بن گیا تھا، آج غزہ ویسا ہی فلسطینی جدوجہد کا ایک استعارہ بن چکا ہے۔ جس طرح سوویٹو ختم ہوا، دنیا نے نسلی امتیاز کے اُس نظام کو زمیں بوس ہوتے دیکھا، اسی طرح اسرائیل میں بھی نسل پرستی پر مبنی نظام کے خاتمے کی امید کی جا رہی ہے۔ اور اب یہ امید پہلے سے کہیں زیادہ قوی ہو چکی ہے۔

21 مارچ 1960ء کو شری پے ولے میں سیاہ فام مظاہرین پر گولیاں برسائی گئیں۔ 16 جون 1976ء کو سوویٹو میں بچوں کو نشانہ بنایا گیا اور پھر 2018ء میں، غزہ میں اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں فلسطینیوں کو گولیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر اب، 2023ء اور 2024ء کے بعد اسرائیل کی کارروائیاں کہیں زیادہ شدید

اور بے نقاب ہو چکی ہیں۔

جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کو ریاستی سطح پر الگ کیا گیا، بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا، اور انہیں ووٹ تک کا حق نہ دیا گیا۔ اسرائیل نے بھی فلسطینیوں کو شہریت سے محروم رکھا (خصوصاً غزہ، مغربی کنارے کے باشندوں کو) آزاد نقل و حرکت، روزگار، تعلیم و علاج جیسے بنیادی حقوق سے محروم کیا، الگ تھلگ بستیوں میں محدود کیا۔ جنوبی افریقہ میں بنٹو اسٹین بنائے گئے، اسرائیل نے "سیلینین اتھارٹی" کو اسی طرز پر محدود خود مختاری دی۔ اسرائیل آج بھی فلسطینیوں کو ان ہی حقوق سے محروم کر رہا ہے جن سے جنوبی افریقہ میں سیاہ فاموں کو رکھا گیا تھا۔

ووٹ کا حق محدود، نقل و حرکت پر پابندیاں، معاشی محاصرے، صحت، تعلیم، روزگار تک محدود رسائی جیسے ظالمانہ ہتھکنڈے استعمال کر کے غزہ کو ایک بہت بڑی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ 2024ء کی جنگ کے بعد عالمی اداروں نے متواتر رپورٹ کیا ہے کہ غزہ ایک "ناقابل رہائش" علاقہ بن چکا ہے۔ دو انہیں ناپید، پانی آلودہ، اور بنیادی ڈھانچہ طبعی کا ڈھیر بن چکا ہے۔ اسرائیل کی پابندیوں اور محاصرے نے لاکھوں جانوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ غزہ کی صورت حال اب انسانی بحران سے کہیں آگے جا چکی ہے۔

آج بھی اسرائیل کی پالیسیوں کے مدافعين موجود ہیں، جیسے کہ رچرڈ گولڈ اسٹون، مگر وہ آوازیں اب اقلیت میں ہیں۔ جنوبی افریقہ کے نوبل انعام یافتہ ڈیسمنڈ ٹوٹو کے مطابق "اسرائیل کی پالیسی وہی ہے جو جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی تھی۔" اب یہ رائے دنیا بھر میں تقویت پکڑ چکی ہے۔ اسرائیل نے 1948ء میں جن سات لاکھ عرب باشندوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کیا، آج ان کی اولادیں غزہ، اردن، لبنان، شام اور مغربی کنارے میں مہاجرت کی زندگی گزار رہی ہیں۔ جب یہ فلسطینی مارچ فار ریٹرن کے تحت اپنی زمینوں کی طرف بڑھتے ہیں، تو انہیں گولیوں سے روکا جاتا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق، ہر بے دخل شدہ قوم کو اپنی آبائی سرزمین کی طرف واپسی کا حق حاصل ہے۔

2023-2025 کے دوران، دنیا نے فلسطینی ریاست کے حق میں ایک نئی لہر دیکھی ہے۔ امریکا کی جامعات سے لیکچریورپ کی پارلیمنٹوں تک، اسرائیل پر دباؤ میں اضافہ ہوا ہے۔ کئی ممالک نے اسرائیلی مظالم کو "ناقابل برداشت" قرار دیا ہے، جسے جنوبی افریقہ کی طرز پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔

اب سوال یہ نہیں رہا کہ اسرائیل کو کیا کرنا چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ اب کتنی دیر اور ظلم برداشت کیا جائے گا؟ اگر اسرائیل دوریاستی حل سے گریزاں ہے، تو اسے جنوبی افریقہ کی طرز پر ایک مشترکہ ریاست کا ماڈل اپنانا ہو گا جہاں ہر فرد—یہودی، مسلمان، یا مسیحی—برابری کے حقوق سے بہرہ ور ہو لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسرائیل کی موجودہ حکومت، خاص طور پر وزیراعظم نیتن یاہو اور اس کے اتحادی، مساوی ریاست کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ 2024ء میں بیت المقدس، غرب اردن اور نیجیف میں جو نئی بستیاں قائم کی گئیں، وہ واضح اشارہ دیتی ہیں کہ اسرائیل فلسطینیوں کو مزید پسپا کرنا چاہتا ہے۔

2024ء کی جنگ میں اسرائیلی درندگی اور انسانیت سوز مظالم نے غزہ کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔ اسپتال، اسکول، پناہ گاہیں تک نشانہ بنیں۔ ہزاروں شہری، جن میں بچے اور خواتین بھی شامل ہیں، جاں بحق ہوئے۔ عالمی میڈیا، سوشل میڈیا اور عینی شواہد نے ان مظالم کو پوری دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا۔ یورپ اور امریکا کی جامعات میں پڑھنے والی نئی عالمی نوجوان نسل کا دباؤ، بالخصوص یہودی نوجوان بھی، اب اسرائیلی بیانیے کو مسترد کرنے لگے ہیں۔ طلبہ مظاہرے، بائیکاٹ مہمات اور عوامی احتجاج نے یورپی سیاستدانوں کو مجبور کیا کہ وہ اسرائیل کی کھلی حمایت کو ترک کریں۔

لیکن اب منظر بدل رہا ہے۔ وہ یورپ، جو کبھی اسرائیل کا خاموش حمایتی تھا، اب فلسطین کے حق میں بول رہا ہے۔ فرانس، اسپین، آئرلینڈ جیسے ممالک فلسطین کو تسلیم کر رہے ہیں۔ یہ صرف سفارتی فیصلہ نہیں، بلکہ یہ اُس بچے کے آنسوؤں کا جواب ہے، جس کا کھلونا خون میں لت پت ہوا۔ یہ ان گناہم قبروں کا اعتراف ہے، جو تاریخ کے ہر ورق پر اسرائیلی جارحیت کا نشان چھوڑ گئی ہیں۔ یہ کہانی صرف فلسطین کی نہیں، یہ ہر اس انسان کی ہے جسے اس کی شناخت، نسل، مذہب یا زمین کے نام پر روند دیا گیا۔ یہ کہانی ختم نہیں ہوئی، لیکن شاید ایک نیا باب شروع ہونے والا ہے۔ یورپی عوامی دباؤ، طلبہ اور رسول سوسائٹی کا فلسطین کے حق میں بھرپور احتجاج، اسرائیلی حکومت کی دائیں بازو پالیسیوں پر عالمی برہمی اور امریکا کی خاموشی اور دہرے معیار نے یورپ کو خود مختار فیصلے لینے پر مجبور کیا۔

غزہ کی تباہ شدہ گلیوں سے اٹھنے والا دھواں ابھی مکمل طور پر چھٹا نہیں، لیکن دنیا کے سیاسی افق پر ایک نئی روشنی کی کرن ضرور پھوٹی ہے۔ فرانس، اسپین، آئرلینڈ، ناروے اور دیگر یورپی ممالک کی جانب سے فلسطین کو باضابطہ ریاست تسلیم کیے جانے کا اعلان، بلاشبہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ برسوں سے عالمی برادری جس اسرائیلی بیانیے کے سائے میں خاموش کھڑی تھی، اب اس کے قدم ڈمگ گانے لگے ہیں۔ عالمی سیاست میں ایک غیر متوقع اور انقلابی موڑ صرف ایک علامتی اشارہ نہیں بلکہ اسرائیل کی نسل پرستانہ پالیسیوں کے خلاف ایک سفارتی بغاوت ہے۔

اسی تناظر میں یورپی ممالک کا حالیہ اقدام محض علامتی اعلان نہیں بلکہ ایک سفارتی انقلاب ہے۔ فرانس جیسے ملک کا فلسطین کو تسلیم کرنا، اسرائیل کے دیرینہ اتحادیوں میں دراڑ کی علامت ہے۔ یہ اقدام دنیا کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ فلسطینی قوم کی آواز کو مزید دبایا نہیں جاسکتا۔

فرانس جیسے ملک کی جانب سے فلسطین کو تسلیم کیا جانا غیر معمولی بات اس لیے بھی ہے کہ یہ ملک طویل عرصے سے امریکا اور اسرائیل کے ساتھ توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتا آیا ہے۔ اب جبکہ اسرائیل نے غزہ میں 2024ء کی جنگ میں بے تحاشا انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں اور عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، تو یہ ممکن نہ رہا کہ یورپ اس ظلم پر خاموش رہے۔ برازیل، جنوبی افریقا، انڈونیشیا، ترکی (عالمی جنوبی ممالک کا اتحاد) اور دیگر ترقی پذیر ممالک فلسطین کے کھلے حامی بن کر سامنے آئے ہیں۔

ان ممالک نے اقوام متحدہ اور دیگر عالمی فورمز پر فلسطینی موقف کی حمایت میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ امریکا کی کمزور خارجہ پالیسی اور داخلی کشمکش، سیاسی تقسیم اور عالمی قیادت میں فقدان نے یورپ کو مجبور کیا کہ وہ خود فیصلہ کرے۔ اب یورپ امریکا کے بغیر بھی سفارتی فیصلے لینے لگا ہے، اور فلسطین کی تسلیمیت اسی رجحان کی علامت ہے۔

فلسطین کو تسلیم کرنے والے ممالک کی بڑھتی ہوئی فہرست نے اسرائیل کو سفارتی محاذ پر تنہا کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسرائیلی حکومت اس وقت شدید سفارتی بحران اور یورپی دباؤ کا شکار ہے اور اندرون ملک بھی مخالفت کا سامنا ہے۔ ایک عرصے سے مردہ سمجھے جانے والے "دورِ یاسی حل" کو نئی زندگی ملی ہے۔ اب فلسطین کو ایک جائز ریاست کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے، جس سے امن مذاکرات کے امکانات پھر سے پیدا ہوئے ہیں جس کے بعد دورِ یاسی حل کی بحالی کا مطالبہ زور پکڑ گیا ہے۔

یہ اقدام اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسرائیل کے حالیہ ظلم و ستم پر امریکی سرپرستی کو مسلسل دیکھتے ہوئے امریکا اور یورپ میں اختلافات ایوانوں سے نکل

کر عالمی میڈیا کی زینت بننا شروع ہو گئے ہیں کہ یورپ اب امریکا کی پیروی نہیں کر رہا۔ یورپ کی آزاد خارجہ پالیسی کا یہ قدم مغربی دنیا کی صف بندی کو نئے سرے سے تشکیل دے رہا ہے۔ جب دنیا کی بڑی طاقتیں فلسطین کو ریاست ماننے لگیں تو فلسطینی عوام کو ایک نئی اخلاقی طاقت اور فلسطینی مزاحمت کو اخلاقی جواز میسر آ جاتا ہے۔ گویا یہ بات اس امر کا ثبوت ہے کہ ان کی جدوجہد اب صرف مزاحمت نہیں بلکہ آزادی کی منظم اور قانونی تحریک بنتی جا رہی ہے۔

یہ پیش رفت بتاتی ہے کہ بین الاقوامی ضمیر بیدار ہو چکا ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ سات عشروں سے روا رکھا جانے والا ظلم، عالمی طاقتوں کیلئے اب دفاع کرنا ممکن نہیں رہا۔ ایک نئی عالمی صف بندی کا آغاز ہو گیا ہے۔ اگر یہ رفتار جاری رہی تو آئندہ چند برسوں میں فلسطینی ریاست اقوام متحدہ کی مکمل رکنیت حاصل کر سکتی ہے۔

اب اسرائیل کو انتخاب کرنا ہو گا یا تو وہ دوریاستی حل قبول کرے، یا ایک مشترکہ ریاست کے اصولوں کو مانے۔ جہاں برابری کے ساتھ فلسطینیوں کو مکمل حقوق دیے جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یورپی ممالک کی جانب سے یہ سفارتی بغاوت ایک بڑی عالمی تحریک میں تبدیل ہو سکتی ہے، جیسی ماضی میں جنوبی افریقا کے خلاف دیکھی گئی تھی۔

اسرائیلی حکومت، خصوصاً نیتن یاہو کی قیادت، اس یورپی اقدام کو ”دہشتگردوں کی فتح“ قرار دے رہی ہے مگر خود اسرائیل کے اندر بھی اختلاف کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ سابق اسرائیلی سفیروں، دانشوروں اور فوجی افسران کی طرف سے تنقید کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ نئی نسل کی اسرائیلی یہودی آبادی کا سوال بھی زور پکڑ رہا ہے کہ کیا ہم واقعی برابری پر یقین رکھتے ہیں یا برتری پر؟

ادھر امریکا کی صورت حال قابل توجہ ہے۔ ایک طرف وہ اسرائیل کے تحفظ کی یقین دہانی کرواتا ہے، دوسری طرف اب اُسے اپنے یورپی اتحادیوں کی نئی خود مختار پالیسیوں کا سامنا ہے۔ واشنگٹن کی سفارتی پوزیشن پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہو چکی ہے۔ ایک طرف وہ خلیجی ممالک پر زور دے رہا ہے کہ وہ اسرائیل سے تعلقات معمول پر لائیں، دوسری طرف اس کے پرانے اتحادی فلسطین کو تسلیم کر کے اسرائیلی موقف سے بغاوت کر رہے ہیں۔

ادھر دوسری طرف ٹرمپ کے داماد جیرالد کشتنر ایک نئے ”لارنس آف عربیہ“ کا کردار ادا کرتے ہوئے 2020ء میں امریکا کی زیر سرپرستی معاہدہ ابراہیمی تشکیل دینے میں کامیاب ہو گیا، جس کے تحت متحدہ عرب امارات، بحرین، مراکش اور سوڈان نے اسرائیل کو باقاعدہ طور پر تسلیم کر لیا۔ اس معاہدے کو امریکا کی ایک سفارتی فتح اور اسرائیل کو ”نار ملانز“ کرنے کی کوشش کے طور پر پیش کیا گیا، اُس وقت اسے امن، ترقی اور مشرق وسطیٰ میں استحکام کی ایک نئی صبح قرار دیا گیا لیکن یہی معاہدہ فلسطینی عوام کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف بھی ثابت ہوا، کیونکہ ان کی ریاستی حیثیت کو مسلسل نظر انداز کیا جاتا رہا۔

تاہم اس ابراہیم کارڈ میں امریکی مقاصد کسی سے چھپے ہوئے نہیں کہ وہ اس خطے میں ایران کو علاقائی طور پر تنہا کرنا، اسرائیل کو عرب ممالک کے قریب لا کر خطے میں اتحادی ہلاک تشکیل دینا، امریکی اسلحہ صنعت اور دفاعی معاہدوں کو فروغ دینا اور فلسطینی مسئلے کو نظر انداز کر کے اسرائیل کی سیاسی برتری کو تسلیم کرنا چاہتا ہے تاکہ مستقبل کے گریٹر اسرائیل کی راہ ہموار کی جاسکے۔



مگر 2024 کی غزہ جنگ نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سینکڑوں بچوں کی لاشیں، مسمار شدہ اسپتال، ٹوٹے ہوئے خواب اور برباد بستیوں کی تصاویر دنیا بھر میں وائرل ہوئیں۔ انسانی حقوق کی عالمی تنظیموں نے پہلی بار کھل کر اسرائیل کو نسل پرست ریاست قرار دینا شروع کیا۔ اقوام متحدہ کی متعدد قراردادوں، عالمی عدالت انصاف کے فتوؤں اور صحافیوں کی رپورٹس نے ثابت کیا کہ اسرائیلی پالیسیوں میں واضح نسل پرستی، جبری قبضہ اور انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں شامل ہیں۔

اس پر مستزاد ٹرمپ کا مطالبہ کہ غزہ کو مکمل طور پر امریکا کے حوالے کر دیا جائے اور وہ عالمی سیاحت کیلئے ایک ماڈل شہر تعمیر کرنا چاہتا ہے اور شنید یہ بھی ہے کہ اس پراجیکٹ میں کئی کمپنیوں کو یہاں پر جدید سہولتوں کے ساتھ ہوٹل اور دیگر سیاحتی مقامات بنانے کا عندیہ بھی دے دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ٹرمپ نے یہ حکم بھی جاری کر دیا تھا کہ یہاں پر بسنے والے تمام باشندوں کو عرب پڑوسی ممالک اپنے ہاں بسانے کا بندوبست کریں۔

2023ء سے لیکر اب تک کی تباہ کن جنگوں کے بعد، فلسطینی مزاحمت نے ایک نئی جہت اختیار کی ہے۔ دنیا کی نظریں غزہ پر جمی ہوئی ہیں۔ اسرائیل اب زیادہ دیر تک نسل پرستی اور جبر کے ساتھ دنیا کے سامنے کھڑا نہیں رہ سکتا۔ عالمی سطح پر اسرائیل کے خلاف بائیکاٹ تحریک، تنقید اور نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔ آج، فلسطینیوں کی جدوجہد کو جنوبی افریقا کی تاریخی تحریک سے جوڑا جا رہا ہے۔ اور جس طرح جنوبی افریقا میں نسلی امتیاز کا قلع قمع ہوا تھا، ویسا ہی انجام اسرائیل میں رائج نا انصافیوں کا بھی مقدربن سکتا ہے۔

☆ یقیناً امریکا میں یورپی ممالک کے اس فیصلے کے رد عمل میں یہودی لابیوں کا موجودہ امریکی حکومت پر مزید دباؤ بڑھ جائے گا اور یہی وجہ ہے کہ امریکی محکمہ خارجہ نے فوری طور پر خاموش سفارتی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے ان فیصلوں پر نرم اختلاف کیا، مگر کھلے عام مخالفت سے گریز کیا تاکہ ٹرانس اٹلانٹک اتحاد کو نقصان نہ پہنچے۔

☆ تاہم امریکا یورپ پر غیر رسمی دباؤ کیلئے نیٹو، جی سیون اور تجارتی پلیٹ فارمز کے ذریعے دباؤ ڈال سکتا ہے کہ وہ اپنے موقف میں نرمی لائیں۔ اقوام متحدہ میں اگر فلسطینی ریاست کو مکمل رکنیت دینے کی کوشش ہو، تو امریکا فلسطینی ریاست کی رکنیت کی مزاحمت کیلئے ویٹو پاور استعمال کر سکتا ہے (جیسا وہ 2011 میں کر چکا ہے)۔

☆ خلیجی ممالک پر دباؤ میں اضافہ کر کے سعودی عرب، عمان، قطر جیسے ممالک پر زور بڑھایا جائے گا کہ وہ اسرائیل سے تعلقات بحال کریں تاکہ یورپ اور دیگر ممالک کی طرف سے فلسطین کو تسلیم کرنے کا "اثر" زائل ہو۔

☆ امریکا فلسطین کے معاملے پر خلیجی ممالک سعودی عرب، عمان، قطر پر دباؤ بڑھائے گا کہ وہ فلسطین کے حق میں بیانات سے گریز کریں اسرائیل سے تعاون جاری رکھیں (بالخصوص انٹیلی جنس، سائبرٹیک، ہتھیار) اور فلسطینی مزاحمت پر کھل کر تنقید کریں مگر یہ ممکنہ رکاوٹیں، یورپ کی طرف سے فلسطینی ریاست کی حمایت کے بعد خلیجی حکومتوں پر اپنے عوامی دباؤ کا سامنا بڑھ جائے گا۔ اگر سعودی عرب فلسطین کو چھوڑ کر اسرائیل سے تعلقات قائم کرتا ہے تو اس کی قائدانہ حیثیت کو زک پہنچ سکتی ہے اور یہ خلیجی ممالک کیلئے ایسا امتحان ہو گا جو ان کے مستقبل کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔

ادھر امریکا میں متعدد بااثر یہودی تنظیمیں سرگرم ہیں، جیسے امریکن اسرائیل پبلک افیئرس کمیٹی، اینٹی ڈیفیمیشن لیگ، جنسا) امریکا کے قومی سلامتی کیلئے یہودی ادارہ اور کرسچن یونائیٹڈ فار اسرائیل اور دیگر طاقتور گروہ یورپی فیصلے کو روکنے یا کم از کم بے اثر بنانے کیلئے متحرک ہو چکے ہیں۔ وہ ایک طرف میڈیا پر اثر ڈال رہے ہیں اور دوسری طرف امریکی پالیسی سازوں پر دباؤ بڑھا رہے ہیں کہ وہ فلسطینی ریاست کی مخالفت جاری رکھیں۔ ان تنظیموں کی طرف سے شدید رد عمل کے طور پر:

☆ اسرائیل نواز یہودی لابیوں کی طرف سے امریکی کانگریس اور سینیٹ میں قراردادیں لائی جاسکتی ہیں جن میں یورپی ممالک کے اقدام کی مذمت ہو۔ عالمی میڈیا پر اثر انداز ہونے کیلئے ایک بھرپور مہم کے ذریعے سی این این، فاکس نیوز، نیویارک ٹائمز اور دیگر بڑے میڈیا اداروں میں فلسطین کی تسلیمیت کو ”یکطرفہ فیصلہ“ یا ”دہشتگردوں کی جیت“ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

☆ امریکی سیاسی امیدواروں پر دباؤ کیلئے آئندہ انتخابات میں وہی امیدوار کامیاب ہوں گے جو اسرائیل کی غیر مشروط حمایت کا عہد کریں گے۔ یہ گروہ، یورپی ممالک کے ساتھ دفاعی شرائط خاص طور پر نیٹو کے اندر اثر ڈالنے کی کوشش کر سکتے ہیں اور یورپی سرمایہ کاری اور دفاعی معاہدوں کو چیلنج کیا جاسکتا ہے۔

تاہم زمینی حقائق اب تبدیل ہو چکے ہیں۔ فلسطینی عوام اب صرف راکٹ یا پتھر کے ذریعے نہیں، بلکہ قانون، سفارتکاری اور عالمی رائے عامہ کی قوت سے اپنی شناخت منوانے نکلے ہیں۔ اسرائیل کو اب انتخاب کرنا ہو گا یا تو وہ دوریاستی حل قبول کرے، یا پھر جنوبی افریقا کے سابق نسل پرست نظام کی طرح ایک برابر کے حقوق پر مبنی ریاست کی طرف قدم بڑھائے، جہاں یہودیوں اور فلسطینیوں کو مساوی شہری حیثیت حاصل ہو۔ فلسطینیوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ اگر اسرائیل ایک مساوی ریاست کی طرف قدم نہیں بڑھاتا تو عالمی دباؤ کی شدت اسے اسی طرح جھکنے پر مجبور کرے گی، جیسے جنوبی افریقا کی نسل پرست حکومت نے آخر کار ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب فلسطینی اور اسرائیلی ایک ہی ریاست میں برابری کی بنیاد پر سانس لیں گے۔ اور تب غزہ، سوویٹو کی طرح، آزادی کا استعارہ بن کر ابھرے گا۔

فرانس، اسپین، آئرلینڈ، ناروے، بیلجیم اور دیگر ممالک کی طرف سے فلسطین کو باضابطہ ریاست تسلیم کرنا، ابراہیمی معاہدوں کی روح کے برعکس ایک بڑا سفارتی جھٹکا ہے۔ یورپی اقدامات کا مطلب اسرائیلی مظالم پر براہ راست بین الاقوامی مذمت کے ساتھ ساتھ فلسطینی ریاست کو قانونی و اخلاقی جواز فراہم کرنا بھی ہے۔ یورپ کے اس عمل پر جہاں امریکا کی یکطرفہ پالیسیوں کے خلاف یورپی مزاحمت کا اظہار ہوتا ہے وہاں خلیجی اور دیگر مسلم ممالک کے اسرائیل سے تعلقات پر اخلاقی سوالات اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

دنیا یہ بھی دیکھ رہی ہے کہ اسرائیلی دائیں بازو کی اندرونی سیاست انتہا پسندی کی طرف تیزی سے مائل ہو رہی ہے۔ مغربی کنارے میں نئی بستیوں، غزہ کا مسلسل محاصرہ، اور بیت المقدس کی مسلسل یہود کاری نہ صرف امن کے امکانات کو زہر آلود کر رہے ہیں بلکہ عالمی حمایت سے بھی ہاتھ دھلا رہے ہیں۔

یورپ کا حالیہ اقدام ثابت کرتا ہے کہ عالمی سفارتکاری میں ایک بڑی تبدیلی کی بنیاد رکھ دی گئی ہے۔ سوال اب یہ نہیں کہ فلسطینیوں کو ریاست کا حق دیا جائے گا یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کب اور کس قیمت پر۔ امریکا، اسرائیل اور ان کے اتحادی اگر واقعی امن کے خواہاں ہیں تو انہیں اب مظلوم کی آواز سننی ہوگی۔

فلسطین کی عالمی تسلیمیت محض ایک سفارتی اقدام نہیں، یہ صدیوں سے جاری استبداد کے خلاف انصاف کی پہلی شعاع ہے۔ اگر یورپ کا یہ قدم مزید ممالک کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، تو اسرائیل کو اپنی نسل پرستانہ پالیسیوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ ورنہ عالمی بائیکاٹ، اخلاقی تنہائی اور سفارتی دباؤ کی شدت میں اضافہ ناگزیر ہے۔

یہ وقت ہے کہ دنیا صرف تماشائی نہ بنے، بلکہ انسانیت کے حق میں، قانون کے تقاضوں کے مطابق، اور مظلوموں کی حمایت میں ایک واضح اور مؤثر موقف اپنائے۔ شاید فلسطینی ماؤں کی آنکھیں کسی روشن کل کا خواب پھر سے دیکھنے لگیں۔

فلسطین اب صرف ایک مظلوم قوم کا نام نہیں، بلکہ انصاف، مزاحمت اور اصولوں کی علامت بن چکا ہے۔ اور جس طرح جنوبی افریقہ میں نسل پرستی دم توڑ گئی تھی، اسی طرح اسرائیل کی نسل پرست پالیسیاں بھی تاریخ کے کوڑے دان کی نذر ہونے والی ہیں۔ فلسطینیوں کا خون شاید سستا سمجھا گیا ہو، مگر اب وہ عالمی ضمیر کی دہلیز پر سوال بن کر کھڑا ہے اور تب تک اس جرم سے رہائی نہیں ملے گی جب تک یہود و ہندو کے مجرمانہ ضمیر کو ان کے انجام تک نہ پہنچایا جائے۔

حق و انصاف کی شع جو فلسطین کے آسمان پر روشن ہوئی ہے، اُس کا نور اب گہری تاریکیوں میں بھی گم نہیں ہو سکتا۔ یہ روشنی صرف سیاسی بیان بازی یا جغرافیائی حدود کی کامنڈ نہیں، بلکہ ایک عالمگیر جذبہ ہے جو انسانیت کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیتا ہے۔ وہی ضمیر جو تاریخ کے طوفانوں میں صدیوں سے خموشی اختیار کیے ہوئے تھا، اب نعرہء حق بلند کر رہا ہے:

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ

اور جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے۔ (النساء: 93)

یہ مقدس آیت ہر ظلم و ستم کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے۔

یہ وہی فلسطین ہے جہاں نہتے بچوں کی معصوم ہنسیوں کو گولیوں نے خاموش کر دیا، جہاں ماؤں کی فریادیں گونجتی ہیں اور پتھروں کی زبان بولتی ہے مگر آج کے دور کے مجاہد نہ صرف فائرنگ کی لڑائی لڑ رہے ہیں، بلکہ عالمی عدالتوں، سفارتی میدانوں اور صحافت کے محاذ پر بھی وہی جذبہء شہادت لئے لڑ رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ظلم و جبر کی دیواریں تباہی کے رستے پر گرتی ہیں، چاہے وہ جنوبی افریقہ کی نسل پرستی ہو یا فلسطین کی زمین پر پھیلا یہ ظالمانہ قبضہ۔

یاد رکھیں: عدل و انصاف کی صبح ظہور میں، فلسطین محض ایک مسندِ دکھ و رنج نہیں، بلکہ صبر و استقامت، حق و صداقت اور ربانی صبر کی جاوداں علامت بن چکا ہے۔ اس کے شہداء کا لہو فراموش شدہ نہیں، بلکہ قربانی کی سیاہی سے تاریخ کے اوراق پر لکھا گیا ایک مقدس عہد ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمان حق ہے:

لَنْ تَغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

نہ ان کے مال ہی اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام آئیں گے اور نہ ان کی اولاد، وہی دوزخ والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے (مجادلہ: 17)

پس یہ روح کی پاکیزگی، حق کی سربلندی اور عوام کی جرات وہ ثقل ہیں جو تاریخ کے ترازو پر بھاری ہوں گے۔

ممالک و ملتوں کی نظروں میں فلسطینی جدوجہد کے حقائق کی پردہ داری ممکن نہیں رہی۔ جس طرح ماضی میں جنوبی افریقہ کے نسلی تعصب کے خلاف تحریک نے عالمی ضمیر کو جھنجوڑا، آج بھی عالمی شعور کو بیدار کر رہی ہے۔ سوال محض یہ نہیں کہ فلسطین کو ریاست کا حق دیا جائے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ کب اور کس قیمت پر انصاف قائم ہو گا۔ فلسطین کے ساتھ کھڑے ہونا، انسانیت، سیاست اور اخلاق کا امتحان ہے، جو ریاستوں کیلئے نہیں، بلکہ پوری دنیا کے ضمیر کیلئے ہے۔

یہ وقت ہے کہ دنیا کے حکمران، جن کے ہاتھوں میں دنیا کے تقدیر کے فیصلے ہیں، حق کی صدائیں اور اپنے ضمیروں کو جگائیں۔ اب راہ صرف انصاف کی ہے، دور ریاستوں کی مساوات یا ایک مشترکہ وطن کی امید، جہاں ہر انسان کو اس کی انسانیت کے مطابق مقام ملے۔ ورنہ وہی انجام ہو گا جو پہلے ہوا، جب ظلم کی دیواریں گر گئیں اور آزادی کی کرنیں پھوٹیں۔ یہی وہ وقت ہے جب اسلام کی اعلیٰ تعلیمات، جو برابری، عدل اور امن کی بنیاد ہیں، دنیا کی سیاست میں روشنی بن کر چمکیں۔ قرآن کی حکمت ہمیں سکھاتی ہے کہ

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ
 ”اور انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی۔“ (النجم: 39)

فلسطینی قوم کی یہ جدوجہد، چاہے جغرافیائی ہو یا سیاسی، محض ایک قوم کی کوشش نہیں، بلکہ عالم انسانیت کی کوشش ہے، ظلم کے خلاف ایک آواز ہے جو دیواروں اور سرحدوں سے بالاتر ہے۔

آج جہاں طاقتوروں کے درمیاں سازشیں اور تضادات عروج پر ہیں، وہاں دنیا کو چاہیے کہ وہ بے نیازی کا لباس اتار کر حق و انصاف کیلئے کھڑے ہوں۔ رستہ کٹھن ہے، ماضی کی گونج ابھی کانوں میں ہے، مگر روشنی کی کرن ضرور آتی ہے۔ ہر مظلوم ماں کی آنکھوں میں وہی خواب پل رہا ہے جس کی تعبیر انصاف ہے۔ فلسطین صرف ایک قوم کا نام نہیں، بلکہ وہ چراغ ہے جو ظلمت کو مٹانے، عدل قائم کرنے، اور حق کی سر بلندی کا پیغام لیے کھڑا ہے۔ جس طرح جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کا خاتمہ ہوا، ویسے ہی اسرائیل کی نسل پرست پالیسیاں بھی تاریخ کے کوڑے دان میں گرتی جائیں گی۔ فلسطینیوں کا خون ستے داموں نہیں بکے گا؛ وہ آج دنیا کے ضمیر پر ایک سوال بن کر کھڑا ہے، اور جب تک ان مظالم کے مجرموں کو ان کے انجام تک نہیں پہنچایا جاتا، یہ جرم معاف نہیں ہو گا۔

یقیناً، تاریخ ظالموں کو معاف نہیں کرتی، اور ایک دن ظلم کی زنجیریں ٹوٹی ہیں، جب عالمی ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ فلسطین کی جدوجہد، جس کی جڑیں ایمان، حریت اور حق کے اصولوں میں پیوست ہیں، نہ صرف خطے بلکہ عالم انسانیت کیلئے ایک روشنی ہے، ایک صدائے احتجاج ہے، جو ظلم کی ہر دیوار کو گرانے کا عزم رکھتی ہے۔

پاکستانی اجالا..... بھارتی اندھیرا

جب تو میں خواب دیکھتی ہیں، تو ان کے خوابوں کی تعبیر کا سفر خون، قربانی، اور ایمان کی راہوں سے گزرتا ہے۔ پاکستان ایک ایسا ہی خواب تھا۔ ایک نظریہ، ایک کلمہ، ایک اذان، جو صدیوں کی محکومی کے بعد آسمانِ ہند پر چکا۔ یہ وہ سرزمین ہے جو لا الہ الا اللہ کے نام پر معرضِ وجود میں آئی؛ جہاں نہ اقتدار کی ہوس کو غالب ہونا تھا، نہ قوم کے نظریے پر سودے بازی ہونی تھی۔ مگر صد افسوس! ہم نے اس خواب کی تعبیر کو نہ صرف فراموش کیا، بلکہ اسے اپنے سیاسی و عسکری مفادات کی نذر کر دیا۔ ہمارا قبلہ اگر خالص محمدی سیاست ہوتی، جہاں عدل، شورایت اور احتساب کا غلبہ ہوتا، تو نہ آج جمہوریت سسکتی، نہ آمریت سینہ تان کر چلتی۔ تاریخ کی گواہی ہے کہ جب قومیں اپنے نظریے سے روگردانی کرتی ہیں تو نہ صرف زوال ان کا مقدر بنتا ہے، بلکہ ان کے دشمن بھی ان کے خوابوں کے مزار پر جشن مناتے ہیں۔

کبھی کبھی اقوامِ عالم کی تاریخ میں ایسے ابواب کھلتے ہیں جن کی روشنائی خونِ دل سے لکھی جاتی ہے اور جن کے الفاظ وقت کے صفحات پر قیامت تک ثبت رہتے ہیں۔ پاکستان بھی ایک ایسی ہی سرزمین ہے۔ جغرافیہ میں شاید نئی، مگر تاریخ کے شعور میں صدیوں کی گونج رکھتی ہوئی۔ یہ مملکت خداداد برصغیر کی تقسیم کے اس لمحہ نازک کی پیداوار ہے جس نے نہ صرف تہذیبوں کو منقسم کیا بلکہ ذہنوں، خوابوں، اور امیدوں کو بھی دو قومی نظریے کی شمع پر مجتمع کر دیا۔

برصغیر کی تقسیم محض جغرافیائی لکیروں کی درستگی نہ تھی، بلکہ تہذیبوں کا ایک بڑا دھچکہ تھی۔ 14 اگست 1947 کو جب پاکستان کا سورج طلوع ہوا، تو اس کی کرنوں میں مسلمانوں کی صدیوں پر محیط جدوجہد کی جھلک تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب برطانوی سامراج کی کمزور ہوتی گرفت اور ہندو اکثریت کی غلبے کی خواہش کے مابین مسلمانوں کو ایک علیحدہ سیاسی تشخص کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے الفاظ میں پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا۔

مگر سوال یہ ہے کہ جس نظریے کے تحت یہ ملک قائم ہوا، کیا ریاست نے اس کی روح کو اپنے نظام میں جذب کیا؟ پاکستان میں تاریخ کی الٹی بہتی ندی کا سیاسی مطالعہ کیا جائے تو ارضِ پاکستان کو اسلامی جمہوریہ کا لقب تو دیا گیا، مگر نہ اسلامی نظام مکمل نافذ ہوا، نہ جمہور کی آواز کو مکمل حق نمائندگی ملا۔ یہاں جمہوریت کا حال نوخیز پودے کی مانند رہا جسے ہر بار اقتدار کے طوفانوں نے جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔

مگر سوال یہ ہے کہ جس جمہوری خواب کو بانیانِ پاکستان نے تعبیر کی خلعت پہنانے کی آرزو کی، وہ خواب کیا وقت کی گرد میں دھندلا نہ گیا؟ ہماری سیاسی تاریخ تو یوں ہے کہ جمہوریت کا سورج جب بھی طلوع ہونے کو ہوتا ہے، افق پر آمریت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں، اور جب آمریت کے سائے دراز ہو جاتے ہیں، تو خلقِ خدا جمہور کے دیے جلانے نکل پڑتی ہے۔ گو پاکستان کی سیاسی فضا ایک ایسے شجر کی مانند ہے جس کی ایک شاخ پر جمہوریت کے پرندے چہچہاتے ہیں اور دوسری پر آمریت کے اُلویٹھے رہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے جب اقوامِ عالم ترقی، تحقیق، اور تہذیب کی نئی منزلوں کی تلاش میں کوشاں تھیں، ہمارا پاکستان چار عسکری حکومتوں کے تجربے سے گزر چکا تھا۔ یہ کیسا عجیب مقام ہے جہاں آمریت بار بار جمہوریت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور جمہوریت، آمریت کی آغوش میں

پناہ لینے پر مجبور دکھائی دیتی ہے؟ یہ ایسی سیاسی سرزمین ہے جہاں "بدترین منتخب حکمران بہترین آمر سے بہتر ہے" کا فلسفہ دلوں میں بسایا گیا، حتیٰ کہ جب کرپشن، اقربا پروری اور سول آمریت کے دھارے بہنے لگے، تب بھی جمہور کے ٹھیکیدار اپنی بانہیں کھولے کھڑے رہے۔

حیرت یہ نہیں کہ یہاں سیاستدان کاروباری بنے اور آمریت نے جمہوری لبادہ اوڑھا، تعجب تو اس پر ہے کہ عوام نے ان دونوں کی ریاکاریوں کو بھی مصلحت وقت کہہ کر قبول کیا۔ سیاست کے بازار میں جب بولی لگتی ہے تو ہر امیدوار عوامی خدمت کا جامہ پہنے دکھائی دیتا ہے، مگر دل میں اقتدار کی حرص کا زہر ہوتا ہے۔ جمہوری اپوزیشن اگر حکومت کے چہرے سے نقاب ہٹانے کا دعویٰ کرتی ہے، تو یہی اپوزیشن کبھی فوجی آمریت کو یاد کر کے گویا اس کی گود میں پناہ لینے کیلئے بیتاب دکھائی دیتی ہے۔ پھر جب آمریت کے سائے طویل ہونے لگیں تو الیکشن کو مسائل کا واحد حل قرار دیکر "فرشتے" اور "لیٹیرے" یکجا ہو کر جمہوریت کی اذانیں بلند کرتے ہیں۔ یہ پاکستان ہے۔ جہاں سیاستدان تجارت کرتے ہیں، اور فوج سیاست۔ جہاں ووٹ بینک بنانے کیلئے مذہب کو بازار کی جنس بنایا جاتا ہے، اور جہاں "فرینڈلی اپوزیشن" حکومت کا سایہ بن کر باری کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کا تصور اکثر خاندانی سیاست، اقربا پروری، اور انتخابی دھاندلی کے زیر سایہ پروان چڑھا ہے۔ عوام کی رائے کے نام پر وہی چہرے بار بار مسند اقتدار پر فائز ہوتے ہیں جو "الیکشن جیتنے کی سائنس" میں ماہر ہیں، نہ کہ خدمتِ خلق کے جذبے میں۔ جمہوریت عوام کی حکومت، عوام کے ذریعے، عوام کیلئے ہونی چاہیے لیکن ہمارے ہاں یہ اکثر اشرافیہ کی حکومت، دولت کے ذریعے، اور اپنے خاندان کیلئے بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپوزیشن باری کی منتظر رہتی ہے، حکومت طاقت کے نشے میں شوریدہ ہو جاتی ہے اور ریاست کی اصل روح جمہوری تجربے کی تلخیوں کی داستان بن کر ہمیں پیغام دے رہی ہوتی ہے کہ یہاں جمہوریت برائے اقتدار کا نام ہے نہ کہ برائے عوام!

پاکستان کی تاریخ میں جمہوریت اور آمریت کی کشمکش ایک نیم روشن نیم تاریک کہانی ہے۔ ہر بار "نجات دہندہ" کے روپ میں نمودار ہونے والی یہ آمریتیں بالآخر قوم کو مزید تقسیم، ادارہ جاتی کمزوری اور عالمی تنہائی کی جانب لے گئیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہر فوجی اقتدار کو سیاسی اشرافیہ، عدلیہ، اور بعض اوقات صحافت کی مدد بھی حاصل رہی۔

پاکستان کی تاریخ میں فوجی آمریتیں یوں سایہ فگن رہیں جیسے وقت کے فرعونوں نے اقتدار کی لاٹھی سے قوم کے شعور کو دبانے کی کوشش کی ہو۔ ایک کے بعد ایک جنرل نے "قومی مفاد" "استحکام ریاست" اور "جمہوری کمزوری" جیسے نعروں کو جواز بنا کر عوامی مینڈیٹ کو پامال کیا، اور پھر انہی نعروں کے سائے میں آئین کو توڑا، سیاسی جماعتوں کو بانٹا، اور شخصی اقتدار کو ادارہ جاتی تحفظ فراہم کیا۔ جنرل ایوب کی 'بنیادی جمہوریت' ہو یا ضیاء الحق کی 'اسلامائزیشن'، یا پھر پرویز مشرف کا 'روشن خیال اعتدال'۔ سب نے قوم کو ایک قدم آگے اور دو قدم پیچھے دھکیلنے کی پالیسی اپنائی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا فوجی آمریت نے عوام کے اندر اعتماد پیدا کیا یا صرف اداروں کو طاقتور بنایا؟ تاریخ بتاتی ہے کہ آمریتیں اپنے ساتھ صرف وقتی نظم و ضبط لاتی ہیں، دیرپا ترقی نہیں۔

یہی تجربہ ہمارے اذلی دشمن بھارت کے اندر جاری علیحدگی پسند تحریکوں سے بھی واضح ہوتا ہے۔ بھارت کی جمہوریت کا بھرم درحقیقت ایک ایسی چادر ہے جس کے نیچے خالصتان کی لٹکار، ناگالینڈ اور منی پور کی آزادی کی چیخیں، نسل بازوں کی بغاوت، اور مقبوضہ کشمیر کی اذانیں برسوں سے گونج رہی ہیں۔ بھارت جنہیں "اندرونی معاملات" کہہ کر دباننا چاہتا ہے، درحقیقت وہی تحریکیں اس کی نام نہاد اکثریتی جمہوریت کی کمزوری کا اعلان ہیں۔ یہ شوریدہ

سر آوازیں آج دہلی کی دہلیز پر سوال بن کر کھڑی ہیں کہ: جس بھارت نے پاکستان کو عدم استحکام کا شکار کرنے کی پالیسی اپنائی، کیا وہ خود داخلی انتشار سے محفوظ رہے گا؟ آج اگر پاکستان اپنے دشمن کے زخموں کو بے نقاب کرے، تو بھارت کی "اتحاد کی اکائی" ریت کی دیوار بن کر بکھر سکتی ہے۔

تاہم اگر پاکستان میں آمریت کی چالاکیاں اور سیاست کی مکاری پاکستان کی سیاست کا ایک رخ ہیں، تو دوسری طرف اس قوم کی وہ تحریکات، صحافت، اور سول سوسائٹی کی وہ جمہوریت کا اصل ہتھیار قوتیں بھی ہیں جنہوں نے آزادی صحافت، آئینی بالادستی، اور شہری آزادیوں کیلئے قربانیاں دیں۔ مثلاً 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ، 1983ء کی ایم آر ڈی (تحریک بحالی جمہوریت)، 2007ء کی وکلاء تحریک اور حال ہی میں 2014ء کی سول ملٹری کشمکش کے خلاف تحریکیں، یہ سب دراصل اس بات کی علامت ہیں کہ پاکستانی معاشرہ مردہ نہیں، بلکہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی قافلہ حق کیلئے ہر سرپیچار ہوتا ہے۔

تاریخ کے حالیہ ورق میں جب پاک بھارت کشیدگی کی چنگاری بھڑکی، تو اس کے اثرات پاکستان کے اندرونی سیاسی منظر نامے پر بھی مرتب ہوئے۔ جنگوں کی بازگشت نے نہ صرف فوج کو ایک مرتبہ پھر مقبولیت کی معراج پر پہنچایا، بلکہ داخلی انتشار کی دھول بھی کچھ دیر کو بیٹھ گئی۔ عوامی تاثر میں فوج نے عزت بحال کر لی، اور ایک باہر ڈنظام حکومت نے جنم لیا جس میں فوج اور سیاستدان بظاہر یکجا ہو کر "ترقی" کا راگ الاپتے دکھائی دیے۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ تحریک انصاف کی قیادت اور کارکنوں پر بغاوت کے الزامات کی گونج سنائی دی۔ 9 مئی کی مبینہ بغاوت نے سیاسی افق پر ایک گہرا نقش چھوڑا، اور ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت کو کٹہرے میں لاکھڑا کیا۔ کلیدی رہنما پابند سلاسل کیے گئے، اور عدالتی فیصلے تاریخ کی نئی سطر لکھنے لگے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب "نئے پاکستان" کی تعبیر یا مکافات عمل ہے یا "پرانے پاکستان" کی جمہوریت کشی کا نیا عنوان؟

دوسری جانب، دہلی کے ایوانوں میں بھی اضطراب کی کیفیت ہے۔ حالیہ جنگ میں عالمی سطح پر ہزیمت اٹھانے کے بعد مودی کی زبان سے نکلا ہوا جملہ "ابھی سندور آپریشن ختم نہیں ہوا" محض ایک سیاسی بیان نہیں، بلکہ خطے پر منڈلاتی نئی جنگ کے بادلوں کا نیا استعارہ ہے۔ مودی سرکار اس وقت نہ صرف داخلی سیاسی بحران سے دوچار ہے بلکہ اپنی عسکری ناکامی کا داغ دھونے کیلئے ممکنہ طور پر ایک نئی جنگ چھیڑنے کی طرف مائل دکھائی دیتی ہے۔ مگر کیا مودی کھلی جنگ کا خطرہ مول لے گا؟ یا پاکستان کے خلاف دہشتگردی، سازش اور سیاسی محاذ آرائی کو جاری رکھتے ہوئے کمزور کرنے کی پالیسی اپنائے گا؟

2025ء کی پاک بھارت جھڑپ میں اگرچہ پاکستان نے دفاعی پوزیشن برقرار رکھی، مگر بھارت کو اندرونی و عالمی سطح پر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ مودی کا مشہور جملہ "ابھی سندور آپریشن ختم نہیں ہوا" دراصل اُس بوکھا ہٹ اور اضطراب کی غمازی کرتا ہے جو ایک ناکام عسکری کوشش کے بعد سیاسی ساکھ بچانے کیلئے جھوٹے نعرے گھڑتا ہے۔

نریندر مودی کی جماعت بی جے پی ہندوتوا کی انتہا پر سیاست کرتی ہے۔ جنگی بیانیہ، قوم پرستی، اور اقلیت دشمنی اس کا باندھن ہیں۔ اس لئے مودی کے ماضی کا مکروہ چہرہ اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ وہ بھارت کے اندرونی مسائل سے توجہ ہٹانے کیلئے، الیکشن کے دوران جنگی بیرو بننے کی کوشش کرے گا۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کی رائے کو ایک مرتبہ پھر بدلنے کیلئے علاقائی بالادستی کے خواب دکھائے گا۔ اس لئے مودی دوبارہ جنگ چھیڑنے سے قبل پاکستان پر دہشتگردی کے ذریعے دباؤ ڈالنے کی عملی کوششوں میں تیزی لے آیا ہے، بلوچستان میں راکہ مداخلت کوئی راز نہیں رہی، کراچی، گلگت، اور



فاٹا میں بھی بھارتی مداخلت کی رپورٹس موجود ہیں لیکن پاکستان اگر جوابی حکمتِ عملی کے طور پر بھارت کی داخلی کمزوریوں کو استعمال کرے، تو نتائج بھارت کیلئے خوفناک ہوں گے۔

دراصل دوائیٹی ریاستوں پاک بھارت کے درمیان تعلقات تلوار کی دھار پر رقص کی طرح ہیں جہاں صرف پاؤں ہی زخمی نہیں ہوں گے بلکہ ٹانگیں بھی دھڑ سے الگ ہونے کے امکانات ہر وقت موجود ہیں۔ اگر بھارت کی پالیسی پاکستان میں عدم استحکام پیدا کرنا ہے، تو کیا پاکستان

بھی اسی سکہ بند زبان میں جواب دے سکتا ہے؟ یہ سوال اس لیے بھی اہم ہے کہ بھارت خود کئی اندرونی شورشوں کا شکار ہے۔ بھارت کے اندر شوریہ سروں کی حقیقت یہ

ہے کہ بھارت کی کئی ریاستیں، جیسے خالصتان تحریک مشرقی پنجاب، ناگا، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، اڑیسہ، مہاراشٹر، آسام، منی پور کی علیحدگی پسند تحریکیں، ماؤنٹ نیکل باڑی تحریک اور کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک، یہ سب دہلی سرکار کی نیندیں اڑانے کیلئے کافی ہیں۔

ان تحریکوں کو مقامی آبادی کی اخلاقی حمایت حاصل ہے اور بعض کو بیرونی تائید بھی۔ ایسے میں اگر پاکستان بھی "دانت کے بدلے دانت" کی پالیسی پر عمل کرے تو بھارت کا داخلی امن اس شدت سے لرز اٹھے گا جیسے تسبیح بکھر جائے اور ہر دانہ الگ راہ لے۔ یہ تمام تحریکیں بھارت کی ریاستی گرفت پر سوالیہ نشان ہیں۔ اگر پاکستان سفارتی محاذ پر ان کو عالمی سطح پر اجاگر کرے تو یہ بھارت کی نام نہاد جمہوریت کی قلبی کھول دیں گی۔

ہندوستان کی جمہوری چادر میں لپٹی سچائی اور فریب ترقی یا سچائی کا خون آلود چہرہ سے اب دنیا واقف ہو چکی ہے۔ یہ کیسا المیہ ہے کہ جس بھارت کو دنیا، دنیاوی ترقی، سافٹ پاور، اور جمہوری اداروں کی مثال کے طور پر پیش کرتی ہے، اسی بھارت کے اندر غریبوں کی آہ، مظلوموں کی چیخ، پسے ہوئے طبقات کی خاموش بغاوت اور عورت کی ماری ہوئی عزت کی صدائیں گونج رہی ہیں؟ جمہوریت کے تاج میں جگمگاتے ہیرے اگر غربت، جہالت، اور انسانی تذلیل سے سجے ہوں تو وہ تاج نہیں، ایک بدبودار زنجیر ہے جسے بھارت کے 140 کروڑ عوام روز جھیلتے ہیں۔

حالیہ بین الاقوامی اور بھارتی سروے رپورٹس میں خود بھارت نے تسلیم کیا ہے کہ دنیا کے سب سے زیادہ غریب بھارت میں بستے ہیں لیکن مودی حکومت میں متعصب ہندو توائے جمہوریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ 80 کروڑ سے زائد لوگ سرکاری راشن پر زندہ ہیں۔ لاکھوں لوگ فٹ پاتھ، ریلوے اسٹیشن، اور سڑک کنارے سوتے ہیں۔ اور یہ صرف سونا نہیں، یہ بھارتی ریاست کے منہ پر ایک خاموش تھپڑ ہے۔ جہالت اور تعلیم کی تباہ حالی کا یہ عالم ہے کہ یونیسیف اور یونیسکو کی رپورٹوں کے مطابق دنیا کے سب سے زیادہ ان پڑھ افراد بھارت میں موجود ہیں۔ ہر سال لاکھوں بچے اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کئی ریاستوں میں لڑکیوں کی تعلیم اب بھی باعثِ شرم سمجھی جاتی ہے۔

بھارت کی اپنی وزارتِ افرادی قوت کے مطابق کروڑوں نوجوان ڈگریاں ہاتھ میں لے کر سڑکوں پر ہیں۔ بے روزگاری ایک خاموش جنگ کی شکل اختیار کر چکی ہے اور بیروزگاری کی بلند ترین شرح 45 سال کی تاریخ میں ریکارڈ کی گئی۔ نوجوان نفسیاتی دباؤ اور خودکشی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

خوراک اور ذلت کا المیہ یہ ہے کہ بھارتی میڈیانے خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ کم از کم 2 کروڑ بھارتی شہری روزانہ چوہے کھانے پر مجبور ہیں۔ جی ہاں؛ چوہے کھانے پر مجبور انسان کے یہی وہ مناظر جسے بھارتی میڈیا کبھی "ثقافتی تنوع" کہہ کر چھپاتا ہے، اور کبھی خاموشی کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔

بھارت میں دنیا کی سب سے بڑی جسم فروشی کی منڈی ہے۔ جسم فروشی، ایڈز اور عورت کا جنسی جنازہ برسر عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایڈز کے مریضوں کی شرح میں بھارت سر فہرست ہے، حتیٰ کہ ایڈز ٹرینیں تک چلائی جاتی ہیں۔ لاکھوں بچیاں روز پیدا ہونے سے قبل قتل کر دی جاتی ہیں؛ فیوٹو سائڈ بھارت کی "جدید" ثقافت کا حصہ بن چکا ہے۔ بیت الخلاء کی محرومی کا یہ عالم ہے کہ آج بھی بھارت کی 70 فیصد دیہی آبادی بیت الخلاء کی سہولت سے محروم ہے۔ بھارتی سماجی بغاوت اور ریاستی زوال کا یہ چہرہ جو کبھی میڈیا پر نہیں دکھایا جاتا لیکن اب خود ایک مغربی ادارے نے اپنے سروے میں انکشاف کیا ہے کہ بھارت میں گردے اور جسمانی اعضا کی منڈی اتنی عام ہو چکی ہے کہ گاؤں کے داخلی راستوں پر اشتہار آویزاں ہوتے ہیں کہ "اس گاؤں کے ہر فرد کا گردہ برائے فروخت" ہے۔ سیاسی اور مذہبی گھٹن اس درجے کو پہنچ چکی ہے کہ 22 ریاستیں آزادی کی متمنی ہیں جو بھارت کے ساتھ مزید رہنے کو بالکل تیار نہیں۔ 100 سے زائد مسلح علیحدگی پسند گروہ حکومت کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ نکل باڑی، خالصتان، کشمیر، منی پور، آسام، ناگ لینڈ۔ یہ بھارت کے اندر چھپے وہ آتش فشاں ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ سکتے ہیں۔ بھارت کا تقریباً 40 فیصد علاقہ حکومت کی موثر رٹ سے باہر ہو چکا ہے۔

عالمی آزاد مالیاتی اداروں کی رپورٹ نے بھارتی معاشی خوش فہمی کا بھانڈہ بیچ بازار میں پھوڑتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت کے معاشی دعوے بھی کاغذی ہیں۔ پانچ سو ارب ڈالر سے زائد کے بیرونی قرضے بھارت کی گردن پر سوار ہیں۔ 377 / ارب ڈالر کے زرمبادلہ ذخائر دراصل 8 فیصد سود پر لیے گئے بینک قرضے ہیں۔ یہ معاشی ترقی نہیں، مالیاتی خودکشی کی چالاکی سے پردہ پوشی ہے۔ حالیہ پاک بھارت جنگ میں عسکری کھوکھلا پن اور جنگی شرمندگیاں بھی سامنے آگئی ہیں۔ یاد رہے کہ کارگل جنگ میں بھارت کے این اے 32 طیارے گراؤنڈ ہو چکے ہیں۔ بوفرز توپیں ناکارہ ہو چکی ہیں۔ یوکرین سے مہنگے معاہدے اور ناقص ہتھیاروں کی خریداری نے بھارتی افواج کی پیشہ ورانہ حیثیت پر سوالات اٹھا دیے ہیں۔

جس بھارت کو "عظیم جمہوریت" کہا جاتا ہے، وہ اندر سے غربت، جہالت، بد حالی، اور بغاوت سے بھری ہوئی ایک ٹوٹتی ہوئی یونین ہے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے یہ بات ناقابلِ تردید ہو چکی ہے کہ پاکستان کا انڈیا سے علیحدہ ہونا نہ صرف درست تھا بلکہ ضروری بھی۔ آج جو لوگ "ہم بھارت سے پیچھے کیوں ہیں؟" کہہ کر روتے ہیں، وہ صرف بھارتی فلموں کے رنگین پردے دیکھتے ہیں، وہ ان فٹ پاتھوں کو نہیں دیکھتے جہاں انسان نہیں، بھارتی جمہوریت کا جنازہ بستا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے افراد تاریخی حوالے سے خود سے ایک سوال ضرور پوچھیں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو کیا آج ہم بھی چوہے کھا رہے ہوتے؟ کیا ہم بھی بیٹیوں کو پیدا ہونے سے پہلے قتل کر رہے ہوتے؟ کیا ہمارے گاؤں کے باہر بھی لکھا ہوتا کہ یہاں گردہ برائے فروخت ہے۔ پاکستان میں کہیں بھی ایسا نہیں ہے، الحمد للہ۔ ہم نے الگ ریاست صرف اس لیے نہیں بنائی تھی کہ ہماری زمین الگ ہو، بلکہ اس لیے بنائی تھی کہ ہمارا ضمیر، نظام، تہذیب، اور روح زندہ رہیں۔

تاریخ ہمیشہ بے رحم ہوتی ہے۔ وہ ان اقوام کو معاف نہیں کرتی جو اپنی اساس کو فراموش کر دیں۔ ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ پاکستان کوئی جغرافیائی حادثہ نہ تھا، بلکہ یہ امت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کی صدا تھی۔ ایک ایسی پکار جس نے لاکھوں مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کیا، ماؤں کی گودیں اجڑیں، قافلے لٹ گئے، مگر نظریہ سلامت رہا۔ آج اگر ہم نے اس نظریے کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیا، تو نہ دشمن کی سازشیں رکیں گی، نہ ہماری زبوں حالی کا سلسلہ تھمے گا۔ ہمیں واپس اسی راستے پر آنا ہے۔ جہاں عدل فاروقی، شجاعتِ حیدری، صدقِ صدیقی اور علمِ حسینی ہماری سیاست کا ستون ہو۔

پاکستان کو اب فیصلہ کرنا ہے کیا ہم اداروں کی بالادستی، آئین کی حکمرانی، اور سیاسی شفافیت کو راستہ دیں گے؟ یا پھر ہم اس دائرے میں گھومتے رہیں گے۔ قوموں کی زندگی میں وہی لمحے قیمتی ہوتے ہیں جو انہیں اپنی تاریخ سے سبق لینے پر آمادہ کریں۔ اب یہ لمحہ آچکا ہے، اگر ہم نے سیکھنا، تو تاریخ ہمیں بار بار وہی اسباق دہراتی رہے گی جو ہم پڑھنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ قومیں ٹینکوں سے نہیں، تعلیم، عدل، اور اتحاد سے بنتی ہیں؛ اور اگر ہم نے یہی سبق آج نہ سیکھا، تو تاریخ کل ہمیں ان قوموں میں شمار کرے گی جنہوں نے چراغ لیکر اپنا ہی گھر جلادیا۔ وقت کی دہلیز پر کھڑا پاکستان ہمیں آواز دے رہا ہے لوگو! تم زمین پر عدل قائم کرو، ورنہ آسمان سے انصاف اترے گا اور پھر نہ تاج بچے گا، نہ تخت۔

یہ وقت تاریخ کے آئینے میں وہ لمحہ ہے جب تقدیر کی ساعتیں قوموں کے نصیب بدلنے کا اعلان کرتی ہیں۔ حالیہ پاک بھارت معرکہ کوئی معمولی سرحدی جھڑپ نہ تھی، بلکہ یہ ایک معرکہ سحق و باطل کی مانند تھا۔ جہاں ایک طرف تکبر میں ڈوبا ہوا بھارت اپنی عسکری و سیاسی برتری کا خواب لیے حملہ آور ہوا، اور دوسری طرف پاکستان تھا، جس کی بنیاد "کلمہ طیبہ" پر رکھی گئی، اور جس کی خاک میں شہداء کے لہو کی مہک بستی ہے۔ یہ جنگ پاکستان کیلئے محض ایک دفاعی کوشش نہ تھی بلکہ ایک پیغام تھی ایک نئی، خوددار، عسکری و سیاسی حقیقت کا ظہور، جب دنیا نے دیکھا کہ پاکستان نے نہ صرف جارحیت کو مؤثر دفاعی حکمت عملی سے پسپا کیا بلکہ عالمی سطح پر جنگی اخلاقیات، اسٹریٹیجک تحمل، اور پیشہ ورانہ عسکری صلاحیت کا وہ مظاہرہ کیا جس نے بہت سے مغربی عسکری تجزیہ نگاروں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

تاہم یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ پاکستان کے چیف آف آرمی اسٹاف نے جس وقار، حکمت و صلاحیت، ذمہ داری اور صبر و تحمل سے میدانِ عمل اور سفارت دونوں محاذوں پر قیادت کی، وہ نئی عسکری قیادت کے ایک معتدل، پیشہ ور اور وینزیری چہرے کی مظہر تھی۔ یہ قیادت نہ صرف ملکی دفاع کیلئے پر عزم ہے بلکہ علاقائی توازن طاقت اور بین الاقوامی عسکری توازن میں پاکستان کو ایک اہم فریق کے طور پر آگے لارہی ہے۔ آج پاکستان کی فوج صرف جنگی قوت نہیں، بلکہ سفارتی فہم، ٹیکنالوجی، اور سی پیک جیسے کثیر الجہتی منصوبوں کی سیکوریٹی میں کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

ایران، چین اور عالمی بیانیہ کی تبدیلی کا یہ سفر اسی وقت کامیاب ہو سکتا تھا جب عسکری حکمت عملی کو خارجہ پالیسی کی پشت پناہی حاصل ہو۔ شاید پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ایران جیسے عظیم ہمسایہ اور نظریاتی حلیف نے نہ صرف ایرانی پارلیمان میں "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگائے بلکہ خود ایرانی صدر نے اپنی صدارت کا پہلا غیر ملکی دورہ پاکستان کو منتخب کیا۔ یہ کوئی رسمی سفر نہ تھا، بلکہ اسلامی اخوت، جغرافیائی اشتراک، اور عسکری ہم آہنگی کی ایک نئی تاریخ کا آغاز تھا۔ ایرانی صدر کا یہ بیان "ہم پاکستان کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں، جیسا کہ بھائی بھائی کیلئے کھڑا ہوتا ہے" اس بات کا اعلان ہے کہ مسلم دنیا میں اتحاد کی شروعات مشرق سے ہو رہی ہے۔

دوسری جانب چین کے ساتھ پاکستان کا دفاعی، معاشی اور اسٹریٹیجک اتحاد نئی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ چیف آف آرمی اسٹاف، وزیر اعظم اور دیگر کلیدی رہنماؤں کے چین کے حالیہ دورے اس بات کا غماز ہیں کہ پاک چین اشتراک صرف ایک سڑک یا بندرگاہ کا منصوبہ نہیں رہا بلکہ ایک علاقائی توازن طاقت کا ضامن بن چکا ہے۔ چین نے نہ صرف پاکستانی موقف کی حمایت کی، بلکہ باہر ڈنگ، ساہر سیکوریٹی، اور جدید عسکری ٹیکنالوجی میں پاکستان کے ساتھ ٹیکنالوجیکل شراکت کی بنیاد بھی رکھ دی ہے۔ مستقبل میں یہ اتحاد جنوبی ایشیا میں امن و طاقت کا نیا مرکز بن سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں وہ لمحے ہمیشہ سنہری رہے ہیں جب عسکری قوت محض فتح کیلئے نہیں، بلکہ عدل، امن، اور دین کی سر بلندی کیلئے بروئے کار آئی ہو۔ آج پاکستان کیلئے بھی وہی موقع ہے کہ وہ اپنی عسکری برتری کو امت مسلمہ کی وحدت، خطے کے امن، اور داخلی استحکام کیلئے استعمال کرے۔ اب وقت آگیا ہے کہ پاکستان صرف ایک ریاست نہ رہے، بلکہ ایک نظریاتی رہنما بنے؛ ایک ایسی قوت جو مسلم دنیا کو تقسیم کی بجائے اتحاد کی طرف لے جائے۔ اک نئی اسلامی حکمت عملی سے عسکری طاقت سے نظریاتی قوت کا سفر شروع کرنا ہو گا۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ نہ تلوار سے امن آتا ہے، نہ سازشوں سے استحکام۔ اگر پاکستان کو واقعی ایک مضبوط، باوقار، اور جمہوری ریاست بنانا ہے تو نہ فوجی بالادستی کا رگر ہے، نہ سیاسی مکاری۔ عوامی شعور، آئینی بالادستی، شفاف انتخاب، صحافت کی آزادی اور ادارہ جاتی ہم آہنگی ہی وہ راستے ہیں جو اس مملکت کو اس کے خوابوں کی تعبیر دے سکتے ہیں۔ تاریخ کی آخری پکار ہمیں آواز دے رہی ہے، قوم کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔ دشمنوں کی صفوں میں تشویش ہے اور دوستوں کی آنکھوں میں امید۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنی شناخت کو از سر نو پہچانیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم کہہ سکیں کہ ہم نے پاکستان کو بچایا نہیں، ہم نے اسے قیادت عطا کی۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے، یا تو ہم پھر سے داخلی سیاسی مفادات کی دلدل میں دھنس جائیں گے، یا عسکری حکمت، سفارتی شعور، اور نظریاتی استقلال کے ساتھ امت مسلمہ کا علم بردار بن کر ابھریں گے۔

یاد رکھیں! وقت کی ساعتیں منزل کی نشاندہی کرتے ہوئے آواز دے رہی ہیں کہ تاریخ کی آواز وہی قوم بنتی ہے۔ جو وقت کے قدموں کی چاپ سن لے۔

اٹھو کہ وقت کا تقاضا ہے صداقت کی سیاست

نہ کہ آمریت کی چادر، نہ منافقت کی قبا

خاکِ وطن کا خوابِ رفتہ

جب تقدیرِ اُم کا قلم لوحِ ازل پر تھر تھراتا ہے تو وقت کی صراحی سے ایسے لمبے ٹپکتے ہیں جن میں قوموں کی حیاتِ نو کے دیے روشن ہوتے ہیں۔ 14 اگست بھی ایک ایسا ہی روح پرور، تاریخ ساز لمحہ ہے جس نے برصغیر کے مظلوم مسلمانوں کو محکومی کی زنجیروں سے نکال کر آزادی کی نکبت بھری فضا میں سانس لینے کا اختیار بخشا۔ یہ دن صرف ایک تاریخ کا نہیں، یہ اذانِ بلال، شمشیرِ خالد، عدلِ عمر، حکمتِ علی اور علمِ حسن کا تجدیدی مظہر ہے۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہم نے مٹی کا نہیں، لالہ، لالا اللہ کا سودا کیا تھا۔ یہ وطنِ ریگزاروں میں بہتے سرخ لہو کی داستان ہے، یہ خاک وہ مقدس امانت ہے جسے کلمہ گو شہیدوں نے اپنے خون سے سیچا۔

"وَنَلَّكَ الْآيَاتُ نُدَاوُلَهَا بَيْنَ النَّاسِ" یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ آلِ عمران 140

اگر آج پاکستان نہ ہوتا، تو شاید دہلی، لکھنؤ، بنارس اور حیدرآباد کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کا مقدر ماضی کے مزاروں سے زیادہ نہ ہوتا۔ ہم مسجد کے میناروں سے اللہ اکبر کی صدا بلند کرنے کیلئے بھی اجازت کے طلبگار ہوتے، اور حجاب و اذان محض کتابوں کے قصے بن جاتے۔ یہ یومِ آزادی اس نظریے کی فتح کا دن ہے جس کے معماروں نے دنیا کو بتایا کہ قومیں رنگ، نسل یا خطے کی بنیاد پر نہیں، عقیدے اور ایمان کی بنیاد پر بنتی ہیں۔ دو قومی نظریہ اگر نہ ہوتا تو آج نہ تو دینے کی محبت میں سرشار نوجوان ہوتے، نہ کشمیر کی آزادی کے نعرے۔

سوائے اہل وطن! آج کے دن یاد رکھو کہ یہ آزادی ہمیں طشت میں رکھ کر پیش نہیں کی گئی، یہ قربانیوں کے سمندر سے نکلا ہوا وہ گوہر ہے جس پر ہمارے اسلاف کی سسکیاں، ماؤں کی دعائیں، اور شہیدوں کا لہو ثبت ہے۔ یہ دن تجدیدِ عہد کا ہے، یہ دن ہے اپنی مٹی، اپنی ملت، اپنی تہذیب، اپنی دین و دانش اور اپنے نصب العین سے وفا کا دن۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔

اور اس شخص سے بات کا اچھا کون ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف بلائے اور عملِ نیک کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں۔

قرآن مجید کی یہ آیت یومِ آزادی کے مہینے اگست کیلئے فکری اور معنوی روشنی کی مانند ہے۔ اگست کا مہینہ آزادی کا جشن مناتے ہوئے ہمیں تاریخی لمحے پر غور کرنا چاہیے اگر پاکستان نہ بنتا، تو کیا ہوتی مسلمانوں کی صورتِ حال؟ یہ سلسلہ فکر ہمیں دو قومی نظریہ کے منطقی اور تہذیبی اثبات تک لے جاتا ہے، اور اسی کو موضوع بناتے ہوئے آئندہ نکات کی روشنی میں ہر پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے۔

یہ مبارک دن یومِ آزادی پاکستان کا مہینہ اگست، مسلمان خطہ ہند میں ایک نئے فکری استقلال کی نوید لیکر آیا۔ اگر برصغیر میں پاکستان نہ بنتا تو اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی حیثیت کیا ہوتی؟ آزادی کی مبارک شمع نہ ہوتی تو شاید ان کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی زندگی ایک انہونی دھند میں گم رہتی۔

وقت نے دو قومی نظریہ کو واضح کر دیا کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تہذیب، تاریخ اور مذہب ہیں۔ اگر آزادی نہ ملتی، تو موجودہ مسلم اکثریت شاہِ ہند کے زیرِ تسلط ایک سیاسی اقلیت میں تبدیل ہوتی۔ دو قومی نظریہ نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی الگ تہذیب، شناخت اور سیاسی خود مختاری کے بغیر ایک باوقار معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں مسلمانوں کی زندگی روز بروز ایک بارود بھرے فوجی، مذہبی اور ثقافتی دباؤ کا شکار رہتی۔ انسانی

حقوق، آزاد تقریر اور مذہبی اظہار محدود ہو کر مرجعیت کا خطرہ لاحق ہوتی۔ یعنی آزادی نہ ہوتی تو مسلمانوں کی تاریخی کشادگی اور سیاسی اہمیت بجائے سکڑنے کے، زوال پذیر ہوتی۔

اگر پاکستان نہ ہوتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی اور مذہبی تشخص خطرے میں رہتا، وہ سیاسی اقلیت کی شکل پانگے ہوتے جس پر اکثر اوقات ناقابل برداشت دباؤ ہوتا۔ معاشرتی زندگی میں ہندو اکثریت کی سیاسی غلبہ کی وجہ سے مذہبی آزادی محدود رہتی۔ حقوق انسانی میں تعصب، تشکیل حکومت اور دستور سازی میں عدم شمولیت کے باعث مسلمان سماجی تنزلی کا شکار ہوتے۔ ہر لمحے ان کے عقائد و ادب کی خود مختاری خطرے میں رہتی، سیاسی خودداری نہ ملتی تو تدریجی بغاوت یا اندرونی خلفشار جنم لے سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں الگ وطن کی تشکیل ایک نئی تہذیبی شدت اور سیاسی بسیطی نتیجہ تھی، نہ صرف جغرافیائی بلکہ فکری آزادی کا آئینہ دار۔

مئی 2025 میں مودودی رنگ فکری مانند برصغیر میں معرکہ حق کا منظر آیا۔ پاکستان اور بھارت کے بیچ شدید عسکری تصادم ہوا، جس کے دوران بھارت نے آپریشن سندور کے تحت پاکستان میں میزائل اور ڈرون حملے کیے، جس سے پاکستان کی بھرپور جوابی کارروائی سامنے آئی۔ پاکستانی شاہینوں نے اپنے تیار کردہ جے تھنڈر 17 اور چینی ساخت جے 10 طیارے استعمال کرتے ہوئے بھارتی اڈوں اور ان کے متعدد جہاز اڑا کر رکھ دیئے۔ پہلی بار فرانسسیسی رافیل کے جیتے ہوئے مبدینہ تکبر کا پردہ چاک ہوا، اور رافیل کے ساتھ دیگر طیاروں کو خاک چاٹنی پڑی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر ان جہازوں کے بکھرے اور پاش پاش ہونے کی تصاویر ساری دنیا میں وائرل ہو گئیں۔ مودی سرکار کو فوری طور پر پاکستانی طاقت دفاع کا زبردست احساس ہو گیا۔

فوری طور پر بھارت اور اسرائیل نے اپنی تباہی کا دواویلا کرتے ہوئے امریکا بھادر کوسیز فائر کیلئے دہائی دینا شروع کر دی جس نے جنگ کے آغاز میں بڑے کلنڈر اہ اور مزاحیہ انداز کا مظاہرہ کیا تھا۔ دراصل اسے یہی پیغام دیا گیا تھا کہ پاکستان کے ساتھ یہ معرکہ صرف چند گھنٹوں میں فتح کے ترانوں کے ساتھ اختتام پذیر ہو جائے گا اور پاکستان سرخم کر کے تمام احکام کی تعمیل بجلائے گا لیکن یہاں صورت حال بالکل اس کے برعکس نتائج کے ساتھ جب سامنے آئی تو ٹرمپ نے درمیان میں کود کر جنگ بندی کے اعلان کا سہرا اپنے سر پر سجالیا جس کا وہ اب تک 35 مرتبہ ذکر کر چکے ہیں۔ مودی حکام نے اپنی ہزیمت اور رسوائی کو چھپانے کیلئے اعلان کیا کہ کسی نے بھی بھارت سے کارروائی روکنے کو نہیں کہا لیکن ایک بار بھی ٹرمپ کے بیان کی نفی کرنے کی ہمت نہیں کر پائے۔ بلاشبہ اب تک گودی میڈیا اور مغربی میڈیا کا زبانی محاذ آپس میں گتھم گتھا ہے، لیکن پاکستان کی قوت دفاع کے شاندار مظاہرے سے خطے میں بھارت کی توقیر کو ایسا جھنجھوڑا ہے کہ عالمی دفاعی ماہرین بھی پاکستان کی کامیابی پر مبہوت ہیں اور انڈیا کا سارا غرور تو اسی دن خاک میں مل گیا تھا جب فرانسسیسی رافیل کینی کے سربراہ نے عالمی میڈیا کے سامنے اپنے رافیل طیاروں کی تباہی کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بیان دیا کہ ہم نے طیارے فروخت کئے ہیں، لڑنے کا حوصلہ نہیں۔

مودی کی حکومت نے مدلل انداز میں اصرار کہ آپریشن جاری ہے اور بھارتی حکومت نے اپنے اندرونی حلقوں میں کمزوری محسوس کی ہے۔ اپوزیشن رہنماؤں نے دھمکی دی کہ اس غیر ملکی عسکری اتحاد۔ خصوصاً چین کے ساتھ ممکنہ خطرہ بڑھ گیا ہے، لہذا خطے میں ممکنہ عسکری تصادم کے خطرے کم نہیں ہوئے۔ اس واقعے کے بعد، سرحدی تنازعات میں جنگ کے خطرات فی الحال مکمل طور پر ٹل گئے ہیں یا نہیں، یہ واضح نہیں کہا جاسکتا۔ دونوں جانب عسکری صورتحال کشیدہ ہے، اور عالمی سطح پر بھی امن کی کوششوں کے باوجود مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔

پاکستان نے 2024-25 کے دفاعی بجٹ میں 55-2 ٹریلین روپے (9 بلین ڈالر) مختص کیے گئے، جو 20 فیصد اضافہ ظاہر کرتا ہے۔ اس میں چلانے کا خرچ تقریباً 704 ارب (29٪ اضافہ)، ملازمین کے اخراجات 846 ارب، اور پیش 742 ارب شامل ہیں جبکہ بھارت نے اپنے دفاعی بجٹ میں تقریباً 5-9٪ اضافہ کرتے ہوئے اسے قریباً \$78.7 بلین قرار دیا، جی ڈی پی کا تقریباً 9-1٪ بڑھادیا گویا پاکستان سے نوگنا زیادہ بجٹ فوج کیلئے مختص کیا لیکن حالیہ پاک بھارت جنگ میں بری طرح رسوائی اور سبکی کے نتائج ساری دنیا نے دیکھ لئے۔

پاکستان کا بیرونی قرضہ تقریباً \$87.4 بلین تک پہنچ چکا ہے، جس کی وجہ سے جی ڈی پی کا تقریباً 1.9٪ حصہ صرف قرض کی قسطوں پر اٹھ رہا ہے، چین اس کا سب سے بڑا قرض دہندہ ہے۔ پاکستان آئی ایم ایف کے ساتھ 7 بلین ڈالر پروگرام کے تحت اقتصادی استحکام کے اقدامات کر رہا ہے۔ ملک کی اقتصادی ترقی کے اہداف 4.2٪ ہیں، جبکہ 2024-25 میں ترقی صرف 2.7٪ رہی، افراط زر 4.7٪ پر آنے کا امکان ہے۔ باوجود مالی مشکلات کے، احتیاطی طور پر عالمی مالیاتی ادارے پاکستان کی اصلاحاتی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں اور ان کا رویہ بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ پاکستان نے آئی ایم ایف کے قرض پروگرام کے تحت معیشت میں استحکام لانے کی کوشش کی ہے۔ عمومی بجٹ کو 17.57 ٹریلین روپے (\$2 بلین) تک کم کیا گیا لیکن دفاعی بجٹ میں اضافہ جاری رکھا گیا۔ عالمی مالیاتی اداروں نے ابھی کچھ احتیاط سے تبدیلی محسوس کی ہے۔ اگرچہ رسمی کریڈٹ ریٹنگ میں بھی بہتری آرہی ہے جس کی بناء پر مالی استحکام کی جانب مثبت اشارے ملنے لگے ہیں، اور ترامیم تسلیم کی جا رہی ہیں۔

پاک چین کے "آئل ویدر فرینڈ شپ" کے ناتے عسکری تعاون طویل عرصے سے رواں دواں ہے۔ سی پیک، مشترکہ دفاعی پیداوار، جدید ساز و سامان، انٹیلی جنس شیئرنگ اور مشترکہ مشقیں اس اتحاد کو تقویت عطا کرتی ہیں۔ چین پاکستان کا سب سے بڑا ہتھیاروں کا فراہم کنندہ ہے۔ 2019-24 کے دوران پاکستان کی کل درآمد کا 81٪ حصہ چین سے آیا، پاکستان مستقبل میں ممکنہ طور پر چین سے ایف سی 31، اور جے 35 پانچویں نسل کے جے 135 سٹیلیٹھ فائٹر طیارے خریدنے جا رہا ہے۔ چین اور پاکستان کے قبضے میں مضبوط فوجی و دفاعی اتحاد مسلسل گہرا ہو رہا ہے، ہتھیاروں کی مشترکہ تیاری اور مشقوں کے ذریعے خطے میں فوجی توازن کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ مشترکہ پروڈکشن جیسے "کے 8"، "جے ایف 17"، اور جدید طیارے، نیوکلیئر انفراسٹرکچر میں تعاون، سمندری، فضائی اور زمینی دفاعی منصوبے اور سی پیک کے ذریعے گواڈر پورٹ میں بھی چینی سرمایہ کاری کی، جو مستقبل میں اسٹریٹجک پورٹ میں تبدیل ہو جائے گی۔ چینی وزارت خارجہ نے اعلان کیا ہے کہ پاک چین عسکری تعاون "معمول کے مطابق" جاری ہے جو کسی تیسرے ملک کو نشانہ نہیں بناتا۔

پاک بھارت جنگ کی فتح کے بعد خطے میں پاکستان کی سفارتی فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا ہے۔ ایرانی پارلیمنٹ میں "پاکستان زندہ باد" کے نعرے اور ایرانی صدر کا پہلا بیرونی دورہ پاکستان، اس بات کی علامت ہیں کہ ایران کا جھکاؤ بھارت سے پاکستان کی جانب مڑا ہے۔ پاکستان نے اسرائیل-ایران جنگ میں متوازن رویہ اختیار کیا، جو ایران کی خارجہ پالیسی میں توازن لایا۔ یہ تبدیلی خطے میں سیاسی ڈاناکس کو نئے موڑ پہ لے گئی ہے۔ اب ایران بھارت کے بجائے پاکستان کی جانب زیادہ مثبت رویہ رکھتا ہے۔ یہ پیشرفت جغرافیائی اور سیاسی توازن کے نئے ابواب کھولتی ہے۔

پاکستان اور ایران کے درمیان حالیہ تعلقات میں ایک خوش آئند اور تزویراتی پیش رفت اس وقت سامنے آئی جب دونوں ممالک نے 12 مفاہمتی معاہدوں اور یادداشتوں پر دستخط کیے، جن میں زمینی رابطوں کا فروغ، کوئٹہ-زاہدان ریلوے ٹریک، تجارتی راہداری اور ایران کے سکل روڈ، گواڈر اور چاہ بہار بندرگاہی منصوبوں میں اشتراک شامل ہیں۔ یہ پیش رفت محض اقتصادی تعاون نہیں بلکہ ایک بڑی اسٹریٹجک شراکت کی نوید ہے۔



دونوں ممالک نے فری ٹریڈ ایگریمنٹ کو حتمی شکل دے دی ہے اور دہشتگردی کے خلاف ہر سطح پر باہمی تعاون پر اتفاق کیا ہے۔

اس دورے کی سب سے بڑی معنویت بھارت کیلئے ہے، جس نے حالیہ اسرائیل-ایران کشیدگی میں اسرائیل کو مبیہ طور پر ایک ملین کے قریب افرادی قوت فراہم کی۔ ایران اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب تہران نے نئی دہلی سے فاصلہ اختیار کرتے ہوئے اسلام آباد کے ساتھ راہیں استوار کی ہیں۔ ایرانی صدر کا پاکستان کو پہلا غیر ملکی دورہ بنانا، ایرانی پارلیمنٹ میں "پاکستان زندہ باد" کے نعرے، ان سب کا پیغام واضح اور خطے میں نئی سفارتی سمت متعین ہو رہی ہے۔

دوسری طرف امریکا کے ساتھ اقتصادی شراکت کا ایک نیا باب کھل رہا ہے۔ ٹرمپ کی جانب سے دیے گئے حالیہ بیانات — جس میں انہوں نے عندیہ دیا کہ مستقبل میں بھارت، پاکستان سے اپنی تیل کی ضروریات پوری کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے — نہ صرف پاکستان کی اہمیت کو تسلیم کرنے کا اشارہ ہیں بلکہ یہ مودی حکومت کیلئے ایک سیاسی دھچکہ بھی ہیں۔

31 جولائی 2025 کو امریکا اور پاکستان کے درمیان ایک تاریخی اقتصادی معاہدہ ہوا، جس کے تحت امریکا پاکستان کے وسیع خام تیل کے ذخائر کی ترقی میں تعاون کرے گا۔ یہ ذخائر بلوچستان، سندھ، پنجاب اور خیبر پختونخوا میں پائے جاتے ہیں۔ ٹرمپ نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان اور امریکا مل کر تیل کے بڑے ذخائر کی تلاش میں ایک دوسرے کی معاونت کریں گے اور اس پراجیکٹ میں پاکستان کی بھرپور مدد کیلئے ایک تیل کمپنی کا انتخاب زیر غور ہے اور شائد وہ ایک دن بھارت کو تیل بھی فروخت کریں گے۔ "سینار جیکو" پاکستان کی سب سے بڑی عموادی طور پر مربوط آئل ریفائننگ کمپنی ہے جو ملک کی توانائی کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ اسی کمپنی کے توسط سے امریکی خام تیل کی ملین بیرل کی پہلی کھیپ پاکستانی ساحل پر پہنچ رہی ہے، اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو تو ماہانہ خام تیل کی کھیپ کی منصوبہ بندی کی جائے گی۔ اس معاہدے سے باہمی ٹریف میں مزید کمی ہوگی، خاص طور پر پاکستانی برآمدات پر، جس سے تجارتی رسائی آسان ہوگی اور سرمایہ کاری میں اضافہ ممکن ہوگا۔

یہ معاہدہ صرف توانائی تک محدود نہیں بلکہ کرپٹو کرنسی، مائننگ، ڈیجیٹل انفراسٹرکچر اور آئی ٹی کے شعبوں میں بھی پاکستان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون شامل ہے۔ پاکستان میں مارچ 2025 میں پاکستان کرپٹو کونسل "پی سی سی" قائم کی گئی، جس کی قیادت وزیر خزانہ محمد اورنگزیب خود کر رہے ہیں، اور "بیانس" کے شریک چیئر مین چانگ پنگ ذہاؤ کو اسٹریٹجک مشیر کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔ پی سی سی نے اسٹریٹجک بٹ کوآئن ریزرو قائم کیا ہے اور 2,000 میگاواٹ کا اضافی بجلی کرپٹو مائننگ اسٹریٹجک مشیر اور مصنوعی ذہانت ڈیٹا سنٹر کیلئے مختص کیا ہے، تاکہ پاکستان کو بلیک چین سرمایہ کاری کا مرکز بنایا جاسکے۔

امریکا کی دلچسپی پاکستانی خام تیل کے بنیادی وسائل کے استعمال اور برآمدات میں ممکنہ اضافہ ہے، نیز پاکستان کو آئندہ ایک ممکنہ مارکیٹ سمجھا جا رہا ہے۔ تجزیہ کاروں نے تیل کے ذخائر کا حصول اور تجارتی رعایت دونوں کا ایک ساتھ حصول کو پاکستان کیلئے "دو پرندے ایک تخت" کی حکمت قرار دیا ہے۔ ادھر چین-پاکستان سی پیک کے تحت چین پہلے ہی مالیاتی اور تکنیکی شراکت میں سرگرم عمل ہے؛ امریکا کی مداخلت ایک سطح پر چین کے ساتھ تزیویراتی

مقابلہ کو جنم دے سکتی ہے۔

یہ معاہدہ پاکستان کیلئے ایک نئی معاشی راہ کھولتا ہے، امریکا کی شراکت سے ہماری تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوگا، تجارتی راہیں کھل سکتی ہیں، اور کرپٹو کرنسی اور آئی ٹی شعبے میں ترقی ممکن ہے۔ اگرچہ اس میں سفارتی، سیاسی اور داخلی حدود میں خطرات موجود ہیں، لیکن حکمت و تدبیر کے ذریعے یہ پاکستان کو ایک نئے معاشی دور کی جانب لے جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ امریکا کی انڈیا سے منہ موڑنے اور پاکستان پر یہ اچانک نوازشات کے پیچھے کیا راز ہے؟

"دی اکنومسٹ" نے 3/ اگست 2025 کی اشاعت میں خصوصی مضمون میں نشاندہی کی ہے کہ فیلڈ مارشل جنرل عاصم منیر کی واشنگٹن میں ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ ملاقات، خطے میں امریکی پالیسی کا نیا باب رقم کرنے کی علامت ہے۔ مضمون کے مطابق 18 جون 2025ء کو والی اس ملاقات نے پاکستان-امریکا تعلقات میں علاقائی سفارتی تبدیلی کا آغاز کیا، جس نے سابق سردمہری کو توڑ کر اعتدال پسند حکمت عملی کی راہ ہموار کی۔ اس کے فوراً بعد ٹرمپ نے بھارت کو "مر جھائی ہوئی مردہ معیشت" قرار دیتے ہوئے 25% ٹیرف عائد کر دیا ہے، اور مزید ٹیرف بڑھانے اور جرمانے کا بھی اعلان کیا ہے۔ ٹرمپ نے بھارت پر شدید تنقید کی، خاص طور پر اسے روسی تیل خریدنے پر ملامت کیا، اور ٹیرفز میں مزید اضافہ عائد کا کر کے معیشتی دباؤ ڈالنے کا بھی اشارہ دیا گیا۔ بھارت نے اس فیصلے کا جواب دیا کہ روسی تیل خریدنا اقتصادی مجبوری تھی اور محدود خام مال بیچنے کے طور پر وہ صرف ریفاہی مصنوعات برآمد کرتا ہے جبکہ پاکستان کے ساتھ نئے تجارتی معاہدے میں نافذ کردہ 19% ٹیرف میں مزید کمی کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے۔

تاہم پاکستان نے واشنگٹن کے ساتھ تجارتی معاہدے کیلئے مزید مثبت اشارے دیے اور امریکی مفادات کیلئے بلوچستان کے معدنی وسائل تک رسائی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ٹرمپ کا یہ خطاب مذاکرات کے نکتہ نظر سے ایک واضح اشارہ تھا۔ اس دوران پاکستان نے واضح کیا کہ وہ امریکی تیل کی درآمد بڑھائے گا اور مخصوص شعبوں میں سرمایہ کاری کی ترغیب دے گا۔ اس پالیسی کی قدر کرتے ہوئے امریکی حلقوں نے پاکستان کو اہم غیر نیٹو اتحادی کا درجہ دیا اور ہتھیاروں کی فروخت، دفاعی تعاون اور انسداد ہتھیاروں کے مباحث کو دوبارہ زندہ کیا۔

اخبار کے مطابق خطے میں اس تبدیلی کے نتیجے میں بدلنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جنرل عاصم منیر کی واشنگٹن میں ٹرمپ سے تاریخی ملاقات محض رسمی سفارت کاری کا تسلسل نہیں بلکہ جنوبی ایشیا میں ایک نئے سفارتی باب کا آغاز تھی، جس نے پاکستان کو علاقائی توازن کے مرکز میں لاکھڑا کیا۔ اس ملاقات کے بعد امریکی پالیسی میں نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ بھارت، جو طویل عرصے سے امریکی مفادات کا ترجیحی شراکت دار رہا، اب ٹیرف اور تجارتی سختیوں کی زد میں آگیا، جبکہ پاکستان کے ساتھ نرم لہجے اور اقتصادی اشتراک کی فضا قائم ہونے لگی ہے۔

امریکا نے پاکستان میں توانائی، معدنی وسائل اور کرپٹو سرمایہ کاری میں دلچسپی ظاہر کی، جبکہ بھارت کو روسی تیل کی درآمد پر سرزنش سرزنش کرتے ہوئے مجوزہ ٹیرف میں اضافہ عائد کرنے کا عندیہ دیا ہے جو تبدیلی کی معاشی پالیسی کیلئے ایک سخت چیلنج ہے۔ اس کے برعکس، پاکستان نے اقتصادی کشادگی اور معدنی وسائل تک رسائی کی پیشکش کے ذریعے امریکا کے ساتھ تعلقات کو نئی جہت دی۔ امریکا نے پاکستان کے ساتھ نہ صرف اقتصادی بلکہ عسکری تعاون کی بحالی کے آثار بھی نمایاں کیے، جبکہ بھارت اس تبدیلی پر ناراضگی کا اظہار کرتا رہا۔ یوں جنوبی ایشیا میں امریکا کی روایتی توازن طاقت کی حکمت عملی نئی صورت اختیار کر گئی ہے، جس میں پاکستان نہ صرف ایک نئی امید بلکہ ایک اسٹریٹیجک ترجیح کے طور پر ابھر کر سامنے آیا ہے۔

دی اکنومسٹ کے مطابق، یہ ملاقات اور اس سے جڑی پالیاں ایک واضح اشارہ ہیں کہ امریکی حکمت عملی بھارت سے پاکستان کی طرف منتقل ہو رہی ہے، اور اس کا دائرہ کشمیر، ایران و چین سے لیکر مشرق وسطیٰ اور اقتصادی شعبوں تک پھیل رہا ہے۔ اس تبدیلی کے نتیجہ میں پاکستان کو سفارتی، تجارتی اور عسکری رسائی میں اضافہ حاصل ہو رہا ہے۔ خطے میں طاقت کا منظر نامہ بدل رہا ہے اور امریکا کی ترجیحات ایک وقت میں بھارت کو بنیاد بنا کر پاکستان کو دوبارہ اہمیت دے رہی ہیں۔

جب تاریخ کی پرچھائیوں سے ایک نئی سحر نمودار ہوتی ہے تو وہ صرف وقت کا تسلسل نہیں بلکہ انسانی شعور کی سمت کا تعین بھی کرتی ہے۔ روس کی جانب سے انٹر میڈیٹ ریخ نیو کلیئر فورسز معاہدے سے مکمل دستبرداری، یورپ، ایشیا اور بحر الکاہل میں سیلینک و کروزمیزائلوں کی تعیناتی کے اعلان نے بین الاقوامی سیاست کے آسمان پر بجلی کی ایک ایسی کڑک پیدا کی ہے، جس کی گونج صرف کرمیلن کی دیواروں تک محدود نہیں، بلکہ وائٹ ہاؤس، بیجنگ، دہلی، اسلام آباد اور برسلز تک سنائی دے رہی ہے۔ یہ فیصلہ تاریخ کے اس موڑ پر سامنے آیا ہے جہاں دنیا پہلے ہی عسکری، معاشی اور نظریاتی کشمکش کے بھنور میں الجھی ہوئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی خطے میں ایک اہم تبدیلی روس کا یہ حالیہ اعلان کہ وہ درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے جوہری میزائلوں کے معاہدے سے مکمل طور پر دستبردار ہو چکا ہے۔ بین الاقوامی سلامتی، بالخصوص یورپ، ایشیا اور بحر الکاہل کے خطے کیلئے نہایت تشویش ناک پیشرفت ہے۔ اس اعلان کے تحت روس نے نہ صرف معاہدے کو رسمی طور پر خیر باد کہا بلکہ اس کے ساتھ ہی سیلینک اور کروزمیزائل ان تمام خطوں میں متعین کرنے کا عزم کا اظہار کر دیا ہے۔

1987ء میں امریکی صدر رونالڈ ریگن اور سوویت رہنما میخائل گورباچوف کے درمیان انٹر میڈیٹ ریخ نیو کلیئر فورسز معاہدہ طے پایا تھا، اس معاہدے نے 500 سے 5,500 کلومیٹر تک مار کرنے والے زمین سے دانے جانے والے میزائلوں پر پابندی عائد کر کے یورپ کو ممکنہ جوہری تباہی سے کچھ حد تک محفوظ کر دیا تھا لیکن 2019ء میں امریکا کی جانب سے اس معاہدے سے نکلنے کے بعد اب روس کی دستبرداری اس معاہدے کو دفتر تاریخ میں دفن کر چکی ہے۔ روس کا موجودہ اعلان ایک متوقع مگر ہولناک پیش رفت ہے۔

روس کی جانب سے انٹر میڈیٹ ریخ نیو کلیئر فورسز معاہدے سے باضابطہ علیحدگی اور میزائلوں کی نئی صف بندی کا اعلان یورپ کیلئے گویا ایک پرانا خواب ٹوٹنے کے مترادف ہے۔ نیٹو اتحادیوں کے ذہنوں میں 1980ء کی دہائی کے وہ دن تازہ ہو گئے ہیں جب یورپ سوویت میزائلوں کی زد میں تھا۔ خاص طور پر جرمنی، پولینڈ اور بالٹک ریاستیں اس نئے منظر نامے میں براہ راست خطرے میں ہیں۔

اس فیصلے نے عالمی اسٹریٹیجک توازن میں بگاڑ کا شدید خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ معاہدہ سرد جنگ کے دور میں امریکا اور سابق سوویت یونین کے درمیان جوہری ہتھیاروں کی دوڑ کو محدود کرنے کیلئے ایک بنیادی ستون تھا۔ اس معاہدے کی منسوخی ایک ایسا اقدام ہے جو نہ صرف اس توازن کو توڑتا ہے بلکہ نئے ہتھیاروں کی دوڑ کو جنم دے سکتا ہے۔ چونکہ انٹر میڈیٹ ریخ نیو کلیئر فورسز میزائل یورپ تک محدود فاصلے میں مار کر سکتے ہیں، لہذا روس کی جانب سے ان کی یورپی حدود میں تعیناتی نے نیٹو اتحادیوں میں خاص طور پر پولینڈ، جرمنی، فرانس جیسے ممالک میں جو ماضی میں سوویت ہدف پر تھے، اضطراب پیدا کر دیا ہے۔

چین، جاپان، بھارت اور پاکستان جیسے ممالک کے گرداگرد روسی میزائل تعینات ہوتے ہیں تو یہ پورے خطے کو غیر یقینی اور خطرناک کشمکش میں جھونک سکتے ہیں۔ بحر الکاہل میں یہ امریکی مفادات، خاص طور پر گوام اور جنوبی کوریا میں امریکی اڈوں کیلئے ایک براہ راست چیلنج ہو گا۔ پاکستان جو پہلے ہی خطے میں بھارت کے بڑھتے ہوئے عسکری عزائم اور امریکی جھکاؤ سے دوچار ہے، روس کے اس فیصلے کو اسٹریٹیجک گہرائی کیلئے ایک موقع بھی سمجھ سکتا ہے۔

بشرطیکہ روس کے ساتھ دفاعی اشتراک کو وسعت دی جائے۔ خاص طور پر اگر روس پاکستان کے ساتھ مشترکہ دفاعی مشقیں، ٹیکنالوجی ٹرانسفر یا میزائل ڈیفنس میں تعاون کرتا ہے۔ روس اور چین کے تعلقات خوشگوار ضرور ہیں، لیکن روسی میزائلوں کی ایشیا میں تعیناتی چین کیلئے بھی ایک دباؤ کا اشارہ ہو سکتی ہے، تاکہ بیجنگ ماسکو کے مفادات سے منحرف نہ ہو۔

ایشیا کے میدان میں یہ فیصلہ ایک نئی ہلچل پیدا کر سکتا ہے۔ امریکا، جو خود کو بحر الکاہل میں ایک غالب طاقت سمجھتا ہے، روسی میزائلوں کی ممکنہ موجودگی کو اپنی بالادستی کیلئے ایک چیلنج سمجھے گا۔ جاپان اور جنوبی کوریا، جہاں امریکی فوجی اڈے موجود ہیں، اب براہ راست روسی ہدف پر آچکے ہیں۔ بحر الکاہل کی حد تک روس کا یہ اقدام امریکا کیلئے واضح پیغام ہے کہ وہ اب صرف یورپ میں نہیں، بلکہ بحر الکاہل کے پانیوں میں بھی اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے گا۔

پاکستان کیلئے یہ ایک دودھاری تلوار ہے۔ ایک جانب خطے میں کشیدگی اور اسلحہ کی دوڑ میں اضافہ، تو دوسری جانب روس کے ساتھ اسٹریٹیجک تعاون بڑھانے کا امکان۔ اگر پاکستان دانش مندی سے سفارتی بساط بچھائے، تو وہ روس کے ساتھ عسکری، تکنیکی اور دفاعی تعاون کو فروغ دے سکتا ہے، بالخصوص اس وقت جب پاکستان پہلے ہی امریکا اور چین کے بیچ متوازن حکمت عملی پر گامزن ہے۔

یہ فیصلہ بھارت کیلئے بھی ایک امتحان ہے۔ اگرچہ بھارت نے ماضی میں روس کے ساتھ قریبی تعلقات قائم رکھے، مگر حالیہ برسوں میں امریکا کی طرف جھکاؤ نے ماسکو کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ روسی میزائلوں کی ایشیائی تعیناتی بھارت کے اسٹریٹیجک ماحول کو مزید پیچیدہ بنا سکتی ہے۔ مزید برآں مودی کیلئے زوال کا سفر اب تیز ہوتا جا رہا ہے۔ پہلا گام حملے کے بعد بھارت نے ہمیشہ کی طرح پاکستان پر الزام تراشی کی روایت دہرائی، مگر اس بار دنیا نے وہ رد عمل نہ دیا جو بھارت کو توقع تھی۔ بھارتی افواج کے ہی ترجمان اب اس الزام سے پسپائی اختیار کر رہے ہیں، جس سے بھارت کے بیانیے کی کمزوری واضح ہو گئی ہے۔

دنیا آج ایک نئے موڑ پر کھڑی ہے، جہاں عسکری طاقت کے توازن میں چھوٹے سے تغیر کا مطلب براعظموں کی تقدیر کا بدلہ جانا ہے۔ روس کی آئی این ایف معاہدے سے دستبرداری، پاک ایران نئی سفارتی جہت، امریکا کے ساتھ معاشی معاہدے، اور بھارت کی عالمی تنہائی — یہ سب اس امر کے غماز ہیں کہ عالمی سیاست میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ روس کی معاہدے سے باضابطہ علیحدگی اور میزائلوں کی نئی صف بندی معاہدے سے دستبرداری اور میزائلوں کی نئی تعیناتی کا اعلان محض ایک دفاعی قدم نہیں، بلکہ ایک نظریاتی پیغام بھی ہے طاقت اب محدود معاہدوں کی اسیر نہیں رہی۔

اے اہل وطن! اصل آزادی صرف جغرافیائی حدود میں نہیں، بلکہ فکری آزادی، معاشی خودداری اور اسلامی حیات کے احیاء میں مضمر ہے۔ خداوند کریم فرماتا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَدْعُو رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِهِ أَحَدًا۔ (الحج: 18) کہہ دو کہ میں تو اپنے پروردگار ہی کی عبادت کرتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں بناتا۔

ایسی سنگینی و جذباتیت کے عالم میں یومِ آزادی کو شایانِ شان منانے کیلئے ضروری ہے کہ قومی سالمیت، اسلامی اعتقاد و اتحاد کو مرکزی توجہ کا مرکز رکھیں۔ مساجد، تعلیمی اداروں اور فوجی تنصیبات میں قرآنی آیات و ملی نغمات کی رونق ہو۔ نوجوان نسل کو جذبہ، قومی وقار و اسلامی تربیت سے روشناس کروائیں۔ محروم طبقات کو یاد رکھ کر مشترکہ اجتماعات میں ان کی شمولیت کو فروغ دیں۔

اسی روشنی میں یومِ آزادی ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنے اسلامی نصب العین کو زندہ کریں، اپنی تہذیب و ثقافت کو سنواریں، اور اپنی سر زمین کو عزت و شان سے آگے بڑھائیں۔ قرآن کی سچائی، اشعارِ جذبات، اور قومی استقامت — یہ لڑی ہر قاری کے دل کو چھو کر ایک نئے ادبی تاثر میں ڈبو دے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دائمی امن، خوشحالی اور اسلامی بیداری عطا فرمائے، آمین۔

اور اب جب کہ ہم یومِ آزادی کے اس آئینے میں اپنی تاریخ کا عکس دیکھ چکے ہیں، تو لازم ہے کہ ہم محض تقریروں، جھنڈیوں اور آتش بازی تک محدود نہ رہیں، بلکہ روحِ پاکستان کو از سر نو بیدار کریں۔ یہ وطن کوئی خطہ زمین نہیں، بلکہ خوابوں، قربانیوں اور دعاؤں کا وہ دستارِ بند قافلہ ہے جس کے ہر پڑاؤ پر کسی ماں کی ممتا، کسی باپ کی امید، کسی جوان کی شہادت اور کسی عالم کا قلم خون میں ڈوبا نظر آتا ہے۔

ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ پاکستان کی حقیقی تکمیل ابھی باقی ہے۔ جس نظریے پر یہ وطن معرضِ وجود میں آیا، اس کی تعبیر تبھی ممکن ہے جب ہر پاکستانی اپنی ذات کو قوم کے چراغ میں جلتا ہوا دیکھے۔ آزادی محض جغرافیائی آزادی نہیں بلکہ فکری آزادی، معاشی خود انحصاری، عدلی عمر جیسا نظام، علم قرآنی کی روشنی، اور شریعتِ محمدی ﷺ کی عملداری کا نام ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم سیاسی انتشار، معاشی زوال اور تہذیبی بے راہ روی کے گرداب سے نکل کر وحدتِ امت، نظریاتی استقامت اور اسلامی تشخص کو اپنا شعار بنائیں۔ ہمیں درکار ہے ایک نئی ہجرت، ایک نیابدر، ایک نیا کربلا مگر بندوق سے نہیں، قلم سے، علم سے، کردار سے، تقویٰ سے۔ جیسا کہ قائد اعظم نے فرمایا: کام، کام، اور بس کام۔ اور اقبالؒ نے صدادی:

نہ تُو ز میں کیلئے ہے، نہ آسمان کیلئے

جہاں ہے تیرے لیے، تُو نہیں جہاں کیلئے

پس اے اہل وطن!

آج کی شب چراغاں ضرور کیجیے، مگر کل کا سویرا اس عہد کے ساتھ طلوع ہو کہ اب پاکستان فقط ایک ملک نہیں، ایک پیغام، ایک مشن، ایک امانت ہے... جس کا ہر باسی امینِ نظریہ، دارِ شہادت، اور پرچم محمدی ﷺ کا علمبردار ہے۔

پاکستان زندہ باد، نظریہ پاکستان پائندہ باد

حکمتِ عملی، جنگ اور امن کا فلسفہ

تذکرہ کر رہے ہیں جس میں دنیا کے حالات جب کجی اور پیچ و خم اختیار کریں تو تاریخ کا قلم بھی سکوت میں تیر چھوڑنے لگتا ہے۔ یہاں ہم ایک ایسے عہد کا جنگ کا چہرہ بدل چکا—یہ عہد وہ ہے جس میں جنگ کے گیت توپوں اور تلواروں سے نہیں، بلکہ برقی لہروں اور خود کار پرندوں سے گائے جا رہے ہیں۔ زمین پر سپاہی اب بھی ہیں، مگر فضا پر حکومت اڑتے لوہے کے پروں اور خاموش قاتلوں کی ہے۔ فوجی محاذ پر انسان کم اور مشینیں بیشتر بولتی ہیں؛ ڈرونز، کروزمیزائل، اور خود کار ہتھیار میدانِ جنگ کے نئے «قلم» بن چکے ہیں۔

اسرائیل کی وزارتِ دفاع نے ایک ایسے راز کو خود آشکار کیا جس پر پہلے صرف قیاس کے چرچے تھے۔ بھارت نے پاکستان کے خلاف جھڑپوں میں اسرائیلی ساختہ ہتھیار استعمال کیے۔ حالیہ کشیدگی میں اسرائیلی حکومت نے باضابطہ منظوری کا اعتراف کیا کہ بھارتی آپریشن سندور کے دوران بھارت نے اسرائیلی ساختہ اسلحہ جن میں باراک-8 میزائل اور بعض لوٹرنگ مینوشنز/ہارپ ڈرونز خصوصی طور پر استعمال ہوئے۔ یہ صرف اسلحے کی فراہمی کا معاملہ نہیں، بلکہ ایک تزویراتی اشارہ تھا—کہ بھارت اور اسرائیل عسکری سطح پر ایک دوسرے کے اتنے قریب ہیں کہ ایک کے دشمن کے خلاف دوسرے کا اسلحہ براہِ راست استعمال ہو۔ یہ اعتراف صرف فنی اطلاع نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی دفاعی ربط کی گواہی ہے جس نے روایتی تصورِ دشمنی کو تبدیل کیا—جب ایک تیسرا فریق، دوسرے کے ساتھ براہِ راست دفاعی تعاون میں نظر آئے۔ پاکستان کیلئے یہ دوہرا چیلنج تھا۔ ایک جانب روایتی دشمن بھارت، دوسری طرف اسرائیلی ٹیکنالوجی کا سامنا۔ اس حقیقت نے خطے کی تزویراتی حرکیات کو بدل دیا اور پاکستان کے دفاعی منصوبہ سازوں کو فوری ردِ عمل پر مجبور کیا۔ پاکستان نے اپنی بہترین صلاحیتوں اور منصوبہ بندی سے ایک محاذ پر دو محاذ دشمنوں کا مقابلہ کیا اور بالآخر جب شکست دشمن کا مقدر بنی تو انہوں نے امداد کیلئے اپنے باپ ٹرمپ کے سامنے دہائی دیکر جان بچانے کی درخواست پر سیز فائر کا میڈل اپنے سینے پر سجا کر اب امن کے نوبل انعام کیلئے بڑے پر امید ہیں۔

اسرائیل کا یہ اعتراف بتاتا ہے کہ عسکری سلسلے جغرافیائی سرحدوں سے ماوراء ہیں؛ ساز و سامان، تجربات اور جنگی ٹیکنالوجی بھی تبادلاً کی اشیاء بن گئی ہیں۔ اس نے اُس قدیم مفروضے کو جھٹکا دیا کہ دو ملکوں کی جنگ میں ثالث غیر جانبدار ہی رہتا ہے—آج جدید اسلحہ ساز کے ساتھ مباشرت روشنی ڈالتی ہے کہ جنگی حرمت کے روایتی دائرے بدل چکے ہیں۔

بھارتی فوج نے اپنی دستاب صلاحیتوں کو منظم کرنے کیلئے نئے ڈرون / یو اے وی دستوں کا اجرا تیز کر دیا ہے؛ سوال یہ ہے کہ بھارتی فوج کی نئی "ڈرون بٹالین"—برتری کا خواب ہے یا عارضی فائدہ؟ "یو اے ویز" ایسا بغیر پائلٹ کے ہوائی جنگی ہتھیار ہے جن میں جہاز کا عملہ یا مسافر نہیں ہوتے ہیں۔ وہ خود کار "ڈرون" یا دور سے چلنے والی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ رفتار اور اونچائی کی ایک کنٹرول شدہ سطح پر طویل عرصے تک پرواز کر سکتے ہیں اور بہت سے پہلوؤں میں اس کا کردار ہے۔

اصطلاحاً "ڈرون بٹالین" کو ایک مستقل جنگی یونٹ کے طور پر ترتیب دیا جا رہا ہے، جس میں محسوس، حملہ آور خود کش ڈرونز کو اکٹھا کر کے مربوط آپریشنل اہداف دیے جاتے ہیں۔ بھارتی فوج میں "ڈرون بٹالین" کے نام سے اس شعبہ کا مقصد ڈرونز کو صرف نگرانی کے آلات کے طور پر نہیں، بلکہ براہِ راست

حملہ آور یونٹس کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ یہ بٹالین جدید سینسرز، لائیو ڈیٹا لنکس، اور ہتھیار بردار خود کش ڈرونز سے لیس ہوگی، جو کمانڈ سینٹر سے براہ راست کنٹرول میں رہیں گی۔ اس تبدیلی کا خدوخال یہ ہے کہ ہر بٹالین میں تیز کمانڈ، "انٹیلی جنس، نگرانی، توثیق" اور ہتھیار بردار ڈرونز کا مجموعہ ہوگا، جس سے جنگی فیصلے کم وقت میں اور کم انسانی مداخلت سے لیے جاسکیں گے۔

فوجی ماہرین کے مطابق یہ بٹالین مختصر مدت میں برتری پیدا کر سکتی ہے، خاص طور پر اگر مخالف کے پاس ان ڈرونز کی تباہی یاروکنے کا مؤثر نظام نہ ہو۔ تاہم، ڈرون جنگیں محض مشینوں کی نہیں، الیکٹرانک ذہانت اور ریسٹل ٹائم ڈیٹا کی بھی ہوتی ہیں۔ جہاں پاکستان نے پہلے ہی اپنی صلاحیت کو بہتر بنانا شروع کر دیا ہے اور مصدقہ ذرائع کے مطابق حالیہ پاک بھارت جنگ میں اسرائیلی ہاروپ ڈرونز کو کامیابی سے نیچے اتار کر پاکستان نے اس ٹیکنالوجی میں پہلے ہی اپنی مہارت کا لوہا منوایا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انڈیا کا اس نئی ڈرونز کی یونٹ کی تیاری کیا اسے عسکری میدان میں برتری دلا سکے گی؟

فنی طور پر، ڈرون بٹالین ایک وقتی برتری دے سکتی ہے۔ خصوصاً جب دشمن دفاعی بندوبست غیر لپٹنے یا ناکافی الیکٹرانک وار فیئر رکھتا ہو۔ مگر حقیقی برتری تعداد، تربیت، کمانڈ و کنٹرول نیٹ ورک، اور دشمن کی وگننس (راڈار، ای ڈیٹو، سیٹو آئی ٹو ایس آر) پر منحصر ہے۔ یہ تمام ٹولز فوجی کارروائیوں کے اندر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تصورات ہیں، خاص طور پر انٹیلی جنس، نگرانی، اور جاسوسی "آئی ایس آر" سے متعلق۔ ریڈار (ریڈیو ڈیٹیکشن اینڈ رینجنگ) ایک ایسا نظام ہے جو اشیاء کا پتہ لگانے اور ان کی حد، زاویہ یا رفتار کا تعین کرنے کیلئے ریڈیو لہروں کا استعمال کرتا ہے۔ الیکٹرانک وار فیئر "ای ڈیٹو" برقی مقناطیسی سپیکٹرم کو کنٹرول کرنے کیلئے برقی مقناطیسی اور ہدایت شدہ توانائی کا استعمال ہے، جس میں دشمن کے نظام کا پتہ لگانا، تجزیہ کرنا اور ان میں خلل ڈالنا، نیز دوستانہ نظاموں کی حفاظت کرنا شامل ہے۔

سی سی ٹو آئی ایس آر (کمانڈ، کنٹرول، کمیونیکیشنز، کمپیوٹرز، انٹیلی جنس، نگرانی، اور جاسوسی) ایک وسیع نظام ہے جو کمانڈروں کو مؤثر فیصلہ سازی کیلئے ضروری معلومات اور کنٹرول فراہم کرنے کیلئے ان صلاحیتوں کو مربوط کرتا ہے۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ڈرون-بنیاد جنگ میں سائلو (تنہا) ڈرونز شاندار نہیں رہتے؛ انہیں جال شناسائی، دفاعی کوریج، اور باریک بین ہدف شناسی درکار ہوتی ہے۔ اگر پاکستان نے سخت الیکٹرانک مداخلت اور مؤثر شوٹ رینج ایئر بس ڈیفنس استعمال کیا تو ڈرون بٹالین کی افادیت کم ہو سکتی ہے۔

بھارت نے اپنے اتحادی اسرائیل کے ساتھ مل کر نئی جنگی حکمت عملی یہ تیار کی ہے کہ ڈرونز بٹالین کو نگرانی، ہدفی نشانہ گیری، باریک حملے اور دشمن کے کمانڈ و کنٹرول کو خلل زدہ کرنے کیلئے استعمال کیا جائے اور بلا واسطہ نشانے جیسے رڈار، میزائل سائنٹس اور فوجی میسرز پر ہاروپ ڈرونز سے خود کش حملے کے ذریعے پاکستان پر وار کیا جائے۔ الیکٹرانک وار فیئر میں سرمایہ کاری ڈرونز کی کمانڈ لنک اور نیویگیشن کو متاثر کرنے کیلئے جیمنگ، جی پی ایسا سپووفنگ اور ریڈیو فریکوئنسی مداخلت شارٹ رینج اینٹی یو اے وی شیلڈز، کاؤنٹر ڈرون سسٹمز جیسے سپائڈر اینٹی یو اے وی شیلڈنگ اور کینینٹک انٹر سپیشن ڈ-رینج اور لور رینج ایئر بس دفاع کی ریفارمنگ، تیزی سے موبائل لانچرز کو حرکت میں لایا جایا گا۔

لیکن پاکستان اس تمام دشمن کارروائیوں پر کڑی نگاہ رکھنے کیلئے جوابی کارروائیوں کی مکمل تیاریوں میں خود کفیل ہے۔ اس سلسلے میں بھارتی ڈرون بٹالین کے افعال اور پاک افواج کی جوابی تیاریاں بھی عروج پر ہیں گویا آئندہ جنگ میں پہلی مرتبہ ایسی جنگ کی بجائے فضائی حدود میں کامیابی اور ناکامی کے فیصلے ہوں گے۔ اس سلسلے میں متوقع ڈرونز جنگ میں پاکستان نے اپنے اس اہم فرائض کی تکمیل کیلئے بھارتی ڈرونز بٹالین کی تمام خفیہ اور اعلانیہ تیاریوں پر کڑی

نگاہ رکھتے ہوئے دشمن کے حساس مراکز کی نگرانی، وقت آنے پر مخصوص اہداف پر پیشگی دفاع کے نقطہ نظر سے اپنے حق کے پہلے استعمال کا اعلان کرتے ہوئے انڈیا کے مشرقی علاقوں کو منتخب کرنے کا عالمی میڈیا میں اعلان کر دیا ہے جس میں فوری اقدام کے طور پر دشمن کے ریڈار اور کمانڈ سسٹم کو ناکارہ بنانا اولین ترجیح ہوگی۔

پاکستان نے اس کے مقابل تین سطحی حکمت عملی اپنائی ہے۔ الیکٹرانک وار فیئر، ریڈیو فریکوئنسی جیمنگ اور اسپوofنگ کے ذریعے دشمن کے ڈرون کو "اندھا" کر دینے، کاؤنٹر ڈرون سسٹم جس میں چھوٹے فاصلے کے اینٹی ڈرون ہتھیار، جو فضا میں ڈرون کو مار گرائیں اور ملٹی لیئر ایئر ڈیفنس حملے، درمیانے اور کم فاصلے کی دفاعی پرتیں، جو ڈرون یا میزائل کو قریب آنے سے پہلے تباہ کر دیں کی کاروائیوں پر فوری عملدرآمد کیا جائے گا۔

بھارت کے پاس ہے "ہیروں" نامی ڈرون ہے جو لمبے فاصلے تک اڑ کر دشمن کی زمین کا چپکے سے جائزہ لیتا ہے، بالکل ایسے جیسے کوئی گدھ آسمان سے شکار پر نظر رکھے۔ یہ یا تو باہر سے منگوا یا گیا ہے یا باہر والوں کی اجازت سے بنایا گیا ہے۔ پھر آتا ہے ہاروپ، یہ ڈرون کوئی عام جاسوس نہیں، بلکہ خود کش، جو ریڈار سگنل پر نشانہ باندھتے ہیں پہلے ہدف ڈھونڈتا ہے، پھر سیدھا جا کر اس سے ٹکرا کر پھٹ جاتا ہے۔ ایک اور ایم کیو 9 سپر ڈرون، جو گھنٹوں نہیں بلکہ پورا دن آسمان میں رہ سکتا ہے۔ یہ نگرانی بھی کرتا ہے اور ضرورت پڑے تو نہایت درست نشانہ لگا کر حملہ بھی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت چھوٹے چھوٹے ڈرونز کا جھنڈ بھی تیار کر رہا ہے، جو ایک ساتھ آسمان میں اڑ کر دشمن کو گھیر لیتے ہیں، جیسے چڑیا کا غول کھیت پر اترتا ہے۔ ان میں سے کئی ڈرون اب اسرائیل کی مدد سے بھارت میں ہی بن رہے ہیں، اور کچھ توسیدھے سیدھے کام کازی یعنی خود کش انداز والے ہیں۔

پاکستان کے پاس اپنا بنایا ہوا براق ڈرون ہے جو میزائل ساتھ لے کر چلتا ہے اور جہاں حکم ہو، وہاں سیدھا نشانہ لگاتا ہے۔ اس کے بعد ہیں شاہپر-2 اور شاہپر-3، یہ درمیانی فاصلے تک اڑ کر دشمن پر نظر رکھتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ہتھیار بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ "یو اے وی" کاؤنٹر ڈرون پونٹس، جو دشمن کو فضا میں تباہ کرنے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ یہ سب ڈرونز ہمارے اپنے ادارے "جی آئی ڈی ایس" اور دوسرے دفاعی مراکز میں تیار ہوتے ہیں، یوں کہیے کہ یہ ہماری اپنی فضا کے باز ہیں، جو دشمن کو نہ صرف آنکھ دکھا سکتے ہیں بلکہ آنکھیں پھوڑ دینے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہاروپ ایک ایسا خود کار ہتھیار ہے جو بظاہر "یو اے وی" کی طرح ہوتا ہے اور اس کو خاموش قاتل کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یہ ہدف کے اوپر گھنٹوں پرواز کر سکتا ہے، اور جب مطلوبہ نشانہ سامنے آئے تو سیدھا ٹکرا جاتا ہے۔ اس کی نشاندہی مشکل اس لیے ہے کہ اس کا سائز چھوٹا اور ریڈار پر کم ظاہر ہوتا ہے۔ یہ زمین کے قریب اور سست رفتاری سے پرواز کرتا ہے، جس سے ریڈار کو دھوکہ دیتا ہے۔ یہ خود کار ہدف شناسی الگورتھم استعمال کرتا ہے، جس سے انسانی مداخلت کم ہو جاتی ہے۔



پاکستان نے حالیہ جنگ میں کئی ہاروپ ڈرونز کو نہ صرف تباہ کیا بلکہ کچھ کو بحفاظت زمین پر اتار کر ان کا سافٹ ویئر اور سنسر ٹیکنالوجی کا تجزیہ کیا۔ اگرچہ تباہی کے نشانات اور ملبہ ملایا میٹ ہو جاتا ہے، مگر چند بحفاظت اتارے جانے والے ڈرونز کی بحالی اور تکنیکی تحقیق کے حوالے سے اہم ہیں۔ کیونکہ ان سے سافٹ ویئر، نیویگیشن اور سنسر ٹیکنالوجی کی نقالی ممکن ہے۔ حقائق کی تفتیشی رپورٹوں اور

فوجی بیانات نے اس دعوے کو تقویت بخشی ہے، مگر پاکستان کے عسکری ادارے کے علاوہ آزاد تحقیقات اور تصاویر کی بنیاد پر تجزیہ جاری کیا گیا ہے کہ پاکستان نے نہ صرف کامیابی سے 69 سے زائد ہاروپ اور دیگر ڈرونز کو تباہ کیا اور ان کے بلے کا عالمی میڈیا کو موقع پر جا کر دکھانا اس کا مضبوط ثبوت ہے اور کچھ کو بحفاظت زمین پر اتار کر ان کا سافٹ ویئر اور سینسر ٹیکنالوجی کا تجزیہ کر کے اس کی تباہی کا فارمولہ تیار کرنے کے پاکستانی دعوے نے اسرائیل اور بھارت کیلئے کئی مشکلات بڑھادی ہیں کیونکہ اسرائیل کا دعویٰ تھا کہ امریکا کا جدید ترین نظام بھی ہاروپ ڈرونز کی نشاندہی کرنے سے قاصر ہے۔

حال ہی میں آئی ایس پی آر کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل احمد شریف چودھری نے بلومبرگ کو انٹرویو میں واضح طور پر یہ اعلان کیا ہے کہ آئندہ پاک بھارت جنگ میں پاکستان کے جنگی اہداف کیا ہوں گے اور پاکستان اپنے پیشگی دفاع کے حق کو استعمال میں پہل کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ فوجی بیانات میں ایک واضح اشارہ دیا گیا کہ کسی بڑے حملے کی صورت میں پاکستان اپنی دفاعی اور جوابی صلاحیت کو مشرقی بھارت تک پھیلانے کا یہ بیان دور رخ رکھتا ہے، ایک طرف یہ ڈٹرنس یعنی روک تھام کا پیغام ہے، دوسری طرف دشمن کے اندر اضطراب پیدا کرنے کی حکمت عملی۔

یاد رہے کہ صحافتی رپورٹس اور فوجی بیانات میں کبھی کبھار ایسی دھمکیوں یا اشاروں کا ذکر ملتا ہے جو جنگی مفاہمت یا جوابی طاقت کی اطلاع دیتے ہیں۔ اگر پاکستان نے "مشرقی بھارت کو نشانہ بنانے" کا علانیہ اشارہ دیا ہے تو اسے دوسری طرف سمجھا جانا چاہیے:

☆ (۱) جوابی تلافی کا بطور ڈٹرنس اظہار؛

☆ (ب) سیاسی پیغام — دشمن کے اندر خوف اور بیرونی دنیا کو خبردار کرنے کا سیاسی آلہ۔ عملی طور پر، بین الاقوامی قوانین، علاقائی پیچیدگیاں اور جوہری زکاؤٹ ایسے فیصلوں کو محدود کرتے ہیں۔ البتہ عسکری طور پر پاکستان کی جانب سے مشرقی علاقے پر دھیان دینے کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ریخ — آئیٹھلیوز، فضائی اور راکٹ صلاحیتوں کو اس لحاظ سے پُر کرے گا کہ اگر ضرورت پڑی تو جوابی ضرب توجہ کے ساتھ دی جاسکے۔ (یہ مرحلہ زبانی بیانات، اسٹریٹجک بریفز اور دفاعی مطالعوں پر منحصر نہیں ہے بلکہ پاکستان اس سلسلے میں جدید سہولیات کے ساتھ مکمل تیاری کر چکا ہے۔)

اب آئیے ہم امریکی اپاچی ہیلی کاپٹر جو انڈیا اور اسرائیل کے زیر استعمال ہیں اور چینی ہیلی کاپٹر "زیڈ-10 ایم ای" کا ایک فنی و عملی موازنہ آپ کے سامنے رکھتے ہیں تاکہ جنگی اسلحے کی طاقت اور کارکردگی کا ادراک ہو سکے۔

چینی ہیلی کاپٹر "زیڈ-10 ایم ای" کا انجن طاقتور ہے اور گرم موسم میں اچھی کارکردگی دکھاتا ہے۔ اس میں ٹینک تباہ کرنے والے میزائل، درمیانے سائز کی توپ، اور راکٹ لگے ہوتے ہیں۔ اس میں جدید ریڈار، سینسر اور مضبوط بکتر موجود ہیں جو حفاظت بڑھاتے ہیں۔ یہ نہ صرف نسبتاً سستا ہے، اس کی مرمت آسان ہے، اور پاکستان کی ضرورت کے مطابق بنایا گیا ہے بلکہ اس کی تیاری میں پاکستانی انجینئرز کا بھی خاصا عمل دخل ہے جبکہ اپاچی ہیلی کاپٹر (امریکا) کا انجن ہر طرح کے موسم میں اچھی کارکردگی دکھاتا ہے۔ اس میں جدید میزائل، بڑی توپ اور راکٹ سسٹم نصب ہیں۔ اس میں اعلیٰ درجے کا ریڈار اور الیکٹرانک دفاعی نظام ہے۔ یہ مہنگا ہے، لیکن کئی سالوں سے آزمودہ اور قابل بھر و سہا ہے۔ پاکستان کیلئے چینی ہیلی کاپٹر "زیڈ-10 ایم ای" ایک عملی انتخاب کا کامیاب نتیجہ ہے۔ وہ مقامی میدان کاروائی، لاجسٹک قابلیت اور روس / امریکا تک رسائی کی پابندیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے موزوں حل فراہم کرتا ہے۔ مگر حقیقی فتح پائلٹس، نیٹ ورک، اور ہارمونی میں ہے نہ کہ محض ہوائی گاڑی کی تکنیکی تفصیل میں۔

پاکستانی دفاعی حکمت عملی میں چینی ہیلی کاپٹر "زیڈ-10 ایم ای" کا انتخاب چند عملی محرکات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ مغربی (خاص کر امریکی) ہتھیاروں

تک محدود رسائی، چین کے ساتھ بڑھتا ہوا دفاعی تعلق، لاگت اور مرمت میں آسانی، اور اسٹرائیک / باہمی دفاعی تقاضوں کیلئے مناسب کارکردگی، اور متعدد رپورٹس کے مطابق "زیڈ-10 ایم ای" کو پاکستانی ضرورت کے مطابق موافق بنایا گیا ہے۔ سینسٹو ٹنگ، ریڈیوسٹر / انجن اپگریڈ اور ساحلی / صحرائی آپریشن کیلئے فلٹرنگ سسٹمز شامل کیے گئے ہیں۔

پاکستان کے میدان اور بجٹ کیلئے زیادہ موزوں چینی ہیلی کاپٹر "زیڈ-10 ایم ای" ہے، جبکہ اپاچی جدید ٹیکنالوجی اور جنگی تجربے میں آگے ہے۔ موجودہ حالات میں چین کا ہیلی کاپٹر پاکستان کیلئے بہتر انتخاب سمجھا جا رہا ہے۔ تاہم گزشتہ پاک بھارت جنگ میں انڈیائی فرانسیسی طیارے رافیل کی موجودگی میں خطے میں اپنی برتری کے بڑے نعرے لگائے تھے لیکن وقت آنے پر انڈیا کے تکبر کو پاش پاش ہوتے ہوئے ساری دنیا نے دیکھا کہ پاکستانی شاہینوں نے اپنے ہی علاقے سے ان کے نہ صرف پرچے اڑا دیئے بلکہ درجن سے زائد طیاروں کو تکنیکی طور پر "لاک" کر کے اپنی مہارت کا ایسا پیغام چھوڑا جس نے ساری دنیا کے دفاعی تجربہ نگاروں کو بھی مبہوت کر دیا اور بالآخر رافیل کمپنی کے سربراہ کو عالمی میڈیا کے سامنے نہ صرف اپنے طیاروں کی تباہی کو تسلیم کرنا پڑا بلکہ اس نے یہ کہہ کر مودی سرکار کا منہ بھی کالا کر دیا کہ ہم نے طیارے فروخت کئے ہیں، لڑنے کا حوصلہ نہیں۔

تکنیکی موازنہ صرف تیز رفتار اعداد و شمار نہیں؛ یہ نظریے اور سیاسی بنیادیں بھی ہیں۔ مغربی ٹیکنالوجی (امریکا، یورپ) روایتی طور پر اعلیٰ فیڈلٹی، طویل تجربہ اور جامع سپلائی چین دیتی ہے۔ چینی ٹیکنالوجی نے پچھلے ایک دہائی میں تیزی سے ترقی کی۔ قیمت میں کم، مقامی طور پر موافق اور تیزی سے اپگریڈ پذیر۔ نتیجتاً مغرب کی ٹیکنالوجی اکثر زیادہ پیچیدہ، آزمودہ اور مستقل ہوتی ہے؛ چینی میدان جنگ میں فرق ٹیکنالوجی رفتہ رفتہ کئی میدانوں میں مقابلہ کر رہی ہے، خصوصاً جب قیمت اور لوکلائزیشن کا سوال ہو۔ علاوہ ازیں امریکا اور مغرب سے اسلحہ کی خریداری کے وقت سیاسی اثرات کے ساتھ ساتھ سیاسی خود مختاری کا ایک راستہ مجروح ہونے کا اندیشہ قائم رہتا ہے جس سے ملکی استحکام کے فیصلوں پر بھی زد پڑنے کا خدشہ بدرجہ اتم موجود رہتا ہے لیکن چین کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں۔ اس لئے مغربی ٹیکنالوجی طویل آزمائش اور اعلیٰ معیار تو ضرور رکھتی ہے، مگر مہنگی ہے۔ چینی ٹیکنالوجی تیزی سے ترقی کر رہی ہے، نسبتاً سستی ہے، اور گاہک کیلئے کسٹمائزیشن میں لچکدار۔ پاکستان کیلئے چینی ماڈلز سیاسی و مالی دونوں پہلوؤں سے قابل قبول ہیں اور ترسیل کیلئے پڑوسی ملک ہمیشہ ایک بہترین انتخاب ہوتا ہے۔

ٹرمپ کی پالیسیوں اور اقتصادی اقدامات نے بھارت کو متبادل اتحادیوں کی تلاش پر مائل کیا۔ چین کے ساتھ تجارتی و دفاعی روابط اور روس سے توانائی واسلحہ خریداری کے امکانات بڑھ گئے۔ امریکا کا رد عمل غالباً دباؤ اور مذاکرات کا امتزاج ہوگا، مگر بھارت اپنی ترویجی خود مختاری برقرار رکھنے کی کوشش کرے گا۔

حالیہ سفارتی و اقتصادی پیچیدگیاں۔ جن میں ٹرمپ کی طرف سے بھارت کے خلاف عائد تعزنی اقدامات (ٹیرفس / پابندیاں) شامل ہیں۔ نے نئی کشیدگی پیدا کی ہے۔ اس طرح کی اقتصادی دباؤ پالیسیاں دہلی کو دوسری طاقتوں (چین، روس) کے قریب لے جانے کا محرک بن گئی ہیں، خاص کر جب انڈیا توانائی (روسی تیل)، دفاعی ساز و سامان، اور تجارتی مواقع کی تلاش میں بھی ہے۔ تجزیہ کاروں کا عمومی خیال ہے کہ ٹرمپ کے غیر متوقع تجارتی فیصلے بھارت۔ امریکا تعلقات میں کشیدگی کے فوری بعد مودی نے پینترہ بدلتے ہوئے روس اور چین کی بلائیں لینی شروع کر دی ہیں اور امریکی اسلحے کے متوقع خریداری کے سودے کو بھی مؤخر کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان موجودہ تناظر میں روس اور چین بھارت پر مکمل اعتبار کرنے کیلئے تیار ہوں گے؟ کیا روس دوبارہ قریب آسکتا ہے؟

روسی-ہندوستانی تعلقات تاریخی ہیں، خصوصاً دفاع اور توانائی کے شعبے میں۔ روس، جو بھارتی ہتھیاروں اور ایندھن کا بڑا ذریعہ ہے، تیزی سے دوبارہ اعتماد حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں ممالک کے اسٹریٹجک مفادات میل کھائیں۔ البتہ بھارت اپنی تزویراتی خود مختاری برقرار رکھنے کا خواہشمند رہے گا تاکہ مزید امریکی رد عمل کا مقابلہ کر سکے؛ وہ امریکا کو اب بھی یقین دلانے کیلئے درپردہ کوششیں کر رہا ہے کہ حالیہ جھکاؤ ممکنہ طور پر مختصر مدت تک ہو سکتا ہے۔

لیکن امریکا کے ممکنہ رد عمل کی دوراہیں ممکن ہیں (الف) مزید اقتصادی / فوجی دباؤ، (ب) سفارتِ بازاری اور قریبی مذاکرات کی کوشش۔ ٹرمپ انتظامیہ کی تازہ پالیسیاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ واشنگٹن دباؤ کے ذریعے پالیسیاں بدلوانا چاہتا ہے، مگر اس کے خلاف عالمی پالیسی اور کثیر الاطراف مفادات بھی کام کریں گے۔ نتیجتاً، بھارت کو ایک معتدل، مگر پریشان کن غیر یقینی میدان ملے گا جس میں وہ اپنے عزم خود مختاری کو برقرار رکھنے کیلئے یا وقتی طور پر متبادل اتحادی تلاش کرے گا۔

اس پورے مضمون کا مقصد محض خبریں جمع کرنا نہیں بلکہ ہر عسکری خبر کے پیچھے تہذیبی، فکری اور سیاسی معنی بھی ہیں۔ میں نے الفاظ کو ایسی تہذیب سے آراستہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ صرف معلومات نہ دیں بلکہ وہ دل و ضمیر کو جھنجھوڑ بھی دیں؛ مضمون میں شکوہ آمیز سادگی اور تاریخی تناظر کا مزاج بھی شامل کیا گیا ہے۔ تاکہ قاری کو معلوم ہو کہ یہ جنگ صرف ہتھیاروں کی محاذ آرائی نہیں بلکہ تصورات کی ایسی کشمکش ہے جو خود مختاری، تزویراتی اعتماد، اور اخلاقی حدود کے سوالات کا پچھندہ تھامے اپنے شکار کی تلاش میں ہے۔۔

آخر میں مختصر سفارشات برائے پالیسی و دفاع پاکستان کو الیکٹرک وارفیئر، "کاونٹر یو اے ای" ٹیکنالوجی میں تیز سرمایہ کاری کرنی چاہیے۔ علاقائی امن کی بحالی کیلئے ثالثی اور بین الاقوامی میکانزم کو فعال رکھنا لازم ہے؛ عسکری جوابات کو سیاسی راہوں کی نسبت آخری قدم بنانا چاہیے۔ دفاعی ساز و سامان کی مقامی تیاری اور اور ریورس انجینئرنگ کے ذریعے خود انحصاری کو فروغ دیا جائے، تاکہ بیرونی بندشیں ملکی دفاعی صلاحیت کو فوری طور پر متاثر نہ کریں۔ اس کے ساتھ یہ ضرور ذہن نشین رہنا چاہئے کہ امریکا کی دوستی کو ہم سے بہتر کوئی نہیں جانتا، تیل کی تلاش میں بلوچستان میں تعاون کی پیشکش پر ایک مرتبہ نہیں، سو بار سوچنا لازم ہے۔

بیت المقدس کا مقدمہ

جب انبیاء کی سر زمین، جو الوہیت کے پیغام کی امین تھی، سازشوں کے پنچے میں آجائے، جب قبلہ اول کی دیواریں خون سے رنگین ہوں، جب اذانوں کی صدایموں کی گونج میں دب جائے، تو پھر تاریخ محض کا غدی داستان نہیں رہتی بلکہ وہ ایک طویل نوحہ بن جاتی ہے۔ یہودیوں کی ریاست ایک ایسا فخر ہے جو مشرق وسطیٰ کے قلب میں پیوست کیا گیا تاکہ ہر دھڑکن غلامی میں ڈھل جائے اور ہر سانس سامراجی جبر کی زنجیر سے جکڑ دی جائے۔

اسرائیل کا قیام امت مسلمہ کی تاریخ میں ایک ایسا ناسور ہے جو ہر لمحہ لہو رستار ہوتا ہے، ہر آن امت کے اجتماعی شعور کو جھنجھوڑتا ہے۔ یہ تحریر ایک تاریخی بیانیہ نہیں، ایک بیداری کی پکار ہے؛ ایک صدائے احتجاج ہے جس میں کربلا کے درد کی جھلک بھی ہے اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار کی جھنکار بھی۔ یہودیوں کیلئے فلسطین کی مقدس سر زمین پر قومی وطن کے قیام کی حمایت کا اعلان دراصل برطانوی سامراج کی اس پالیسی کا مظہر ہے جس میں مقامی باشندوں کی زمین پر بیرونی عناصر کو بسا نا کوئی اخلاقی سوال نہ تھا، بلکہ سیاسی چالاک تھی۔ یہ اعلان نہ صرف مقامی عرب مسلمانوں بلکہ پوری اسلامی دنیا کیلئے ایک کھلا پیغام تھا کہ اب سامراجی طاقتیں آپ کی روحانی و تاریخی سر زمین پر سیاسی تجربے کریں گی، اور اس کیلئے وہ کسی شرم یا قانون کی پابند نہ ہوں گی۔ جب استعمار انسانیت کے نام پر انسانوں کی آزادی چھیننے لگے تو اس طرز فکر کو فکری دیوالیہ اور تہذیبی استبداد کہتے ہیں۔ ایسے افراد کے بارے میں قرآن تنبیہ کرتا ہے:

وَلَا تَرْكُؤْاْ اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَاَنْتُمْ مِّنَ النَّارِ ۚ وَمَالَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُوْنَ (ہود: آیت 113)

اور ظالموں کی طرف ذرا بھی جھکاؤ نہ کرو، ورنہ تمہیں آگ چھولے گی۔

اسرائیل کا قیام محض زمین کی حد بندی کا معاملہ نہ تھا، یہ تہذیبوں کے تصادم، مذہبی نفسیات، سامراجی عزائم اور سیاسی مفادات کا ایک ایسا فسانہ عبرت ہے جسے تاریخ نے خونچکاں الفاظ میں قلم بند کیا۔ اسرائیل کا قیام ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا، جس کے پس پردہ صدیوں پر محیط منصوبہ بندی، سامراجی سازشیں اور مذہبی تعصبات پنہاں تھے۔ 1948ء میں اسرائیل کا قیام کسی اچانک انکشاف کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کے پیچھے برسوں کی خفیہ تدبیریں، استعماری وعدے، اور نسلی برتری کے زعم کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ یہ قیام محض سیاسی مفاد نہیں، بلکہ اسلامی امت کے قلب میں ایک خنجر پیوست کرنے کے مترادف تھا۔ فلسطین، جو ہمیشہ انبیاء کی جائے پناہ رہا، صیہونی استعمار کے رحم و کرم پر کر دیا گیا۔

وہ 38 الفاظ کی مختصر مگر زہر آلود سحر انگیز تحریر "اعلان بالفور" جس نے خطے میں قوموں کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ ایک پوری قوم کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا۔ برطانوی وزیر خارجہ آر تھر بالفور کا یہ وعدہ درحقیقت ایک سامراجی منصوبہ تھا جو خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالم اسلام کو مزید تقسیم در تقسیم میں ڈالنے کی سازش تھی۔ اس خط نے دین کے نام پر ظلم کی تائید اور تاریخ میں نفاق کا ایسا بیج بو دیا جو آج ظلم و ستم اور درندگی کا ایک ایسا مسلم کش تناور درخت بن گیا ہے جس کی جڑوں میں اب تک لاکھوں افراد کا خون ناحق شامل ہو چکا ہے لیکن اب تک اس کی انتہائی مکاری اور منافقت کے ساتھ آبیاری کی جا رہی ہے۔

2 نومبر 1917ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ آر تھر جیمز بالفور نے روتھشیلڈ خاندان کو لکھا گیا ایک مختصر خط، جسے "اعلان بالفور" کہا جاتا ہے، عالمی سیاست میں ایک زلزلہ لے آیا۔ اس خط کا مکمل متن آج بھی محفوظ ہے جس میں کہا گیا:

(2 نومبر 1917ء، وزارت خارجہ، برطانیہ)

بخد مت عالی جناب لارڈ روتھشاٹلڈ،

(نمائندہ برطانوی یہودی برادری)

محترم!

مجھے یہ امر مسرت سے لبریز ہے کہ میں آپ کے توسط سے یہ مکتوب آپ کی خدمت میں پیش کروں جو حکومت برطانیہ کی جانب سے یہودی صیہونی تمناؤں سے ہمدردی کا مظہر ہے۔ یہ وہ بیان ہے جسے کابینہ نے باقاعدہ منظوری دے کر آپ کے سامنے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ اس عظیم الشان سلطنت (برطانیہ) کی حکومت فلسطین میں یہودی قوم کیلئے ایک قومی وطن کے قیام کیلئے مخلصانہ رغبت رکھتی ہے، اور اس مقصد کے حصول کیلئے ہر ممکن کوشش کرے گی۔ البتہ یہ امر واضح طور پر مد نظر رہے گا کہ فلسطین میں موجود غیر یہودی باشندوں (یعنی عربوں) کے شہری و مذہبی حقوق میں کوئی ایسی مداخلت نہیں کی جائے گی جو انہیں نقصان پہنچائے۔ اسی طرح دیگر ممالک میں آباد یہودیوں کے شہری و سیاسی حقوق پر بھی کوئی اثر نہ پڑے۔ میں تیر دل سے امید کرتا ہوں کہ آپ اس

اعلامیہ کو صیہونی فیڈریشن تک پہنچادیں گے تاکہ وہ اس پیغام کی روشنی میں اپنی آئندہ راہ متعین کریں۔

خیر اندیش،

آرتھر جیمز بالفور

(وزیر خارجہ، حکومت برطانیہ)

2 نومبر 1917ء کو برطانوی وزیر خارجہ لارڈ آرتھر جیمز بالفور کا یہ مختصر سا مکتوب عالمی سیاست کے نقشے پر وہ لکیر کھینچ گیا جس نے نہ صرف مشرق وسطیٰ کی تاریخ کو بلکہ امت مسلمہ کی وحدت کو بھی دہلا کر رکھ دیا۔ یہ محض ایک خط نہ تھا بلکہ تہذیبوں کی تقدیر، اقوام کی خود مختاری، اور عدل و انصاف کی روح کے خلاف سامراجی استبداد کا علامتی آغاز تھا۔ اس اعلان کو اگر محض تاریخی دستاویز کے طور پر پڑھا جائے تو شاید اس کے زہر کو سمجھنا ممکن نہ ہو لیکن اگر اسے مسلم دنیا کے دل سے گزرتے ہوئے محسوس کیا جائے تو یہ ایک ایسا خنجر ہے جو صدیوں بعد بھی تازہ زخم دیتا ہے۔

بالفور کے ان 38 الفاظ کو پڑھ کر دل تاریخ کے آہوں بھرے دفتر میں داخل ہو جاتا ہے جہاں الفاظ، تلواروں سے زیادہ تیز اور فیصلوں سے زیادہ کاری ہوتے ہیں۔ یہ محض ہمدردی کا اعلان نہیں، بلکہ ایک پوری ملت کیلئے جغرافیائی بے وطنی کا پروانہ تھا۔ برطانیہ، جو خود کو مہذب دنیا کا امام گردانتا تھا، نے ایک ایسی سرزمین جو نہ اس کی ملکیت تھی نہ اس پر قانونی دعویٰ لیکن کیسے قوم یہودی کیلئے وطن قائم کرنے کا عندیہ دے دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بغیر مالک سے مشورہ کیے قفل کی چابی کسی کو ہدیہ کر دے۔

یہ اعلان دراصل مغربی سامراج کا مذہب کی آڑ میں مفادات کا سودا گر بننے کا آغاز تھا۔ اس اعلان نے عالمی سیاست کو مذہبی و لسانی بنیادوں پر بانٹ کر تہذیبی تصادم کی بنیاد رکھ دی۔ یہ مکتوب، دراصل ایک تہذیبی بددیانتی کا ابتدائی باب تھا، جہاں اپنے ظالمانہ مفادات کیلئے ایک قوم کی تمناؤں کا خون کسی اور قوم کے خون سے کیا گیا۔ یہ خط بظاہر خیر سگالی کا پیغام تھا لیکن درحقیقت یہ ایک ملت کے وجود کو مٹانے کی سند اور دوسری ملت کے سامراجی خواہوں کی تکمیل کی دستاویز تھی۔ برطانوی سامراج نے عثمانی خلافت کے زوال کے بعد فلسطین کو اپنے زیر اثر لاکر صیہونی منصوبوں کی آبیاری شروع کی۔

یہ خط دراصل برطانیہ کی سامراجی سیاست، صہیونی تحریک کی سرگرم لابی اور پہلی جنگ عظیم میں اتحادیوں کی پوزیشن سے جڑا ہوا ہے۔ تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اس وقت عثمانی سلطنت زوال پذیر تھی، اور برطانیہ مستقبل میں مشرق وسطیٰ کو اپنی کالونیوں میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ برطانیہ چاہتا تھا کہ یہودیوں کی حمایت حاصل کرے، خاص طور پر امریکا میں موجود بااثر یہودی حلقوں کی، تاکہ جنگ میں حمایت مضبوط ہو۔

اس خط کی یہ سطریں بظاہر اخلاقیات سے معمور ہیں، لیکن درحقیقت منافقت کی دبیز چادر ہیں جو سامراجی عریانی کو چھپانے میں ناکام ہیں۔ برطانیہ کی اس گارنٹی کو وقت نے کھوکھلے الفاظ کا ملبہ ثابت کر دیا۔ نہ تو فلسطینیوں کے حقوق محفوظ رہے، نہ ان کا وقار، نہ ان کا وطن۔ یہ ضمانت سیاسی تسلی کے سوا کچھ نہ تھی تاکہ عالمی ضمیر کو کچھ دیر کیلئے سلا دیا جائے۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں یہ ایک ایسی اخلاقی تدبیر تھی جو چالاکی سے فتنہ باطن کو تقدس کے پردے میں چھپا کر پیش کرتی ہے؛ یہودی کیلئے وطن اور اہل فلسطین کیلئے صبر، قناعت، اور گمنامی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وعدے کی روشنی میں جو بھی سیاسی روشنی نکلی، اس نے صرف یہودی راہوں کو روشن کیا اور اہل عرب کی بستیوں کو تاریک کر دیا۔

فلسطین کے مقامی باشندوں کے مذہبی و شہری حقوق کی مشروط گارنٹی کے اس اعلان میں جن "غیر یہودی باشندوں" کا ذکر ہے، وہی فلسطین کے اصل وارث ہیں لیکن ان کے حقوق کا ذکر بھی ایک "مشروط" سانچے میں پیش کیا گیا، گویا وہ اصل فریق ہی نہ ہوں، بلکہ محض سائے ہوں جنہیں دھوپ سے بچانے کی فرضی یقین دہانی کر دی گئی ہو۔ یہ جملہ ایک ایسے منافقانہ طرز فکر کا آئینہ دار ہے جس میں طاقتور کی مرضی قانون، انصاف اور اخلاقیات سے بالا سمجھی جاتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ عدل نہیں بلکہ مکر ہے۔ یہ تحفظ نہیں بلکہ دھوکہ ہے۔ اگر زمین کسی قوم کی ہے تو اس کے مستقبل پر فیصلے کا حق بھی اسی کو ہونا چاہیے، نہ کہ کسی سامراجی ثالث کو۔

اعلان بالفور میں یہودیوں کیلئے جو بین الاقوامی حقوق کی ضمانت دی گئی، وہ درحقیقت انہیں ایک خاص نسلی و مذہبی استثناء دینے کی کوشش تھی، جو پوری دنیا میں ایک خطرناک نظیر بن گئی۔ یہ امر بذات خود اس اعلان کے دہرے معیار، سامراجی تعصب، اور مخصوص عالمی ایجنڈے کا پتہ دیتا ہے۔ ایک طرف یہودیوں کے حقوق پر غیر مشروط یقین دہانی، اور دوسری طرف فلسطینی مسلمانوں کیلئے مشروط، مبہم اور قابل تاویل جملے، یہ سب ایک منظم منصوبے کی چغلی کھاتے ہیں۔ یہ وہ اعلان تھا جس میں انصاف کے لباس میں نفاق چھپا ہوا تھا، تہذیب کی آڑ میں جارحیت بول رہی تھی، اور ہمدردی کے پردے میں مفاد پرستی کا ناچ تھا۔

اس نکتے میں ایک ایسا فلسفیانہ تضاد پنہاں ہے جو صرف مغرب کی منافقت زدہ سیاست ہی پیدا کر سکتی ہے۔ فلسطینی عربوں کے حقوق کی بات مشروط طور پر کی گئی، لیکن مغربی ممالک میں یہودیوں کے سیاسی حقوق کو یقینی بنانے کا اعلان بلا شرط کیا گیا۔ یہ اعلان دراصل ایک اعلیٰ نسل (یہود) کو عالمی درجہ عطا کرنے کی کوشش تھی، جبکہ دوسری طرف فلسطینیوں کو صرف سہنے کی ضمانت دی گئی۔ اگر اسے لطیف نثر میں لکھا جائے تو شاید یوں ہو کہ یہ عجیب اعلان ہے! گویا ایک طرف شعلوں کا وعدہ ہے، اور دوسری طرف بادلوں کی تسلی ہے۔ یہودیوں کیلئے آسودگی کی چھتری، اور اہل فلسطین کیلئے آندھی کی آغوش اس نقطے میں مغرب کی وہ نسلی برتری کھل کر ظاہر ہوتی ہے جس نے دنیا کو دوسری جنگ عظیم سے پہلے بھی جلایا اور بعد میں بھی۔ آج بھی یہی دہرا معیار اقوام متحدہ کی پالیسیوں، انسانی حقوق کے قوانین، اور میڈیا کے بیانیے میں واضح دکھائی دیتا ہے۔

دلچسپ تضاد یہ ہے کہ نہ صرف مسلمان، بلکہ خود بہت سے یہودی بھی اسرائیل کے قیام کو ایک مذہبی بغاوت سمجھتے ہیں۔ ہر یہودی اسرائیل کے قیام کا حامی نہیں ہے، "نیٹری کارتا" جیسا فرقہ اسرائیل کو "خدائی حکم کی خلاف ورزی" اور ایک مذہبی بغاوت تصور کرتے ہیں۔ ان کے مطابق حقیقی یہودی تب تک وطن قائم نہیں کر سکتے جب تک ان کے عقیدے کے مطابق میخانہ آئے، یہودیوں کو کوئی ریاست قائم کرنے کی اجازت نہیں لیکن سیاسی صیہونیت نے مذہب کو آلہ کار بنا کر دنیا کو یہ باور کرایا کہ اسرائیل کا قیام یہودیت کا مذہبی تقاضا ہے۔ اس طرح صیہونی سیاسی تحریک نے مذہب کو بھی اپنے سیاسی مفاد کا اسیر بنالیا ہے۔

یورپ میں یہودیوں کی نکاسی کو محض تعصب کہنا تاریخ سے ناانصافی ہوگی۔ صدیوں تک انہوں نے معاشی اجارہ داری، مالی سود خوری، اور خفیہ تنظیموں کے ذریعے ریاستی ڈھانچوں کو اندر سے کھوکھلا کرنے کی کوشش کی۔ جرمنی، فرانس، پولینڈ اور روس جیسے ممالک میں یہودیوں کی مسلسل بے دخلی محض تعصب کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اکثر مقامات پر ان کی مالیاتی اجارہ داری، خفیہ ریشہ دوانیاں، اور ثقافتی تضادم نے مقامی اکثریتی اقوام کو برا بھینٹہ کیا۔ گویا ہر اخراج کا پس منظر ایک پیچیدہ سیاسی و تہذیبی کشمکش رکھتا ہے۔ یہ وہی فتنہ پرور سوچ تھی جس کا قرآن کریم میں بارہا ذکر آیا—

وَقَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ فِي الْكِتَابِ لِنُفْسِدَنَّ فِي الْأَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَنَعْلَنَّٰ غُلُوًّا كَبِيرًا۔

اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہہ دیا تھا کہ زمین میں دو دفعہ فساد مچاؤ گے اور بڑی سرکشی کرو گے۔ (الاسراء: 4)

یہودیوں نے خلافت عثمانیہ سے فلسطین کے بدلے قرض اتارنے کا سودا کرنا چاہا، جب عثمانی خلافت قرضوں کے بوجھ تلے دب رہی تھی، تب یہودی سرمایہ داروں نے فلسطین میں وطن کے بدلے قرض اتارنے کی پیش کش کی۔ مگر سلطان عبدالحمید ثانی نے دو ٹوک انکار کر کے تاریخ میں غیرت ایمانی کا ایک روشن باب رقم کرتے ہوئے وہ تاریخی جملہ کہا: "میں اپنی ریاست کو اس طرح نہیں بیچ سکتا جیسے کوئی دودھ بیچنے والا اپنی بالٹی بیچ دیتا ہے اور میں اپنے جسم کے زخموں پر صیہونی نمک نہیں چھڑکوں گا۔" یہ انکار فقط سیاسی نہیں، بلکہ دینی غیرت اور ایمان کا مظہر تھا۔ یہ پیشکش تردید کے طومار میں لپیٹ دی گئی اور خلافت نے آخری دم تک فلسطین کی حرمت کا سودا نہ کیا۔

کیا اسرائیل محض ایک قوم کی پناہ گاہ ہے؟ یا یہ سامران کا ایک مستقل قلعہ ہے جو تیل سے لبریز سرزمین پر پہرہ داری کا فریضہ سرانجام دیتا ہے؟ اسرائیل مشرق وسطیٰ میں امریکا اور مغرب کا مستقل عسکری اڈہ ہے۔ یہاں نہ تو امن مطلوب ہے نہ ہی انصاف؛ بلاشبہ، اسرائیل کا وجود خطے میں امریکی عسکری و تجارتی مفادات کا نگہبان ہے بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ اسرائیل کو بطور کرائے کے سپاہی استعمال کر کے مسلمانوں کو آپس میں لڑایا جائے اور خطے کے وسائل کو لوٹا جائے۔ ایک ایسا دامن چوکیدار جو مشرق وسطیٰ میں کسی بھی ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

Foreign Office,
November 2nd, 1917.

Dear Lord Rothschild,

I have much pleasure in conveying to you, on behalf of His Majesty's Government, the following declaration of sympathy with Jewish Zionist aspirations which has been submitted to, and approved by, the Cabinet.

"His Majesty's Government view with favour the establishment in Palestine of a national home for the Jewish people, and will use their best endeavours to facilitate the achievement of this object, it being clearly understood that nothing shall be done which may prejudice the civil and religious rights of existing non-Jewish communities in Palestine, or the rights and political status enjoyed by Jews in any other country."

I should be grateful if you would bring this declaration to the knowledge of the Zionist Federation.

Am J. B. A. J.

اسرائیل کے ذریعے مغرب نے اس خطے میں نہ صرف اپنے عسکری ساز و سامان کی منڈی قائم کی بلکہ اپنی دفاعی صنعت کے مستقل صارف بھی تلاش کیے۔ یہودی ریاست نے دنیا کی سب سے بڑی اسلحہ کی منڈیوں سے معاہدے کر کے مشرق وسطیٰ کو مستقل جنگ کا میدان بنا دیا۔ جنگیں برپا ہوئیں، معاہدے ٹوٹے، اور ہر سمت خون بہتا رہا۔ مگر اسلحے کی منڈی ہمیشہ گرم رہی۔ مسلمان ریاستوں

کو ڈرایا گیا، دبایا گیا، اور مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی دولت مغربی دفاعی صنعتوں کے قدموں میں نچھاور کر دیں۔

یہودی لابیوں خصوصاً امریکن اسرائیل پبلک افیئرس کمیٹی جیسی تنظیمیں امریکی سیاست کو اپنی گرفت میں لیے بیٹھی ہیں، میڈیا کنٹرول، بینکاری نظام، عدلیہ اور ہالی ووڈ جیسے میدانوں میں اس حد تک سرایت کر چکی ہیں کہ امریکی کانگریس اور یورپی پارلیمنٹ بھی ان کے اشاروں پر چلنے لگے ہیں۔ اب صورتحال یہ ہے کہ امریکا اسرائیل کو سالانہ اربوں ڈالر زر کی امداد دیتا ہے اور اس کے بدلے میں پالیسی سازی میں بھی اسرائیل کی رائے غالب آتی ہے۔ ہر شعبہ یہودی لابیوں کے زیر اثر ہے۔ اب وہ وقت آچکا ہے کہ اسرائیل نہ صرف خود مختار ریاستوں کو بلیک میل کرتا ہے بلکہ اقوام متحدہ جیسے اداروں کو بھی محض ایک کٹھ پتلی بنا چکا ہے۔

1956ء میں جب اسرائیل، برطانیہ اور فرانس نے مصر پر حملہ کیا تو سویز بحران وہ واحد لمحہ تھا جب امریکی صدر آئزن ہاور نے دباؤ ڈال کر اسرائیل کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ یہ اس وقت ممکن ہوا کیونکہ تب امریکا خود مختار اور اس کی سامراجی خود اعتمادی مضبوط اور صیہونی گرفت سے آزاد تھی۔ آج حالات یکسر بدل چکے ہیں، اب فیصلہ کن قوتیں نیویارک اور واشنگٹن کی لابیوں میں بیٹھتی ہیں۔ آج وہ صیہونی لابیوں کا قیدی ہے۔

کیا اسرائیل کی موجودگی ایک فوبیا ہے جسے خلیجی حکمرانوں پر مسلط کر کے ان کی خود مختاری کو دبوچا گیا؟ اسرائیل کو ایک بھوت بنا کر خلیجی حکومتوں کو امریکا کے زیر نگیں رکھا گیا۔ ہر نیا معاہدہ، ہر دفاعی خریداری، اسی خوف کا نتیجہ ہے۔ یہ نوراکشتی دراصل ایک سوچا سمجھا کھیل ہے جس میں امریکا بظاہر اسرائیل کو قابو میں رکھتا دکھائی دیتا ہے مگر دراصل دونوں مل کر عرب دنیا کو اپنے مفادات کے تابع رکھتے ہیں تاکہ امت مسلمہ بیدار نہ ہو اور وہ ہمیشہ غیر ملکی سہاروں پر انحصار کرتی رہے۔

چین نے اپنی خاموش مگر ٹھوس معاشی حکمت عملی سے مشرق وسطیٰ میں نئی صف بندی شروع کر دی ہے۔ چین کی ابھرتی ہوئی معاشی قوت نے خلیجی ممالک کو ایک نئے افق کی جانب متوجہ کیا ہے۔ امریکا کی مسلسل ڈکٹیشن کے برخلاف، چین کی پالیسی "عدم مداخلت اور باہمی مفاد" پر مبنی ہے۔ خلیجی ممالک اب امریکی کنٹرول سے نالاں ہو کر چین کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ چینی سرمایہ کاری، سستے قرضے اور عدم مداخلت کی پالیسی نے انہیں متوجہ کیا ہے۔ یہ ایک نیا توازن ہے جس سے مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

یمن کے مسئلے پر ایران و سعودی عرب کے درمیان چین کی ثالثی ایک تاریخی کامیابی ہے۔ یمن میں سعودی عرب اور ایران کی مصالحت، جو چین کی ثالثی سے ممکن ہوئی، اس غیر معمولی عمل نے چین کو ایک غیر جانبدار اور قابل اعتماد قوت کے طور پر منوایا ہے۔ اس کے نتیجے میں خطے میں امریکا کی گرفت کمزور پڑ رہی ہے اس عمل نے چین کو نہ صرف ایک معاشی پارٹنر بلکہ ایک سفارتی طاقت کے طور پر منوایا ہے۔ امریکا کیلئے یہ صورتحال خطرے کی گھنٹی ہے، جس پر وہ مستقبل میں کوئی جوابی کارروائی ضرور کرے گا۔

ٹرمپ کے دورہ سعودی عرب میں 400 ارب ڈالر سے زائد کے معاہدے محض معاشی لین دین نہ تھے بلکہ امریکی دباؤ کی ایک اعلیٰ مثال تھے۔ ان معاہدوں کے ذریعے امریکا نے خلیجی خزانے کو اپنے مفادات کیلئے استعمال کیا۔ اس سرمایہ کاری کا مقصد خلیجی دولت کو امریکی معیشت کی سانسوں کا آکسیجن بنانا تھا۔ یہ معاہدے سیاسی توازن کو بگاڑنے کی ایک چال تھے۔

ابراہیمی معاہدے ایک نیاباب ہیں جہاں اسلامی شناخت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اسرائیل کو مشرق وسطیٰ میں مرکزی حیثیت دی جا رہی ہے۔ سعودی عرب تاحال اسرائیل کو باضابطہ تسلیم نہیں کر پایا، لیکن ابراہیمی معاہدے کی روشنی میں یہ امکان بڑھتا جا رہا ہے اور اسرائیل کو تسلیم کرنے کے امکانات اب کسی حد تک واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ پس پردہ مذاکرات اور دباؤ کی سیاست اسی جانب اشارہ کر رہی ہے۔

غزہ، جہاں آج بھی بچوں کی لاشیں کھلونوں سے زیادہ گرتی ہیں، کو ایک سیاحتی جنت بنانے کا خواب دراصل فلسطینی مزاحمت کو ہمیشہ کیلئے دفن کرنے کا منصوبہ ہے۔ حماس کو غیر مسلح کرنے اور غزہ کو فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کرنے کی کوششیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ حالیہ اطلاعات کے مطابق خلیجی طاقتیں حماس کو غیر مسلح کرنے اور غزہ کو فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ بعد ازاں، امریکی منصوبے کے تحت غزہ کو ایک "سیاحتی جنت" میں بدلنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جہاں خون کی جگہ خوشبو ہو مگر وہ خوشبو فلسطینی لاشوں کے تعفن سے ابھرے۔

کیا یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ اسرائیل، جو خود ایک مکمل ایٹمی قوت ہے اور جس کے پاس دیوناکا ایٹمی مرکز کئی دہائیوں سے فعال ہے، اسے آج تک کسی بین الاقوامی ادارے نے جواب دہ نہیں بنایا؟ امریکانے، نہ یورپ نے، اور نہ اقوام متحدہ نے۔ یہ وہی اسرائیل ہے جس نے 1981ء میں عراق کے اوسیراک ایٹمی ری ایکٹر پر حملہ کر کے بین الاقوامی قوانین کو پاؤں تلے روند ڈالا، مگر مغرب نے اسے دہشتگردی قرار دینے کے بجائے "احتیاطی کارروائی" کا لقب دے دیا۔ ایران جب اپنے ایٹمی پروگرام کو پر امن توانائی کے مقصد کیلئے بڑھاتا ہے تو اس پر پابندیاں، حملے اور خفیہ کارروائیاں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ یہ دہر امعیار اسلام دشمنی کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

چین آج خلیجی ممالک خصوصاً سعودی عرب، ایران، اور امارات کے ساتھ مضبوط تجارتی رشتے قائم کر چکا ہے۔ چین اپنی توانائی کی ضروریات کیلئے سعودی عرب سے یومیہ 1.76 ملین بیرل تیل خریدتا ہے، جبکہ ایران پر امریکی پابندیاں ہونے کے باوجود چینی کمپنیاں ایرانی تیل کی خریداری جاری رکھے ہوئے ہیں، اکثر بالواسطہ طریقوں سے۔ بندرعباس کی بندرگاہ، چابہار کا اشتراک، اور مشترکہ انرجی وٹرانسپورٹ منصوبے اس گہرے اتحاد کے مظہر ہیں۔

جب حالیہ برسوں میں ایران اور اسرائیل کے درمیان خفیہ اور نیم علانیہ جنگ کے مظاہر سامنے آئے، تو چین اور روس کی غیر معمولی خاموشی نے عالمی تجزیہ نگاروں کو چو نکا دیا۔ اس خاموشی کے پیچھے ایک جانب ان کی مشرق وسطیٰ میں توازن قوت کی پالیسی ہے، تو دوسری جانب تجارتی مفادات کی مجبوری۔ چین کسی بھی فریق کو ناراض کیے بغیر اپنی معاشی رسائی برقرار رکھنا چاہتا ہے جبکہ روس یوکرین جنگ میں مصروف ہو کر کھل کر اظہار رائے سے گریزاں ہے۔

بادوثوق ذرائع کے مطابق، امریکانے ایران اور اسرائیل کے درمیان کشیدگی کم کرانے کیلئے پاکستان کو ایک نرمی آور ثالث کے طور پر متحرک کیا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں توازن، اسلامی دنیا میں اس کی حیثیت، اور ایران و عرب دنیا دونوں سے تعلقات اسے اس کردار کیلئے موزوں بناتے ہیں۔ تاہم، پاکستان کا یہ کردار غیر اعلانیہ اور خفیہ سفارتکاری کی حد تک محدود رہا۔

حالیہ دنوں ٹرمپ نے بھارت پر 25 فیصد درآمدی ٹیکس عائد کر کے اور اسے روس و چین سے بڑے عسکری و معدنیاتی معاہدوں پر تنبیہ دے کر یہ واضح کر دیا کہ امریکا بھارت کی دورخی پالیسی سے خائف ہے۔ ایک طرف بھارت خود کو امریکا کا اسٹریٹجک پارٹنر کہتا ہے، دوسری جانب روس سے ایس 400

دفاعی نظام خریدتا ہے اور چین سے نایاب معدنیات کی درآمدات میں ملوث ہے۔ یہ وہی بھارت ہے جو عالمی اسٹیج پر امریکی حلیف بنتا ہے مگر میدانِ عمل میں مشرقی طاقتوں کا خاموش ہمنوا ہے۔ یہ تضاد اب امریکا کیلئے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے اور ٹرمپ کی طرف سے بھارت پر 25% ٹیrf اور مزید جرمانہ کی خبر بھارتی معیشت پر بجلی بن کر گری ہے اور مستقبل قریب میں بھارت کو اس کا سفر اتنی خمیازہ بھگتنا پڑ سکتا ہے۔ خود انڈیا میں مودی کو منہ چھپانا مشکل ہو گیا ہے۔

یہ صرف تاریخ نہیں، یہ ہماری اجتماعی نااہلی اور بے حسی کا نوحہ ہے۔ اسرائیل محض ایک ریاست نہیں، یہ استعماری ذہنیت کا مظہر، مذہبی منافقت کا استعارہ اور سیاسی بربریت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ امتِ مسلمہ فکری غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر ایک نئے شعور کے ساتھ بیدار ہو، ورنہ تاریخ ایک بار پھر اپنے صفحات پر ہمارے زوال کے ماتم کو رقم کرے گی۔

اے اہل ایمان! کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کہ اللہ تمہیں دشمنوں کے خلاف بیداری کا حکم دیتا ہے؟ کیا بیت المقدس کی مٹی تمہیں آواز نہیں دیتی؟ وقت آچکا ہے کہ ہم خوابِ غفلت سے جاگیں۔ یہ تحریر محض تاریخ کا بیان نہیں، ایک اذان ہے۔ بیداری کی اذان۔ وہ اذان جو دلوں کو جھنجھوڑ دے، وہ اذان جو غلامی کے بت توڑ دے، اور وہ اذان جو امت کو پھر سے ایک ملتِ واحدہ میں بدل دے۔ ورنہ ہمارا انجام بھی ان قوموں جیسا ہو گا جن کے بارے میں رب نے فرمایا: كَلَّمَا رَاٰهُ اَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ۔ (الحج: 22)

جب کبھی وہ گھبرا کر جہنم سے نکلنے کی کوشش کریں گے پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے کہ چکھو اب جلنے کی سزا کا مزہ۔ ۵

اعلانِ بالفور وہ قلمی خنجر تھا جس سے فلسطین کی روح کو چیر دیا گیا۔ یہ اعلان محض سامراجی ہمدردی نہیں، بلکہ ایک ایسا تاریخی شرمناک سودا تھا جو ایک قوم کی سرزمین کو دوسری قوم کی بے وطنی کا تادان بنا کر پیش کیا گیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اگر قرآن کی زبان مستعار لی جائے تو شاید یہی کافی ہو:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ۔ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُونَ وَلَكِنْ لَا يَشْعُرُونَ (البقرہ: 11-12)

جب کبھی ان سے کہا گیا کہ زمین میں فساد برپا نہ کرو، تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں مگر انہیں شعور نہیں۔

اعلانِ بالفور وہ دستاویز ہے جس نے ایک پوری ملت کے زخم کو کاغذ پر لکھا، اور اسے مہذب دنیا کا فیصلہ قرار دیا۔ یہ اعلان نہ صرف فلسطینی مسلمانوں کی سرزمین پر غاصبانہ قبضے کی بنیاد بنا، بلکہ یہ مسلم دنیا کے سیاسی زوال، تہذیبی انحطاط اور عالمی استبداد کی علامت بھی ہے۔ آج ایک صدی گزرنے کے باوجود اس اعلان کی بازگشت نہ صرف غزہ کے بلے میں سنائی دیتی ہے، بلکہ القدس کی فضا میں بھی اس کے سائے محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اگر عالمی انصاف کو واقعی زندہ رکھنا ہے تو اعلانِ بالفور کو ایک تاریخی غلطی کے طور پر تسلیم کرنا ہو گا، اور اس کے مضمرات سے امتِ مسلمہ کو بیدار ہو کر نکالنا ہو گا، ورنہ وہی تاریخ دوبارہ دہرائی جائے گی جو آج بھی ہمارے زخموں میں گونجتی ہے۔

مَنْ أَعَانَ عَلَى قَتْلِ مُسْلِمٍ بِسَطْرِ كَلِمَةٍ، لَقِيَ اللَّهَ مَكْثُوبًا بَيْنَ عَيْنَيْهِ: آيِسٌ مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ۔ حدیث نبوی، سنن ابن ماجہ: 2620

جو کسی مسلمان کے قتل پر زبان یا اشارے سے بھی مدد کرے، قیامت کے دن اس کی پیشانی پر لکھا ہو گا کہ یہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہے۔

وطن کی شہ رگ کا سودا نہیں ہوگا

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ: اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلہ کیلئے مہیا رکھو (الانفال: 60)۔ یہ محض قرآنی حکم نہیں، بلکہ ہر اس قوم کیلئے ابدی پیغام ہے جو اپنی عزت و بقا کی قیمت پہچانتی ہے۔ دنیا کی سیاست آج ایک ایسے موڑ پر آکھڑی ہے جہاں قوموں کی تقدیریں صرف جنگ کے میدان میں نہیں بلکہ سفارت کے ایوانوں، معیشت کے زینوں اور اتحاد کی فسیلوں پر کی فسیلوں پر لکھی جا رہی ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب برصغیر کی فضا میں ایک نیا طوفان اُٹھ رہا ہے۔ اور یہ طوفان محض ہوا کا جھونکا نہیں، بلکہ وہ — آندھی ہے جو کمزور خیموں کو اکھاڑ پھینکتی ہے اور مضبوط قلعوں کی دیواروں کو مزید سخت کر دیتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب قومیں اپنی قوت کے سرچشموں کو بیدار کرتی ہیں، تو دنیا کی سب سے بڑی سلطنتیں بھی ان کے قدموں میں جھک جاتی ہیں۔

دورِ حاضر کے ہنگامہ خیز منظر نامے میں، جہاں قوموں کی تقدیریں ایک لمحے میں پلٹ جاتی ہیں اور جہاں سفارت کے دبیز پردوں کے پیچھے معرکے لڑے جاتے ہیں، ایک تازہ باب رقم ہوا ہے۔ اس باب کے مرکزی کردار وہ مرد میدان ہیں جن کی نگاہ زمان و مکان کی قید سے آزاد اور جن کے قدم حالات کی دھند میں بھی سمت پہچانتے ہیں۔

اسی منظر نامے میں حالیہ دنوں ایک نیا باب کھلا ہے۔ دہلی کی فضاؤں میں غیر معمولی ارتعاش اُس وقت محسوس ہوا جب خود بھارت کے عسکری ایوانوں سے یہ صدا اٹھی کہ ملک کی حفاظت صرف بندوق اور بارود کا کھیل اور تلوار کی دھار نہیں، بلکہ معیشت کی مضبوطی، سیاست کی بصیرت اور عوام کا اعتماد بھی اس کے قلعے کی فسیلیں ہیں۔ نئی دہلی میں طوفان اس وقت اٹھا جب خود بھارت کے عسکری حلقوں سے ایک غیر معمولی صدا بلند ہوئی۔ دہلی کے عسکری حلقوں سے ابھرنے والی یہ صدا معمولی نہیں۔ انڈین فوج کے سابق اور موجودہ جرنیلوں نے صاف کہہ دیا کہ ملک کی سلامتی محض توپ اور تلوار کا وظیفہ نہیں، بلکہ سیاست و معیشت کی ہم آہنگی اور عوامی اعتماد کا مروجہ منہ منت ہے۔

یہ پیغام مودی سرکار کے ان ایوانوں تک جا پہنچا جہاں اقتدار کا غرور حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ جملہ سیدھا مودی حکومت کے سنگین کانوں تک پہنچا۔ وہ حکومت جو اپنے غرورِ اقتدار کے نشے میں اپنی ہی صفوں کی صدا بھی برداشت نہیں کر پاتی۔ یہ تنبیہ سیدھی مودی کے دربار تک پہنچی، جہاں سیاسی خود پسندی اور تکبر کا غبار چھٹنے کا نام نہیں لیتا۔

اسی دوران، پاکستان کے سپہ سالار فیلڈ مارشل جنرل عاصم منیر، ڈیڑھ ماہ میں اپنا دوسرا دورہ امریکا مکمل کر کے لوٹے ہیں۔ یہ محض ملاقاتوں کا سفر نہ تھا۔ یہ تعلقات کی از سر نو تعمیر کا اعلان تھا۔ اس سفر نے دونوں ملکوں کے تعلقات کی کاپیلٹ دینے والے اشارے دیے ہیں۔ امریکی عسکری مرکز سینٹ کام کے ٹمپاہیڈ کوارٹر میں کمانڈر کی تبدیلی کی اعلیٰ تقریب میں جنرل منیر کی بطور مہمان خصوصی شرکت، ایک نئی فوجی قربت اور تعاون کی لہر کا مظہر تھی۔ یہ دورہ محض عسکری سلام و کلام نہیں تھا، بلکہ ایک نئے اعتماد، نئے رابطے اور نئی راہوں کا اشاریہ تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان بڑھتے اعتماد کی ایک علامت تھی۔ وہاں جنرل مائیکل کوریلا نے پاکستانی جنرل کے کردار کو خراج تحسین پیش کیا، جنہوں نے پاک-امریکا عسکری روابط میں نئی جان ڈالی۔ جنرل عاصم منیر کا بطور خصوصی مہمان، استقبال اور جنرل مائیکل کوریلا کا خراج تحسین پیش کرنا اس بات کا اعلان تھا کہ پاکستان عالمی بساط پر ایک مضبوط، باوقار اور متحرک کردار ادا کر رہا ہے۔

"وَلَا تَهْنُؤُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ" یقین رکھو! نہ کمزوری دکھاؤ، نہ غم کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو

بلوم برگ کی رپورٹ میں اس دورے کو محض عسکری ملاقات نہیں بلکہ ایک "تعمیر نو" کے سفر کانسنگ میل قرار دیا گیا ہے۔ بوم برگ کی رپورٹ نے اس ملاقات کو تعلقات کی تعمیر نو کانسنگ میل قرار دیا، اور یہ دورے پاک-امریکا تعلقات کو ایک پائیدار اور مثبت سمت میں ڈالنے کیلئے ہیں۔ بوم برگ کی رپورٹ کے مطابق کہ یہ دورہ ایک نئی جہت کانسنگ میل ہے۔ یہ تعلقات کو پائیدار اور مثبت سمت میں ڈالنے کی کوشش ہیں۔ اور مستقبل میں ممکنہ تجارتی معاہدے پاکستان کی معیشت کیلئے ایک نیا افق کھول سکتے ہیں۔

خود فیلڈ مارشل منیر کے مطابق یہ دورے تعلقات کو ایک تعمیری، پائیدار اور مثبت راستے پر گامزن کرنے کی کوشش ہیں اور مستقبل میں امریکا کے ساتھ ممکنہ تجارتی معاہدے بھاری سرمایہ کاری کے دروازے کھول سکتے ہیں۔ اور یہ تجارتی معاہدے پاکستان کی معیشت کیلئے کسی بارش رحمت سے کم نہیں۔

یہ خوش خبریاں اپنی جگہ، مگر افق پر خطرات کے بادل اب بھی چھائے ہیں۔ یہ سب سفارتی گرمی کے بیچ بھی خطے کا آسمان کسی طوفانی بادل سے خالی اور پر امن نہیں۔ جنرل منیر کا بر ملا انتباہ واضح تھا کہ بھارت نے خطے کو خطرناک جنگ کے دہانے پر لاکھڑا کیا ہے، اور پاکستان ہر جارحیت کا منہ توڑ جواب دے گا۔ ان کا انتباہ محض جذباتی نعرہ نہیں بلکہ زمینی حقیقتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ کشمیر نہ بھارت کا "اندرونی معاملہ" ہے اور نہ کبھی ہو گا۔ یہ ایک نامکمل بین الاقوامی ایجنڈا ہے، ان کے الفاظ میں قائد اعظم محمد علی جناح کا وہ عزم جھلکتا ہے، جب انہوں نے فرمایا تھا "کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے"

امریکی سینٹکام میں خطاب کے دوران جنرل منیر نے بھارت کے "وشواگرو" بننے کے دعوے کو محض ایک فریب نظر خواب قرار دیتے ہوئے یہ بھی واضح کیا کہ عملی طور پر وہ خطے کے امن کو سبوتاژ کرنے میں مصروف ہے، حقیقت میں وہ خطے میں عدم استحکام کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ہماری حالیہ سفارتی اور سکیورٹی کامیابیاں اللہ تعالیٰ کی رحمت، قوم کی اجتماعی کاوش، سیاسی قیادت کی دوراندیشی اور فوج پاکستان کی پیشہ ورانہ مہارت کا نتیجہ ہیں۔ اب سوال یہ نہیں کہ ہم انھیں گے یا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ ہم کتنی جلدی اور کتنی قوت سے انھیں گے۔

ادھر ایک اور انڈین جھوٹ نے مودی سرکار کو اقوام عالم میں شرمندہ کر دیا جہاں انڈین فضائیہ کے سربراہ ایئر چیف مارشل اے پی سنگھ نے تین ماہ بعد دعویٰ کیا کہ مئی میں انڈیا اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے دوران انڈیا نے پاکستان کے کم از کم 6 طیارے مار گرائے تھے۔ واضح رہے کہ انڈیا کی جانب سے اب تک کسی قسم کے پاکستانی طیاروں کے گرائے جانے سے متعلق کوئی تصویری یا ویڈیو شواہد بھی پیش نہیں کیے گئے جبکہ دوسری جانب ڈی جی آئی ایس پی آر لیفٹیننٹ جنرل احمد شریف نے پریس کانفرنس کے دوران دعویٰ کیا تھا کہ انڈین فضائیہ کے پانچ گرائے جانے والے طیاروں میں سے تین رفال طیارے تھے جبکہ ایک مگ 29 لڑاکا طیارہ اور ایک ایس یو طیارہ شامل ہے۔

یاد رہے کہ بی بی سی ویریفائی نے تین ایسی ویڈیوز کی تصدیق کی تھی جن کے بارے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ ان میں نظر آنے والا ملبہ ایک فرانسیسی ساختہ رفال طیارے کا ہے جو انڈیا کی فضائیہ کے زیر استعمال ہیں۔ ان میں سے ایک ویڈیو کی جیولوشن سے بی بی سی ویریفائی کو علم ہوا تھا کہ یہ انڈین ریاست پنجاب میں بھٹنڈہ کے مقام کی ہے۔ اس ویڈیو میں یونیفارم میں ملبوس اہلکار لڑاکا طیارے کا ملبہ اکٹھا کرتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔ دوسری جانب چین

دنیا کی کوئی طاقت شہر کو پاکستان سے الگ نہیں کر سکتی



کے ایک معتبر تھک ٹینک نے بھارتی فضائیہ کے سربراہ کے تین ماہ بعد دینے والے بیان کو نہ صرف مضحکہ خیز قرار دیا بلکہ ٹھوس شواہد سے مسترد کر دیا اور اب عالمی دفاعی ماہرین بھی اس جھوٹی خبر کو مودی کی نئی تذلیل قرار دے رہے ہیں۔

اس سب کے بیچ، جہاں بھارت کی خفیہ ایجنسی "را" کے عالمی سطح پر پھیلانے گئے جال بے نقاب ہوتے جا رہے ہیں وہاں اس کے گھناؤنے منصوبے بھی عیاں ہوتے جا رہے ہیں۔ کینیڈا میں سکھ رہنما کا قتل، قطر میں آٹھ نیول افسران کا معاملہ، اور کلجھوشن یاد پو جیسے واقعات اس کی زندہ مثالیں اور شواہد ہیں۔

18 جون 2023 کو برطانوی کولمبیا کے شہر سروں میں واقع گوردوارہ کے پارکنگ لاٹ میں سکھ رہنما ہر دیب سنگھ نجا کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ کینیڈین سیکورٹی ایجنسیز نے بھارتی حکومت کے ایجنٹس کے ممکنہ ملوث ہونے کی بنیاد پر تحقیق شروع کی۔ وزیر اعظم جسٹن ٹروڈو نے اس واقعے پر شدید رد عمل دیا اور بھارت سے تعاون کا مطالبہ کیا۔ وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ کینیڈین انٹیلیجنس ایجنسیاں مضبوط و مصدقہ قابل اعتبار الزامات کی بنیاد پر تحقیق کر رہی ہیں کہ ممکنہ طور پر بھارتی حکومت کے ایجنٹس اس قتل میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ 2024ء میں کینیڈین پولیس نے اس کیس میں تین افراد—جن کی شناخت بھارتی نژاد شہریوں کے طور پر کی گئی ہے—کو قتل میں ملوث ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا۔ تحقیقات جاری ہیں۔

اس پر دو طرفہ تعلقات میں تیزی سے تلخی آئی—اس کے نتیجے میں دونوں ملکوں نے اپنے سفارتی نمائندوں کا تبادلہ کیا—بھارت نے کینیڈا کے سفارتی عملے کو برطرف کیا، اور کینیڈا نے بھارت کا ہائی کمشنر ملک بدر کیا۔ کینیڈا کی جاسوس ایجنسی سی ایس آئی ایس نے اس قتل کو "ٹرانس نیشنل" دباؤ اور انتقام کا ایک نیا درجہ قرار دیا اور بھارت کو خارجی مداخلت کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ آسٹریلیا، برطانیہ اور امریکا نے بھی اپنی تشویش کا اظہار کیا اور دونوں ممالک سے بات چیت جاری رکھنے پر زور دیا۔

اگست 2022 میں قطر نے 8 سابق بھارتی نیول افسران کو گرفتار کیا، جنہیں سب میرین پروجیکٹ سے متعلق اسرائیل کیلئے جاسوسی کرنے پر سزائے موت سنائی گئی تھی۔ عدالت اول کی یہ سزا بھارت کیلئے شدید صدمہ کا باعث بنی۔ وزیر خارجہ ایس جے شنکر اور نیوی چیف نے مقدمے میں بھارت کے شہریوں کیلئے معافی کی درخواست کی۔ دسمبر 2023 میں قطری ایبیل کورٹ نے سزا کو مؤخر کر دیا اور موت کی سزا کو قید کی مختلف مدتوں میں کم کر دیا۔ پھر ان میں سے سات افسران کو فروری 2024 میں بھارت واپس بھیج دیا گیا حالانکہ تفصیلی فیصلہ ابھی بھی زیر التوا ہے۔

بھارت کا سابق خفیہ ایجنٹ کلجھوشن یاد 2016 میں بلوچستان (پاکستان) میں گرفتار ہوا، اور دہشتگردانہ سرگرمیوں کی حمایت میں ملوث ہونے پر قتل اور سازش کے الزامات میں موت کی سزا سنائی گئی۔ مقدمے کے دوران اس نے میڈیا کے سامنے دہشتگردانہ کارروائیوں اور پاکستان میں سیکٹروں افراد کے قتل میں ملوث ہونے کا اعتراف کیا۔ پاکستانی شہریوں میں بڑے پیمانے پر جانی نقصان کے اعتراف کے بعد اس کیس نے بین الاقوامی انسانی حقوق اور عدالتی شفافیت کے حوالوں سے عالمی مباحث کو جنم دیا جبکہ اس معاملے نے بین الاقوامی عدالتوں اور انسانی حقوق کے حلقوں میں ایک پیچیدہ قانونی مباحث کو جنم دیا ہے۔

یہ تین واقعات — (1) نجار کا قتل، (2) قطر میں نیول افسران کا کیس، اور (3) کلجھوشن یاد یو کا معاملہ — سبھی بھارتی خفیہ ایجنسی "را" سے منسوب ہیں، اور ہر ایک نے عالمی سطح پر سفارتی رسوائی پیدا کی، جو ابھی تک مکمل طور پر سلجھائی نہیں گئیں۔ بھارتی "را" کے یہ تین بڑے واقعات گویا ایک ایک ہی زنجیر کے مختلف کڑیاں ہیں — ہر کڑی میں سفارت، قانون اور عالمی سیاست کے پیچیدہ دھاگے گندھے ہوئے ہیں۔

پہلا منظر کینیڈا کی برفانی فضاؤں میں کھلتا ہے، جہاں سکھ رہنما ہر دیب سنگھ نجار کے خون سے برٹش کو لمبیا کی گلیاں سرخ ہوئیں۔ کینیڈا کی سلامتی ایجنسیوں نے اس قتل کی تہہ میں جھانکا تو ان کے ہاتھ بھارتی ریاستی ایجنٹوں کے سائے لگے۔ معاملہ اتنا سنگین ہوا کہ اوٹاوا اور دہلی کے درمیان سفارت کاری کی زبان ترک ہو کر الزامات کی گونج سنائی دینے لگی۔ سفارتی نمائندے نکالے گئے، اور عالمی منظر نامے پر یہ سوال ابھرا کہ خود کو "وشوا گرو" کہلوانے والا ملک کیا خود اپنے ہی دعوؤں کی بنیاد کھوکھلی کر رہا ہے؟

دوسرا باب خلیج کے پانیوں سے جڑا ہے۔ قطر کی عدالت نے آٹھ سابق بھارتی نیول افسران کو "اسرائیل کیلئے جاسوسی" کے الزامات پر موت کی سزا سنائی۔ یہ فیصلہ دہلی کیلئے بجلی کا کڑکا ثابت ہوا۔ بھارتی حکومت نے قانونی و سفارتی محاذ پر ہر حربہ آزمایا، اور بالآخر سزائیں تخفیف کروالی لیکن اس تمام مہم کے پیچھے ایک نہ ایک راز دارانہ کہانی، اور خلیجی سیاست کے دبے دبے اشارے، آج بھی تجزیہ نگاروں کیلئے سوال بنے ہوئے ہیں۔

تیسرا اور شاید سب سے ننگا بچ بلوچستان کی خاک میں دبا ہوا ہے — کلجھوشن یاد یو کا اعتراف، جس میں اُس نے "را" کے ایجنٹ کی حیثیت سے پاکستان میں دہشتگردی کی منصوبہ بندی، اور سینکڑوں معصوم جانوں کے ضیاع کو تسلیم کیا۔ پاکستانی عدالت نے اسے موت کی سزا سنائی، اور دنیا بھر میں اس فیصلے نے قانون و انصاف، خود مختاری اور بین الاقوامی تعلقات پر ایک نئی بحث چھیڑ دی۔

یوں یہ تینوں واقعات، مختلف مقامات اور مختلف انداز میں، ایک ہی حقیقت کی گواہی دیتے ہیں — کہ خطے کی سیاست میں خفیہ ادارے محض پس پردہ کھلاڑی نہیں، بلکہ بعض اوقات وہ پوری بساط الٹ دینے والی چال چل دیتے ہیں۔ اور ہر چال کے بعد سفارت، قانون اور عالمی رد عمل کی شطرنج ایک نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

عالمی تاریخ گواہ ہے کہ جب قومیں عدل کی بنیاد سے ہٹ جائیں اور طاقت کے نشے میں غرور کی چال چلیں، تو ان کے قدم صراطِ مستقیم سے پھسل جاتے ہیں۔ خداوندِ قدوس نے فرمایا: وَلَا تَبْغِ الْفُسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ (القصص: 77) یعنی زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، بے شک اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بھارت، جو اپنے آپ کو "وشوا گرو" کہلانے کی آرزو رکھتا ہے، آج اپنے خفیہ ہاتھوں سے اس خطے میں خون، بارود اور بد اعتمادی کی آگ بھڑکار رہا ہے۔ کینیڈا کی برف پوش فضاؤں میں، سکھ رہنما ہر دیب سنگھ نجار کے خون کے دھبے اب تک گواہی دے رہے ہیں کہ ظلم کی چال کتنی بھی تاریک گوشوں میں تیار اور خفیہ کیوں نہ ہو، ایک دن سورج کی روشنی میں آ جاتی ہے۔ کینیڈا نے جب اپنی انٹیلیجنس رپورٹ میں بھارتی ایجنٹوں کے ملوث ہونے کا اشارہ دیا، تو اوٹاوا اور دہلی کے درمیان سفارت کاری کی نرمی ٹوٹ کر تلخی میں بدل گئی۔ سفیر نکالے گئے، الفاظ زہر آلود ہوئے، اور دنیا کے ضمیر پر سوال اٹھا کہ کیا ایک جمہوری دعوے دار ریاست قتل و غارت کی زبان بول رہی ہے؟

پھر خلیج کی موجوں سے ایک اور باب ابھرا، قطر کی عدالت سے 8 بھارتی نیول افسران کو "اسرائیل کیلئے جاسوسی" کے جرم میں سزائے موت کا فیصلہ دہلی کی سیاست پر بجلی بن کر گر۔ بالآخر مودی سرکار نے ذاتی معافی تلافی سے سزاکم کروالی، لیکن یہ سوال باقی رہ گیا کہ اگر جرم نہ تھا تو یہ مداخلت کیوں؟ اور اگر جرم تھا تو یہ معافی کیوں؟ تاریخ ان سوالات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔

لیکن سب سے زنگاچ بلوچستان کی ریت میں چھپا تھا، جہاں کلہوڑوں نے اپنے ہی لبوں سے وہ سب اگل دیا جو دشمن کے ایجنٹ کی پہچان ہے۔ دہشتگردی کے منصوبے، معصوم جانوں کی قربانیاں، اور پاکستان کے امن کو تاراج کرنے کے ارادے۔ اسے سزائے موت سنائی گئی، اور یہ فیصلہ نہ صرف عدل کا پیما نہ ٹھہرا بلکہ دنیا کو یہ پیغام بھی دیا کہ پاکستان اپنی سرزمین پر کسی بھی جارحیت کو برداشت نہیں کرے گا۔

اے اہل نظر! یہ تینوں واقعات صرف خبریں نہیں، یہ خطے کی روح پر لگے زخم ہیں۔ یہ یاد دہانی ہے کہ "باطل" ہمیشہ اپنی بقا کیلئے سازش کے جال بنتا ہے، لیکن "حق" کا وعدہ رب کائنات نے یوں فرمایا ہے: **بَلْ نَقْضُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ** (الانبیاء: 18) یعنی ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے، اور باطل مٹ کر رہ جاتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ وقت کا پہیہ اپنی گردش میں بے رحم ہے۔ قومیں جو لمحہ ہاتھ سے گنوا دیتی ہیں، وہ صدیوں کے خسارے میں بدل جاتا ہے۔ آج جب دنیا کا سیاسی نقشہ ہر مہینے نئی لکیروں سے بھر جا رہا ہے، برصغیر کی بساط پر مہرے بھی ایک نئے کھیل کیلئے تیار ہیں۔ آج پاکستان ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں ہر قدم تاریخ میں ثبت ہو گا۔ یہ وہ لمحہ ہے جب قرآنی وعدہ ہمارے سامنے ہے: **إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُخْلِفْ اللَّهُ مَكَانَكُمْ** (محمد: 7) اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

یوں لگتا ہے کہ برصغیر کی سیاسی بساط پر مہرے ایک بار پھر اپنی جگہ بدل رہے ہیں۔ تاریخ کے اس موڑ پر، جہاں ایک طرف طاقت کے کھیل کی بے رحم چالیں ہیں، وہیں دوسری جانب امید کی کرنیں بھی ہیں۔ بشرطیکہ ہم قومی عزم، فکری یکجہتی اور عملی بصیرت کو اپنا شعار بنائیں۔ وقت کے قلم نے نیا باب لکھنا شروع کر دیا ہے؛ اب یہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ اس کے الفاظ کس رنگ اور کس روشنی میں رقم ہوں۔

وقت کی ریت ہمارے ہاتھوں میں ہے، اگر ہم نے اسے مضبوطی سے تھام لیا تو یہ سنہری حروف میں تاریخ کا حصہ بن جائے گی، اور اگر گنوا دی تو صدیوں کے خسارے میں بدل جائے گی۔ آج ہم سب ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔ ہمارے سپاہی سرحدوں پر پہرہ دے رہے ہیں، سفارتکار دنیا کے ایوانوں میں پاکستان کی ساکھ کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں، اور قوم کو اپنی دعاؤں اور عزم کے قلعے میں ایک ہی صف میں کھڑا ہونا ہے۔ یہ وقت قوم کے ہر فرد کیلئے لمحہ امتحان ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کا، کہ ہم صرف تاریخ کے صفحات پر لکھی تحریر بنیں گے یا تاریخ کے باب لکھنے والے۔ یہ وہ گھڑی ہے جب اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہمارے سامنے ہے: **إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ** (العمران: 160) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔

یاد رکھیں! وقت کے دریا میں کوئی لمحہ دوبارہ نہیں آتا۔ اگر ہم نے اپنی صفوں کو متحد نہ کیا تو تاریخ ہمیں صرف ایک مثال کے طور پر یاد رکھے گی۔ اور اگر متحد ہو گئے تو ہماری داستان آئندہ نسلوں کیلئے ایمان، قربانی اور غیرت کا ترانہ بنے گی۔ ان شاء اللہ

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم محض تماشائی نہ بنیں، بلکہ اس بازی کے کھلاڑی بنیں جہاں ہماری تلوار دلیل ہے، ہماری ڈھال اتحاد ہے، اور ہمارا ذراہ ایمان۔

- بھارت کی "را" اگر اپنے خنجر کی دھار تیز کرے، تو ہم اپنے عزم کا فولاد مزید سخت کریں۔ یہ معرکہ محض زمین کا نہیں، ضمیر کا ہے۔ اور تاریخ نے ہمیشہ ضمیر کی جنگ میں حق کو فاتح دکھایا ہے۔

آئیے! یہی وہ گھڑی ہے کہ جب ہم سب ایک ہو کر، ایک زبان، ایک دل اور ایک پرچم کے سائے تلے یہ اعلان کریں ہم اپنی شہ رگ کا سودا نہیں کریں گے، ہماری شہ رگ محفوظ رہے گی، ہمارا پرچم سر بلند رہے گا، اور ہماری نسلیں آزاد سانس لیں گی۔ ہم اپنی نسلوں کا مستقبل محفوظ رکھیں گے، ہم اپنی آزادی کا پرچم سر بلند رکھیں گے، چاہے اس کیلئے وقت کا ہر امتحان کیوں نہ جھیلنا پڑے۔

یاد رکھیں! قومیں صرف اپنی سرحدوں سے نہیں بلکہ اپنے خوابوں اور اپنے یقین سے زندہ رہتی ہیں۔ آج پاکستان صرف ایک جغرافیہ نہیں، یہ ایک عہد ہے، ایک وعدہ ہے، ایک مشن ہے جو ہمارے بزرگوں نے اپنے خون سے لکھا۔ ہم اس وعدے کے امین ہیں، اور اس امانت کو وقت کے ہر طوفان سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ دنیا کے نقشے پر بہت سے رنگ مٹ چکے، پر وہ رنگ کبھی نہیں مٹتا جو قربانی اور ایمان سے روشن ہو۔ پس سن لو! ہم نہ دیں گے، نہ جھکیں گے، نہ رکیں گے۔ ہم اپنے پرچم کو سر بلندی کے آخری زینے تک لے جائیں گے۔ وقت کا مورخ جب اس دور کو لکھے گا، تو وہ لکھے گا۔ یہ وہ نسل تھی جس نے خواب نہیں بیچے، جس نے سر نہیں جھکایا، اور جس نے اپنے وطن کی تقدیر اپنے ہاتھوں سے سنہری حروف میں لکھی۔

پاکستان رہے گا، پاکستان جیتے گا، اور پاکستان کا پرچم قیامت تک سر بلند رہے گا، ان شاء اللہ۔

ووٹ کا تقدس اور طاقت کا فریب

انسانی تاریخ کے ہر دور میں اقتدار کے کھیل نے معاشرتی انصاف کے ترازو کو جھکانے کی کوشش کی ہے۔ جب سیاست کے میدان میں دھاندلی اور ووٹوں کی چوری کا سایہ پڑتا ہے، تو نہ صرف عوام کی امیدیں تاریک ہوتی ہیں بلکہ جمہوریت کا چراغ بھی مدھم پڑنے لگتا ہے۔ جہاں عقل و انصاف کا پیمانہ بوجھل پڑ جائے، وہاں حکمرانی کا تاج بھی دھوکہ بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کے ہر گوشے میں جمہوریت کی کشتی ہمیشہ عوامی اعتماد کے دریا میں رواں رہتی ہے اور جمہوریت اپنی روشنی اور اپنے سائے کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ جہاں یہ عوام کے اعتماد اور ریاستی شفافیت کی ضمانت بنتی ہے۔ جب اس کشتی کے تختے امانت و دیانت کے کیل سے جڑے ہوں تو یہ طوفانوں کا بھی مقابلہ کر لیتی ہے، مگر جب اس کے پینڈے میں خیانت کا شگاف پڑ جائے تو ساحل کی مسافت لمحوں میں ڈوبنے کی گہرائی میں بدل جاتی ہے وہیں اس کے سائے میں دھندلی اور شکوک بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برصغیر بالخصوص ہندوستان کی سیاست آج اسی گہرے اندیشے کے دہانے پر کھڑی ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں حالیہ دنوں میں ووٹ چوری، انتخابی فہرستوں میں جعلی ووٹرز کی شمولیت اور اہل ووٹرز کے اخراج کے الزامات نے جمہوری شعور کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ معاملہ محض ایک سیاسی تنازع نہیں، بلکہ ایک ایسا آئینہ ہے جو اس عظیم ملک کی جمہوریت کے عہد و پیمان کی تصویر عیاں کرتا ہے۔ یہ محض انتخابی اعداد و شمار کا معاملہ نہیں، بلکہ ایک ایسی امانت کا قصہ ہے جو ایک کاغذ کی پرچی میں بند ہو کر کروڑوں عوام کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جب "حق رائے دہی" صرف ایک قانونی شق نہیں رہتا بلکہ ایک اخلاقی اور تاریخی عہد میں ڈھل جاتا ہے اور جب اس عہد کو توڑا جاتا ہے تو جمہوریت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، جیسے طوفان کے پہلے جھٹکے پر چراغ کی لولہ زنی لگے۔

قوموں کی زندگی میں ایسے وقت آتے ہیں جب فیصلہ میدان جنگ میں نہیں، ضمیر کی عدالت میں ہوتا ہے۔ آج کا ہندوستان شاید ایسے ہی ایک فیصلے کے دہانے پر کھڑا ہے۔ جہاں ایک طرف عوامی اعتماد کا چراغ جل رہا ہے، اور دوسری طرف مکار مودی کے سیاسی مفادات کی آندھیاں اسے بجھانے پر تلی ہوئی ہیں۔ اسی منظر نامے میں ووٹ چوری، جعلی ووٹروں کی شمولیت، اور اہل ووٹروں کے اخراج کے الزامات نے انڈیا کے سیاسی درودیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ تحریر اسی کشمکش کی روداد ہے، جو اعداد، الزامات، تردیدوں اور تاریخ کے تناظر میں قاری کے سامنے کھولی جائے گی۔ تاکہ ہر شخص خود طے کرے کہ حقیقت کس طرف ہے اور فریب کس طرف۔

گزشتہ ہفتے کے اوائل میں اپوزیشن رہنما راہول گاندھی نے ایک نیوز کانفرنس کے دوران 2024 کے عام انتخابات کے تناظر میں بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کے مبینہ انتخابی فراڈ کے بارے میں جو الزامات عائد کیے، اس نے نہ صرف قومی سطح پر بحث کو شدت بخشی بلکہ انتخابی نظام کی شفافیت پر سوالیہ نشان بھی کھڑا کر دیا ہے۔ راہول گاندھی کے مطابق صرف کرناٹک کی ایک اسمبلی حلقے کی ووٹر لسٹ میں کم از کم ایک لاکھ جعلی ووٹرز شامل کیے گئے ہیں، جبکہ پہلی مرتبہ ووٹرز میں ایسے ہزاروں نام بھی ہیں جن کی عمر 80 اور 90 برس کے درمیان دکھائی دیتی ہے۔ یہ دعویٰ ایک طویل المدتی سیاسی دھندلاپن کا عائد یہ دیتا ہے، جس میں جمہوریت کا سب سے بنیادی ستون یعنی ووٹ کا تقدس متاثر ہوتا ہے۔

اپوزیشن جماعتیں، جن میں کانگریس، عام آدمی پارٹی اور مجلس اتحاد المسلمین نمایاں ہیں، الیکشن کمیشن پر الزام لگاتی ہیں کہ ووٹر لسٹوں میں بڑے پیمانے پر فراڈ ہوا ہے۔ ان کا خدشہ یہ ہے کہ گزشتہ پارلیمانی اور کئی ریاستی انتخابات میں اسی طرح کی دھاندلی کے ذریعے حکمران جماعت کو غیر منصفانہ فائدہ

پہنچایا گیا۔ خاص طور پر بہار کی مثال سامنے آئی، جہاں الیکشن کمیشن نے انتخابات سے صرف تین ماہ قبل ووٹر لسٹوں پر نظر ثانی کے خصوصی عمل کا آغاز کیا۔ یہ عمل جسے 'ایس آئی آر' اسپیشل انٹینسائیو یویشن کہا جاتا ہے، 25 جون سے 26 جولائی تک جاری رہا اور اس کے تحت کروڑوں ووٹروں سے شہریت کی تصدیق کیلئے پاسپورٹ، پیدائش کا سرٹیفکیٹ، اور رہائشی سرٹیفکیٹ جیسی دستاویزات طلب کی گئیں۔

اپوزیشن کا کہنا ہے کہ اس عمل کی شفافیت مشکوک ہے۔ عام آدمی پارٹی کے رکن پارلیمان سنجے سنگھ کے مطابق کمیشن نے 65 لاکھ ووٹرز کے نام کاٹ دیے، لیکن ایک بھی نئے ووٹر کا نام شامل نہیں کیا، جو واضح طور پر انتخابی بدنیتی کی عکاسی کرتا ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین کے رہنما اسد الدین اویسی نے مسلمانوں، دلتوں اور پسماندہ طبقے کے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مطلوبہ 11 دستاویزات تیار رکھیں، ورنہ ان کی شہریت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

یہ صرف اعداد و شمار کا کھیل نہیں، بلکہ عوامی اعتماد، جمہوری شعور، اور اقلیتوں کے بنیادی حقوق کی آزمائش ہے۔ اس منظر نامے میں، طرزِ تحریر کی فکری تمکنت اور لسانی آراستگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہر سیاسی اور سماجی واقعہ کو تاریخی تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ اس کالم میں تحریر تمثیلات اور لفاظی اس بات کا عندیہ دیتی ہیں کہ لفظ صرف اطلاع نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی جہت بھی رکھتا ہے، اور اسلامی رنگ والے تجربے ہمیں یہ یاد دلاتے ہیں کہ انصاف اور شفافیت کی روحانی بنیادیں بھی اتنی ہی اہم ہیں جتنی قانونی دفعات۔

یہی حال آج ہندوستان کے سیاسی منظر نامے کا ہے، جہاں ووٹ چوری، انتخابی فہرستوں میں جعل سازی اور اہل ووٹرز کے اخراج کے الزامات نے عوامی سطح پر شدید ہلچل مچادی ہے۔ تاریخی تناظر کے مطابق ہندوستانی جمہوریت میں ووٹر لسٹ کی دیانت ہمیشہ سوالیہ نشان رہی ہے۔ 1950 کی دہائی سے لے کر آج تک کئی ریاستوں میں انتخابی فہرستوں کے تنازعات نے سیاسی فضا کو مسموم کیا۔ 1975 کی ایمر جنسی کے دوران بھی ووٹر لسٹ میں رد و بدل کے الزامات سامنے آئے، اور آج کا بحران اسی سلسلے کی ایک کڑی محسوس ہوتا ہے۔

انتخابی شفافیت کا پہلا اور سب سے سنگین سوال یہی ہے: کیا ووٹروں کی فہرست میں دانستہ طور پر جعلی نام شامل کیے گئے؟ اپوزیشن کا کہنا ہے کہ یہ عمل ایک منظم منصوبے کے تحت ہوا تاکہ حکمران جماعت کو غیر منصفانہ برتری حاصل ہو۔ گذشتہ ہفتے کے اوائل میں اپوزیشن رہنما راہول گاندھی نے 2024 کے عام انتخابات میں حکومتی پارٹی بی جے پی کے خلاف الزامات لگاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حکومت نے مبینہ طور پر ووٹر لسٹوں میں جعل سازی کی گئی تاکہ انتخابات میں غیر منصفانہ فائدہ حاصل کیا جاسکے۔

اپوزیشن جماعتیں الیکشن کمیشن پر الزامات لگا رہی ہیں کہ ووٹر لسٹوں میں بڑے پیمانے پر فراڈ کیا گیا۔ گذشتہ پارلیمانی اور ریاستی انتخابات میں اسی طرح کی دھاندلی ہوئی، جس سے حکمران جماعت کو انتخابی فائدہ حاصل ہوا۔

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا۔ (النساء: 58) بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔ یہ آیت جمہوریت کے اصول پر براہِ راست لاگو ہوتی ہے، کیونکہ ووٹ کی پرچی محض کاغذ نہیں، یہ امانت ہے۔ الیکشن کمیشن کا موقف ہے کہ تمام اندراجات اور اخراجات قانونی ضابطوں کے مطابق ہیں، لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسے الزامات ہندوستانی سیاست کا نیا باب نہیں۔ 1989، 1971 اور 2004 کے انتخابات میں بھی ایسے ہی تنازعات اٹھے، اور ہر بار حقیقت کی تلاش دھند میں گم ہو گئی۔

گزشتہ ہفتے کانگریس کے رہنما راہول گاندھی نے کرناٹک کے ایک حلقے کی ووٹر لسٹ پیش کی، جس میں ان کے مطابق ایک لاکھ جعلی ووٹر تھے۔ حیرت کی بات یہ کہ 30 ہزار ووٹرز کے پتوں کا خانہ خالی تھا، اور ہزاروں ایسے نام درج تھے جو "پہلی بار ووٹ دینے والے" تھے مگر ان کی عمریں 80 یا 90 برس لکھی گئی تھیں، جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ ووٹر حقیقی نہیں ہیں۔ تاہم جب سیاست انصاف کی راہ چھوڑ دے تو تدبیر کا لباس پہن کر دھوکا دیتی ہے۔ گویا یہاں یہ فکری محاورہ بالکل درست ثابت ہوتا ہے کہ جہاں اندھیرا زیادہ ہو، وہاں حق کی کرن بھی دھندلی نظر آتی ہے۔

کانگریس نے "ووٹ چور، گدی چھوڑ" کے نعرے کے ساتھ ملک گیر احتجاج کا اعلان کیا، جبکہ بی جے پی اور اس کے اتحادی اس عمل کو غیر قانونی ووٹروں کی روک تھام کا اقدام قرار دیتے ہیں۔ مگر عوام کے ذہن میں سوال باقی ہے "کیا میرا ووٹ میرے اپنے ہاتھ میں ہے یا کسی اور کی جیب میں؟" اپوزیشن کا دعویٰ ہے کہ یہ صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ گزشتہ عام انتخابات اور ریاستی پولز میں ووٹر لسٹ میں چھیڑ چھاڑ کا تسلسل ہے۔ حکومتی موقف یہ ہے کہ یہ سب "ووٹر لسٹ کی تطہیر" کیلئے کیا گیا۔ گویا ایک فارسی ضرب المثل کے مطابق "چودزدی با چراغ آید، گزیدہ تر برد کالا۔" جب چور چراغ لے کر آئے تو سب سے قیمتی چیز چالے جاتا ہے۔ یہی صورت حال انتخابی فہرست کے نام پر بھی دیکھی جا رہی ہے۔

الیکشن کمیشن نے ریاست بہار میں انتخابات سے محض تین ماہ قبل ووٹر لسٹوں پر جامع نظر ثانی کا عمل شروع کیا، جسے انہوں نے اسپیشل انٹینسیو ریویشن (ایس آئی آر) کہا۔ یہ عمل 25 جون سے 26 جولائی تک جاری رہا۔ اس عمل میں 65 لاکھ ووٹرز کے نام کاٹ دیے گئے، اور اپوزیشن کے مطابق ایک بھی نیا ووٹر شامل نہ ہوا، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نیت کیا ہے۔ نظر ثانی کے اس عمل کے تحت کروڑوں ووٹروں سے شہریت کی تصدیق کیلئے پاسپورٹ، برتھ سرٹیفکیٹ اور رہائشی سرٹیفکیٹ جیسی دستاویزات طلب کی گئیں۔ اور اپوزیشن کا خدشہ ہے کہ کروڑوں غریب اور ناخواندہ شہری یہ دستاویزات فراہم نہیں کر پائیں گے، اور اس طرح ان کے ووٹوں کو بلا جواز خارج کیا جاسکتا ہے۔

معاملہ اس وقت سنگین ہوا جب بہار میں انتخابات سے محض تین ماہ قبل (ایس آئی آر) کا عمل شروع کیا گیا اور عام آدمی پارٹی کے سنجے سنگھ کے مطابق یہ شفافیت نہیں بلکہ سیاسی صفایا تھا۔ کمیشن کا کہنا ہے کہ یہ سب قانونی اور شفاف تھا، لیکن اپوزیشن کے مطابق یہ حکمت عملی ایک خاص ووٹ بینک کو کمزور کرنے کیلئے اپنائی گئی۔ اسد الدین اویسی (مجلس اتحاد المسلمین) نے مسلمانوں، دلتوں اور پسماندہ طبقے سے اپیل کی کہ وہ اپنی پاسپورٹ، پیدائش کا سرٹیفکیٹ، ذات کا سرٹیفکیٹ اور دیگر 11 دستاویزات تیار رکھیں، ورنہ ان کی شہریت خطرے میں پڑ سکتی ہے اور وہ ووٹ کے حق سے محروم ہو جائیں گے۔ گویا یہاں فکری استعارہ قابل ذکر ہے کہ ایک ووٹر کی آواز دبائی گئی، تو یہ نہ صرف ایک فرد کا حق ضائع ہوا بلکہ جمہوریت کا کل چراغ مدھم ہوا۔ حکومت نے اسے محض شفافیت کی کوشش قرار دیا، مگر عوامی سطح پر یہ خوف بڑھتا جا رہا ہے کہ کہیں یہ عمل شہری حقوق پر قدغن نہ بن جائے۔

وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ﴿١٥٢﴾ (الانعام: 152) اور جب بات کہو تو انصاف سے کہو، خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

تاریخی اور عالمی تناظر کا اگر مطالعہ کریں تو دنیا کے کئی ممالک میں انتخابی دھاندلی کے واقعات نے جمہوریت کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ امریکا میں 2000 کے صدارتی انتخابات میں فلوریڈا کی ووٹر لسٹوں کی جانچ پڑتال میں شدید اختلافات سامنے آئے، اور افریقا کے کئی ممالک میں ووٹر رجسٹریشن میں شفافیت کی کمی نے مقامی اور بین الاقوامی مبصرین کی توجہ مبذول کرائی۔ ہندوستان میں بھی یہی تصویر اب نظر آرہی ہے، جہاں کروڑوں ووٹروں کی دستاویزات کی جانچ پڑتال کے عمل میں عدم توازن نے عوامی شکایات کو ہوا دی ہے۔ ایسی ہی شکایات پاکستان میں بھی سنائی دیتی ہیں۔

یہ عالمی منظر نامہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جمہوریت کے ستون صرف قوانین سے قائم نہیں رہتے، بلکہ ان پر عوامی اعتماد اور شفاف عمل کی بنیاد بھی اتنی ہی مضبوط ہونی چاہیے۔ اگر یہ ستون ڈگمگا جائیں تو نہ صرف انتخابات بلکہ پورا سماجی اور سیاسی ڈھانچہ متاثر ہوتا ہے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ 1324 لیکشن کمیشن کو وسیع اختیارات دیتی ہے تاکہ وہ انتخابات کو شفاف اور غیر جانبدارانہ بنا سکے۔ تاہم، جب ووٹر لسٹوں میں بڑے پیمانے پر ترامیم کی جاتی ہیں، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عمل آئینی حدود میں ہے یا نہیں۔ ایس آئی آر کا عمل اگرچہ قانونی طور پر جائز ہے، لیکن اس کے نفاذ کے طریقے پر شفافیت کی کمی نے انتخابی عمل پر سوالیہ نشان کھڑا کر دیا ہے۔ انصاف اور شفافیت کی ضمانت دینے والا ادارہ، اگر خود عوامی شکوک کا مرکز بن جائے، تو اس سے جمہوریت کے بنیادی اصول خطرے میں پڑ جاتے ہیں۔ یہی وہ اہم نقطہ ہے کہ ہر ادارے کا اخلاقی اور عملی وزن اس کی قانونی حیثیت کے برابر اہم ہے۔

یہ مسئلہ صرف اعداد و شمار یا قانونی چالاکیاں کا نہیں، بلکہ اس کے سماجی اور نفسیاتی اثرات بھی بے حد گہرے ہیں۔ کروڑوں افراد جو دستاویزات کی کمی یا پیچیدگی کے باعث ووٹ دینے سے محروم ہو جائیں، وہ نہ صرف اپنے جمہوری حق سے محروم ہوں گے بلکہ ان کے سماجی اعتماد میں بھی کمی آئے گی۔ اقلیتیں، پسماندہ طبقہ اور ناخواندہ شہری خاص طور پر اس دباؤ کا شکار ہوں گے، اور ان کا محسوس شدہ جمہوری نقصان طویل مدت تک سیاسی عدم اعتماد میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

یہاں ہمیں اسلامی اور سیاسی بصیرت یاد دلاتی ہے کہ ہر فرد کی عدل و انصاف کی ضمانت دینا ریاست کی سب سے اہم ذمہ داری ہے۔ اگر کسی ایک گروہ کی رائے یا حق پر ظلم ہو جائے تو پوری قوم کی جمہوری صحت متاثر ہوتی ہے۔ یہ دھاندلی صرف سیاسی کھیل نہیں بلکہ سماجی انصاف کی پامالی ہے۔ حق کی پامالی ہر شخص کے دل میں خوف اور مایوسی کا بیج بوتی ہے، جو پوری قوم کے مستقبل کیلئے خطرہ ہے۔ اپوزیشن کے خدشات کی روشنی میں، کروڑوں ناخواندہ شہری اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہو سکتے ہیں۔ یہ امر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بھی قابل غور ہے: **وَأَقِيمُوا الزُّنْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ** (اور انصاف کے ساتھ میزان قائم کرو اور میزان میں کمی نہ کرو۔ الرحمن: 9)

انڈین سیاست میں یہ دھاندلی کسی نئی بات کی نمائندگی نہیں کرتی، بلکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اقتدار کے حصول کیلئے ہمیشہ فریب اور جعل سازی کے وسائل استعمال کیے گئے ہیں۔ تاریخی اور ادبی نقطہ نظر کے مطابق جہاں عدل کی کرنیں مدھم ہوں، وہاں طاقت کی آندھی ہر حقیقت کو مٹا دیتی ہے۔ یہی صورت حال

آج بھی دہرائی گئی ہے، جب ووٹر لسٹوں میں غیر حقیقی نام شامل کر کے انتخابات کو مشکوک بنایا جا رہا ہے۔ الیکشن کمیشن کے مطابق، نظر ثانی عمل کا مقصد صرف ووٹر لسٹوں کی شفافیت ہے۔ تاہم، اپوزیشن کے مطابق اس عمل میں انتخابی فوائد کیلئے جان بوجھ کر نام حذف کیے گئے ہیں۔ اس مسئلے پر انتخابی دھاندلی کے قانونی پہلو کے مطابق عوام میں شدید عدم اعتماد پیدا ہوا ہے، اور سیاسی مباحث میں ہر طرف تنقید کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ تمام حقائق اور الزامات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ جمہوریت کی بنیاد عوامی اعتماد پر قائم ہے، اور جب یہ اعتماد ٹوٹتا ہے تو ریاست کے ہر شعبے میں بحران پیدا ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ جمہوریت کا اصل مال عوام کی رائے ہے، اور جب یہ مال چھینا جائے، تو ریاست کا تمام سرمایہ بے کار ہو جاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات ہمیں یاد دلاتی ہیں:



يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدِينَ وَالْأَقْرَبِينَ (نساء: 135)

اے ایمان والو! انصاف کے ساتھ قائم رہو اور اللہ کیلئے گواہی دو، خواہ وہ تمہارے اپنے نفس، والدین یا رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ ہو۔ یہ آیت اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انصاف کا معیار کبھی ذاتی مفادات پر منحصر نہیں ہو سکتا۔

یہ داستان صرف ایک انتخابی تنازع کی روداد نہیں، یہ اس آئین کی روح کا امتحان ہے جس پر ایک ارب سے زائد انسانوں کی امیدوں کا چراغ جل رہا ہے۔ ووٹ کی پرچی جو بظاہر ایک معمولی کاغذ ہے — دراصل وہ میزان ہے جس میں اقتدار کے دعوے اور عوام کی امانت کو تولاجاتا ہے۔ اگر اس میزان کا پلڑا پہلے ہی جھکا دیا جائے تو باقی رہ جانے والا کھیل محض "جمہوریت کا تماشا" ہے۔ آج ہندوستانی سیاست ایک ایسے موڑ پر ہے جہاں سچ اور جھوٹ کی لکیر دھندلا دی گئی ہے، اور طاقتور ہاتھ اس دھند کو گہرا کرنے میں مصروف ہیں۔ اپوزیشن کے نعرے ہوں یا حکومت کی وضاحتیں، اصل سوال وہی ہے۔ کیا میرے اپنے ہاتھ میں ہے یا کسی اور کی جیب میں؟ یہ حقیقت فراموش نہیں کی جاسکتی کہ جب "میرا ووٹ جو ہر باشعور شہری کے دل میں گونج رہا ہے امانت ضائع ہوتی ہے تو قومیں صرف اپنے حقوق نہیں کھوتیں، بلکہ اپنی تاریخ کا وہ باب بھی کھودیتی ہیں جو عزت اور وقار سے لکھا جاسکتا تھا۔"

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آتَمٌ قَلْبُهُ (البقرة: 283) اور گواہی کو مت چھپاؤ، اور جو اسے چھپائے گا تو اس کا دل گنہگار ہے۔ قومیں بدوق کے سائے میں نہیں، انصاف کے سائے میں پروان چڑھتی ہیں۔ اگر آج ہم نے ووٹ کے تقدس کی حفاظت نہ کی تو آنے والے کل میں ہمارے بچوں کے نصاب میں "جمہوریت" صرف ایک مردہ لفظ رہ جائے گا۔ یہ وہ لمحہ ہے جب ہر شہری کو یہ طے کرنا ہے کہ وہ خاموش تماشائی رہے گا یا تاریخی صفحے پر اپنا نام اس فہرست میں لکھوائے گا جو جمہوریت کی حفاظت کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر ہم نے آج یہ جنگ ہار دی، تو آنے والا کل ہم سے سوال کرے گا — اور ہم اس سوال کا جواب دینے کے بھی اہل نہیں رہیں گے۔

انڈین جمہوریت بھی اس وقت ایک نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ ووٹر لسٹ میں شفافیت کی کمی، غیر ضروری دستاویزی پیچیدگی، اور سیاسی مقاصد کیلئے انتخابی عمل میں دخل اندازی، سب مل کر اس کی بنیادوں کو ہلا رہے ہیں۔ یہ محض سیاسی دائرہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی اور فکری امتحان ہے۔ جمہوریت کی حفاظت صرف قانون اور اداروں سے نہیں بلکہ عوامی شعور، عدل، اور شفاف عمل سے ممکن ہے۔

اگر ہم آج ان چینلجز کا موثر اور بروقت مقابلہ نہ کریں، تو کل کی نسلیں ہمیں نہ صرف تاریخ میں قصور وار پائیں گی بلکہ جمہوریت کے روشن خواب بھی مدھم پڑ جائیں گے۔ اس لیے یہ وقت ہے کہ ہم انصاف، شفافیت اور عوامی اعتماد کو جمہوری عمل کی بنیاد بنائیں اور ہر شہری کو حق رائے دہی کی مکمل آزادی فراہم کریں، تاکہ ملک کی سیاست ایک روشن، اخلاقی اور فکری سمت میں آگے بڑھ سکے۔ ان تمام حقائق، الزامات اور تجزیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ انڈین انتخابات کا منظر نامہ ایک نہایت پیچیدہ اور متنازع صورت اختیار کر چکا ہے۔ اپوزیشن کے خدشات، عوامی عدم اعتماد، اور ووٹر لسٹوں میں ممکنہ دھاندلی کا سایہ جمہوری اداروں پر گہرا پڑا ہے۔ یہ ایک ایسا لمحہ ہے جب تاریخ کے صفحات پر لکھا جائے گا کہ جب عوام کی رائے کا احترام نہ کیا گیا، تو انصاف کی روح تک زخمی ہوئی۔ ہر مقتدر قوت کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انصاف اور شفافیت کے بغیر ریاست کے ستون ٹوٹ جاتے ہیں، اور ہر دھاندلی ایک قومی زخم بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں نہ صرف سیاسی دھاندلی کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے بلکہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو مضبوط کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

امت کا ابراہیم کہاں.....؟

آج امت ایک ایسے دور ہے پرکھڑی ہے جہاں راستوں کے نشانات مٹ چکے ہیں، اور قافلے کے رہبر سوئے ہوئے ہیں۔ ہمارے گردِ یزیدیت کا حصار تنگ ہو رہا ہے، ہمارے قبلے کی سمت پر بادل چھا گئے ہیں، اور ہمارے بچوں کی مسکان، ہماری ماؤں کی چادر، اور ہمارے بزرگوں کا وقار دشمن کے نشانے پر ہے۔ ہم تاریخ کے اُس لمحے پر ہیں جہاں ہر دل یہ سوال کر رہا ہے، اور آج میں بھی آپ کے سامنے ایک سوال رکھتا ہوں... ایسا سوال جو آپ کے دل کی گہرائیوں کو ہلا دے گا۔ کیا اس امت میں کوئی ابراہیم باقی ہیں؟ ابراہیمؑ جنہوں نے تنہا باطل کے ایوان ہلا دیے۔ جنہوں نے تن کے پر نچے ہونے کی پروانہ کی مگر ایمان کی شمع بجھنے نہ دی۔

اے کاش! کوئی ہو جو آگ کو گلزار بنادے، کوئی ہو جو مندر کے بت توڑ دے، کوئی ہو جو طاغوت کے ایوانوں میں اذانِ حق بلند کر دے۔ ابراہیمؑ... وہ مردِ حق جو باطل کے ایوانوں میں اکیلا کھڑا ہوا۔ ابراہیمؑ... جن کے سامنے نہ بادشاہ کا جلال رکا اور نہ آگ کی تپش کا خوف۔ خود اللہ گواہی دے رہا ہے کہ:

"إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً" بیشک ابراہیمؑ خود ایک امت تھے۔

ہماری تاریخ گواہ ہے، جب بھی امت پر اندھیرے چھائے، اللہ نے ایک ابراہیم بھیجا۔ کبھی صلاح الدین کی صورت میں، کبھی محمد بن قاسم کی شکل میں، کبھی عمر بن عبد العزیز کی طرح۔ مگر آج... ہمارے شہر جل رہے ہیں، ہمارے بچے قبروں میں سو رہے ہیں، ہمارے مصلے خون سے رنگین ہیں... اور ہم ابراہیمؑ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

آج ہمارے آنگن میں خوشیاں نہیں، بین سناکی دیتے ہیں۔ غزہ کی گلیوں میں بچوں کے کھلونے مٹی اور خون میں لت پت پڑے ہیں، اور مائیں، اپنے جگر کے ٹکڑوں کو گود میں لیے، آسمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں۔ غزہ میں مائیں اپنے لختِ جگر کے لاشے اٹھائے بیٹھی ہیں، مائیں اپنے جگر کے ٹکڑوں کو گود میں لیے آسمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی ہیں کیا کوئی ہے جو ہماری پکار سنے؟

یہ سنو... غزہ کے ایک آٹھ سالہ بچے، یوسف، نے اپنے زخمی ہاتھ میں ایک کاغذ تھام رکھا تھا۔ خون اس کے چہرے پر جمی ہوئی مٹی کے ساتھ مل چکا تھا۔ اس کاغذ پر صرف تین الفاظ لکھے تھے "أُمِّي سَأَذْهَبُ إِلَى الْجَنَّةِ" ماں میں جنت میں جا رہا ہوں۔ مگر اس کی ماں یہ خط کبھی نہ پڑھ سکی۔ یہ وہ خط تھا جو اس نے پہلو میں خون میں لت پت اپنی شہید ماں کو لکھا۔

کشمیر میں بیٹیاں اپنے باپ کا سایہ ترستی ہیں، کشمیر کی وادی میں بہتے چشمے اب صرف پانی نہیں، آنسو بہا رہے ہیں، وہاں ایک ماں اپنے بیٹے کے جنازے کے پاس کھڑی تھی۔ آنکھوں میں آنسو نہ تھے، کیونکہ رونا ختم ہو چکا تھا۔ وہ صرف ایک جملہ دہرا رہی تھی: تو میرے شہید شوہر کی آخری نشانی تھی، تو بھی مجھے چھوڑ کر اپنے باپ اور اپنے تین بھائیوں کے پاس جا بسا ہے۔ میرا پیغام لیتا جا کہ میرا عزم آج بھی ویسا ہی جو ان وتروں کا ہے جیسے میرے ہاتھ میں تیری تربت پر رکھنے والے یہ سرخ گلاب کے پھول اور زمین پر لسنے والے ان تمام فراغین کیلئے یہ پیغام ہے کہ ابھی ہم جیسی ماؤں کی گود بانجھ نہیں ہوئیں کہ ان کی نگاہیں اب بھی کسی ابراہیم کی تلاش میں ہیں۔ اور ایک پیغام ان قائدین کے نام بھی ہے جنہوں نے سینکڑوں ارب ڈالر کی سرمایہ کاری گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کا حکم دینے والا قصاب، اور کشمیری مسلمانوں کے قاتل مودی کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔

برما اور اراکان میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی، برما کے ساحل پر لٹے پٹے مہاجر، تپتی ریت پر قدم رکھے، نگاہیں آسمان کی طرف اٹھائے کھڑے ہیں۔ افریقا کے قحط میں امت کے بچے مٹھی بھر اناج کو ترس رہے ہیں اور غزہ میں تو اب باقاعدہ بھوک مٹانے کیلئے گولیوں کے ساتھ ان کو ہمیشہ کیلئے ختم کیا جا رہا ہے۔ ایک روٹی کے ٹکڑے کیلئے مسلمان بچے دھوپ میں ہاتھ پھیلائے کھڑے ہیں اور دنیا کی طاقتیں کروڑوں ڈالر کے اسلحے پر بدست ہیں۔ جب ان بچوں کو روٹی کی بجائے ہمیشہ کی نیند سلا یا جا رہا تھا تو اس وقت قصر سفید کا فرعون اربوں ڈالر سرمایہ کاری کے نام پر اپنے ملک کے خزانے کے نام کر رہا تھا جہاں ایک مرتبہ پھر اسلحہ سازی کے کارخانوں کا پھیرہ تیزی سے چلنا شروع ہو گیا ہے جو بعد ازاں انہی مسلمان ملکوں کے پرچے اڑانے کا کام کریں گے۔ اور ہم...؟ ہم کبھی تیل کی قیمت پر جھگڑتے ہیں، کبھی سرحدی تنازعات میں وقت ضائع کرتے ہیں، کبھی مسلکی بحث میں الجھ کر دشمن کو خوش کرتے ہیں۔ قرآن ہمیں جھنجھوڑتا ہے "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا" اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو۔ اور ہم... کافر نسوں کے ہالوں میں تصویریں کھنچواتے ہیں، قراردادیں پڑھ کر تالیاں بجاتے ہیں، اور اگلے دن سب بھول جاتے ہیں۔

اے مسلمانو دشمن متحد ہے۔ چاہے وہ اسرائیل ہو یا بھارت، امریکا ہو یا یورپ۔ سب ایک صف میں ہیں۔ دشمن نے اپنی صفیں مضبوط کر لی ہیں۔



اسرائیل سے لیکر بھارت تک، نیٹو سے لیکر پیٹنگ اتحادیوں تک، ایک خفیہ اور اعلانیہ منصوبہ جاری ہے اور اس کا ایک ہی ہدف ہے، امت مسلمہ کا شیرازہ بکھیر دینا۔ وہ ہمارے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، ہماری سرحدوں کے نقشے، اور ہمارے ایمان کی بنیاد تک کو چیلنج کیا جا رہا ہے، ہمارے تعلیمی نصاب میں اپنی فکر داخل کرنا چاہتے ہیں، ہماری نوجوان نسل کو خواہشات میں الجھا کر اس کا غیرت مند خون سرد کرنا چاہتے ہیں۔

ٹیکنالوجی کے محاذ پر، وہ ڈرون سے بم برسا رہے ہیں، مصنوعی ذہانت سے ذہن بدل رہے ہیں، اور میڈیا سے ہمارے ہیر و کوولن اور ہمارے دشمن کو مسجنا آپ جانتے ہیں؟ یہ صدی صرف تلواروں کی نہیں، یہ ابلاغ، معیشت، اور ٹیکنالوجی کی صدی ہے۔ ہمارے دشمن ڈرون سے وار کرتے رہے ہیں۔ کیا ہیں، میڈیا سے ذہن مارتے ہیں، اور معیشت سے امت کو غلام بناتے ہیں۔ یاد رکھو اگر ہم نے اپنے بچوں کے ذہن اور زمین کی حفاظت نہ کی، تو وہ دن دور نہیں جب ہماری تاریخ صرف میوزیم میں قید ہوگی۔ اگر امت جاگ جائے تو یہ سب ہتھیار کاغذی شیر بن جائیں۔۔۔۔۔

یہ وقت محض آنسو بہانے کا نہیں، یہ وقت کھڑے ہونے کا ہے۔ ہمیں اب خواب سے اٹھنا ہو گا۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے مسلک، نسل، زبان کے پردے پھاڑ کر ایک امت کی صورت اختیار کریں۔ اس کیلئے ایک جامع، طاقتور، اور فیصلوں سے بھرپور اسلامک سمٹ کانفرنس ناگزیر ہے۔ ہمیں ایک ایسی اسلامک سمٹ کانفرنس چاہیے جو محض تصویروں اور بیانات کا ڈھیر نہ ہو، یہ کانفرنس محض تقریروں کا میلہ نہ ہو۔ بلکہ امت کے وسائل کو جوڑنے کا منصوبہ ہو۔

مشترکہ دفاعی ٹیکنالوجی کی تیاری کا اعلان ہو جس میں امت کا اپنا ڈرون، اپنا سٹارٹ، اپنا سائبر ڈیفنس سسٹم ہو۔ یقین کریں کہ اس امت میں ایسے ذہین و فطین افراد اور سائنسدان موجود ہیں جو آئرن ڈوم سے کہیں بہتر ڈیفنس سسٹم تیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اقتصادی اتحاد کیلئے تیل، گیس، زراعت

اور ٹیکنالوجی میں خود کفالت کے منصوبے ہمارے انتظار میں ہیں، میڈیا اور کامقابلہ کرنے کیلئے امت کی حکمت عملی طے کی جائے۔ اپنی فلمیں، اپنے چینل، اپنا بیانیہ، جو امت کی عزت اور تاریخ کو زندہ رکھے۔ مظلوم خطوں کیلئے عملی حکمت عملی تیار کی جائے۔ فلسطین، کشمیر، برما، اراکان، افریقہ ہر محاذ پر امداد اور سفارتکاری کیلئے عملی مدد کا خاکہ ہو۔ یہ سمٹ ایسی ہونی چاہیے جہاں لیڈران فیصلہ کریں، اور امت عمل دیکھے۔ نہ کہ صرف تقریریں اور جواب میں ایسی تذلیل جس میں ہم ڈوبے ہوئے ہیں۔

آج ہمیں تلوار سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے، جذبے سے زیادہ اتحاد کی۔ ہمارے دشمن نے ہمارے خواب چُرا لیے ہیں، مگر وہ ہمارا ایمان نہیں چھین سکتا۔ بشرطیکہ ہم اُسے تھامنے والے ہاتھ مضبوط کر لیں۔

یہ وقت محض ماتم کا نہیں، مشورے اور عمل کا ہے۔ یہ وقت مسلک اور قومیت کے پردے پھاڑ کر، ایک امت بننے کا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم ایک ایسی اسلامک سمٹ کانفرنس کا انعقاد کریں جو زبانی بیانات نہیں، عملی حکمت عملی دے؛ جو محض تصویروں کی نمائش نہیں، بلکہ فیصلوں کی بازگشت ہو؛ جو امت کو ایک جھنڈے تلے، ایک صف میں کھڑا کر دے۔ یہ کانفرنس اس لیے ناگزیر ہے کہ بیت المقدس کی فصیلیں ہمیں پکار رہی ہیں، غزہ کی زمین لہو میں نہا کر کہہ رہی ہے "امت کہاں ہے"۔

کشمیر کی وادیاں چیخ رہی ہیں، برما کے جلے ہوئے گاؤں گواہی دے رہے ہیں، اور افریقہ کے قحط زدہ مسلمان ہمارے ضمیر کو جھنجھوڑ رہے ہیں۔ امت کے ابراہیم کی تلاش کا مطلب ایک شخص نہیں، بلکہ وہ روح ہے جو ہر مسلمان کے دل میں بیدار ہو، تاکہ ہم سب مل کر وہ قدم اٹھائیں جو ملت کو غلامی کے اندھیروں سے نکال کر عزت کی روشنی میں لے آئے۔

☆ آؤ ہم اس عہد کی تجدید کریں کہ جب تک امت کا ہر فرد، ہر بستی، ہر ملک ایک دوسرے کا سہارا نہیں بن جاتا۔ ہم نہ بیٹھیں گے، نہ جھکیں گے، نہ

☆ آؤ ہم اپنے رب سے عہد کریں کہ ہم اس امت کے ابراہیم بنیں گے، اور طاعوت کے ہر بت کو پاش پاش کر دیں گے۔
☆ آج، یہاں، اس مجلس میں... ہم عہد کریں کہ ہم امت کے ابراہیم بنیں گے۔ ہم وہ امت ہیں جو کبھی شکست تسلیم نہیں کرتی، جو اپنے بچوں کو قرآن اور شمشیر دونوں کا وارث بناتی ہے، جو اپنے خوابوں کو خون سے سیتختی ہے۔ ہم طاعوت کے ہر بت کو توڑیں گے، چاہے وہ طاقت کا ہو یا جھوٹ کا۔ ہم ہر اس باطل قوت کو لٹکائیں گے جو اللہ کے دین کو مٹانا چاہتی ہے۔

☆ ہم اپنے مسلک، اپنی زبان، اپنی نسل کے حصار توڑ کر ایک امت کی صورت میں اٹھیں گے۔ ہم وہ آواز بنیں گے جو نہ دبائی جاسکے، وہ ہاتھ بنیں گے جو اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ پھیلیں، وہ دل بنیں گے جو نہ بکس۔

☆ اے اللہ ہماری غفلت کو بیداری میں بدل دے، ہمارے کمزور ہاتھوں میں اسلام کی نصرت کا لوہا بھر دے۔
☆ ہمیں ابراہیمؑ کا حوصلہ، اسماعیلؑ کی قربانی کا جذبہ، موسیٰؑ کی جرات اور لٹکا دے، اور محمد ﷺ کی رحمت اور سیرت عطا فرما۔ ہمارے دلوں کو ایمان کے نور سے بھر دے، ہماری صفوں کو یکجان کر دے۔ ہمیں عمرؓ کی غیرت دے، علیؓ المرتضیٰؓ کی بصیرت دے، اور سیدنا بلالؓ کا صبر عطا فرما۔

☆ اے اللہ ہمیں ایک امت بنادے، ہمارے صفوں میں اتفاق پیدا کر دے، اور ہمیں ظلم کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنادے۔ اے اللہ ہمارے شہیدوں کے خون کو ضائع نہ ہونے دے، ہمارے شہیدوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرما، اے اللہ ہماری ماؤں کے آنسو اپنے عرش

پر قبول فرما، ہمارے زندہ لوگوں کو اپنی راہ کا سپاہی بنا، اور اس امت کو وہ قیادت دے جو ظلم کے ایوان ہلا دے۔
☆ اے اللہ ہمیں اس امت کا بانی اور محافظ بنا جس پر فرشتے بھی فخر کریں۔ آمین، یا رب العالمین۔

بروز جمعۃ المبارک 5 ربیع الاول 1447ھ / اگست 2025ء

جہاں قربانیاں بولتی ہیں وہی پاکستان ہے

آج کے دن جب فضائیں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج رہی ہیں، جب ہر گلی، ہر کوچہ سبز ہلالی پرچم کی چمک سے جگمگا رہا ہے، جب بچے معصوم ہنسی کے ساتھ شہداء کے خوابوں کو زندہ کر رہے ہیں، تو میرے دل کی دھڑکنیں بھی پاکستان کی دھڑکن کے ساتھ جڑ گئی ہیں۔ یہ دن ہمیں صرف خوشی نہیں دیتا، بلکہ ہماری رگوں میں وہی تپش دوڑاتا ہے جو 1947 کے قافلوں کے زخمی قدموں میں تھی، جو شہیدوں کے خون میں تھی، اور جوماؤں کی دعاؤں میں تھی۔ یقین جانے آج اگر ہم آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں، تو یہ ہمارے شہداء کی بدولت ہے۔ یہ پاکستان ہمیں تحفے میں نہیں ملا—یہ پاکستان ہمیں لہو، آنسو اور قربانیوں کے عوض ملا ہے۔

آج ہم جس نظریے کی بات کرنے جا رہے ہیں، وہ کوئی معمولی سوچ نہیں، بلکہ وہ روحانی چراغ ہے جس نے غلامی کے اندھیروں میں روشنی کی کرن دکھائی۔ نظریہ پاکستان وہ صدا تھی جو کروڑوں مسلمانوں کے دل سے اُٹھی، وہ خواب تھا جسے لاکھوں آنکھوں نے دیکھا اور جسے لاکھوں جانوں نے اپنی قربانیوں کے نذرانے سے تعبیر بخشی۔ یہ نظریہ محض زمین کے ٹکڑے کے حصول کا نام نہیں، یہ تو ایمان کی حرارت، یقین کی طاقت اور قربانی کی عظمت کا استعارہ ہے۔ پاکستان کا وجود اسی نظریے کا زندہ معجزہ ہے۔

نظریہ پاکستان دراصل ایک خواب کی تعبیر ہے، وہ خواب جو کروڑوں مسلمانانِ ہند نے اپنے دلوں میں سجایا تھا۔ یہ خواب آزادی کا، اپنے تشخص کے تحفظ کا اور دین اسلام کے سنہری اصولوں پر مبنی ایک ایسی مملکت کا تھا جہاں عدل، مساوات اور بھائی چارہ پروان چڑھے۔ جب ظلم و ناانصافی کے اندھیروں میں مسلمانوں کی شناخت مٹانے کی کوششیں ہو رہی تھیں، اس وقت نظریہ پاکستان ایک روشن چراغ بن کر ابھرا، جس نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر ایک آزاد وطن کی منزل دکھائی۔ یہ صرف سیاسی مقصد نہ تھا بلکہ ایک دینی، تہذیبی اور جذباتی جدوجہد تھی جس نے مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کر دیا۔

نظریہ پاکستان کوئی محض سیاسی مطالبہ نہ تھا، یہ تو ایک امت کی روح کی پکار تھی، ایک خواب کی تعبیر تھی جو دلوں میں ایمان کی لو کی مانند جل رہا تھا۔ یہ نظریہ اس وقت پروان چڑھا جب غلامی کی زنجیریں مسلمانوں کی شناخت کو جکڑنے لگیں اور ان کے دینی و تہذیبی وجود پر اندھیروں کا سایہ منڈلانے لگا۔ ایسے میں یہ نظریہ ایک مینارِ نور بن کر ابھرا، جس نے کروڑوں دلوں کو ایک مرکز پر مجتمع کر دیا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے بے سروسامان قافلوں کو حوصلے اور جرأت کے زارِ راہ سے نوازا اور انہیں منزل کی جانب رواں دواں کر دیا۔ پاکستان کی بنیاد محض خاک و خون پر نہیں بلکہ ایک آفاقی نظریے، ایک ایمانی یقین اور ایک ناقابلِ شکست عزم پر رکھی گئی۔

آج ہم اس ارضِ مقدس پر کھڑے ہیں جسے اللہ نے لاکھوں شہیدوں کے خون سے سیراب کیا، جس کے ایک ایک ذرے میں قربانی کی خوشبو ہے، جس کی فضاؤں میں شہداء کی آہوں اور دعاؤں کی گونج اب بھی سنائی دیتی ہے۔ یاد کرو وہ دن جب لاکھوں مائیں اپنی گودیں خالی کر کے پاکستان کے خواب کی آبیاری کر رہی تھیں؛ جب بہنوں نے اپنی عصمتیں قربان کر کے ہمیں یہ سبز ہلالی پرچم دیا؛ جب نوجوانوں نے ہنستے ہنستے اپنی جانیں نچھاور کر کے ہمیں آزادی کی سانس بخشی۔ آج ہم آزاد ہیں... مگر یہ آزادی ہمیں کسی خیرات میں نہیں ملی، یہ آزادی ہمیں اپنے خون سے لکھی ہوئی تاریخ کے ورثے میں ملی ہے۔

آج ہم اس مقدس دن کی یاد منارہے ہیں جس روز برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں، ان کی دعاؤں اور ان کے لہو کی سرخی نے تاریخ کے اوراق پر ایک نیا چراغ جلایا۔ یہ چراغ پاکستان ہے۔ ایمان، قربانی اور عزت نفس کا وہ نشان جس نے ہمیں دنیا کی اقوام میں ایک الگ شناخت عطا کی۔ آج اسی میدان میں ہم فخر سے کھڑے ہیں، سر جھکانے کے بجائے سر اونچا کر کے، یوم آزادی کے اس عظیم موقع پر جہاں ہماری آنکھوں میں روشنیاں اور دلوں میں تڑپ موجزن ہے۔ آج ہم ان شہداء کی یاد میں بھی کھڑے ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ہمیں یہ وطن عطا کیا، اور ان عظیم روحوں کی قربانی کو سلام پیش کرتے ہیں جنہوں نے ہر ظلم و ستم کے بیچ پاکستان کو اس مقام پر پہنچایا جہاں آج یہ دنیا کے نقشے پر واحد ممتاز نشان ہے۔

سب سے پہلے، اس حالیہ پاک-بھارت کشیدگی اور ۲۰۲۵ کی فتح مبین کا ذکر نہ کرنا انتہائی ناشکری ہوگی، اور عجز و انکساری کے ساتھ اس احسانِ عظیم کا ذکر کرتے ہوئے سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔ ہاں وہی 14 / اگست 2025 کی شام جب ہمیں نئی قوت، نئے ہمت، اور نئے ولولے کے ساتھ مردِ مجاہدین کی وہ مثال ملی جو ملک کی حفاظت کیلئے اسلامی شعور کے نگینے کی مانند چمکے۔ اس کو آپ معرکہ الحق کہہ سکتے ہیں۔ اس دوران نیا آرمی راکٹ فورس کمانڈ قائم کیا گیا، تاکہ دشمن کو منہ توڑ جواب دینے کا عہد مزید مضبوط ہو جائے، پاک فوج نے اپنی دفاعی صلاحیتوں میں ایک نیا سنگ میل عبور کیا ہے۔

یہ سال ایک نیا باب رقم کرتا ہے۔ پاک-بھارت حالیہ معرکہ جسے تاریخ فتح مبین کے نام سے یاد کرے گی، اس بات کی گواہی ہے کہ پاکستان کا دفاع ناقابلِ تسخیر ہے۔ ہماری افواج نے جس جرات اور ایثار سے وطن کا پرچم سر بلند رکھا، وہ آنے والی نسلوں کیلئے مینارِ نور ہے۔ دشمن کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ پاکستان محض ایک سرحد نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے۔ اور نظریے کو کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔ یہ فقط ایک سیاسی یا عسکری اقدام نہیں تھا بلکہ یہ ایک جذبہ تھا، یاد دہانی تھی، اس بات کی کہ اگر پاکستان نہ ہوتا، تو کشمیر کے شہید، الحاقِ وطن کی تڑپ، مسلمانوں کا حیثیت، سب کچھ خطرے میں ہوتا۔

لیجیے، اب دیکھتے ہیں پاکستان کی معاشی ترقی کے روشن اعداد و شمار، اگلے سالوں میں اس معاشی ترقی کی بنیاد جو کہ پچھلے سال کے ۲.۵٪ کے مقابلے میں بہتری کی علامت ہے۔ ہماری بلند پرواز معاشی حکمت عملی ہے، جو ۲۰۲۴-۲۹ کیلئے ترتیب دی گئی، اور جس نے افراط زر کو 8-11٪ سے گھٹا کر 3.5٪ تک لانے میں کامیابی پائی، ترسیلات زر میں کئی ارب ڈالر کے کرنٹ اکاؤنٹ سرپلس کا اعزاز بھی حاصل کیا، یہ سب منصوبوں میں شفافیت اور کارکردگی کی برتری کا ثبوت ہے۔ وفاقی بجٹ 2025-26 نے عوام دوست اصلاحات اور ترقیاتی سرمایہ کاری کو ترجیح دی، جبکہ دفاعی تقویت کے ساتھ ساتھ نمونہ ہدف 4.2٪ مقرر کیا گیا۔ ایک واضح سمت نشوونما۔

ساتھ ہی، یہ اطمینان بھی ہے کہ پاکستان صرف دفاعی قوت میں ہی نہیں بلکہ معاشی میدان میں بھی مستحکم قدم بڑھا رہا ہے۔ حالیہ مالی سال میں معیشت کی شرح نمو 2.7٪ رہی، مہنگائی کو قابو میں لایا گیا، ترسیلات زر میں نمایاں اضافہ ہوا، اور ترقیاتی منصوبے جاری ہیں۔ اُٹان پاکستان جیسے اقدامات اس امر کا ثبوت ہیں کہ ہم استحکام کی دہلیز سے ترقی کی شاہراہ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ثابت کرتے ہیں کہ ہماری قربانیاں، ہماری صبر آزما جدوجہد کبھی رائیگاں نہ گئی۔ بلکہ وہ آج ہمیں استحکام، ترقی اور عالمی مقبولیت کا مرتبہ دینے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔

چودہ اگست ہمیں صرف جشن منانے کا دن نہیں دیتا بلکہ ہمیں یہ یاد دلاتا ہے کہ اگر پاکستان نہ ہوتا تو آج برصغیر کے کروڑوں مسلمان کس حال میں ہوتے؟ بھائیو غور کریں کہ اگر پاکستان نہ ہوتا، تو برصغیر میں مسلمانوں کا معاشرتی، سیاسی، اور ذہنی مقام کیا ہوتا؟ نہ دینی آزادی میسر آتی، نہ عزت نفس، اور نہ وہ سیاسی و قار جو آج ہمیں ایک آزاد ریاست میں حاصل ہے۔ اگر پاکستان نہ ہوتا تو عالم اسلام مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہتا۔ وہ سرزمین جہاں آج کے

علمی و فوجی، تکنیکی و اقتصادی کامیاب نوجوان بستے ہیں، وہاں آج مسلم ہمدردی اور اسلام کی عزت کی جو کوجہل رہی ہے، وہ شاید بھادی جاتی۔ آج دنیا کے میدانوں میں آواز بنانے والے، آج کے قومی و عالمی فورمز پر علم اڑانے والے۔ ہم میں سے ہی تو ہیں۔ غیور قوم نے آج تک ہر آزمائش کا مقابلہ ایمان اور پختہ ارادوں کے دم سے کیا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا تھا: پاکستان اسی لیے بنایا گیا تھا کہ ہم اپنی قسمت کے خود مالک ہوں، آزاد فضاؤں میں سانس لیں اور اسلام کے اصولوں کو اپنی زندگی کا منشور بنائیں۔ حالیہ دنوں میں پاک۔ بھارت معرکے میں جس فتح مبین کو دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ اس قوم کے ایمان کی طاقت تھی۔ ہماری افواج پاکستان نے ثابت کیا کہ ہم نہ صرف اپنی سر زمین کے محافظ ہیں بلکہ اپنے نظریے کے بھی پاسبان ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب دشمن کو یقین ہو گیا کہ پاکستان ناقابلِ تسخیر ہے۔

مگر یاد رکھیں یہ صرف عسکری میدان ہی نہیں جس میں ہم نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ہماری معیشت بھی اب ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ افراطِ زر کم ہوا، ترسیلاتِ زر بڑھی، اور اٹلان پاکستان جیسے منصوبے ہماری منزل ترقی کی نوید بن رہے ہیں۔ یہ اعداد و شمار ہمیں بتاتے ہیں کہ پاکستان صرف ایک خواب نہیں رہا۔ یہ حقیقت ہے، اور یہ حقیقت روز بروز مضبوط ہو رہی ہے۔

اگر پاکستان نہ بنتا، تو آج مسلمانوں کا حال غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کا ہوتا۔ نہ عزت ہوتی، نہ خود داری۔ عالم اسلام مزید ذلت کے اندھیروں میں بھٹک رہا ہوتا۔ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو برصغیر کے مسلمان آج بھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے۔ ہندو اکثریت کے غلبے میں نہ ان کی مذہبی آزادی باقی رہتی اور نہ ہی سیاسی خود مختاری۔ مسلمانوں کے رسم و رواج، ثقافت اور زبان دباؤ کا شکار ہوتے، اور رفتہ رفتہ ان کی شناخت مٹ جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک پاکستان محض سیاسی جدوجہد نہیں تھی، بلکہ مسلمانوں کی بقا اور ان کے مستقبل کا سوال تھی۔



پاکستان نے ہمیں وہ آزادی دی جس کے بغیر انسان کی عزت اور وقار قائم نہیں رہتا۔ آج ہم آزاد فضا میں اپنے دین پر عمل کر سکتے ہیں، اپنی اقدار کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں اور اپنی قومی شناخت کو دنیا میں اجاگر کر سکتے ہیں۔ اگر یہ ملک نہ بنتا تو ہم بھی دوسری اقوام کے پیچھے چلنے والی ایک محکوم قوم ہوتے، جن کے پاس نہ عزت باقی رہتی اور نہ ہی خود داری۔

عالم اسلام کیلئے بھی پاکستان ایک امید ہے۔ ایٹمی قوت ہونے کے ناطے پاکستان نہ صرف اپنے دفاع کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ امت مسلمہ کے وقار کی علامت ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس نے دنیا کو دکھایا کہ مسلمان اگر متحد ہو جائیں تو اپنے دشمنوں کو منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ پاکستان کے وجود نے دنیا بھر کے مسلمانوں کے دلوں کو ایک نیا حوصلہ دیا اور انہیں یہ یقین دلایا کہ اسلام آج بھی ایک زندہ اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ لہذا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔ اس کی حفاظت، ترقی اور استحکام ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم نے اس ملک کی قدر کی اور اپنی آنے والی نسلوں کو بھی اس کی اہمیت سے آگاہ کیا تو پاکستان ہمیشہ سر بلند اور کامیاب رہے گا۔ یہ صرف ایک خطہ زمین نہیں بلکہ ہماری عزت، ہماری پہچان اور

ہمارے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہ پاکستان ہے جس نے ہمیں وقار دیا، یہ پاکستان ہے جس نے ہمیں عزت دی، اور یہ پاکستان ہی ہے جو ہماری آنے والی نسلوں کی امید ہے۔ یاد رکھو اقبال کا وہ پیغام:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یاد رکھیے کہ یہ سب قربانیوں کی بدولت ہے۔ لاکھوں شہداء کے خون اور بے شمار ماؤں، بہنوں کی عصمت و آنسو کے طفیل ہے۔ ان کی داستانوں کے

بغیر پاکستان کی تاریخ ادھوری ہے۔ آج میں پوری قوم کو دعوت دیتا ہوں کہ اس یومِ آزادی پر ہم سب مل کر عہد کریں کہ:

ہم اپنی ان قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ہم پاکستان کی حفاظت، ترقی اور استحکام کیلئے ایک جسم اور ایک جان بن کر کھڑے ہوں گے۔ ہم

اسلام کے اصولوں، قائد اعظم کے فرمان اور علامہ اقبال کے خواب کو اپنی عملی زندگی کا محور بنائیں گے۔

قرآن مجید کا فرمان ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (محمد: 7)

(اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا)

اور سنو حفیظ جالندھری کا وہ ترانہ جو آج بھی ہمارے لہو میں بجلیاں دوڑا دیتا ہے

پاک سر زمین شاد باد

کشور حسین شاد باد۔۔۔۔۔

آج جب ہم اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑاتے ہیں تو یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ پاکستان کی اصل قوت اس کا نظریہ ہے۔ اگر ہم اس چراغ کو بجھنے نہ دیں، تو ہماری منزلیں اور بھی تابناک ہو جائیں گی۔ یہ سر زمین اُن قربانیوں کا ثمر ہے جن کے لہونے اس کے ذروں کو مقدس بنا دیا۔ پاکستان ایک امانت ہے، ایک وعدہ ہے، ایک پیغام ہے۔ ایمان، اتحاد اور قربانی کا پیغام۔ آئیے ہم یہ بھی عہد کریں کہ اپنے بزرگوں کی قربانیوں کا پاس رکھتے ہوئے اس وطن کو نہ صرف سنواریں گے بلکہ دنیا میں اس کے پرچم کو بلند تر کرتے رہیں گے۔ یہی نظریہ پاکستان کی حقیقی روح ہے اور یہی ہمارے مستقبل کی ضمانت۔

پاکستان محض ایک جغرافیہ نہیں بلکہ ایک ایمان، ایک یقین اور ایک وعدہ ہے۔ وہ وعدہ جو ہم نے اللہ اور اپنے بزرگوں سے کیا تھا کہ اس سر زمین کو اسلام کا قلعہ بنائیں گے۔ ہم اس نظریے کو اپنی رگوں میں خون کی طرح زندہ رکھیں گے اور پاکستان کو ہمیشہ سر بلند رکھیں گے۔

آج وقت ہم سے سوال کرتا ہے: کیا ہم نے اس نظریے کو زندہ رکھا ہے؟ کیا ہم نے اُن شہیدوں کے لہو کا حق ادا کیا ہے جنہوں نے پاکستان کے خواب کو حقیقت بنایا؟ یاد رکھیے! پاکستان محض جغرافیہ نہیں، یہ ایک وعدہ ہے۔ اللہ سے کیا ہوا وعدہ، اپنے اسلاف سے کیا ہوا عہد۔ اگر ہم اس نظریے کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنالیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی۔

آئیے، آج ہم سب مل کر اس عزم کو دہرائیں کہ ہم اپنے وطن کو نہ صرف سنبھالیں گے بلکہ اسے ترقی، خوشحالی اور عظمت کی نئی بلندیوں تک پہنچائیں گے۔ یہی نظریہ پاکستان کی اصل روح ہے اور یہی ہماری آنے والی نسلوں کیلئے سب سے قیمتی ورثہ ہے۔ یاد رکھیں! کہ پاکستان ہماری پہچان، ہماری غیرت،

ہمارا ایمان ہے اور ہم اس کے وقار کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز رکھیں گے۔

آج کے دن میں ہر شہید کی ماں کے آنسوؤں کو یاد کرتا ہوں، ہر یتیم کے سہمے ہوئے خوابوں کو یاد کرتا ہوں، اور ہر بہن کے قربان کیے گئے ہنستے بھائی کو یاد کرتا ہوں۔ ان سب کی قربانیوں کا تقاضا ہے کہ ہم پاکستان کی حفاظت صرف الفاظ میں نہیں بلکہ اپنے عمل سے کریں۔ پاکستان صرف ایک زمین نہیں؛ یہ ایمان کا پرچم ہے، قربانیوں کی داستان ہے، اور ہر مسلمان کی دعاؤں کا مرکز ہے۔ آج جب آپ اپنے ہاتھ سینے پر رکھتے ہیں، تو دل سے مان لیجئے کہ یہ تیرا پاکستان، اور یہ تیرا فرض ہے کہ اس کی قدر، اس کی خدمت کرو، اور اسے لہو اور آنسو سے سچی وفا اور عشق کے دیپوں سے روشن رکھو۔

آئیے اس دن ہم عہد کریں کہ ہم پاکستان کے وقار کو اپنی جان سے بڑھ کر عزیز رکھیں گے۔ ہم شہیدوں کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے۔ ہم علم، امن اور ترقی کی راہوں پر گامزن رہیں گے اور ہم دنیا کو یہ باور کرائیں گے کہ پاکستان صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے، اور نظریے کو کبھی شکست نہیں دی جاسکتی۔ آج پاکستان کی بقا اور ترقی بھی اسی نظریے کی پاسداری میں مضمر ہے۔ اگر ہم اپنے اسلاف کی قربانیوں کو یاد رکھیں اور نظریہ پاکستان کو اپنی زندگیوں کا محور بنالیں تو کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی۔ یہ وطن شہیدوں کا لہو مانگ کر حاصل ہوا ہے، لہذا اس کے ہر ذرے کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔

آؤ اس یوم آزادی پر ہم سب مل کر عہد کریں کہ ہم قربانیوں کو عقیدت سے یاد رکھیں گے اور ہم ترقی کی رفتار کو سست نہیں ہونے دیں گے، ہم علم، صنعت، اور امن کی راہ کمائیں گے۔ اسی میں ہماری عزت، شکوہ، اور 14 / اگست کا شعور پنہاں ہے۔ ہم پاکستان کو صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک نظریہ سمجھ کر سنبھالیں گے۔ ہم علم، امن اور ترقی کو اپنا ہتھیار بنائیں گے اور ہم دشمن کو یہ پیغام دیں گے کہ پاکستان زندہ تھا، زندہ ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آئیے اس وعدے پر قائم رہیں اور پاکستان کو دنیا کے نقشے پر امن، ترقی اور اسلام کی سر بلندی کا مرکز بنائیں۔ اسلام کا پرچم سدا سر بلند رہے۔ پاکستان ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے۔

افواج پاکستان پائندہ باد

عزت، انا اور عالمی سیاست: بھارت کی آزمائش

بین الاقوامی سیاست کے افق پر بعض اوقات ایسے بادل چھا جاتے ہیں جن سے دھوپ بھی چھن جاتی ہے اور بارش بھی برسنے لگتی ہے۔ ایک طرف امریکا ہے جو پابندیوں کے کوڑے سے اپنے مخالفین کو راہِ راست پر لانے کا خوگر ہے، دوسری طرف بھارت ہے جو اپنی معاشی پیاس بجھانے کیلئے روسی چشمہ تیل سے سیراب ہو رہا ہے، اور تیسری طرف روس ہے جو خاموشی سے اس کھیل کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کیا یہ محض تیل و تجارت کی داستان ہے یا اصل میں انا اور اقتدار کا معرکہ ہے؟ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھو، جب کسی قوم پر پابندیوں کے طوق ڈالے گئے تو وہ یا تو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گئی یا پھر نئی راہوں کے درکھلے۔

بین الاقوامی سیاست میں پابندی محض ایک معاشی ہتھکنڈہ نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسا کوڑا ہے جس سے طاقتور ممالک اپنے مخالفوں کو سیدھی راہ پر چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکا نے بھارت پر پابندیاں لگا کر گویا ایک پیغام دیا ہے کہ نئی دہلی اپنی تیل کی پالیسی میں آزاد نہیں مگر تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی قوم کو دبایا گیا تو اس نے کسی دوسرے دروازے پر دستک دی۔ آج بھارت کی نگاہیں چین کی طرف ہیں، گویا دشمنِ دیرینہ اب وقتی سہارا بننے جا رہا ہے۔ یہاں روسی صدر ولادیمیر پوتن کا کردار سب سے زیادہ معنی خیز ہے۔ کیا وہ مودی کی مشکل گھڑی کو اپنے مفاد کی سیڑھی بنا سکتے ہیں؟ سیاسی شطرنج میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک کی کمزوری دوسرے کا موقع بنی ہے۔

تاہم آج سے کچھ ماہ پہلے کسی نے بھی اس منظر نامے کے بارے میں سوچا تک نہ تھا کہ واشنگٹن کی سیاست نئی دہلی کے کوڑے بردار پر اس حال کو پہنچے گی۔ پابندیوں کی بجلی بھارت کی زمین کو جلانے اس شدت سے پہنچے گی اور بھارت اس کے جواب میں بیجنگ اور ماسکو کے گھنے جنگلات کے سایہ کیلئے فریاد کناں ہو جائے گا۔ آج امریکا نے بھارت پر قہر برسا یا ہے، لیکن یہ قہر شاید بیجنگ اور ماسکو کے دروازے پر ایک نئی دستک بن جائے۔ دشمنِ دیرینہ کبھی وقت کے مصلحتوں میں دوست بن جاتا ہے اور روس وہ تو صدیوں سے اپنی مصلحتوں کا محافظ رہا ہے، کیا عجب کہ وہ دہلی کی کمزوری کو اپنی قوت کا پل بنالے۔

تاریخ کا پہیہ ایک بار پھر وہی منظر دکھا رہا ہے جو عہدِ قدیم میں سلطنتوں کے زوال کے وقت دکھایا کرتا تھا۔ جب ایک طاقت اپنے کوڑوں اور پابندیوں سے دوسروں کو غلام بنانے پر نٹل جاتی ہے تو دوسری طاقتیں ان غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کیلئے دستک دیتی ہیں۔ آج امریکا نے بھارت پر پابندیوں کا طوق ڈالا ہے، لیکن یہ طوق شاید دہلی کو بیجنگ کے آستانے کی طرف دھکیل دے۔ اور پوتن — وہ مردِ آہن — خاموشی سے اس موقع کو اپنے فائدے کی سیڑھی بنا رہا ہے۔

یہ تاریخ کا وہی کھیل ہے جہاں دشمن کل کے، آج وقتی سہارا بن جاتے ہیں۔ اور سوال اب یہ ہے کیا پوتن اس فرصت کو اپنی شطرنج کی اگلی چال کیلئے استعمال کریں گے؟ کیا وہ مودی کی کمزوری کو اپنی طاقت کا زینہ نہیں بنالیں گے؟ یقیناً امریکا نے بھارت پر ٹیرف میں اضافہ اور تجارتی معاہدوں کو منسوخ کی شکل میں پابندیوں کی بجلی گرائی ہے۔ مگر بھارت اس بجلی کے جھٹکے سے بچنے کیلئے اپنے مردہ تن میں بیجنگ اور ماسکو سے معاشی حیات کا طلب گار بن کر اپنی کوششوں میں مصروف ہے۔ اور پوتن؟ وہ موقع کی تاک میں ہے، وہ دہلی کی کمزوری کو اپنی طاقت بنانا چاہتا ہے۔ سوال یہ ہے کیا بھارت دوسروں کی بساط کا مہرہ بنے گا یا اپنی تقدیر کا علمبردار؟

ٹرمپ کا 50 فیصد ٹیرف محض اعداد و شمار کا کھیل نہیں بلکہ ایک ایسا سیاسی ہتھیار ہے جو بھارت کی ریڑھ کی ہڈی پر رکھا گیا ہے۔ اس میں روسی تیل کی خریداری کی وجہ سے اضافی 25 فیصد ٹیرف بھی شامل ہے۔ اس فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کی برآمدی مصنوعات امریکی منڈی میں اپنی کشش کھو بیٹھیں گی۔ سوال یہ ہے کہ کیانی دہلی اس دباؤ کے آگے جھک جائے گا یا اپنی معیشت کیلئے نئے راستے نکالے گا؟ گویا دونوں اطراف مفادات کے اژدھے ایک دوسرے کو نگلنے کیلئے تاک میں ہیں۔

ٹرمپ نے جب سے بھارت پر ٹیرف کا کوڑا برسایا ہے تو گویا دہلی کے بازاروں میں کہرام مچ گیا ہے۔ ٹرمپ نے اعلان کیا کہ بھارت پر سخت اقتصادی قد عینیں عائد کی جائیں گی۔ یہ فیصلہ کسی معمولی اختلاف کا شاخسانہ نہیں بلکہ اس عالمی بساط پر ایک نیا مہرہ ہے۔ بظاہر یہ ایک سخت ضرب ہے، لیکن تاریخ کی گواہی ہے کہ بعض اوقات زخم بگڑ جائے تو زندگی بچانے کیلئے جسد سے علیحدگی ضروری ہو جاتی ہے، تو کیا اس کیلئے مودی کو سیاست کے منظر نامے سے غائب ہونا پڑے گا لیکن یہ بات تو طے ہے کہ بھارت کیلئے یہ فیصلہ زحمت بن گیا ہے کہ اس کی معیشت پر فوری دباؤ بڑھے گا، برآمدات مہنگی ہو جائیں درآمدی منڈیوں میں بھارتی مصنوعات کی مسابقت گھٹ جائے گی۔ لیکن بھارت اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے چین کے ساتھ جاری کشیدگی کی، اور میں نرمی کا خوشگوار دکھائی دے رہا ہے اور بھارت کو روس کی طرف زیادہ جھکاؤ کا جواز ملے گا اور چین کے ساتھ جاری کشیدگی میں بھی نرمی پیدا ہوگی۔ گویا ہر ضرب ایک نئے اتحاد کی راہ ہموار کر رہی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انڈیا اس کی کیا قیمت ادا کرے گا۔

اگر بھارت خطے میں سیاست کے اس یوٹرن میں کامیاب ہو جاتا ہے اور امریکی گھاؤ کو شفا میں تبدیل کرنے کی کوشش کر لیتا ہے تو سختی کے کوڑے میں نصرت کی جھلک حاصل کر سکتا ہے۔ آج ٹرمپ نے بھارت پر 50 فیصد ٹیرف کا بوجھ رکھا ہے۔ بظاہر یہ دہلی کیلئے زحمت ہے، لیکن اگر یہ زحمت اسے اپنی سمت نظر بدلنے پر مجبور کر دے، روس کے ساتھ رشتہ گہرا کر دے اور چین کے ساتھ کشیدگی کم کر دے تو یہی زحمت رحمت میں بدل سکتی ہے۔

وائٹ ہاؤس کی پریس سیکریٹری کیرولین لیویٹ نے اعلان کیا کہ بھارت پر یہ پابندیاں دراصل روس۔ یوکرین جنگ کے پس منظر میں لگائی گئی ہیں۔ یوں امریکا نے گویا ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی ہے، روس پر دباؤ اور بھارت کو سبق۔ لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ کیا واقعی بھارت روسی جارحیت کا خاموش شراکت دار ہے یا یہ محض مغربی سیاست کی ایک نئی علامت ہے؟

امریکی وزیر خزانہ سکاٹ بسنٹ نے الزام لگایا کہ بھارت روسی تیل خرید کر منافع کما رہا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ چین کے بارے میں انہوں نے یہی زبان استعمال نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ ان کے تیل کے ان پٹس متنوع ہیں۔ یہ دوہرا معیار بتاتا ہے کہ اصل ہدف بھارت ہے۔ کیا یہ الزام محض معاشی ہے یا سیاسی بھی؟ حقیقت یہ ہے کہ تیل اب صرف توانائی کا ذریعہ نہیں بلکہ عالمی سیاست کی شہ رگ ہے۔ جس کے ہاتھ میں تیل کی ٹنگی ہے وہی طاقت کی کنجی رکھتا ہے۔ کیا حالیہ بھارت کے خلاف امریکی اقدامات روس۔ یوکرین جنگ کے تناظر میں اٹھائے گئے ہیں؟ کیا یہ صرف جنگ کی تپش ہے یا مودی اور ٹرمپ کی اناؤں کا تصادم؟

وائٹنگٹن نے اعلان کیا کہ بھارت کو سزا روس۔ یوکرین جنگ کی وجہ سے ملی۔ لیکن کیا یہ جنگ صرف یوکرین کے کھیتوں میں لڑی جا رہی ہے؟ نہیں یہ جنگ دلوں کی جنگ ہے، عزت نفس کی ہے، اناؤں کی جنگ ہے، اور عالمی طاقتوں کے بین السطور فیصلوں کی جنگ ہے۔ یہ وہی جنگ ہے جس کی گونج قرآن نے "أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ حَمَّاءُ بَيْنَهُمْ" کے الفاظ میں بیان کی کہ اصل طاقت وہی ہے جو باطل کے سامنے سخت ہو اور اپنے اندر اتحاد قائم کرے۔

بھارت کے پاس یہ قوت نہیں، اسی لیے وہ دوسروں کے فیصلوں کا اسیر ہے۔ روسی تیل کی خریداری اور اس کی دوبارہ فروخت کا الزام امریکی وزیر خزانہ نے بھارتی حکومت پر لگایا، جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ بھارت منڈی کے منافع کی ہوس میں روسی توپوں کو بارود فراہم کر رہا ہے۔ اس کے جواب میں بھارتی سفارتکاری خاموش ہے، لیکن یہ خاموشی کسی رضامندی کی نہیں بلکہ شطرنج کی چال ہے۔

اس کے ساتھ ہی 50 فیصد ٹیرف کا اعلان ہوا—گویا ایک تازیانہ جو دہلی کی معیشت پر برسایا گیا۔ البتہ سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر ٹرمپ واقعی روسی جارحیت کے خاتمے کے خواہاں تھے تو الاسکا میں پوتن سے ملاقات کے بعد نرم لہجہ کیوں اختیار نہ کیا؟ شاید اس لیے کہ اصل تنازعہ تیل نہیں بلکہ کریڈٹ کا ہے۔ مودی کیلئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرائیں کہ جنگ بندی کا سہرا ٹرمپ کے سر بندھتا ہے۔ یوں معاملہ دونوں رہنماؤں کی انا کے درمیان اکھڑا ہوا۔

امریکی وزیر خزانہ نے بھارت پر انگلی اٹھائی کہ تم روسی تیل کے سوداگر ہو لیکن وہی مودی جو سینہ بھلا کر ٹرمپ کو "مائی فرینڈ" کہہ کر مخاطب ہوتے تھے، آج گودی میڈیا یہ الزام لگا رہا ہے کہ جب چین کی باری آئی تو نرم لہجہ اختیار کیا۔ یہی ہے مغرب کی سیاست کا اصل چہرہ جسے چاہا ملامت کا ہدف بنایا، جسے چاہا چشم پوشی سے نوازا۔ یہ محض تیل کا سوال نہیں، یہ انصاف کے پیمانوں کی جانچ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا گودی میڈیا ماضی کے آئینے میں اپنا داغدار چہرہ دیکھے تو یہی کام بھارت نے سوویت یونین ٹوٹنے پر اپنے پرانے حلیف سے کیا تھا تو اب اس پر آنسو بہانا بے سود ہے۔ بھارت پر تیل کا الزام لگا—کوڑے برسائے گئے—چین پر یہی الزام لگا—خاموشی اختیار کی گئی۔ بھارت یہ الزام بھی لگا رہا ہے کہ یہ انصاف نہیں، یہ طاقت کا کھیل ہے۔ یہی ہے مغرب کی سیاست ایک طرف کوڑا، دوسری طرف مکمل دبیز پردہ!

پیٹر ناوارونے بھارت پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ امریکی گاہک بھارتی سامان خریدتے ہیں اور بھارت انہی ڈالر سے روسی تیل خرید کر اسے دنیا بھر میں فروخت کرتا ہے۔ گویا بھارت کو روسی جارحیت کا بالواسطہ سہولت کار قرار دیا گیا۔ یہ زبان ظاہر کرتی ہے کہ امریکا بھارت کو محض ایک تجارتی حریف نہیں بلکہ ایک اخلاقی طور پر دھوکہ دہی اور گناہگار کردار کے طور پر سمجھتا ہے۔ پیٹر ناوارونے گویا دہلی پر فتوے کی ضرب لگائی ہے کہ بھارت امریکی ڈالر سے روسی توپوں کو بارود فراہم کر رہا ہے یہ الزام نہیں، یہ اخلاقی تختہ مشق اور مکافاتِ عمل ہے کہ جس پر دہلی کو باندھ کر کوڑے برسائے جا رہے ہیں۔ گویا بھارت کو مجرم ٹھہرا کر دنیا کے سامنے ننگا کیا جا رہا ہے۔

دوسری طرف تھنک ٹینک انٹرنیشنل نے بجا کہا ہے کہ مغرب کے نزدیک بھارت محض ایک "پینچنگ بیگ" ہے۔ روس اپنی حکمتِ عملی میں بھارتی زخموں کی پروا نہیں کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بھارت اور امریکا کا جھگڑا عارضی ہے، مستقل نہیں چنانچہ ماسکو کیلئے دہلی ایک ایسا شراکت دار ہے جسے کبھی اپنے مفاد کیلئے تھام لینا ہے اور کبھی چھوڑ دینا ہے جیسا بھارت نے اس سے کیا تھا۔

الاسکا میں ٹرمپ اور پوتن کی ملاقات کے بعد یہ تاثر ابھرا تھا کہ شاید بھارت پر سے اضافی ٹیرف ہٹالیا جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عالمی سیاست میں وعدے اور امیدیں اکثر ریت کی دیوار کی طرح گر جاتی ہیں۔ بھارت کی امیدیں اگرچہ برحق تھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کھیل میں اصل فیصلہ واشنگٹن اور ماسکو کے تعلقات پر ہوتا ہے، دہلی محض ایک مہرہ ہے۔



جو کل کلاں سیاسی منافرت میں بدل گیا تو یہ بوجھ غلامی کے دروازے تک لے جائے تو یہ اس کیلئے تباہی کا نشان ہو گا۔

یاد کریں وہ لمحہ جب الاسکا کی سرد فضاؤں میں ٹرمپ اور پوتن نے مصافحہ کیا تو مودی کے دل میں ایک نئی امید پھوٹ رہی تھی، کہ شاید نئی امید کا چراغ روشن ہو لیکن امید کے چراغ بجھ گئے، آس اور بھارتی آرزوؤں کا دیپ ٹمٹما کر ختم ہو گیا۔ وعدے ریت کے گھروندے تھے۔ ایک لہر آئی، سب بہا لے گئی۔ یہ سبق ہے کہ عالمی سیاست کے وعدے ریت کے گھروندے ہیں، ایک لہر آتی ہے اور سب بہا لے جاتی ہے۔ یہ سبق ہے کہ قومیں اگر دوسروں کے وعدوں پر اپنی تقدیر کا انحصار کریں تو ان کا انجام ہمیشہ مایوسی ہوتا ہے۔ بقول قرآن: **وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَاَتَمْسَکْهُمُ النَّارُ** اور جو لوگ ظالم ہیں، ان کی طرف مائل نہ ہونا، نہیں تو تمہیں (دوزخ کی) آگ آ لپے گی۔ یاد رکھو طاقتوروں کے وعدوں پر اعتماد کرنا اپنے چراغ کو دوسروں کے ہاتھ دینا ہے۔

اگر بغور دیکھا جائے تو امریکا کو روس یا چین سے اتنی رنجش، اتنی چھین نہیں، جتنی بھارت سے ہے۔ چین سے اتنا خوف نہیں، جتنا بھارت سے غصہ ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ اس کا جواب محض تیل نہیں بلکہ اس اعتماد کا ٹوٹنا ہے جسے واشنگٹن دہلی پر قائم کیے ہوئے تھا۔ بھارت ایک ایسا اتحادی سمجھا جاتا تھا جو مغرب کے قریب رہے گا لیکن روسی تیل کی خریداری نے گویا اس رشتے میں دراڑ ڈال دی ہے۔ جب اتحادی بے وفائی کرے تو زخم زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ یہ رنجش ایک ٹوٹے ہوئے اعتماد کا شاخسانہ ہے۔ یہ وہی اعتماد کا شیشہ ہے جو ٹوٹ گیا ہے۔ مغرب بھی سمجھتا تھا کہ بھارت ان کا اتحادی ہے، مگر دہلی نے روسی تیل کی خوشبو سونگھ لی۔ اور بس، یار انا بدگمانی میں بدل گیا اور اتحادی کی بے وفائی کا زخم سب سے گہرا ہوتا ہے۔ یہ زخم اعتماد کے ٹوٹنے کا زخم ہے۔ اصل تصادم تیل کا نہیں، انا کا ہے۔ ٹرمپ چاہتے تھے کہ امن کا سہرا ان کے سر بندھے، مودی نے انکار کیا۔ اور جب دو تاجداروں کی عزت نفس ٹکراتی ہے تو وہ زلزلہ پیدا ہوتا ہے جسے تاریخ برسوں یاد رکھتی ہے۔

یہ سوال اب زیادہ اہمیت اختیار کر رہا ہے کہ کیا ٹرمپ اور مودی کے درمیان جھگڑا صرف تیل کا ہے یا انا کا؟ آئیے، اصل راز کھولیں، یہ جھگڑا تیل کا نہیں، یہ تصادم اناؤں کا ہے۔ ٹرمپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ مودی نے جنگ بندی کا کریڈٹ انہیں نہیں دیا، ٹرمپ چاہتے تھے کہ جنگ بندی کا سہرا ان کے سر باندھا جائے کیونکہ مودی اور نیٹن یاہو کی پکار پر ہی ٹرمپ نے مداخلت کی تھی۔ مودی یہ قبول نہیں کر سکتے تھے کیونکہ گودی میڈیا نے اس جنگ میں مودی کو ساتویں آسمان کی فتح پر بٹھادیا تھا۔ مودی کیلئے اپنے عوام کے سامنے یہ تسلیم کرنا ممکن نہیں تھا کہ امن کا سہرا امریکا کو جاتا ہے۔ یوں معاملہ اناؤں کے تصادم میں بدل گیا ہے۔ اور یوں دو تاجداروں کی عزت نفس ٹکرا گئی۔ اور جب عزت نفس ٹکراتی ہے، تب فیصلے توپوں اور بندو قوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ یہی ہے اصل تصادم۔ یہی ہے وہ آگ جس نے سیاست کو سلگا دیا ہے۔ اور مودی کے قدموں کے نیچے سے اب بھارتی اقتدار کی زمین لرزہ بر اندام ہے۔

تاریخ کہتی ہے کہ قومیں اپنی عزت نفس پر قائم رہتی ہیں یا پھر بکھر جاتی ہیں۔ قوموں کی تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ عزت نفس پر لڑی جانے والی جنگیں سب سے شدید ہوتی ہیں۔ قوموں کے درمیان بڑے جھگڑے اکثر عزت نفس پر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی دونوں رہنما اپنی اپنی سیاسی بقا کیلئے ایک دوسرے کو جھکانے پر تلے ہیں۔ ٹرمپ کو اپنی برتری دکھانی ہے، ٹرمپ دین تو امریکا کی برتری کو دھچکا لگے گا۔ مودی کو اپنی چانکیہ سیاست بچانی ہے، مودی جھکیں تو عوامی غیرت ٹوٹے۔ یہ معرکہ اب محض اعداد و شمار کا نہیں رہا۔ یہ دلوں کی ضد اور ان کی کشمکش ہے۔ یہ معرکہ کسی تجارتی معاہدے سے زیادہ نفسیاتی اور سیاسی ہے۔ یہ وہ کھیل ہے جہاں دونوں کیلئے پسپائی زہر قاتل ہے۔

در اصل یہ وہ مقام ہے جہاں "لا غالب الا اللہ" کا سبق ہی اصل حل ہے۔ طاقتیں ٹوٹتی ہیں، مگر عزت اور وقار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قومیں اپنی عزت نفس پر زندہ رہتی ہیں یا پھر بکھر جاتی ہیں۔ یہ معرکہ اعداد و شمار کا نہیں، یہ معرکہ اب امریکی غیرت بن چکا ہے۔ اس فیصلے سے پیچھے ہٹنا گویا ٹرمپ سلطنت کی برتری کو دھچکا۔ یہی ہے اصل جنگ۔ تھنک ٹینک انٹنا سینٹر نے بالکل درست کہا ہے کہ بھارت مغرب کے نزدیک ایک پینچنگ بیگ ہے، حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہاں، یہ وہی حقیقت ہے جو دہلی کے سامنے کھڑی ہے۔ یقیناً بھارت کو وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ وہ پانچ دہائیوں تک روس کا طفیلی رہا لیکن جونہی روس پر برا وقت آیا تو اس نے ایک منٹ کی تاخیر کئے بغیر امریکی تلوارے چاٹنے میں عافیت سمجھی۔ اب پوتن کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ بھارت کو نقصان پہنچے، وہ اپنے مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔

پوتن بھارت کے زخموں کی پرواہ نہیں کریں گے، وہ صرف اپنے مفاد کی فکر کرتے ہیں۔ ٹرمپ کو بھارت کی عزت کی فکر نہیں۔ یہ وقت دہلی کیلئے غور کا ہے، کیا وہ ہمیشہ دوسروں کی بساط کا مہرہ رہے گا یا اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کرے گا؟ اب سوال یہ ہے کیا دہلی ہمیشہ دوسروں کے مہرے کی طرح کھیلا جائے گا یا اپنی تقدیر کا علمبردار بنے گا؟ بھارت کیلئے یہ لمحہ امتحان ہے کہ وہ کب تک دوسروں کی تھالی کا پیٹنگ بن کر رہے گا۔ یوں بھارت ایک ایسے کھیل کا حصہ ہے جس میں وہ خود فیصلہ ساز نہیں بلکہ دوسروں کے فیصلوں کا شکار ہے۔ چین اور پوتن کو پرواہ نہیں، ٹرمپ کو فکر نہیں۔ بھارت کب اپنی تقدیر کا چراغ خود جلائے گا؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ بھارتی عوام روس اور پاکستان کے تعلقات سے اتنے پریشان نہیں جتنے پاکستان اور امریکا کے تعلقات سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بھارت جانتا ہے کہ روس کے ساتھ تعلقات وقتاً فوقتاً بدلتے رہیں گے، لیکن امریکا کے ساتھ پاکستان کی قربت بھارت کیلئے ایک مستقل دیر پا خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ خوف بتاتا ہے کہ بھارت کی اصل فکر امریکا ہے، روس نہیں۔ یہ کمزوری ہے، کیونکہ جو قوم کسی ایک طاقت سے خوف کھا کر اپنی پالیسی بنائے، وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتی۔ یہ نفسیات بھارت کی کمزوری بھی ہے اور اس کی حکمت عملی کا آئینہ بھی۔ ان کے ذہنوں میں امریکا کا سایہ زیادہ بڑا ہے۔ یہ نفسیاتی غلامی ہے اور غلامی کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ آدمی طاقت کے سائے سے خوف کھانے لگے اور طاقت کے سائے سے لرزنے لگے۔

روس کا پاکستان اور طالبان کے ساتھ بڑھتا تعلق بھارت کیلئے نیا خطرہ ہے۔ یہ وہی حقیقت ہے جو عہد قدیم میں سلطنتوں نے دیکھی تھی کہ طاقتیں کبھی ایک جگہ ٹک کر نہیں رہتیں، ہمیشہ نئے تعلقات بنتے اور بگڑتے ہیں۔ خطے کی بساط مزید پیچیدہ تب ہوئی جب پاک-چین-افغان مذاکرات میں سی پیک کی توسیع کا اعلان ہوا۔ یہ اعلان نہ صرف اقتصادی مفہوم رکھتا ہے بلکہ سیاسی معنویت میں بھارت کیلئے ایک کاری ضرب ہے۔ وہ بھارت جو کبھی خطے میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا، اب اسے اپنے ہمسایوں کے اتحاد کے سائے میں دباؤ کا سامنا ہے۔

اسی دوران پاکستان اور روس کے بڑھتے ہوئے تعلقات بھارت کیلئے مزید پریشانی کا سامان ہیں۔ کبھی ماسکو اسلام آباد کو اسلحہ فراہم کرتا تھا، آج وہ طالبان کے ساتھ بھی دفاعی روابط بڑھا رہا ہے۔ گویا وہ وقت دور نہیں جب جنوبی ایشیا کی سیاست میں نئی صف بندیوں جنم لیں گی اور بھارت اپنے پرانے توازن کو کھو بیٹھے گا۔

الغرض، موجودہ حالات محض تجارتی اعداد و شمار یا تیل کے سودے کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی سیاست کے اس کھیل کا حصہ ہیں جس میں عزت نفس، انا، اور طاقت کے استعارے سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اگر ٹرمپ بھارت کو سزا دے رہے ہیں تو پوتن مسکرا رہے ہیں، اور اگر دہلی شطرنج کی نئی چال سوچ رہا ہے تو بیجنگ خاموشی سے اپنے تاش کے پتے سنبھال رہا ہے۔

آنے والا وقت بتائے گا کہ یہ امریکی سختیاں بھارت کیلئے زحمت ثابت ہوں گی یا رحمت۔ مگر فی الحال اتنا کہنا بجا ہے کہ عالمی سیاست کے اس مقتل میں بھارت ایک ہی وقت میں دوستوں کی امید اور دشمنوں کے شک کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ اور یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے اور سب سے بڑا امتحان بھی۔ یہ نئی صف بندی بھارت کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ جنوبی ایشیا کی سیاست میں بھارت اب تنہا ہوتا جا رہا ہے اور روس بھی اس تنہائی کو مزید گہرا کر رہا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جنوبی ایشیا کی سیاست میں روس ایک نئے کھلاڑی کے طور پر ابھر رہا ہے جو بھارت کو مسلسل دباؤ میں رکھے گا۔ جنوبی ایشیا کی سیاست میں بھارت اب تنہا ہوتا جا رہا ہے اور روس بھی اس تنہائی کو مزید گہرا کر رہا ہے۔ یہ نئی صف بندی بھارت کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ آنے والا وقت اسے خطے کی بساط سے بے دخل کر دے گا۔

پاک-چین-افغان مذاکرات میں سی بیک کی توسیع کا اعلان بھارت کیلئے ایک کڑا دھچکا اور ناقوس موت ہے۔ یہ اعلان خطے کی معیشت اور سیاست اب دہلی کے گرد نہیں گھومے گی بلکہ بیجنگ اور اسلام آباد کے محور پر گھومے گی، یہ وہ لمحہ ہے جب بھارت کا مرکزی کردار پیچھے ہٹ رہا ہے اور خطے کا نقشہ بدل رہا ہے اور بھارت کی مرکزی حیثیت ماضی کا قصہ بن رہی ہے کیونکہ اس کے اثر و سونخ میں کمی کا مطلب ہے کہ خطے کی معیشت اور سیاست اب دہلی کے گرد نہیں بلکہ بیجنگ اور اسلام آباد کے محور کی محتاج رہے گی۔ یوں بھارت کا مرکزی کردار پس منظر میں جا رہا ہے۔ یہ اعلان بھارت کیلئے ایک فیصلہ کن ضرب ہے۔

اے صاحبانِ فکر یہ کھیل تیل اور ٹیرف کا نہیں، یہ کھیل عزت و غیرت، انا اور وقار کا ہے۔ ٹرمپ دہلی کو سزا دے کر اپنا جھنڈا گاڑنا چاہتا ہے۔ مودی اپنے اقتدار کے چراغ کو بجھنے نہیں دینا چاہتا، پوتن مسکرا کر موقع کو نقد بنا رہے ہیں، اور بیجنگ خاموشی سے اپنی بساط پھیلا رہا ہے۔ تاریخ کا ورق چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ جو قومیں دوسروں کی شطرنج کے مہرے بنتی ہیں، وہ کبھی تاجدار نہیں بن سکتیں۔ سوال یہ ہے بھارت کب تک دوسروں کے فیصلوں کا شکار رہے گا، اور کب اپنی تقدیر کا علمبردار بنے گا؟

تاریخ ہمیشہ ان قوموں کو سرخرو کرتی ہے جو اپنی تقدیر کے فیصلے خود کرتی ہیں۔ اور قرآن کی صدا آج بھی گونج رہی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُعْزِزُ مَآ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُعْزِزُوا وَأَمَّا بِالذِّمَّةِ فَعَزَّزْنَا...

یہ پورا منظر نامہ بتاتا ہے کہ موجودہ بحران محض تیل اور ٹیرف کی کہانی نہیں بلکہ انا، عزت نفس اور عالمی سیاست کا ایک عظیم معرکہ ہے۔ امریکا اپنی طاقت کا سکہ جمانا چاہتا ہے، بھارت اپنی خود مختاری بچانا چاہتا ہے، روس موقع کا فائدہ اٹھا رہا ہے، اور چین خاموشی سے اپنے پتے سینے سے لگائے

بیٹھا ہے۔ تاریخ کا ورق ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب بڑے کھیل کھیلے جاتے ہیں تو چھوٹے ملک اکثر مہرے بن جاتے ہیں۔ اب یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مودی نے اس خطے میں جو کچھ بویا ہے، وہ فصل اسے ہر حال میں کاٹنی ہوگی کیونکہ قوموں کی تقدیر دوسروں کے وعدوں سے نہیں، اپنی غیرت کے چراغ سے بدلتی ہے۔

بروز منگل 9 ربیع الاول 1447ھ 2 ستمبر 2025ء

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَاتِلَع

قوموں کی زندگی میں کچھ دن محض تقویمی تاریخ نہیں ہوتے بلکہ ان کے وجود کی اساس اور ان کے شعور کی جڑیں بن جاتے ہیں بلکہ قوم کی روح میں ابدی کی تقسیم چراغ کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔ پاکستان کا قیام 1947ء میں محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک روحانی اور تہذیبی انقلاب تھا۔ برصغیر کے نتیجے میں کلمے کی بنیاد پر قائم ہونے والی اس معجزاتی ریاست نہ صرف جغرافیہ کی کلیروں کو بدلایا بلکہ دلوں کے دھڑکنے کا انداز بھی بدل دیا۔ یہ ریاست "لا الہ الا اللہ" کے پرچم تلے وجود میں آئی اور اسی کلمے نے اس کی بنیادوں کو وہ استحکام بخشا جو دنیا کی کسی اور تحریک کے نصیب میں نہ آیا۔

"لا الہ الا اللہ" کی بنیاد پر وجود میں آنے والی یہ ریاست اس عہد کی علامت تھی کہ مسلمان اپنی جداگانہ تہذیب، دینی تشخص اور نظریاتی اساس کے بغیر دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ پاکستان کا قیام 1947ء میں محض ایک سیاسی واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک روحانی اور تہذیبی انقلاب تھا۔ یہ ریاست "لا الہ الا اللہ" کے پرچم تلے وجود میں آئی اور اسی کلمے نے اس کی بنیادوں کو وہ استحکام بخشا جو دنیا کی کسی اور تحریک کے نصیب میں نہ آیا۔

لیکن جس دن یہ مملکت خداداد معرض وجود میں آئی، اسی دن سے اس کے دشمنوں نے اس کے خلاف سازشوں کے جال بننے شروع کر دیے۔ بھارت کے ہندو زعماء نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ ان کے نزدیک تقسیم ہند ایک عارضی واقعہ تھا اور پاکستان ایک "حادثہ" جسے جلد یا بدیر مٹا دینا ہے۔ بھارت، جس کے سینے پر پاکستان کا وجود ایک ناسور کی طرح تھا، نے ہر موڑ پر پاکستان کو مٹانے کی کوشش کی۔ کبھی براہ راست جنگ کے ذریعے، کبھی پراسیز اور دہشتگردی کے ذریعے، اور کبھی فطرت کے وسائل کو ہتھیار بنا کر۔

لیکن بھارت کے ہندو زعماء نے اس حقیقت کو کبھی تسلیم نہ کیا۔ ان کے نزدیک تقسیم ہند ایک عارضی واقعہ تھا اور پاکستان ایک "حادثہ" جسے جلد یا بدیر مٹا دینا ہے۔ کانگریس کے بڑے رہنما بارہا کہتے رہے کہ "پاکستان تاریخ کی ایک غلطی ہے"۔ اسی سوچ سے آگے چل کر "اکھنڈ بھارت" کا خواب پروان چڑھا۔ اس خواب کی وحشت یہ ہے کہ وہ صرف پاکستان ہی کو نہیں بلکہ نیپال، بھوٹان، سری لنکا، بنگلہ دیش اور یہاں تک کہ بحر ہند کے پانی سے جڑے ہر ملک کو "اکھنڈ بھارت" کا حصہ قرار دیتے ہیں۔ گویا خطے کے تمام ممالک کو اپنی توسیع پسندانہ ہوس کی بھینٹ چڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

قرآن نے ایسے ہی فتنہ پرور گروہوں کے بارے میں فرمایا:

وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَزُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا (البقرہ: 217)

وہ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے تاکہ اگر وہ طاقت پا جائیں تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔

پاکستان کے خلاف بھارت کی سازشیں اسی آیت کی عملی تصویر ہیں لیکن تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جب قومیں اپنے ایمان پر قائم رہیں، تو کوئی باطل قوت انہیں مغلوب نہیں کر سکتی۔

یہ داستان محض جنگوں کی روداد نہیں بلکہ ایمان اور کفر، ظلم اور عدل، طاقت اور عقیدے کی کشمکش کی کہانی ہے۔ یہ وہ تاریخ ہے جس میں بدرو حنین کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، جس میں کربلا کا استقامت بھرا سبق جھلکتا ہے، اور جس میں اقبال کی دعا اور قائد اعظم کا عزم گونجتا ہے۔ اس روداد میں پاکستان بار بار لہو میں نہایا، لیکن ہر بار ایک نئے حوصلے کے ساتھ ابھرا۔

6 ستمبر 1965ء کی رات تاریخ کے اوراق پر وہ سیاہ لمحہ ہے جب برصغیر کی سرزمین پر ظلم کی سیاہ آندھی نے پاکستان کے ننھے چراغ کو بجھانے کا خواب دیکھا۔ 6 ستمبر 1965ء کی وہ رات جب بھارت نے رات کی تاریکی میں پاکستان پر بزدلانہ یلغار کی، دراصل کفر اور ایمان کا ایک اور معرکہ تھا۔ بھارت، جو اپنے حجم، وسائل اور عسکری طاقت میں چھ گنا بڑا تھا، رات کی تاریکی میں حملہ آور ہوا۔ دشمن نے لاہور کو نشانہ بناتے ہوئے یہ سوچا کہ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے وہ اس شہر کو روند ڈالے گا۔ لاہور کی سرحدوں پر جب دشمن نے اپنی زبردست فوجی طاقت سے قدم بڑھایا تو اس کا یہ گھمنڈ، تکبر اور گمان تھا کہ اگلے چند گھنٹوں میں لاہور جہنما پار کے جھنڈوں کے نیچے ہو گا۔ اس کے خیال میں شاید یہ مٹی کا گھر ہے جو ایک آندھی کے جھونکے سے بکھر جائے گا لیکن وہ یہ بھول گئے تھے کہ یہ سرزمین بدر واحد کے وارثین کی ہے۔ پاک فوج کے جوانوں نے نہ صرف ٹینکوں کے سامنے اپنے جسموں کو ڈھال بنایا بلکہ پاک فوج کے جوان ٹینکوں کے سامنے اس طرح ڈٹ گئے جیسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یرموک کے معرکے میں روم کی فوجوں کے سامنے ڈٹے تھے۔

لیکن وہ دن کی روشنی تک نہ جان پایا کہ یہ شہر محض اینٹ اور پتھر کا مجموعہ نہیں، یہ عاشقانِ رسول ﷺ کے قلوب کا حصار ہے، یہ مومن کے ایمان کی قلعہ بندی ہے۔ جہاں کے کوچہ و بازار اقبال کی صداؤں اور مجاہدین کے خوابوں سے معمور ہیں۔ یہاں کے جوانوں نے ٹینکوں کے سامنے سینے بچھا دیے، یہاں کے سپاہیوں نے "اللہ اکبر" کی صداؤں سے دشمن کے دل دہلا دیے۔ یہی وہ دن تھا جب اقبال کا خواب اور قائد کا پیغام حقیقت کے لہو میں نہایا اور نئی زندگی کا اعلان ہوا۔

ہندو بنیاء یہ بھول گیا کہ لاہور محض سرسبز باغات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ ان مخلص عاشقوں کا شہر ہے جو وطن پر جان نچھاور کرنا ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ پاک فوج کے جوانوں نے نہ صرف ٹینکوں کے سامنے اپنے جسموں کو ڈھال بنایا بلکہ اس جنگ میں عوام نے بھی حیرت انگیز کردار ادا کیا۔ اس وقت پاکستان کے گلی کوچے "اللہ اکبر" کی صداؤں سے گونج اٹھے۔ گھروں کی عورتوں نے اپنے زیور بیچ کر محاذ کیلئے چندہ دیا، بچے فوجیوں کو پانی اور کھانے پہنچاتے رہے، اور پوری قوم "پاکستان زندہ باد" کے نعرے میں ایک آواز ہو گئی اور اس بھارتی جارحیت کے نتیجے میں پوری قوم ایک صف میں کھڑی تھی۔ مکار برہمن نہیں جانتا تھا کہ یہ سرزمین ایک نظریے پر قائم ہے، ایک کلمے کی بنیاد پر استوار ہے، اور اس کے سپوت وہی ہیں جن کی رگوں میں بدروحین کے شہ سواروں کا خون گردش کرتا ہے۔

وہ سترہ دن کی جنگ، جس میں دشمن نے بار بار یلغار کی، پاکستان کے جوانوں نے بڑھ چڑھ کر ہر وار کو سینے پر روکا۔ دشمن کی شکست ایسی تھی کہ آج تک اس کی پیٹھ اور منہ پر زخم ہر اے۔ سترہ دن کی جنگ کے بعد دنیا نے پاکستان کا پرچم پہلے سے زیادہ سر بلند دیکھا اور دشمن کے عزائم خاک میں مل گئے۔ اس دن بھارت کو یہ سمجھ آگئی کہ پاکستان محض جغرافیہ نہیں، یہ ایمان کا قلعہ ہے۔ لیکن زخم خوردہ کمینہ و مکار برہمن دشمن آج تک اس شکست فاش کو فراموش نہ کر سکا اور ہر نئے مکروہ حربے کے ساتھ پاکستان کے وجود کو مٹانے کے درپے رہا۔

اس شکست نے بھارت کے منہ پر ایسی کالک ملی اور دل پر ایسا زخم لگایا کہ وہ آج تک نہ تو چہرے کی سیاہی دور ہوئی اور نہ ہی زخم بھر سکا لیکن اسی کے ساتھ دشمن کے اندر ایک انتقام کی آگ دہکنے لگی، جو آج تک بجھی نہیں۔ یہ وہی جذبہ تھا جس کا ذکر قرآن نے کیا:

اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُذْهِبْ اَقْدَامَكُمْ (محمد: 7)

اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

سترہ دن کی اس جنگ کے بعد دشمن پسپا ہوا۔ اس کے دل پر وہ زخم لگا جو آج تک رس رہا ہے لیکن ساتھ ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ براہِ راست جنگ سے ہٹ کر سازشوں کے نئے دروازے کھولے جائیں گے۔

وقت گزرا، لیکن دشمن کی سازشیں نہ رکیں۔ اس نے جان لیا کہ میدانِ جنگ میں پاکستانی شیر اس کو روند ڈالیں گے، جب براہِ راست میدان میں بھارت کو ناکامی ہوئی، تو اس نے اندرونی انتشار کو ہتھیار بنایا۔ جب میدانِ جنگ میں اس کی ایک نہ چلی، تو اس نے مکار بزدلوں کی طرح پاکستان کو اندر سے توڑنے کی کوشش کی۔ لہذا اس نے نئے محاذ کھولے۔ دہشتگردی کے اندھیروں کو پاکستان پر مسلط کر دیا گیا۔ بلوچستان، خیبر پختونخواہ اور ملک کے دیگر گوشے خون آلود کر دیئے گئے۔ بلوچستان، خیبر پختونخواہ کو بالخصوص ہدف اور ملک کے دیگر حصوں کو بالعموم دہشتگردی کا نشانہ بنادیا۔ وہاں دہشت گردی کی آگ بھڑکائی گئی۔ مساجد کو نشانہ بنایا گیا، مدارس کے طلبہ کو شہید کیا گیا، اور معصوم پاکستانیوں کے خون سے بازاروں کی گلیاں سرخ کر دی گئیں۔ یہ دہشتگرد محض بدوق بردار نہ تھے، یہ وہ بھارتی پراکسیز تھیں جنہیں پاکستانی قوم آج "فتنہ خوارج" اور "فتنہ ہند" کے نام سے پہچان چکی ہیں۔



ان خوارج نے مسلمانوں کے ہی خون کو حلال سمجھا، مسجدوں میں معصوموں کو شہید کیا، بازاروں میں خون کی ندیاں بہائیں اور دنیا نے دیکھا کہ یہ سب کس کے اشارے پر ہو رہا تھا۔ دشمن نے سوچا کہ اگر براہِ راست حملہ کامیاب نہیں ہوتا تو اندرونی انتشار پیدا کیا جائے لیکن وہ یہ بھول گیا کہ جس قوم نے ہجرت کے بعد بھی بدرجہا جیتی، احد کے زخم سہہ کر بھی زندہ رہی، اور کربلا کے امتحان میں بھی صبر کا جھنڈا بلند رکھا، وہ قوم دہشتگردی کی اس آگ میں بھی اپنی شناخت کھونہ سکے گی۔

یہی وہ وقت تھا جب دنیا نے دیکھا کہ "فتنہ خوارج" ایک بار پھر سراٹھارہا ہے۔ قرآن نے جس گروہ کو "شر الدواب" کہا تھا، وہی گروہ مسلمانوں کا خون بہانے میں پیش پیش تھا۔ یہ دہشتگرد اپنے آپ کو اسلام کا داعی کہلاتے تھے، لیکن درحقیقت وہ دشمن کے ایجنڈے کے تحت کام کر رہے تھے۔ یہ وہی خوارج تھے جن کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا:

يَخْرُجُ فِي آخِرِ الزَّمَانِ قَوْمٌ أَحْدَاثُ الْأَسْنَانِ، سُفَهَاءُ الْأَحْلَامِ، يَقُولُونَ مِنْ خَيْرِ قَوْلِ الْبَرِيَّةِ، يَقْرَأُونَ الْقُرْآنَ لَا يُجَاوِزُ تَرَاقِيهِمْ، يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ كَمَا يَمْرُقُ السَّهْمُ مِنَ الرَّمِيَّةِ (صحیح بخاری)

"آخر زمانے میں ایک قوم نکلے گی جو قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہ اترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔" یہ دہشتگرد انہی خوارج کی عملی شکل تھے۔ وہ مسلمانوں کے خون کو حلال سمجھتے، اور دشمن کے اشاروں پر پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑتے۔ لیکن پاکستان نے صبر، حوصلے اور قربانی کے ساتھ اس فتنے کو بھی ناکام بنایا۔

بھارت کی پراکسیز نے پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش کی، لیکن قوم نے ان اندھیروں میں بھی امید کا چراغ جلانے رکھا۔ فوج، عوام اور ریاستی ادارے مل کر اس فتنے کے مقابلے پر ڈٹ گئے اور تاریخ نے پھر ایک بار گواہی دی کہ ایمان کی بنیاد پر قائم قوم کو دہشتگردی کی دھول میں چھپایا نہیں جاسکتا۔ مئی 2025ء ایک اور معرکہ بھی گواہی دے گا اور تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔ دشمن نے ایک بار پھر پاکستان کو کمزور کرنے کا خواب دیکھا۔ بھارت نے بڑے زور و شور سے اسرائیل کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے پاکستان کو ایک بار پھر کچلنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کا مکمل منصوبہ بنایا۔ اس نے جدید اسلحے اور ٹیکنالوجی پر بھروسہ کیا لیکن یہ بھول گیا کہ اصل طاقت ایمان ہے، نہ کہ توپ اور ٹینک لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا اور نتائج اس

کے گمان کے برعکس نکلے۔

اسرائیل کے ساتھ مل کر اس نے پاکستان پر یلغار کی فاش غلطی تو کر لی، اپنے جدید ترین اسلحے اور اسرائیلی ٹیکنالوجی پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مریوں کو بھی بڑے تکبر سے اطلاع دی کہ اگلے چند گھنٹوں میں پاکستان گھنٹوں اور منہ کے بل گر کر معافی کا طلب گار ہو کر غلامی اختیار کر لے گا لیکن جب پاک فوج کے جوان "اللہ اکبر" کے نعروں کے ساتھ میدان میں اترے تو دشمن کے ٹینک اور طیارے سب خاک چاٹنے لگے۔ اسرائیلی اسلحہ، جدید ٹیکنالوجی، اور پراپیگنڈے کے طوفان بھی پاکستانی جوان کے عزم کے آگے ریزہ ریزہ ہو گئے۔ پاکستانی جوانوں نے اس معرکے میں جس جرات کا مظاہرہ کیا، وہ ہمیں یرموک اور قادسیہ کی یاد دلاتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے وہ الفاظ زندہ ہو گئے کہ اللہ کے سپاہی جب اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں تو دنیا کی کوئی فوج ان کا راستہ نہیں روک سکتی۔ تاریخ نے خود گواہی دی کہ جس سرزمین کے پشت پر ایمان کی ڈھال ہو، اس پر باطل کا وار کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

دنیا نے حیرت کے ساتھ دیکھا کہ اسرائیلی حمایت کے باوجود بھارت کو منہ کی کھانی پڑی۔ بالآخر اس کی قیادت کو امریکی صدر ٹرمپ سے سیز فائر کی بھیک کرنی پڑی۔ یہ لمحہ بھارت کی تاریخ کا سب سے بڑا داغ ہے، جب اس کی فوجی طاقت اور عالمی حمایت کے باوجود وہ پاکستان کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔ یہ لمحہ بھارت کی تاریخ کا سیاہ ترین لمحہ تھا۔ اسرائیلی مدد کے باوجود یہ رسوائی اس بات کا اعلان تھی کہ پاکستان کے خلاف ہر اتحاد ناکام ہو گا۔ تاریخ کے صفحات پر یہ لمحہ اس کیلئے قیامت صغریٰ ہے، اور پاکستان کیلئے ایک اور غازیانہ فتح کا عنوان۔

جب دشمن عسکری اور دہشتگردی کے محاذ پر ناکام ہوا تو اس نے فطرت کے سب سے قیمتی تحفے، یعنی پانی کو ہتھیار بنانے کی کوشش کی۔ آبی دہشتگردی کا ایک نیا باب کھلا۔ بھارت نے اپنے ڈیموں کے پانی کا رخ موڑ کر پاکستان کو سیلابوں میں ڈوبنے کی سازش کی۔ ڈیمز کے پانی کو روک کر اور پھر بارشوں کے موسم میں رخ بدل کر پاکستان کو سیلابوں میں غرق کرنے کی سازش کی گئی۔ گرمیوں میں پانی روک لیا گیا تاکہ پاکستان کے کھیت پیاس سے مرجائیں، اور بارشوں میں یکدم پانی چھوڑ کر بستیاں ڈوب دی گئیں۔ یہ آبی دہشتگردی محض پاکستان کے خلاف نہیں بلکہ بین الاقوامی قوانین کے خلاف بھی تھی۔

دنیا کے مہذب معاشرے پانی کو زندگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، لیکن بھارت نے اسے موت کا ہتھیار بنا دیا۔ لیکن پاکستان کے عوام نے ان آفات کو بھی صبر اور حوصلے سے سہہ لیا۔ بھارت نے دنیا کے سامنے اسے "قدرتی آفت" کا نام دیا لیکن ہر صاحب بصیرت نے جان لیا کہ یہ دراصل دشمن کی نئی سازش ہے۔ وہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ قدرتی آفات کا بہانہ بنا کر اپنی سازش چھپالے گا، لیکن حقیقت آخر کار سامنے آہی گئی۔ وہ اپنے تئیں مکاری کے اس سراپ میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ پانی کے سیلاب سے ایک نظریہ کو بہالے جائے گا مگر وہ نہیں جانتا کہ کلمہ حق کی بنیاد کو کوئی طوفان مٹا نہیں سکتا۔

یہ وہی پرانا حربہ ہے جو فرعون نے نیل کے پانی پر قبضے کا خواب دیکھا تھا لیکن بالآخر اسی نیل نے اسے غرق کیا۔ بھارت کی آبی دہشتگردی بھی اسی فرعونی روش کی یاد دلاتی ہے۔ قرآن نے فرعون کے انجام کے بارے میں فرمایا:

فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ (النازعات: 25) پھر اللہ نے اسے دنیا اور آخرت دونوں کیلئے عبرت کا نشان بنا دیا۔

یہ آیت اس بات کی ضمانت ہے کہ جو بھی قوم فطرت کے نظام سے کھیلنے کی کوشش کرے گی، وہ خود اس کے عذاب میں گرفتار ہوگی۔

مودی نے پاکستان کو کمزور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مودی نے اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھا کہ جس امریکا پر اس نے تکیہ کیا تھا، وہ اب کھل کر اس کی پالیسیوں سے کنارہ کشی کر رہا ہے۔ مودی، جو کبھی واشنگٹن کے دروازے پر سر رکھتا تھا، آج ٹرمپ کی بے رخی دیکھ کر چین اور روس کی طرف دیکھ رہا

ہے۔ امریکی صدر نے نہ صرف اسے دھتکارا بلکہ بھارت میں ہونے والی "کواڈ" میٹنگ میں نہ صرف شرکت سے انکار کیا بلکہ بھارت کی پالیسیوں پر کھلے لفظوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب بھارت کیلئے عالمی سیاست کے دروازے بند ہونے لگے۔

مودی کیلئے یہ لمحہ شکست و ریخت کا تھا۔ اب وہ اپنی کھوئی ہوئی سیاسی عزت کو بچانے کیلئے روس اور چین کے در پر جا بیٹھا ہے۔ ایسے میں روس اور چین کے سامنے ہاتھ پھیلا نا اس کی مجبوری بن گیا لیکن یہ بھی ایک عارضی سہارا ہے، کیونکہ روس اور چین کی اپنی ترجیحات ہیں، اور یہ دونوں ممالک بھارت کو محض ایک مہرہ اور آلہ سمجھتے ہیں، نہ کہ کوئی حلیف اور نہ کوئی حقیقی شراکت دار۔ بھارت کیلئے یہ تبدیلی ایک ایسی ڈوبتی کشتی ہے جس کا سہارا بھی غیر یقینی ہے۔

ٹرمپ کے اس رویے کے بعد مودی کو عوامی نفرت اور دباؤ نے اس کے اوسان خطا کر دیئے اور یہ وہی وقت ہے جب "اکھنڈ بھارت" کا خواب پھر سے اس کے لبوں پر آنے لگا۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ بحر ہند کے ساحل سے جڑے تمام ممالک — سری لنکا، نیپال، بھوٹان، مالدیپ، حتیٰ کہ پاکستان تک — سب "اکھنڈ بھارت" کا حصہ ہیں۔ یہ سوچ دراصل چانکیہ کے اس فلسفے کا تسلسل ہے جس میں طاقت اور دھوکہ ہی سیاست کے ہتھیار ہیں لیکن تاریخ اس خواب کی بار بار نفی کر چکی ہے۔ محمود غزنوی کے حملے ہوں یا احمد شاہ ابدالی کی یلغار، بھارت ہمیشہ بیرونی طاقتوں کے سامنے کمزور ثابت ہوا۔ آج بھی اس کا "اکھنڈ بھارت" کا محض سراپ بھارت کے جلد ٹوٹنے کا آغاز بھی ہے جو مودی کے ہاتھوں انجام تک پہنچے گا۔

ٹرمپ نے بھارت کی پالیسیوں پر کڑی تنقید اور پاکستان پر بھارتی آبی جارحیت کو کھلے الفاظ میں مسترد کرتے ہوئے کہا کہ امریکا روس اور چین کے اتحاد سے خوفزدہ نہیں۔ اس بیان کا اصل مخاطب بھارت تھا۔ گویا بھارت کو واضح پیغام دے دیا کہ اس کی جارحانہ روش ناقابل قبول ہے۔ وہ دنیا کے سامنے روس اور چین کے صدور کے ساتھ تصویریں بنوا کر امریکا کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مودی کا یہ اوجھا عمل درحقیقت وہ ایک تنہا ریاست کا ہے، جو اپنی ناکامیوں کو چھپانے کیلئے دنیا کے سامنے جھوٹی نمائش کر رہا ہے۔ یہ پیغام دراصل بھارت کیلئے ایک تنبیہ تھا کہ حقیقت کو چھپا نہیں سکتا۔

دنیا کے سامنے بھارت کا اصل چہرہ ابھر آیا ہے۔ اس کے ہتھکنڈے، اس کی پراسیز اور اس کی آبی دہشتگردی سب بے نقاب ہو چکی ہیں۔ پاکستان کے خلاف ہر سازش ناکام ہوئی ہے، اور دنیا کے ضمیر نے بھارت کو ایک جارح ملک کے طور پر پہچان لیا ہے۔ بھارت کی یہ پالیسی خود اس کیلئے وبال جان ہے۔ امریکانے واضح کر دیا کہ وہ بھارت کی جارحانہ روش کا حامی نہیں۔ گویا عالمی سیاست میں بھارتی تنہائی اور زوال کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ اور پاکستان، اپنی مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود، دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

پاکستان کی تاریخ ایمان، قربانی اور حوصلے کی کہانی ہے۔ پاکستان کی یہ تاریخ دراصل ایمان، قربانی اور عزم کی کہانی ہے۔ 1965ء کی جنگ سے لیکر 2025ء کے معرکوں اور سازشوں تک دشمن نے بار بار اسے مٹانے اور پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پاکستان ایک نئے حوصلے کے ساتھ ابھرا۔ کبھی جنگ کے میدان میں، کبھی دہشتگردی کے اندھیروں میں، کبھی پانی کے طوفانوں میں، اور کبھی عالمی سیاست میں لیکن ہر بار ناکام ہوا، ہر سازش بے نقاب ہوئی، اور ہر حملہ پاکستان کیلئے نئی حیات کا پیغام بن گیا۔ ہمیشہ پاکستان کا پرچم بلند رہا۔

یہ ملک محض سرحدوں کا نام اور محض جغرافیہ نہیں بلکہ کلمہ کی بنیاد پر ایک نظریہ ہے۔ یہ وہ خواب ہے جس کی تعبیر اور تکمیل قائد اعظم کی جدوجہد اور عزم کے ساتھ معرض وجود میں آئی، اور یہ شہداء کے خون کی امانت ہے۔ اسی لئے دشمن کی ہر سازش ناکام ہو گئی، اور پاکستان آج بھی "لا الہ الا اللہ" کی بنیاد پر سینہ سپر ہے قرآن کی وہی آیت آج بھی اس قوم کی بنیاد ہے: **كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ: 249)**

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔

پاکستان کا وجود اسی آیت کا زندہ ثبوت ہے۔ دشمن کے تمام ہتھیار، تمام سازشیں، اور تمام خواب ہمیشہ ناکام ہوں گے کیونکہ یہ سرزمین "لا الہ الا اللہ" کے نام پر بنی ہے، اور یہ پرچم قیامت تک سر بلند رہے گا۔ پاکستان آج بھی اپنی شناخت پر قائم ہے۔ یہ داستان ہمیں سبق دیتی ہے کہ جب قوم اپنے ایمان پر ڈٹ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے شکست نہیں دے سکتی۔ پاکستان کی یہ سرزمین ہمیشہ قائم رہے گی، کیونکہ یہ کلمہ حق پر قائم ہے۔ اور جو قوم کلمہ حق کو اپنی بنیاد بناتی ہے، اس کے خلاف باطل کے تمام ہتھیار ہمیشہ ناکام رہتے ہیں۔

بروز جمعۃ المبارک 12 ربیع الاول 1447ھ 5 ستمبر 2025ء

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

آج کا دن... صرف ایک تاریخ کا نشان نہیں... بلکہ ایک روحانی اور فکری جشن ہے۔ آج کا دن محض ایک تاریخ کا نشان نہیں، بلکہ ایک روحانی اور فکری جشن ہے۔ آج کا دن صرف ہمارے ملک کے جغرافیائی وجود کی خوشی کا وہ دن ہے جو مسلمانوں کی قربانیوں، استقلال اور اتحاد کی بدولت ممکن ہوا۔ پاکستان ایک معجزہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا، اور یہ معجزہ صرف ہمارے اہل ایمان کے اتحاد اور قربانی کی بدولت ممکن ہوا۔ پاکستان، یہ معجزاتی ریاست، صرف سرزمین کی بنیاد پر نہیں بلکہ قربانی، اتحاد، اور اسلامی شعور کی بنیاد پر وجود میں آئی۔ ہر گوشہ، ہر پتھر، ہر گلی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ یہاں ایک خواب حقیقت میں بدلا۔ پاکستان صرف ایک سرزمین نہیں، بلکہ ایک معجزہ ہے، جس کی بنیاد قرآن و سنت کے اصولوں، اقبال کے نظریات اور قربانی کے جذبے پر رکھی گئی ایک خواب اور پیش گوئی، قائد اعظم کی قیادت اور لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کا ثمر ہے۔ بقول اقبال ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے

یہ صرف ایک شعر نہیں، بلکہ ایک عملی اصول ہے جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر مسلمان کی اولین ذمہ داری اس کے ایمان، تہذیب اور وطن کی حفاظت ہے۔ یہ ذمہ داری صرف ایک فوجی فرض نہیں، بلکہ علم، اخلاق اور بصیرت کی بنیاد پر بھی لازم ہے۔ یہ محض الفاظ نہیں... یہ ایک عملی اصول ہے۔ ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ یہ شعر نہیں، بلکہ ایک عملی اصول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر پاکستانی کی اولین ذمہ داری ایمان، تہذیب اور وطن کی حفاظت ہے۔ یہ ذمہ داری صرف فوج کی ہی نہیں بلکہ علمی، اخلاقی، اور فکری طور پر بھی لازمی ہے۔ آج کا دن، پاکستان کی عظمت اور بقا کی یاد دلاتا ہے، جب ایک قومی جذبے اور مسلم اتحاد نے تاریخ کے صفحات میں روشن باب رقم کیا۔ علامہ اقبال کے یہ محض الفاظ نہیں بلکہ ایک ایسی فرمانبرداری اور قربانی کی پکار ہے جو ہر مسلمان کے دل میں زندہ رہنی چاہیے۔

پاکستان کی بنیاد ایک طویل اور صبر و تحمل کی جدوجہد کے بعد رکھی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کی خاطر قربانی دی۔ برصغیر کے مسلمانوں نے صدیوں تک اپنی پہچان کیلئے جدوجہد کی۔ آزادی کی راہیں خون سے سینی گئیں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے مذہبی، ثقافتی اور سیاسی حقوق کیلئے جدوجہد کی۔ یہ وہ قوم تھی جو قرآن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اپنی پہچان کو محفوظ رکھنا چاہتی تھی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان صرف ایک جغرافیائی حدود نہیں، بلکہ ایک نظریہ، ایک معجزہ ہے، جسے قرآن کریم نے ہمارے لیے مقدر فرمایا لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہمیں کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ قرآن کریم نے ہمیں اتحاد کی اہمیت بتائی ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**، یعنی اللہ کے رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور بٹو۔ یہی رسی ہمیں ایک قوم اور ایک مقصد میں باندھتی ہے۔

یہ اتحاد ہی ہمیں مضبوط بناتا ہے، اور ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہماری طاقت، ہماری شناخت، اور ہماری بقا اسی میں مضمر ہے۔ ہماری طاقت، ہماری شناخت، اور ہماری بقا اسی میں مضمر ہے۔ پاکستان اسی اتحاد کی صورت میں ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آیا۔ یہ اتحاد کی طاقت تھی جس نے ہمیں غلامی کے سائے سے نکال کر ایک روشن مستقبل کی طرف گامزن کیا۔ پاکستان صرف سرزمین نہیں، بلکہ ایک نظریاتی مشعل راہ اور ایک اخلاقی فرض ہے۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ وہ اپنی تہذیب، اپنی زبان، اور اپنی دینی پہچان کو زندہ رکھیں۔ وہ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ مسلمان کی سب سے بڑی طاقت اس کا اتحاد ہے۔ ان کے اشعار صرف شاعری نہیں، بلکہ مسلمانوں کیلئے فکری مشعل راہ ہیں۔ علامہ اقبال نے مسلمانوں کو یہ شعور دیا کہ وہ

صرف جسمانی آزادی تک محدود نہ رہیں، بلکہ اپنے فکری اور روحانی وجود کو بھی آزاد کریں۔ ان کا تصور پاکستان صرف ایک ریاست نہیں، بلکہ ایک فکری و روحانی منزل تھا۔ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ خودی کو بلند کرنا اور اللہ کی رضا کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ انہوں نے فرمایا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اپنی ذات کو مضبوط کرنا اور اللہ کی رضا کے مطابق عمل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ یہ کلمات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہماری قومی بقا اور عظمت اسی میں مضمر ہے کہ ہم اپنے اندر مضبوطی پیدا کریں، علم حاصل کریں، اور اپنی دینی و ثقافتی اقدار کو زندہ رکھیں۔ اقبال ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ایک مضبوط خودی ہی قوم کو بقا اور عظمت کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمیں اپنی خودی... اپنے شعور... اور ایمان کو بلند کرنا ہو گا۔

تاریخ کا بانی، فکری تمکنت اور لسانی آراستگی کا حسین امتزاج ایک ایسے سبق کی طرح ہے جس کا ازبر یاد رہنا ہماری ذمہ داریوں شامل ہے۔ موجودہ حالات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ آزادی کا تحفظ فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ علم، اخلاق اور بصیرت کا ساتھ بھی ضروری ہے۔ قوم کی بقا کا راز صرف سر زمین میں نہیں، بلکہ علم، تربیت اور اخلاق میں مضمر ہے۔ قوم کی بقا اور عظمت آزادی کی راہوں کو روشنی بخشتے ہیں۔ قومیں صرف زمین پر نہیں جیتی جاتی، بلکہ دلوں، ذہنوں اور روحوں میں بستی اور زندہ رہتی ہیں۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ قومی شعور کو زندہ رکھے۔

ہمیں یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ قوم کی بقا کیلئے صرف دفاع کی ضرورت کے ساتھ ثقافت، ادب اور زبان کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے کیونکہ علم و ادب کے چراغ جلانے سے قوم کی روح زندہ رہتی ہے۔ قوم وہ ہے جو اپنی زبان کی مٹھاس اور ادب کی روشنی سے زندہ رہے۔ یعنی ہمارے افواج کے ساتھ ساتھ، ہمارا ادب، ہماری زبان، اور ہماری تہذیب بھی وطن کی حفاظت کا ایک مضبوط حصہ ہیں۔ اگر ہم اپنی تہذیب کو بھی بچانے کی فکر کریں تو دشمن کبھی ہمیں کمزور نہیں کر سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان دنوں سوشل میڈیا پر دشمن کی پھیلائی باتوں کا یقین کرنے کی بجائے ان کی سازشوں سے باخبر رہیں کہ اس حالیہ پاک بھارت جنگ کے بعد دشمنوں کی توپوں کا رخ سوشل میڈیا پر ہماری نوجوان نسل کو اپنی ہی فوج کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈہ میں شب و روز کام کر رہا ہے تاکہ وہ کسی طریقے سے اپنی شکست اور ہزیمت کا بدلہ لے سکیں۔ یاد رکھیں کہ ہمارا ادب، ہماری زبان، اور ہماری ثقافت... وطن کی حفاظت کا نہ صرف ایک مضبوط حصہ ہیں بلکہ آج بھی ہمارے لئے چراغِ راہ ہیں۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ پاکستان کی بنیاد ایک اسلامی نظریے پر رکھی گئی۔ پاکستان ایک اسلامی ریاست کے طور پر وجود میں آیا، اور اس کی بقا کا دار و مدار ایمان، اتحاد اور اسلامی اصولوں پر ہے۔ قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہر مسلم کا فرض ہے کہ وہ اسلام دشمن قوتوں سے خبردار رہے، اپنی زندگی اور قوم کو اللہ کی رضا کے مطابق سنوارے۔ یاد رکھیں کہ فتح و کامیابی اللہ کی طرف سے ہے، اور اس کیلئے ہمیں اپنی جان و مال، علم اور کردار کو مضبوط کرنا ہو گا۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی زندگی، کردار اور اعمال کے ذریعے اسلام دشمن قوتوں سے خبردار رہیں اور پاکستان کو ایک مضبوط، اسلامی نظریہ پر قائم رہنے والا ملک بنائیں۔ اسلام دشمن قوتوں سے خبردار رہنا، اپنے کردار، اپنی نظریاتی اور اخلاقی تربیت کو مضبوط کرنا، اور اپنی زندگی کو دینی اصولوں کے مطابق ڈھالنا ہر مسلمان کی ذمہ داری اور ہمارے فرض کا حصہ ہے۔

حال ہی میں ہماری افواج نے شجاعت، اتحاد اور ایمان کے ذریعے دشمن کے عزائم کو خاک میں ملا دیا۔ یہ فتح صرف فوجی طاقت کی نہیں، بلکہ قومی اتحاد، ملی

جذبہ، قربانی اور اللہ پر یقین اور ایمان کی بدولت حاصل ہوئی۔ ہمارے شہداء کی قربانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ پاکستان کی حفاظت ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ ان کی قربانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ قومیں شہداء کے خون سے جنم لیتی ہیں اور قربانی سے زندہ رہتی ہیں۔ قرآن فرماتا ہے وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ یعنی فتح صرف اللہ کی طرف سے ہے۔

ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ دشمن کبھی بھی غافل نہیں ہوتا۔ لہذا ہمیں نہ صرف فوجی، بلکہ اقتصادی، تعلیمی اور فکری محاذ پر بھی مضبوط رہنا ہو گا۔ ہر شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ذاتی اور قومی زندگی میں اسلام کی تعلیمات کو اپنائے اور اپنی سر زمین کی حفاظت کرے۔ ہم نے اقبال کے فلسفے سے سیکھا ہے کہ خودی، اتحاد اور قربانی ہی قوم کو مضبوط بناتے ہیں۔ یعنی ہر فرد کی ذاتی اور اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ وطن اور دین کی حفاظت کرے۔ اس لیے نہ صرف فوج بلکہ ہر شہری کو اقتصادی، تعلیمی، اور فکری محاذ پر مضبوط رہنا ہو گا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان کی سب سے بڑی طاقت اس کا اتحاد ہے۔

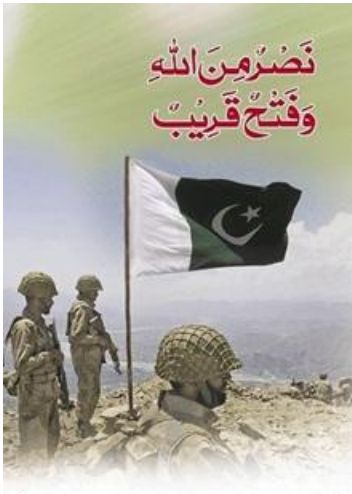
ہر شہری کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانے اور اسلام کی حفاظت میں اپنا کردار ادا کرے۔ پاکستان ایک معجزاتی ریاست ہے۔ قرآن نے فرمایا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْذِرُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَانْقُضُوا إِلَهُ إِنْ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ: مومنو! (کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو اور خدا سے ڈرتے رہو۔ بے شک خدا استغاثا جانتا ہے۔

ہمیں اپنے اعمال اور قربانیوں میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھنا ہے۔ پاکستان کی سر زمین پر ہم نے اللہ کی مدد سے اپنی تقدیر خود لکھی۔ یہاں اسلامی اصولوں کے مطابق معاشرہ قائم کرنا ہے، اور ہمیں اس کی حفاظت کرنی ہے۔ ہمیں اپنے اعمال اور قربانیوں میں اللہ کی رضا کو مقدم رکھنا ہے۔ یہ نعمت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ وطن کی حفاظت اور ترقی ہر مسلمان کی مقدس ذمہ داری ہے۔ آج، اس یوم آزادی پر، ہمیں اقبال کے اس شعر کو صرف یاد نہیں کرنا بلکہ عملی زندگی میں اسے نافذ کرنا ہو گا، ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے!

قوموں کی زندگی میں کچھ دن ایسے ہوتے ہیں جو وقت کی گرد میں چھپ نہیں سکتے، جو صدیوں کے اندھیروں میں چراغِ راہ بن کر جگمگاتے رہتے ہیں۔ جب تاریخ کے اوراق پر نگاہ دوڑائی جاتی ہے تو کچھ دن محض دن نہیں رہتے، وہ ایک عہد کی پہچان، ایک خواب کی تعبیر اور ایک قوم کی روحانی بیداری بن جاتے ہیں۔ پاکستان کا یوم آزادی بھی ایسا ہی دن ہے۔ یہ دن محض جغرافیائی آزادی کا نہیں، بلکہ ایمان، قربانی، اور وحدت کی صدا کا دن ہے۔ یہ محض ایک تقویمی تاریخ نہیں بلکہ ایک فکری بیداری، ایک روحانی انقلاب، اور ایک سیاسی معجزہ ہے۔

یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اللہ کی مشیت جب کسی قوم کے ساتھ ہو تو غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں، اور ایک ایسی مٹی جنم لیتی ہے جو معجزے کی مانند تاریخ کے سینے میں ہمیشہ روشن رہتی ہے۔ یہ وہ دن ہے جب غلامی کی زنجیریں ٹوٹیں، جب ایک خواب حقیقت میں ڈھلا، اور جب دنیائے دیکھا کہ ایمان اور قربانی سے مسلح قومیں کس طرح تاریخ کا دھارا موڑ دیتی ہیں۔ پاکستان صرف ایک جغرافیہ نہیں، بلکہ ایک نظریہ ہے۔ وہ نظریہ جس کی جڑیں قرآن و سنت کی تعلیمات میں پیوستہ ہیں، جس کی آبیاری لاکھوں شہداء کے خون سے ہوئی، اور جسے اقبال کے افکار اور قائد اعظم کی قیادت نے جلا بخشی۔ یہ سر زمین ہمارے لیے امانت ہے، اور امانتیں صرف زمین پر نہیں، دلوں میں بسائی جاتی ہیں۔

آج کا دن ہمیں صرف جشن منانے کیلئے نہیں، بلکہ خود احتسابی اور عہد نویکیئے پکار رہا ہے۔ دشمن آج بھی بدلتے ہتھیاروں کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ کبھی وہ توپ و تفنگ سے حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی سوشل میڈیا کے پردے میں ہمارے نوجوانوں کے اذہان کو مسموم کرنے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ دشمن



کی یہ سازشیں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ آزادی کی حفاظت صرف بندوق کے دہانے سے نہیں ہوتی بلکہ قلم، علم، کردار اور اتحاد سے بھی کی جاتی ہے۔

یہی وہ لمحہ ہے جب ہمیں سوچنا ہو گا کہ کیا ہم اپنی فکری و اخلاقی سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں؟ کیا ہم اپنی زبان، ادب اور تہذیب کے چراغ روشن رکھے ہوئے ہیں؟ کیا ہم اقبال کے اس پیغام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں کہ مسلمان کی سب سے بڑی طاقت اس کا اتحاد اور اس کا شعور ہے؟ یہ دن ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ ہم صرف ماضی کی قربانیوں پر فخر نہ کریں، بلکہ اپنے حال کو اس قربانی کے شایانِ شان بنائیں۔

یہ دن ہمیں بتاتا ہے کہ پاکستان کسی حادثے کا نام نہیں، بلکہ لاکھوں شہیدوں کی اذانوں، لاکھوں ماؤں کی دعاؤں اور لاکھوں نوجوانوں کی قربانیوں کا وہ مقدس حاصل ہے، جو قرآن و سنت کے نور سے روشن ہوا۔ آج کا دن ہمیں جھنجھوڑتا ہے کہ ہم محض ایک قوم نہیں، بلکہ ایک امانت کے وارث ہیں۔ وہ امانت جس کا محافظ ہر فرد، ہر قلم، ہر تلوار اور ہر دعا ہے۔

اے وطن تیری مٹی پر بہایا گیا ہر قطرہ خون ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ قومیں محض سرحدوں سے نہیں بلکہ ایمان، علم اور قربانی سے زندہ رہتی ہیں۔ آج کا دن ہمیں اس عہد کی تجدید پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اقبال کے خواب اور قائد اعظم کی قیادت کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں، اور دشمن کی سازشوں کے مقابل صرف ہتھیار سے نہیں، بلکہ علم، کردار اور اتحاد کے چراغ سے بھی جواب دیں۔

اے پاکستان تو ایک معجزہ ہے، وہ معجزہ جسے اللہ نے ایمان اور قربانی کی بدولت ہمیں عطا کیا۔ تیری سرزمین پر بہایا گیا خون ہمیں ہر لمحہ یاد دلاتا ہے کہ آزادی کی حفاظت صرف فوجی مورچوں میں نہیں بلکہ ہر گھر، ہر قلم، ہر دل اور ہر زبان پر فرض ہے۔

اے پاکستان تو محض ایک خطہ زمین نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے۔ وہ نظریہ جو قرآن و سنت کی روشنی میں پروان چڑھا، وہ خواب جس نے اقبال کی فکر سے جنم لیا اور وہ حقیقت جو قائد اعظم کی قیادت اور لاکھوں شہداء کی قربانیوں سے وجود میں آئی۔ تیری سرزمین پر بہایا گیا خون ہمیں بتاتا ہے کہ آزادی کی حفاظت کسی ایک ادارے یا فرد کا نہیں بلکہ پوری قوم کا فرض ہے۔

آج کے دور میں دشمن نے جنگ کا طریقہ بدل دیا ہے۔ آج دشمن نے اپنی چالیں بدل لی ہیں۔ اب وہ توپ و تفنگ سے زیادہ فتنہ اور جھوٹ کے ساتھ حملہ آور ہے، پروپیگنڈے کے تیر چلاتا ہے۔ سوشل میڈیا پر وہ نوجوانوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ ہماری نئی نسل کو شکوک و شبہات کے دلدل میں دھکیلنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اپنی فوج، اپنی تاریخ اور اپنے دین پر اعتماد کھو بیٹھے۔ ہماری فوج پر سوالیہ نشان لگانے کی تدبیریں کرتا ہے، اور ہماری ثقافت و زبان پر حملے کرتا ہے۔ مگر یاد رکھو اگر ہم نے شعور، اتحاد اور ایمان کو اپنا ہتھیار بنایا تو یہ سازشیں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ جس قوم کے نوجوان شعور کے ہتھیار سے لیس ہوں، وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتے۔

یہی وقت ہے کہ ہم اپنی تعلیمی اداروں کو علم و تحقیق کے گڑھ بنائیں، میڈیا کی فضا کو صداقت کا میدان بنائیں، اور اپنے گھروں کو اخلاق اور تہذیب کی پناہ گاہ بنائیں۔ پاکستان کی بقا صرف زمین پر نہیں، بلکہ ہمارے کردار میں ہے۔ ہماری فوج کے شجاع جوان مورچوں پر قربانیاں دیتے ہیں تو ہمیں بھی اپنے

قلم، اپنی سوچ اور اپنے کردار کو مورچہ بنانا ہو گا۔ یہ وطن ہمارے ایمان، ہماری ثقافت اور ہمارے اتحاد کا نام ہے۔ اگر ہم نے قرآن و سنت کو اپنی اصل قوت بنایا، اگر ہم نے اقبال کے فلسفے کو عملی جامہ پہنایا، اور اگر ہم نے دشمن کے پروپیگنڈے کو اپنے اتحاد اور بصیرت سے توڑا، تو کوئی طاقت ہمیں زیر نہیں کر سکتی۔ یہی وہ وقت ہے کہ ہم محض نعروں پر نہ رکیں، بلکہ آج ہی 5 عملی اقدامات کریں۔

☆ پہلا کام نوجوان نسل اپنی توجہ صرف ڈگری لینے تک محدود نہ رکھے بلکہ علم کو ہتھیار اور تحقیق کو عادت بنائے۔ مضبوط قومیں کتاب اور تحقیق سے بنتی ہیں۔

☆ دوسرا کام ہر نوجوان یہ عہد کرے کہ دشمن کے پروپیگنڈے کا شکار نہیں ہو گا، بغیر تحقیق کسی خبر کو آگے نہیں بڑھائے گا، اور اپنی زبان و قلم کو سچائی اور اتحاد کا ترجمان بنائے گا۔

☆ تیسرا کام ہماری زبان، ہمارا ادب، ہماری تہذیب دشمن کے نشانے پر ہیں۔ ہمیں اپنی نسل کو اردو، اسلامی تاریخ اور اپنی تہذیبی قدروں سے جوڑنا ہو گا تاکہ شناخت محفوظ رہے۔

☆ چوتھا قدم یہ تعلق صرف نعرے یا پریڈ تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں اپنی فوج کے ساتھ ہر محاذ پر کھڑا ہونا ہو گا خواہ وہ تعلیمی ہو، سائنسی ہو یا معاشی۔

☆ پانچواں قدم کرپشن، جھوٹ، اور اخلاقی کمزوری دشمن کے ہاتھ مضبوط کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنی ذاتی زندگی میں ایمان داری اور قربانی کو اپنا اصول بنالیں تو کوئی طاقت پاکستان کو شکست نہیں دے سکتی۔

پاکستان محض ایک خطہ زمین نہیں... یہ اللہ کی عطا کردہ ایک امانت ہے۔ اقبال کا خواب، قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد، ہمارے لاکھوں شہیدوں کے خون اور قربانی سے ملایہ زمین کا ٹکڑہ، اس سرزمین کا ہر ذرہ، ہر گلی، ہر وادی ہمیں یہ صدا دیتی ہے کہ آزادی کوئی تحفہ نہیں — یہ قربانیوں کا صلہ ہے یہ ایمان کا انعام ہے۔ آج کے دن ہمیں یہ یاد رکھنا ہو گا کہ دشمن آج بھی ہمارے سامنے ہے لیکن اس بار وہ بارود کے دھوئیں میں نہیں، سوشل میڈیا کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ وہ ہماری نوجوان نسل کو گمراہ کرنا چاہتا ہے، ہماری فوج پر انگلی اٹھانا چاہتا ہے، ہماری زبان اور ہماری تہذیب پر حملہ آور ہے لیکن دشمن سن لے جس قوم کے نوجوان علم، شعور اور ایمان سے مسلح ہوں، اسے کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی۔ وقت آگیا ہے کہ ہم محض نعرے نہ لگائیں، بلکہ عمل کے میدان میں اتریں۔ ہمیں پانچ عہد کرنے ہیں:

☆ ہم تعلیم کو اپنی سب سے بڑی طاقت بنائیں گے، تحقیق کو اپنا ہتھیار بنائیں گے۔

☆ ہم سوشل میڈیا پر دشمن کے پروپیگنڈے کو شعور اور تحقیق سے توڑیں گے۔

☆ ہم اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تہذیب کے چراغ جلانے رکھیں گے تاکہ ہماری پہچان محفوظ رہے۔

☆ ہم اپنی فوج کے شانہ بشانہ کھڑے رہیں گے — چاہے محاذ بندوق کا ہو، چاہے علم اور معیشت کا۔

☆ اور سب سے بڑھ کر، ہم اپنی زندگیوں میں ایمان داری، قربانی اور اخلاص کو اپنا شعار بنائیں گے۔

یاد رکھیں قومیں توپ و تفنگ سے نہیں جیتی جاتیں، قومیں اتحاد، کردار اور ایمان سے زندہ رہتی ہیں۔ اگر ہم نے قرآن و سنت کو اپنی اصل طاقت بنایا، اگر

ہم نے اقبال کے فلسفے کو عملی جامہ پہنایا، اگر ہم نے دشمن کے پروپیگنڈے کو اپنی بصیرت سے توڑا—تو ان شاء اللہ کوئی طاقت پاکستان کو زیر نہیں کر سکتی۔ تو میں صرف توپوں سے نہیں بلکہ علم و اخلاق اور اتحاد سے زندہ رہتی ہیں۔ آج کے دن ہم یہ عہد کریں کہ پاکستان کو نہ صرف محفوظ رکھیں گے بلکہ اسے قرآن و سنت کی روشنی میں عدل و انصاف کا مرکز، علم و تحقیق کا گہوارہ اور دنیا کے مظلوموں کیلئے امید کی کرن بنائیں گے۔

یاد رکھیں پاکستان کوئی عام سرزمین نہیں—یہ اللہ کی عطا کردہ امانت ہے۔ اگر ہم نے اسے قرآن و سنت کی روشنی میں سنوارا تو یہ دنیا میں عدل و روشنی کا مینار بنے گا، ورنہ تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی۔

آئیے ہم سب ایک بار پھر وہی عہد دہراتے ہیں، ہم علم کو اپنی تلوار، اتحاد کو اپنی ڈھال، اور قربانی کو اپنی پہچان بنائیں گے۔ ہم پاکستان کو نہ صرف محفوظ رکھیں گے بلکہ اسے دنیا کے سامنے اسلامی فکر اور اخلاقی عظمت کی جیتی جاگتی تصویر بنادیں گے۔

آئیے آج کے دن ہم سب مل کر یہ عہد کریں ہم اپنی جان سے، اپنے قلم سے، اپنے کردار سے، پاکستان کی حفاظت کریں گے۔ ہم اس معجزاتی وطن کو دنیا کیلئے عدل و انصاف کا مینار، علم و تحقیق کا گہوارہ اور اسلام کی عظمت کی جیتی جاگتی تصویر بنادیں گے۔ ہم اپنی فوج کے شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے، ہم اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تہذیب کو زندہ رکھیں گے، ہم دشمن کی سازشوں کو اپنے علم اور اتحاد سے خاک میں ملا دیں گے، اور ہم پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنائیں گے جو قرآن و سنت کی روشنی میں دنیا کیلئے عدل و انصاف کا مینار ہو۔

اللہ پاکستان کو قیامت تک سلامت رکھے، اسے دشمن کی ہر چال سے محفوظ فرمائے، اور ہمیں اپنی جان، اپنے قلم، اور اپنے عمل سے اس کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا کرے۔ اسے دشمن کی ہر سازش سے محفوظ فرمائے، اور ہمیں اپنے خون، اپنے قلم اور اپنے عمل سے اس کی حفاظت کا شرف عطا کرے۔ اس کے شہداء کے خون کو قبول فرمائے، اور ہمیں اخلاص بھرے قول و فعل سے اس کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا کرے۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم علم، اتحاد، قربانی، اور ایمان کے ساتھ پاکستان کی حفاظت کریں۔ یہ ہماری پہچان، ہماری ذمہ داری اور ہماری تاریخ ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس معجزاتی وطن کو مضبوط، بامعنی اور روشن مستقبل کیلئے تیار کریں۔ تاکہ یہ معجزاتی ریاست اپنی بقا اور عظمت کے ساتھ دنیا میں روشنی کا مینار بنے۔ اللہ پاکستان کو سلامت رکھے اور ہمیں اپنے دین اور وطن کی حفاظت کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اپنے خون، قلم اور کردار سے اس کی حفاظت کا شرف عطا کرے۔ اللھم آمین یا رب العالمین

پاکستان زندہ باد، ہمیشہ پائندہ باد

قطر سے بیت المقدس تک: تاریخ کا خونچکاں تسلسل

مشرق وسطیٰ کی تاریخ بارہا اس امر کی گواہ رہی ہے کہ یہاں کی زمین بارود اور سازشوں کی جولانگاہ بنی رہی۔ مشرق وسطیٰ ہمیشہ سے عالمی طاقتوں کے کھیل کا میدان رہا ہے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد اس خطے کی سرزمین پر کبھی تیل کی خاطر جنگ لڑی گئی، کبھی مذہب کے نام پر تصادم ہوا، اور کبھی عالمی سیاست کے شطرنجی کھلاڑیوں نے یہاں کے عوام کو ایندھن بنایا۔ یہ سرزمین مشرق وسطیٰ، جہاں انبیائے کرام کے قدموں کی خوشبو رچی بسی ہے، جہاں بیت المقدس کے مینار آج بھی اذان کی صدا بلند کرتے ہیں، اور جہاں امت مسلمہ کے شہداء کا خون زمین کی رگوں میں دوڑتا ہے، ایک بار پھر ظلم و ستم کی آندھیوں میں گھری ہوئی ہے۔

آج ہم ایک ایسے سانحے پر گفتگو کیلئے جمع ہیں جس نے امت مسلمہ کے دلوں کو لرزادیا ہے۔ دوحہ کی سرزمین، جو امن کی علامت سمجھی جاتی تھی، اسرائیلی بمباری کی زد میں آگئی ہے۔ یہ حملہ محض قطر پر نہیں، یہ ہماری غیرت، ہماری عزت، اور ہمارے ایمان پر ایک کھلا وار ہے۔

اسرائیلی جارحیت کے تازہ باب نے ایک بار پھر دنیا کو چوکنا دیا ہے۔ دوحہ پر حملہ نہ صرف قطر کیلئے ایک براہ راست چیلنج ہے بلکہ عالمی سیاست کے ایوانوں کیلئے بھی ایک نیا امتحان ہے۔ دوحہ پر اسرائیلی حملہ محض ایک عسکری کارروائی نہیں، یہ دراصل ایمان والوں کی غیرت کو لاکارنے کی کوشش ہے۔ یہ وہی آوازِ باطل ہے جو کبھی صلیبی جنگوں کے لشکروں میں گونجی تھی، اور وہی خنجر ہے جو کبھی بغداد کے گلی کوچوں میں چمکا تھا۔ آج اسرائیل کے دوحہ پر حملے نے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ یہ محض قطر کی خود مختاری پر حملہ نہیں بلکہ عالمی سیاست کے تضادات کا آئینہ ہے۔ اس پس منظر میں امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے بیانات، قطر کی پالیسی، اور مسلم دنیا کے رد عمل کو سمجھنا ناگزیر ہے۔

ٹرمپ نے اسرائیلی حملے پر غصے، ناراضگی اور مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس حملے سے خوش نہیں ہیں لیکن مسلم دنیا ان کے بیان پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں، اور اس بیان کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ مسلم دنیا نے ان کے بیان کو محض سفارتی لفاظی سمجھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہ وہی امریکا ہے جس نے فلسطینیوں کی نسل کشی پر خاموشی اختیار کی، جب فلسطین کا لہو بہایا گیا، اس وقت بھی امریکی صدور نے مذمت کے جملے کہے مگر پالیسی ہمیشہ اسرائیل اور جارحیت کے حق میں رہی۔ یہی جس نے عراق کو کھنڈر بنایا، جس نے افغانستان کو دہائیوں تک بارود کی آماجگاہ بنایا۔ عوام بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے بیانات میں سچائی کم اور مصلحت زیادہ ہوتی ہے۔

ان کے نزدیک یہ مذمتی الفاظ ایک روایتی سفارتی فقرہ ہیں۔ یہ کھلا تضاد آج بھی لوگوں کو بے یقینی کی طرف لے جاتا ہے۔ تاریخ نے یہ سبق دیا ہے کہ امریکی صدور کے مذمتی جملے اکثر الفاظ کی حد تک محدود رہتے ہیں۔ فلسطین سے عراق تک کی کہانیوں نے عوام کے اذہان میں یہ یقین راسخ کر دیا ہے کہ امریکا کے لب و لہجے اور عملی اقدامات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لیکن امت مسلمہ کے اذہان سوال کرتے ہیں: کیا یہی امریکا نہیں جس نے فلسطین کے لہو پر آنکھیں بند رکھیں؟ کیا یہی امریکا نہیں جس نے عراق کو کھنڈر بنایا؟ کیا یہی امریکا نہیں جس نے افغانستان کو لہو میں نہلایا؟ ہم کیسے ان بیانات پر یقین کر لیں جو صدیوں سے محض لفظی فریب ثابت ہوئے ہیں؟ عملی اقدامات میں ان کا عکس کم ہی دکھائی دیا۔ عوام سمجھتے ہیں کہ اگر امریکا اسرائیل کے معاملے میں واقعی غیر جانبدار ہوتا تو آج فلسطین کی سرزمین لہو میں نہ نہائی ہوتی۔

ٹرمپ کا یہ کہنا کہ وہ مشرق وسطیٰ کے کسی واقعے پر حیران نہیں ہوتے، دراصل ایک تاریخی رویے کی جھلک، سیاسی پردہ پوشی اور منافقت کا اعتراف ہے۔ بظاہر بے بسی کا اظہار ہے، مگر دراصل یہ سازش کا پردہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ جملہ گویا اعتراف ہے کہ خطے کے خونریز کھیل پر امریکا کی خاموشی محض لاعلمی

نہیں، بلکہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی ہے۔ امریکا ہمیشہ اسرائیل کی غیر متوازن جارحیت کو نظر انداز کرتا آیا ہے۔ یہ بیان گویا اس امر کا اعلان ہے کہ اسرائیلی خود سری پرواشنگٹن کی خاموشی کوئی نئی بات نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا یہ واقعی بے بسی ہے یا پھر وہی پرانی نظر بند حکمت عملی جو اسرائیل کو کھلی چھوٹ دیتی ہے؟

امریکا کیلئے اسرائیل کی ہر جارحیت ایک معمول ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر امریکا حیران نہیں ہوتا تو پھر کب بیدار ہوگا؟ یا شاید یہ سکوت رضا ہے جو اسرائیل کی ہر بربریت کو ڈھانپ لیتا ہے لیکن بین السطور سازش کی وہ مہک ہے جو تاریخ کے اوراق میں بارہا محسوس کی جا چکی ہے۔ یہ الفاظ گویا اعتراف جرم بھی ہیں اور چشم پوشی کا اقرار بھی۔

اسرائیل کی جارحیت نئی نہیں۔ 1982 میں بیروت پر بمباری، 2006 میں لبنان کی اینٹ سے اینٹ بجانا، 2008 اور 2014 میں غزہ پر قیامت خیز حملے۔ یہ سب مظاہرہ اسی تسلسل کا ہے۔ اسرائیل نے ہمیشہ اپنی جارحیت سے خطے کو لرزایا ہے۔ غزہ ہو یا لبنان، شام ہو یا ایران، سب اس کی بربریت کے گواہ ہیں۔ اسرائیل نے غزہ، لبنان، شام اور ایران پر بمباری کی؛ یہ سب دنیائے دیکھا مگر قطر پر حملہ چونکا دینے والا تھا۔ قطر وہ ملک ہے جہاں امریکا کا سب سے بڑا اڈہ العدید قائم ہے۔ یہی تضاد ثابت کرتا ہے کہ اسرائیل اب واشنگٹن کی ہدایات کا محتاج نہیں، بلکہ وہ خود کو خطے کا بے لگام مالک سمجھنے لگا ہے۔

اسرائیل نے پہلے ہی دنیا کو باور کرا دیا ہے کہ وہ امریکی سرپرستی میں پورے خطے کو اپنی عسکری طاقت کا شکار بنا سکتا ہے۔ ہر طرف بارود کی بارش اس کے اختیار میں ہے مگر دوحہ پر حملہ اس لیے غیر معمولی ہے کہ قطر نہ صرف امریکا کا قریبی اتحادی ہے بلکہ وہاں امریکی فضائی اڈہ بھی موجود ہے۔ اس سے یہ سوال جنم لیتا ہے کہ کیا اسرائیل اب واشنگٹن کے اثر سے آزاد ہو چکا ہے یا پھر یہ کھیل امریکی اشارے پر ہی کھیلا گیا؟

سوال یہ ہے کہ کیا قطر پر حملے کی جرات امریکی مصلحتوں کے دائرے سے باہر دکھائی دیتی ہے؟ یہی تضاد اس جنگی کھیل کو مزید پیچیدہ بناتا ہے۔ یہ تضاد عالمی سیاست کی سب سے بڑی گتھی ہے کہ امریکا اپنے ہی اڈے کے سائے میں ہونے والے حملے پر محض لفظی مذمت پر اکتفا کرتا ہے۔ اے اہل اسلام! سوچو! اگر ایک ایسا ملک جس کی سرزمین پر امریکی افواج محفوظ نہیں، تو پھر کون محفوظ ہے، اس پر کیسے یقین کیا جائے کہ اب اسرائیل امریکا کو بھی خاطر میں نہیں لاتا؟

قطر کے حکمران خاندان نے ہمیشہ واشنگٹن کے ساتھ قریبی تعلقات رکھے ہیں۔ العدید اڈہ امریکی فضائیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ اب جب کہ انہی فضاؤں پر اسرائیلی بمباری ہوئی ہے تو قطر کی قیادت کا سوال بجا ہے کہ امریکا اپنے اتحادی کی سلامتی کی ضمانت کیوں نہ دے سکا؟ قطر اب براہ راست امریکا کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا ہے۔ جب ان کے ملک کی فضاؤں میں امریکی طیارے موجود ہیں تو پھر اسرائیلی بم کیسے گر سکتے ہیں؟ وہ کیسے خاموش رہ سکتا ہے جبکہ اس کے اپنے وطن میں امریکی افواج کے طیارے پرواز کرتے ہیں اور انہی فضاؤں کو اسرائیلی جارحیت نے روند ڈالا ہے؟

کیسے ممکن ہے کہ جس سرزمین سے امریکی طیارے پرواز کرتے ہیں، اسی سرزمین پر اسرائیلی بمباری ہو اور واشنگٹن اس پر خاموش رہے؟ یہ سوال محض ایک ریاستی شکایت نہیں، بلکہ واشنگٹن کے کردار پر ایک کھلا مقدمہ ہے۔ یہ سوال نہ صرف قطر کا ہے بلکہ پوری مسلم دنیا کا ہے۔ یہ سوال محض سفارتی نہیں بلکہ اعتماد اور عزت کا بھی ہے۔ یہ سوال محض قطر کا نہیں، بلکہ عالمی سیاست کے ایوانوں پر ایک کڑا امتحان ہے۔

قطری وزیراعظم اور امیر دونوں نے اسرائیلی حملے کو مجرمانہ لاپرواہی اور ریاستی دہشتگردی قرار دیا۔ یہ اعلان محض غصے کا نہیں بلکہ عالمی قانون کی عدالت میں ایک مضبوط گواہی ہے کہ اسرائیل کی کارروائیاں محض عسکری حملے نہیں بلکہ ریاستی سطح پر دہشتگردی کی بدترین مثال ہیں۔ یہ الفاظ بین الاقوامی قانون کے تناظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ 1970 کی دہائی میں جب عراق اور کویت کے مابین تنازعہ ہوا، تب بھی ریاستی جارحیت کا تصور عالمی سطح پر ابھر اٹھا۔ آج قطر اسی زبان میں بات کر رہا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسرائیل کی حرکت محض ایک جنگی اقدام نہیں بلکہ عالمی نظام کے خلاف بغاوت ہے۔

قطر کے وزیراعظم کا یہ اعلان محض غصے کا اظہار نہیں بلکہ ایک عالمی اصول کی تصدیق ہے۔ تاریخ یاد دلاتی ہے کہ جب 1990 میں کویت پر حملہ ہوا تھا تو دنیا نے اسے ریاستی جارحیت کہا۔ آج قطر اسی اصول کے تحت اسرائیل کے خلاف کھڑا ہے۔ قطر کے امیر نے اسرائیلی اقدام کو مجرمانہ کارروائی اور ریاستی دہشت گردی قرار دیا۔ یہ الفاظ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ چھوٹے ملک بھی جب غیرت سے بولتے ہیں تو تاریخ میں اپنی جگہ بناتے ہیں۔ یہ وہی لہجہ ہے جو کبھی صلاح الدین ایوبی نے کہا تھا: ہم بیت المقدس کو آزاد کئے بغیر دم نہ لیں گے۔



اسرائیلی حملے کے بعد امیر قطر نے صدر ٹرمپ سے رابطہ کیا۔ ٹرمپ نے قطر کے ساتھ یکجہتی اور اس کی خود مختاری کی حمایت کا اعلان کیا تاہم امیر قطر نے اسرائیلی حملے کو مجرمانہ لاپرواہی قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کا ملک اپنی حفاظت، اپنی سلامتی کے دفاع کیلئے تمام اقدامات کرے گا۔ یہ الفاظ ایک چھوٹے مگر غیرت مند ملک کی خود

داری کا آئینہ اور قومی غیرت کا مظہر ہیں۔ یہ وہی لہجہ ہے جو کبھی صلاح الدین ایوبی کے ہونٹوں پر تھا، چھوٹے وسائل مگر بڑی غیرت، لیکن تاریخ کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ امریکی مذمت اکثر لفظوں کے ہنگامے تک محدود رہتی ہے، ان کے پیچھے عملی اقدام کی کمی ہوتی ہے۔

حماس نے اس حملے کو اپنی قیادت کے خلاف ناکام منصوبہ قرار دیا۔ چھ جانوں کی قربانی نے اس تنظیم کی جدوجہد کو مزید جواز بخشا۔ حماس نے کہا کہ ان کی قیادت محفوظ رہی، اور یہ اسرائیلی منصوبے کی ناکامی ہے۔ تاریخ کے آئینے میں یہ فلسطینی مزاحمت کی نئی زندگی اور فلسطینی مزاحمت کی حیات جاوداں کا پتہ بھی دیتی ہے؛ جس طرح احد کے میدان میں زخمی مگر سرخرو مسلمان کھڑے رہے، ویسے ہی آج غزہ اور دوحہ کی فضاؤں میں مزاحمت زندہ ہے۔ یہ شہداء ہماری آنکھوں کا نور ہیں۔ ان کے لہو سے امت کی غیرت کو جلا ملتی ہے۔ یاد رکھو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا. مومن، مومن کیلئے ایک عمارت کی طرح ہے، جس کا ہر حصہ دوسرے کو سہارا دیتا ہے۔

آج سوال یہ ہے کیا ہم اپنے شہداء کے سہارا ہیں یا محض خاموش تماشا؟

دوسری طرف اردن نے وضاحت دی کہ اسرائیلی طیاروں نے ان کی فضائی حدود استعمال نہیں کیں۔ ہر ملک اپنے آپ کو اس آگ سے دور رکھنے اور صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے تاکہ اس آگ کی لپیٹ سے بچ سکے جس کی لپٹیں پورے خطے کو اپنی گرفت میں لینے کو ہے۔ یہ مناظر ہمیں 1967 اور 1990ء کی خلیجی جنگ کی یاد تازہ کرتی ہیں، جب ہر ملک کو اپنی سرحدوں کے بارے میں عالمی دباؤ کا سامنا تھا، جب ہر عرب ریاست اپنی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کرتی رہی اور نتیجہ بیت المقدس کے کھوجانے کی صورت میں نکلا۔

ڈیموکریٹ سینیٹر کرس کوئز کی حیرت معنی خیز ہے کہ اسرائیل نے اپنے سب سے بڑے اتحادی امریکا کو اطلاع دینا بھی گوارا نہ کیا۔ گویا یہ پیغام واشنگٹن کو بھی ہے کہ اب تل ابیب اپنی مرضی کا مالک بن چکا ہے۔ یہ روش اس اتحاد میں دراڑوں کا پتہ دیتی ہے۔ یہ بات امریکی اقتدار کی کمزوری اور اسرائیلی خود سری کا جہاں اعلان ہے وہاں یہ صورتحال امریکا اور اسرائیل کے تعلقات میں ایک نیارخ ظاہر کرتی ہے۔ یہ رویہ اس امر کی علامت ہے کہ اسرائیل اب "جونیر پارٹنر" نہیں رہا بلکہ "خود سر اور خود مختار" کھلاڑی کی طرح کھیل رہا ہے۔ گویا اب اسرائیل اپنے سب سے بڑے حلیف کو بھی اطلاع دینے کا پابند نہیں سمجھتا۔ یہ رویہ اس اتحاد میں خفیہ دراڑوں کا پتہ دیتا ہے۔

یہ صورتحال عراق جنگ کے دور سے مختلف ہے جب اسرائیل امریکی حکمت عملی کا حصہ تھا۔ آج تل ابیب بظاہر اپنی راہ پر چل رہا ہے، جو واشنگٹن کیلئے ایک نیا چیلنج ہے۔ یہ وہی لمحہ ہے جب طاقتور سامراج کے پاؤں ڈگمگاتے ہیں۔ یہ وہی کیفیت ہے جو رومی سلطنت کو اپنی آخری سانسوں میں لاحق ہوئی تھی، جب اس کے اتحادی اس کی مرضی کے بغیر فیصلے کرنے لگے تھے اور اس کے اتحادی اس کی پرواہ کرنا چھوڑ گئے تھے۔ یہی وہ لمحات ہیں جو ہمیں رومی سلطنت کے زوال میں دکھائی دیا تھا۔

عرب لیگ نے اسرائیلی حملے کو بین الاقوامی امن کیلئے خطرہ قرار دیا مگر تاریخ کی گواہی اور ماضی کے تجربات بتاتے ہیں کہ عرب لیگ کے بیانات اکثر الفاظ کے جھوم تک محدود رہتے ہیں لیکن اے اہل اسلام! کیا ہم نہیں جانتے کہ ان کے بیانات اکثر کاغذی ہوتے ہیں؟ عملی قوت کا عکس ان میں کم اور نایاب ہی دکھائی دیتا ہے۔ 1967 اور 1973ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد سے آج تک عرب اتحاد کی کمزوری کھل کر سامنے آچکی ہے جب ہر عرب ملک نے دوسروں پر ذمہ داری ڈالی اور نتیجہ یہ نکلا کہ بیت المقدس ہاتھ سے نکل گیا۔ یہی کمزوری اسرائیل کو مزید جری بناتی ہے تاہم یہ بیانات اور مذمت کم از کم اس بات کا اعلان ہیں کہ اسرائیل کی جارحیت صرف قطر یا فلسطین کا نہیں بلکہ پورے خطے کا مسئلہ اور سلامتی کا ہے۔

اس حوالے سے اگر تاریخی تناظر کے تسلسل پر نگاہ دوڑائیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ 1948ء سے اب تک ہر جنگ میں اسرائیل کو امریکی پشت پناہی حاصل رہی۔ 2006ء، لبنان میں اسرائیلی جارحیت کے دوران امریکی انتظامیہ نے کھلے عام اسرائیل کو مزید وقت دینے کا مطالبہ کیا تاکہ وہ حزب اللہ کو کمزور کر سکے۔

1991ء عراق و کویت کی جنگ نے ثابت کیا کہ امریکی اڈوں کی موجودگی کے باوجود مسلم ممالک اپنی خود مختاری کی ضمانت نہیں لے سکتے۔ ان حملوں میں بھی دہشتگردی کے خلاف جنگ کا نعرہ استعمال ہوا، مسلم ممالک کی تباہی کا تماشا سب نے دیکھا، مگر حقیقت میں افغانستان عراق پر امریکی حملے مسلم دنیا کے وسائل پر قبضے کی جنگ تھی۔ آج قطر پر حملہ انہی تاریخی دھاگوں میں پرویا ہوا ایک نیاموتی اور قطر پر حملہ انہی زنجیروں کا ایک نیا کڑا ہے۔

نتیجتاً سوالات کا انبار ہمارے سامنے کھڑا ہے؟ دوحہ پر اسرائیلی حملہ ایک نئے عہد کی نشانی ہے۔ کیا امریکا واقعی بے بس ہے یا یہ سب ایک طے شدہ کھیل کا حصہ ہے؟ کیا قطر اپنی خود مختاری کے دفاع میں کوئی عملی قدم اٹھا سکے گا یا الفاظ کی دنیا تک محدود رہے گا؟ کیا مسلم دنیا کبھی متحد ہو کر اسرائیلی جارحیت کا جواب دے سکے گی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب آنے والے وقت دے کافی الحاح حقیقت یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ کی سر زمین ایک بار پھر تاریخ کے دھواں دھار باب کا مرکز بن چکی ہے۔

یہ پورا واقعہ مشرق وسطیٰ کے سیاسی منظر نامے میں ایک نئے باب کی تمہید ہے۔ ٹرمپ کی ناراضگی، اسرائیل کی خود سری، قطر کی غیرت اور عرب لیگ کی مذمت — سب مل کر اس خطے کی اس کہانی کو دہرا رہے ہیں جو صدیوں سے خون و آگ کے استعاروں میں لکھی جا رہی ہے۔ سوال یہ نہیں کہ کون کیا کہہ رہا ہے؛ اصل سوال یہ ہے کہ عمل کی دنیا میں کون سا کردار ابھرے گا۔ تاریخ فیصلہ کرے گی کہ یہ محض الفاظ کا غبار تھا یا آنے والے کل کے طوفان کا پیش خیمہ۔

دوحہ پر اسرائیلی حملہ محض ایک عسکری کارروائی نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ کے سیاسی افاق پر ایک نیا طوفان ہے۔ ٹرمپ کی ناراضگی، اسرائیل کی خود سری، قطر کی غیرت، اور عرب لیگ کی قراردادیں سب ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ خطے میں ایک نیا بحران جنم لے رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا یہ محض الفاظ کا غبار ہے یا تاریخ کے اوراق پر ایک نیا خونچکاں باب لکھنے کی تمہید۔

اے امتِ مسلمہ! ایمان کی لٹکا اور تاریخ کی یہ صدا دراصل بیداری کے وقت کا مطالبہ لئے ہمیں جھنجھوڑ رہی ہے۔ دوحہ کے آسمان پر گرنے والے یہ بم صرف قطر کے نہیں، بلکہ پوری امت کے قلب پر گر رہے ہیں۔ یاد رکھو! قرآن ہمیں کہتا ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا**۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو۔ آج اگر ہم تفرقہ کا شکار رہے، تو دوحہ کے بعد مکہ و مدینہ بھی محفوظ نہیں رہیں گے۔ یہ حملہ ہمیں پکار رہا ہے کہ کیا ہم دوبارہ اپنی صفوں کو درست کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے بیت المقدس کو آزاد کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے شہداء کے لہو کا قرض اتار سکتے ہیں؟

اے امتِ محمدیہ ﷺ! وقت غفلت کا نہیں، بیداری کا ہے۔ دوحہ پر حملہ ہمیں یاد دل رہا ہے کہ ہمارا دشمن ایک ہے اور ہمارا ایمان بھی ایک ہے۔ اگر آج ہم نے غفلت کی تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی لیکن اگر ہم ایمان کے پرچم تلے جمع ہو گئے، تو دنیا دیکھے گی کہ وہی امت جو بدروخیہ کے میدانوں میں سرخرو ہوئی تھی، آج بھی زندہ ہے، جاویداں ہے، اور اللہ کے نام پر قربان ہونے کیلئے تیار ہے۔

آج تاریخ ایک بار پھر ہمیں جھنجھوڑ رہی ہے۔ اے امتِ مسلمہ! کیا تمہیں اپنے شہداء کا لہو یاد نہیں؟ کیا تم نے بدرواح کی صدائیں فراموش کر دی ہیں؟ کیا تمہاری غیرت سو گئی ہے؟ یاد رکھو! اگر ہم نے اپنی صفیں درست نہ کیں، تو تاریخ ہمیں معاف نہیں کرے گی لیکن اگر ہم نے اپنے ایمان کے پرچم تلے جمع ہو کر آواز بلند کی، تو دنیا ایک بار پھر دیکھے گی کہ بدروخیہ کی امت آج بھی زندہ ہے۔

مغرب کا غروب، مشرق کا ظہور

اے اہل دنیا! کیا تم نے تاریخ کے دھارے کو بدلتے نہیں دیکھا؟ کیا تم نے وقت کی موجوں کو مغرب سے مشرق کی طرف پلٹتے محسوس نہیں کیا؟ صدیوں تک طاقت کا سورج رُوما کے ایوانوں، لندن کے محلات اور واشنگٹن کے قلعوں سے طلوع ہوتا رہا، مگر آج اس کی کرنیں بدل چکی ہیں۔ وہ کرنیں جو کبھی بحر اوقیانوس کو جگمگاتی تھیں، اب بحر جنوبی چین میں رقص کر رہی ہیں۔

پوچھو اپنے دل سے کیا یہ محض توپوں کی گھن گرج ہے؟ یا یہ تاریخ کا اعلان ہے کہ مغرب کے ہاتھوں سے قیادت کی لگام چھوٹ رہی ہے؟ کیا یہ صرف ایک پریڈ ہے یا یہ زمانے کی سمت کا تعین ہے؟ شی جن پنگ نے دنیا کو بتایا ہے کہ اب مرکز جہاں بدل چکا ہے۔ کل کا محکوم آج کا قائد ہے، کل کا زخمی آج کا فاتح ہے۔ یہ لمحہ، یہ منظر، یہ صدا دنیا کو جھجھوڑ کر کہہ رہی ہے کہ طاقت کا رخ مشرق کی طرف مڑ گیا ہے۔

تاریخ کا دھارا ہمیشہ ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وقت کا دریا اپنی موجوں کو کبھی مغرب کی طرف دھکیلتا ہے اور کبھی مشرق کی آغوش میں ڈال دیتا ہے۔ صدیوں تک دنیا کی باگ ڈور کبھی رومیوں کے ہاتھ میں رہی، کبھی ترکوں کے۔ پھر یورپ نے اپنی مہمات اور استعمار کے ذریعے قیادت سنبھالی اور بالآخر دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا دنیا کا مطلق العنان رہنما بن کر ابھر اگرا۔ تاریخ کی کروٹ ایک نیا باب لکھنے کو ہے۔ واشنگٹن کے ایوانوں سے قیادت کی لگام چھوٹی دکھائی دے رہی ہے اور بیجنگ کی فضاؤں میں ایک نئے سورج کی کرنیں جھلملانے لگی ہیں۔

یہ محض عسکری طاقت کا مظاہرہ نہیں، بلکہ تہذیبوں کی کشمکش ہے۔ یہ محض توپوں اور طیاروں کی گونج نہیں بلکہ عالمی سیاست کا اعلان ہے۔ شی جن پنگ کی پریڈ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ صدیوں سے جس مشرق کو کمزور اور محکوم سمجھا جاتا رہا، وہ اب اپنے قدموں پر کھڑا ہے اور دنیا کی قیادت کی کمان سنبھالنے کیلئے تیار ہے۔ امریکا جو کل تک دنیا کے فیصلے کرتا تھا، آج دیکھ رہا ہے کہ تاریخ کے ترازو میں اس کا پلڑا ہلکا پڑ رہا ہے اور ایک نیا توازن وجود میں آرہا ہے۔

تاریخ کے سفر میں کچھ لمحات ایسے آتے ہیں جب محض واقعات نہیں بلکہ عہد کی سمت متعین ہوتی ہے۔ یہ لمحات محض دن اور رات کی گردش نہیں بلکہ قوموں کے مقدر کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بیجنگ کی ایک صبح بھی ایسا ہی لمحہ تھی جب شی جن پنگ نے اپنی فوجی پریڈ کے ذریعے دنیا کو یہ بتایا کہ اب طاقت کا مرکز بدل رہا ہے۔ یہ منظر محض توپوں کی گرج اور طیاروں کی پرواز نہ تھا بلکہ تہذیبوں کی ٹکرائو اور سیاست کے نئے موڑ کی علامت تھا۔ بیجنگ کی صبح، توپوں کی گھن گرج اور طیاروں کی پرواز۔ یہ سب محض منظر نہیں بلکہ ایک عہد کا اعلان تھا۔ طاقت نے اپنا چہرہ دکھایا اور دنیا نے محسوس کیا کہ تاریخ نے کروٹ لی ہے۔

چین صدیوں تک مغربی سامراج کی یلغار کا شکار رہا۔ فیون کی جنگوں سے لے کر جاپانی جارحیت تک، اسے بارہا شکست اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا مگر آج کا چین ماضی کی شکست کا اسیر نہیں، بلکہ مستقبل کی قیادت کا امیدوار ہے۔ یہی اس پریڈ کا سب سے بڑا پیغام تھا۔ بدھ کی صبح بیجنگ کے افق پر جو منظر کھلا، وہ محض ایک فوجی پریڈ نہ تھا بلکہ ایک تاریخ کا اعلان اور مستقبل کی تمہید تھا۔ شی جن پنگ کی تقریر اور چین کی فوجی پریڈ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ صرف عسکری قوت کا مظاہرہ نہیں بلکہ عالمی قیادت کے ایک صدیوں پرانے خواب کی تعبیر ہے جس سے مشرقی قیادت کا چراغ جل اٹھا ہے۔ شی جن پنگ کی تقریر اور چین کی عسکری قوت کا مظاہرہ اس بات کا غماز تھا کہ مشرقی قیادت اب عالمی قیادت کے منصب پر اپنی دعوے داری پیش کر رہی ہے۔ اس موقع

پر جو جاہ و جلال دکھایا گیا، وہ طاقت کے ساتھ ساتھ سیاسی پیغام کی رمزیت بھی اپنے اندر رکھتا تھا۔

چین کی پریڈ محض ایک فوجی مظاہرہ نہیں تھا، بلکہ عالمی سیاست کے منبر پر ایک نئے عہد کے آغاز کا اعلان تھا۔ طاقت ہمیشہ اپنے ساتھ ایک خاموش پیغام بھی رکھتی ہے، اور اس دن شی جن پنگ نے یہ پیغام دیا کہ ”اب فیصلہ کرنے والے صرف مغرب کے ایوان نہیں ہوں گے۔“ مشرق کی بیداری، جس کی جھلک صدیوں سے خوابوں اور آرزوؤں میں محفوظ تھی، اب عسکری قوت کے مظاہرے کے ساتھ دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی۔ طاقت کا استعمال ہمیشہ دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک ظاہری یعنی اسلحے اور فوج کی تعداد، اور دوسرا باطنی یعنی پیغام اور تاثر۔ اس دن بیجنگ نے دنیا کو دونوں پیغام دیے۔ ایک طرف ہتھیاروں کی جھلک تھی اور دوسری طرف قیادت کے ارادے کا اعلان۔

پریڈ کے آغاز کے ساتھ ہی بحر اوقیانوس کے پار سے ایک آتش مزاج صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے مخصوص آندھی و طوفان خیز انداز میں سوشل میڈیا پر ایک صدا بلند ہوئی۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے سوشل میڈیا پر اعلان کیا کہ یہ تینوں رہنما—شی، پوتن اور کم—امریکا کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ یہ صدر اصل ایک زخمی غرور کی چیخ تھی۔ وہ چیخ جو اس وقت بلند ہوتی ہے جب طاقت ہاتھ سے پھسل رہی ہو۔ یہ شعلہ بیانی دراصل اس غصے کی آئینہ دار تھی جو انہیں مرکز نگاہ نہ رہنے پر لاحق ہوئی۔

ٹرمپ کے رد عمل میں وہی پرانی نفسیات جھلکتی ہے جس میں امریکا اپنے سوا کسی اور قیادت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ٹرمپ کی برہمی اس وقت کی جھلک تھی جب طاقت کے زوال کی پہلی آہٹ کانوں تک پہنچتی ہے۔ سوشل میڈیا پر ان کا الزام دراصل ایک سیاسی چیخ تھی کہ ”میں اب مرکز نہیں رہا۔“ گویا وہ اپنے زوال کی ابتدائی آہٹوں کو محسوس کر رہے تھے۔ ان کا پیغام گویا ایک اعلان اور دہمکی بھی تھا کہ عالمی طاقت کا اعزاز ہم آسانی سے جانے نہیں دیں گے اور واحد عالمی سپر طاقت کے تاجداری کی حفاظت کے ہم اب بھی پوری طرح اہل ہیں۔ مگر دنیا اب بدل رہی تھی۔ یہ رد عمل دراصل اس بات کی علامت تھا کہ امریکا کے طاقتور حلقے اس اجتماع کو کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ٹرمپ کی شخصیت ایک ایسی آئینہ دار ہے جس میں امریکا کی خود پسندی، مرکزیت اور بالادستی کی نفسیات جھلکتی ہے۔ ان کا غصہ اور الزام تراشی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں محسوس ہو رہا ہے کہ عالمی قیادت کی کمان اب ان کے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے۔

شی جن پنگ کی تقریر اور بیجنگ کی فوجی پریڈ نے یہ حقیقت آشکار کر دی کہ یہ محض عسکری قوت کا مظاہرہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی اعلان ہے۔ توپیں صرف گولی نہیں چلاتیں، وہ پیغام بھی دیتی ہیں۔ ٹینک صرف لوہے کے پیسے نہیں گھماتے، وہ تاریخ کے دھارے کو بھی موڑ دیتے ہیں۔ چین نے اپنی صدیوں کی شکست و ریخت کو فتح کے تاج میں بدلنے کا عزم ظاہر کیا۔ شی جن پنگ نے پوتن کو دائیں اور کم جانگ ان کو بائیں بٹھا کر دنیا کو ایک خاموش پیغام دیا۔ یہ محض کرسیوں کی ترتیب اور پروٹوکول کا معاملہ نہ تھا بلکہ ایک سیاسی استعارہ تھا، یہ ایک سیاسی مثلث کا بھرپور اور زبردست اعلان تھا۔ سیاست میں بعض اوقات خاموش علامتیں الفاظ سے زیادہ اثر رکھتی ہیں۔ دائیں جانب روس کی عسکری طاقت اور بائیں جانب شمالی کوریا کی بے خونی گویا مشرقی اتحاد کے دو بازوئی کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ منظر امریکا کیلئے ایک صریح پیغام تھا ہم اکیلے نہیں ہیں، ہم ایک اتحاد ہیں۔ سیاست میں یہ علامتیں الفاظ سے زیادہ اثر رکھتی ہیں۔

شی جن پنگ کی تقریر اور بیجنگ کی فوجی پریڈ نے یہ حقیقت آشکار کر دی کہ یہ محض عسکری قوت کا مظاہرہ نہیں بلکہ ایک تہذیبی اعلان ہے۔ توپیں صرف

گولی نہیں چلاتیں، وہ پیغام بھی دیتی ہیں۔ ٹینک صرف لوہے کے پیسے نہیں گھماتے، وہ تاریخ کے دھارے کو بھی موڑ دیتے ہیں۔ چین نے اپنی صدیوں کی شکست و ریخت کو فتح کے تاج میں بدلنے کا عزم ظاہر کیا۔

چینی صدر نے نہایت شعوری طور پر پوتن کو اپنے دائیں اور کم جانگ ان کو اپنے بائیں جانب بٹھایا۔ یہ محض پروٹوکول کا معاملہ نہ تھا بلکہ ایک سیاسی استعارہ تھا۔ بیجنگ کی اس تقریب میں پوتن کو دائیں اور کم کو بائیں جانب بٹھانے کا فیصلہ ایک محض پروٹوکول نہ تھا بلکہ ایک سیاسی علامت تھی۔ دائیں جانب روس کی عسکری طاقت اور بائیں جانب شمالی کوریا کی بے خوفی۔ گویا مشرقی اتحاد کے دوبازوشی کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ منظر امریکا کیلئے ایک صریح پیغام تھا ”ہم اکیلے نہیں ہیں، ہم ایک اتحاد ہیں۔“ سیاست میں یہ علامتیں الفاظ سے زیادہ اثر رکھتی ہیں۔

پوتن دائیں، کم بائیں۔ اور درمیان میں شی۔ یہ منظر گویا ایک مثلثی اتحاد کی تمثیل تھا۔ سیاست کی زبان اکثر الفاظ سے زیادہ کرسیوں اور نشستوں سے بولتی ہے۔ یہ نشستیں اس اتحاد کی مثلث کو ظاہر کر رہی تھیں جو امریکا کے سامنے ایک دیوار کی طرح کھڑا ہونا چاہتی ہے۔ سیاست میں اشارے الفاظ سے زیادہ بولتے ہیں، اور یہ نشستوں کا اشارہ بہت بلند تھا۔ چینی صدر نے جیسے سب کچھ سوچ سمجھ کر ترتیب دیا تھا۔ دائیں ہاتھ پر پوتن، بائیں جانب کم جانگ ان۔ گویا مشرقی اتحاد کی مثلث اپنے توازن میں مکمل دکھائی دیتی تھی۔ یہ محض نشستوں کی تقسیم نہ تھی بلکہ ایک پیغام تھا جو براہ راست واشنگٹن کی جانب بھیجا گیا۔

کیا یہ سب محض ایک طبعی انتظام تھا یا ایک سوچا سمجھا منصوبہ؟ کیا یہ ٹرمپ جیسے مرکزیت پسند رہنما کو غصہ دلانے کی دانستہ تدبیر تھی یا کسی خاص شخصیت کو جلانے کا اہتمام؟ تاریخ کے بنوں پر یہ سوال قائم رہے گا مگر اتنا طے ہے کہ چین نے اپنے حریف کے دل پر دستک ضروری اور چین نے عسکری طاقت کے ساتھ سیاسی ذہانت بھی دکھائی۔ یہ بات بھی زیر غور ہے کہ شی نے یہ سب کسی خاص شخصیت یعنی ٹرمپ کو طیش دلانے کیلئے ترتیب دیا ہو۔ ٹرمپ کی شخصیت اپنی خود نمائی اور مرکزیت پر اصرار رکھتی ہے، اور ایسے شخص کیلئے یہ منظر ایک کڑوی گولی تھا۔

یہ بھی بعید نہیں کہ شی جن پنگ نے اس نشست کی ترتیب اور پوری تقریب کو خاص طور پر ٹرمپ جیسے مزاج رکھنے والے رہنما کو بھڑکانے کیلئے ڈیزائن کیا ہو۔ ٹرمپ اپنی شخصیت میں مرکزیت پسند ہیں اور دنیا کے اسٹیج پر سب سے آگے رہنا چاہتے ہیں۔ ایسے شخص کیلئے یہ منظر ایک ناقابل برداشت تلخی تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ چین نے محض فوجی طاقت ہی نہیں بلکہ سیاسی ذہانت کا بھی مظاہرہ کیا۔

یہ سوال باقی ہے کیا یہ محض تدبیر تھی یا کسی خاص شخصیت کو جلانے کا اہتمام؟ مگر ایک بات طے ہے کہ چین نے عسکری طاقت کے ساتھ سیاسی ذہانت بھی دکھائی۔ یہ بات بھی زیر غور ہے کہ شی نے یہ سب کسی خاص شخصیت یعنی ٹرمپ کو غصہ دلانے کیلئے ترتیب دیا ہو۔ ٹرمپ کی شخصیت اپنی خود نمائی اور مرکزیت پر اصرار رکھتی ہے، اور ایسے شخص کیلئے یہ منظر ایک کڑوی گولی تھا۔ ٹرمپ اپنی شخصیت میں مرکزیت پسند ہیں اور دنیا کے اسٹیج پر سب سے آگے رہنا چاہتے ہیں۔

ایسے شخص کیلئے یہ منظر ایک ناقابل برداشت تلخی تھا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ چین نے محض فوجی طاقت ہی نہیں بلکہ سیاسی ذہانت کا بھی مظاہرہ کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب تدبیر ایک ایسے صدر کے خلاف کی گئی ہو جس کا مزاج اشتعال سے بھرا رہتا ہے اور جو خود کو دنیا کا مرکز دیکھنے کا خواہاں ہے۔ اس طرح شی نے ایک تیر سے کئی شکار کیے۔

پریڈ میں شی جن پنگ صرف ایک صدر نہیں تھے بلکہ ایک محور تھے۔ ایک ایسی شخصیت جس کے گرد مشرقی اتحاد گھوم رہا تھا۔ یہ منظر اعلان تھا کہ اب دنیا کی قیادت یکطرفہ نہیں رہے گی۔ ٹرمپ کی غیر متوقع پالیسیوں نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ شی جن پنگ کی حکمت عملی یہ تھی کہ پوری دنیا کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی جائے اور یہ مقصد وہ بخوبی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ ایسے میں شی جن پنگ نے گویا یہ پیغام دیا کہ اگر مغرب لرزاں ہے تو مشرق مطمئن ہے۔ یہ تضاد آج کی عالمی سیاست کا اصل خلاصہ ہے۔

دنیا نے دیکھا کہ ایک مشرقی طاقت اپنے اتحادیوں کے ساتھ اس انداز میں ابھری ہے جیسے کل کا قائد یہی ہو۔ شی جن پنگ نے دنیا کو باور کرایا کہ وہ نہ صرف چین بلکہ پورے مشرقی اتحاد کے قائد ہیں۔ یہ اتحاد دراصل ایک ایسی قوت ہے جو امریکی بالادستی کو چیلنج کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ اس موقع پر چین نے واضح کر دیا کہ وہ اپنی طاقت کو صرف دفاع کیلئے نہیں بلکہ قیادت کیلئے استعمال کرے گا۔

شی جن پنگ نے خود کو صرف ایک صدر نہیں بلکہ ایک محور کے طور پر پیش کیا۔ مشرق کا رہنما، مشرقی اتحاد کا مرکز، اور مغرب کی بالادستی کے خلاف ایک نیا علمبردار۔ یہ منظر دراصل ایک اعلان تھا کہ اب عالمی سیاست یک قطبی نہیں رہی۔ سرد جنگ کے بعد امریکا نے جو ”واحد سپر پاور“ ہونے کا زعم پالا تھا، اس کی بنیادیں ہلنے لگی ہیں۔

شی جن پنگ نے اپنی شخصیت اور اپنی ریاست کو تقریباً کامرکز بنایا۔ انہوں نے یہ باور کرایا کہ اب مشرقی قیادت ایک جھنڈے تلے جمع ہے اور ان کا مقصد دنیا سے امریکا کی بالادستی کے طلسم کو توڑنا ہے۔ یہ ایک ایسے گروہ کا اعلان ہے جو اپنی راہوں پر خود قدم رکھنا چاہتا ہے۔



شی جن پنگ کا یہ مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب دنیا ٹرمپ کی صدارت کے غیر متوقع فیصلوں سے ہنوز سنبھل نہیں پائی۔ ٹرمپ کے غیر متوقع فیصلوں سے دنیا ہل چکی تھی۔ ایسے میں شی نے گویا دنیا سے کہا مشرق کا راستہ پختہ ہے، اور ہم لرزاں نہیں۔ ایسے میں چین کا یہ مظاہرہ گویا دنیا کو ایک یقین دہانی تھی کہ اگر مغرب غیر متوازن ہے تو مشرق میں ایک نئی قیادت ہے جو اپنے عزم اور تسلسل

کے ساتھ دنیا کو نئی سمت دے سکتی ہے۔ شی کا یہ رویہ دراصل اس اضطراب کا جواب ہے جو دنیا کو ٹرمپ کے غیر متوقع فیصلوں نے دیا۔ انہوں نے دنیا کو بتایا کہ اگر مغرب غیر یقینی میں ہے تو مشرق اپنے عزم میں پختہ ہے۔ دنیا کے بہت سے ممالک ابھی تک ٹرمپ کی غیر متوقع پالیسیوں سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ شی کا یہ رویہ ان کیلئے ایک طرح کی یقین دہانی تھی کہ اگر مغرب غیر مستحکم ہے تو مشرق ایک پختہ لائحہ عمل رکھتا ہے۔

بظاہر یہ تقریب دوسری عالمی جنگ میں جاپان کی شکست کے اسی برس مکمل ہونے کی یاد میں تھی، مگر درحقیقت اس کے پس منظر میں ایک اور پیغام چھپا تھا کہ یہ چین کی فتح کا اعلان تھا۔ شکست کے زخم کو قیادت کے تاج میں بدل دینا تاریخ کی بڑی قوموں ہی کا وصف ہے۔ چین دنیا کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ اب چین محض ماضی کی یادوں میں نہیں بلکہ مستقبل کی قیادت میں قدم رکھ رہا ہے۔ اب چین ماضی کا زخم خوردہ ملک نہیں بلکہ مستقبل کا رہنما ہے۔ اب وہ محض ایک شکست خوردہ قوم نہیں بلکہ ایک فاتح طاقت ہے جو اپنے ماضی کے زخموں کو مرہم لگا کر مستقبل کی قیادت کے منصب پر فائز ہو رہی ہے۔ یہ منظر تاریخ کا ایک استعارہ تھا شکست کی یاد کو فتح کے اعلان میں بدل دینا گویا ایک شکست کی یاد کو فتح کے اعلان میں بدل دیا گیا۔

شی کے عقب میں جو فوج کھڑی تھی، وہ دنیا کیلئے ایک انتباہ تھی۔ یہ محض عسکری ساز و سامان نہ تھا بلکہ ایک نظریہ تھا کہ اب طاقت کا توازن بدلنے والا ہے۔ مغرب نے ہمیشہ اپنی فوجی قوت کے ذریعے دنیا پر تسلط قائم رکھا مگر آج چین نے یہ باور کرادیا کہ وہ اب کسی کے تابع نہیں۔ شی کے پیچھے کھڑی وہ فوج تھی جسے مغرب کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ یہ صرف عسکری قوت کا اظہار نہ تھا بلکہ ایک عزم تھا کہ سمندروں اور فضاؤں میں اب طاقت کا توازن بدلنے والا ہے۔ شی کے ساتھ موجود فوجی طاقت اس امر کی شاہد تھی کہ چین نے اپنی عسکری تیاری کو مغرب کے برابر بلکہ اس سے آگے بڑھانے کا عزم کر لیا ہے۔ چینی فوج کا جلوہ محض توپ اور بارود نہ تھا بلکہ ایک نظریہ تھا طاقت اب مشرق کے ہاتھ میں ہے۔ ہتھیار صرف لوہے اور بارود کا ڈھیر نہیں ہوتے، بلکہ ایک نظریہ اور ایک اعتماد بھی ہوتے ہیں۔

تیا نمین اسکوائر پر تین رہنماؤں کی موجودگی گویا ایک عہد کی تصویر سی سند تھی۔ تاریخ نے اس منظر کو اپنے صفحات میں ایک نئے آغاز کے طور پر محفوظ کر لیا۔ شی، پوتن اور کم کا ایک ساتھ کھڑا ہونا ایک نئی تاریخ کی تحریر تھا۔ شی، پوتن اور کم کا ایک ساتھ نظر آنا عالمی سیاست میں ایک نیا منظر تھا۔ تیا نمین اسکوائر میں یہ اجتماع دراصل اس بات کا اعلان تھا کہ مشرق اب اپنی راہیں خود طے کرے گا۔ یہ پہلی بار تھا کہ شی، پوتن اور کم اکٹھے نظر آئے۔ تیا نمین اسکوائر پر۔ جسے گیٹ آف ہیونلی پئس کہا جاتا ہے۔ یہ منظر تاریخ کے باب میں ایک نئی سطر لکھ رہا تھا۔ تیا نمین اسکوائر پر ان کی موجودگی اس بات کی علامت تھی کہ مشرقی دنیا ایک جھنڈے تلے جمع ہو رہی ہے۔ یہ تصویر عالمی سیاست کے مستقبل کا ایک آئینہ ہے جس میں طاقت کا نیا توازن جھلکتا ہے۔ یہ تصویر آئندہ نسلوں کیلئے ایک علامت کے طور پر محفوظ ہوگی۔

یہ وہی مقام تھا جہاں 1949ء میں ماؤزے تنگ نے جمہوریہ چین کا اعلان کیا تھا۔ یہ جگہ تاریخ کے فیصلوں کی گواہ ہے۔ بعد ازاں دس برس بعد یہی مقام سوویت رہنما خروشیف اور کم کے دادا کی فوجی پریڈ کی میزبانی کا گواہ بنا۔ آج شی نے اسی ورثے کو نئی معنویت دی۔ گویا تاریخ اپنے دائرے کو مکمل کر کے ایک نئے سفر پر روانہ ہوئی۔ وہی مقام جہاں ماؤ نے جمہوریہ کا اعلان کیا تھا، آج شی نے ایک نئی تاریخ کی صدا بلند کی۔ تاریخ اپنے دائرے میں پھر سے لوٹ آئی۔ آج اسی مقام پر شی نے ایک نیا باب کھولا۔ گویا تاریخ ایک دائرہ ہے جو اپنے محور پر دوبارہ گھوم آیا۔

یورپی اور امریکی حلقے اس تقریب کو دیکھ کر اضطراب میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ان کے دل میں بے چینی نے جنم لے لیا ہے۔ طاقت کے ترازو میں اب پلڑا بدلتا دکھائی دینے لگا۔ یورپ اور امریکا میں پریشانی کی لہریں دوڑتی نظر آئیں۔ کچھ چہروں پر اس طاقت کے مظاہرے نے اثر دکھایا اور طاقت کا یہ مظاہرہ ان کیلئے ایک چیلنج بھی تھا اور ایک انتباہ بھی کہ اب عالمی سیاست یک قطبی نہیں رہی۔ دنیا کے توازن میں ایک نیا پلڑا وجود میں آرہا ہے اور اب دنیا کی سیاست میں ان کی اجارہ داری کو خطرہ لاحق ہے۔ یہ پریشانی محض سیاسی نہ تھی بلکہ تہذیبی بھی۔ مغرب صدیوں سے اپنی برتری کا خوگر رہا ہے، اور اب وہ اس کے زوال کی پہلی آہٹیں سن رہا ہے۔

شی نے اپنے خطاب میں یہ سخت اعلان بھی کیا کہ 2035 تک تائیوان واپس آجائے گا اور دوبارہ چین کا حصہ بنے گا۔ یہ بیان محض ایک سیاسی دعویٰ نہیں بلکہ قومی غیرت اور تہذیبی ورثے کا مسئلہ ہے۔ یہ بیان تائیوان کیلئے ایک خوف اور دنیا کیلئے ایک اعلان تھا۔ چین ہمیشہ تائیوان کو اپنا صوبہ سمجھتا آیا ہے، اور اب اس نے دنیا کے سامنے یہ عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں اس ادھورے خواب کو حقیقت بنائے گا۔ یہ اعلان تائیوان کے عوام کیلئے خوف اور چین کے عوام کیلئے امید کا پیغام اور خواب کی تعبیر تھا۔

شی نے طاقت کے استعمال کے امکان کو رد نہیں کیا۔ جو ہتھیار دکھائے گئے، ان میں زیادہ تر بحری قوت کی برتری کو ظاہر کر رہے تھے۔ بحری قوت کی نمائش اس بات کا اعلان تھی کہ چین اب تائیوان کے گرد سمندری دائرہ مضبوط کر رہا ہے۔ شی نے طاقت کے استعمال کو رد نہیں کیا۔ جو ہتھیار دکھائے گئے، وہ خاص طور پر بحری قوت کی برتری ظاہر کر رہے تھے اور یہ اشارہ تھا کہ تائیوان کے گرد سمندروں میں چین کا دائرہ تنگ ہو تا جا رہا ہے۔ یہ سمندری حصار کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔ یہ دراصل ایک پیغام تھا کہ چین اپنے سمندری دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنا رہا ہے۔ تائیوان کے گرد سمندروں پر بالادستی کا خواب اب قریب ہے۔ شی نے طاقت کے استعمال کے امکان کو رد نہیں کیا۔ جو ہتھیار پیش کیے گئے، ان میں زیادہ تر بحری صلاحیتوں سے متعلق تھے۔ یہ تائیوان کے گرد سمندروں میں اپنی بالادستی کا اشارہ تھا۔ گویا سمندراب مشرق کے قدموں کے نیچے آرہے ہیں۔

یوکرین کی جنگ میں الجھامغرب اس تقریب میں غیر حاضر تھا۔ چین نے اپنی موجودگی اور مغرب نے اپنی غیر موجودگی کے ذریعے دنیا کو حقیقت بتا دی۔ چین نے اس موقع پر ایک طرف اپنی طاقت دکھائی اور دوسری طرف مغرب کی کمزوری کو عیاں کر دیا۔ یہ غیر حاضری اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ مغرب اپنی اندرونی مشکلات میں پھنس چکا ہے اور مشرق اپنے قدم آگے بڑھا رہا ہے۔

چین کے بحری بیڑے، چھٹی نسل کے طیارے اور مسلسل مشقیں اس بات کا اعلان ہیں کہ وہ امریکا کی ”جزائر کی زنجیر“ توڑنے پر تلا ہوا ہے۔ امریکا نے بحر الکاہل میں چین کو محدود رکھنے کیلئے جزائر کا ایک حصار کھڑا کیا تھا مگر چین اب اس حصار کو توڑ کر سمندروں میں آزادانہ حرکت کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ چین اب اسے توڑنے کیلئے اپنی مشقیں اور بیڑے تیار کر رہا ہے۔ چین بحری بیڑوں کی حرکت، چھٹی نسل کے طیاروں اور مسلسل مشقوں کے ذریعے یہ ظاہر کر رہا ہے اور چین کا یہ پراسرار عمل اس بات کا اعلان ہیں کہ وہ امریکا کی ”جزائر کی زنجیر“ کو توڑنے پر تلا ہوا ہے جس کے ذریعے وہ چین کو محدود رکھنا چاہتا ہے۔

سمندروں پر حکمرانی ہمیشہ عالمی طاقت کیلئے شرطِ اول رہی ہے۔ برطانیہ نے سمندروں پر حکمرانی کر کے سلطنت قائم کی۔ امریکا نے بھی یہی کیا اور اپنی بالادستی بحری بیڑوں کے سہارے قائم رکھی۔ اب چین بھی اسی خواب کی تعبیر چاہتا ہے۔ اب چین اسی تاج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ محض خواب یا مستقبل کی دستک اور محض عسکری حکمت عملی نہیں ہی نہیں بلکہ ایک تہذیبی بیداری کا استعارہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی بحری قوت کا تاج اب زیادہ دور نہیں۔ چین سمندروں پر حکمرانی کے خواب کو حقیقت کے قریب لے آیا ہے۔ چین کے خواب میں سمندروں پر حکمرانی محض ایک عسکری مقصد نہیں بلکہ تہذیبی بیداری کا استعارہ ہے۔ جب کوئی قوم سمندروں پر قابض ہو جاتی ہے تو اس کے خواب بھی لا محدود ہو جاتے ہیں۔

اعداد و شمار یہ بتا رہے ہیں کہ امریکا کے پاس 219 جنگی بحری جہاز ہیں، جبکہ چین کے پاس 234۔ یہ گنتی نہیں بلکہ تاریخ کا اشارہ ہے کہ طاقت کا توازن بدل رہا ہے۔ یہ اعداد محض گنتی نہیں بلکہ ایک مستقبل کی جھلک ہیں جو طاقت کا توازن بدل سکتی ہے۔ یہ عددی حقیقت اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ طاقت کا پلڑا بدلنے لگا ہے۔ یہ محض عددی برتری نہیں بلکہ ایک تاریخی موڑ ہے، جہاں طاقت کا توازن جھکنے لگا ہے۔ اگر یہ رفتار جاری رہی تو آنے والا وقت سمندروں کی حکمرانی کا تاج مشرق کے سر پر سجادے گا۔

یہ پریڈ محض ایک تقریب نہ تھی بلکہ ایک اعلان تھا کہ دنیا کا مرکز بدل رہا ہے۔ یہ پریڈ محض ایک تقریب نہ تھی بلکہ عالمی سیاست میں ایک نئے موڑ کا اعلان تھی۔ شی جن پنگ نے دنیا کو بتایا کہ اب طاقت کا مرکز مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ مشرق کی صبح طلوع ہو رہی ہے اور مغرب کی

شام ڈھلنے کو ہے۔ دنیا اب اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ چین محض ایک طاقتور ملک نہیں بلکہ ایک ایسا رہنما ہے جو مشرق کو متحد کر کے مغرب کی بالادستی کو چیلنج کرنے کیلئے تیار ہے۔ تاریخ کے صفحات میں یہ لمحہ ہمیشہ ایک نئے موڑ اور ایک باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔ یہ منظر نامہ دراصل ایک نئی عالمی بساط کا عکس ہے، جہاں مشرقی رہنما اپنے خدو خال مرتب کر رہے ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں یہ لمحہ محض ایک پریڈ نہیں بلکہ ایک یادگار اعلان ہے کہ دنیا کی قیادت کی سمت بدل رہی ہے۔

گویا یہ محض ایک پریڈ کی روداد نہیں، اس کے تاریخی، سیاسی اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ واضح کرتی ہیں بلکہ ایک پوری عالمی تاریخ کا موڑ ہے جو دنیا کی سیاست کے مستقبل کو بدلنے والا ہے۔ یہ منظر محض ایک فوجی پریڈ نہ تھا بلکہ تاریخ کا ایک فیصلہ تھا۔ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ طاقت کا مرکز اب یکطرفہ نہیں رہا۔ واشنگٹن کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے اور بیجنگ کے ہاتھ مضبوط ہو رہے ہیں۔ مشرق جسے کل تک محکوم سمجھا جاتا تھا، آج فاتح کی طرح کھڑا ہے۔ یہ لمحہ ہمیں رومی سلطنت کے زوال، اندلس کی شام، اور برطانوی سلطنت کے غروب کی یاد دلاتا ہے۔ ہر عہد کا ایک سورج ہوتا ہے، جو طلوع بھی ہوتا ہے اور غروب بھی۔ امریکا کا سورج اپنی نصف النہار سے ڈھل رہا ہے اور مشرقی آسمان پر ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

چینی پریڈ نے یہ پیغام دیا ہے کہ دنیا کی باگ اب مغرب کے ہاتھوں میں نہیں رہے گی۔ یہ قیادت کی منتقلی کا اعلان ہے۔ ایک ایسا اعلان جو توپوں کی گھن گرج، بحری بیڑوں کی روانی اور اتحاد کی علامتوں کے ساتھ کیا گیا۔ آج کے بعد دنیا کو یہ ماننا ہو گا کہ تاریخ نے کروٹ بدل لی ہے، اور مستقبل کا باب مشرق کے ہاتھ سے لکھا جائے گا۔

اے دنیا کے رہنے والو! تم کب تک آنکھیں بند رکھو گے؟ کیا تمہیں نہیں دکھائی دیتا کہ واشنگٹن کے ایوانوں میں اضطراب ہے اور بیجنگ کے میدانوں میں اطمینان؟ کیا تم نہیں سنتے کہ تاریخ کی گھنٹیاں بج رہی ہیں؟ وہی گھنٹیاں جو کبھی رومی سلطنت کے زوال پر بجی تھیں، وہی گھنٹیاں جو اندلس کی شام پر بجی تھیں، وہی گھنٹیاں جو برطانیہ کی ڈوبتی سلطنت پر بجی تھیں۔ آج وہی صد امریکا کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔

دیکھو! مشرق کے افق پر ایک نیا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ وہ سورج جس کی کرنیں توپوں کی لویں، بحری بیڑوں کی روانی میں، اور اتحاد کے عزم میں جھلک رہی ہیں۔ دنیا کی باگ اب مغرب کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔ یہ لمحہ اعلان کر رہا ہے کہ قیادت کا تاج مشرق کے سر پر سج چکا ہے۔

اور اے اہل مغرب! سن لو! تمہارے دن گزر گئے، تمہارا غرور ٹوٹ چکا۔ تاریخ نے کروٹ بدل لی ہے، اور مستقبل کا صفحہ اب بیجنگ کے قلم سے لکھا جائے گا۔

تاریخ کی نئی کروٹ اور پاکستان کا مقام

اے اہل وطن! آج ہم اُس لمحے کے دہانے پر کھڑے ہیں جو صدیوں کی خاموشی اور آزمائش کے بعد ہمارے لیے روشن روشنی لے کر آیا ہے۔ وہ لمحہ جب امتِ مسلمہ کیلئے ہر زمین کے ذرے میں شعور کی چمک، ہر آسمان میں امید کا نور اور ہر دل میں عزم و غیرت کی تپش محسوس ہو رہی ہے۔

یاد کرو وہ دن جب حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں اہل مدینہ نے مہاجر و انصار کے ساتھ مل کر ایک نیا عہد قائم کیا، یاد کرو بدر کے وہ دن جب ایمان کی طاقت نے چھوٹی جماعت کو بڑی قوت پر غالب کر دیا:

كَمْ مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ: 249)

کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئیں۔

آج وہی روح، وہی عزم، وہی یقین ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ پاکستان وہ قلعہ ہے جو دشمنوں کیلئے راز تھا، اور آج وہ تلوار ہے، وہ چراغ ہے، وہ سورج ہے جس سے مشرق روشن ہو رہا ہے۔ یہ وہ پاکستان ہے جو ایمان کی بنیاد پر مضبوط، اتحاد کی رسی سے بندھا، اور تاریخ کی نظروں میں ابھرتا ہے۔ یہ لمحہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کوئی قوت مسلم دنیا کو بانٹ نہیں سکتی، کوئی چال امتِ اسلام کی یکجہتی کو کمزور نہیں کر سکتی۔ یہ وہ وقت ہے جب ایک نئے عہد کی طرف بڑھ رہی ہے۔ پاکستان اور امت کی تقدیر

آج کی اس گھڑی میں تاریخ اپنی پوری شدت کے ساتھ ہمیں آواز دے رہی ہے۔ صدیوں کی محکومی کے بعد وہ لمحہ قریب آ گیا ہے جب امتِ مسلمہ کے قدموں تلے زمین لرزتی ہے اور آسمان اپنی آنکھوں سے ایک نیا منظر دیکھنے کو بے قرار ہے۔ یاد کرو بدر کے ریگزار کو، یاد کرو اُحد کے میدان کو، یاد کرو صلاح الدین ایوبی کا وہ لمحہ جب صلیبی قلعے اس کے قدموں تلے کانپ رہے تھے۔ آج وہی روح، وہی ایمان، وہی غیرت، پھر سے ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔

پاکستان ہاں، یہ پاکستان — جو کبھی دشمنوں کیلئے ایک راز تھا، آج ان کیلئے ایک بجلی ہے، ایک تلوار ہے، ایک قلعہ ہے۔ اور دنیا کو سن لینا چاہئے کہ یہ سرزمین اب نہ جھکے گی، نہ بکے گی، نہ دبے گی۔ یہ وہ پاکستان ہے جو ایمان کا محور، اسلام کا قلعہ، اور مشرق کا سورج ہے!

اہل نظر! وقت کی گردشیں ہمارے سامنے ایک نیا منظر نامہ رقم کر رہی ہیں۔ دنیا کی سیاست کا دریائے بلاخیز ایک نئے موڑ پر آ پہنچا ہے۔ تاریخ کے افق پر وہی منظر ابھر رہا ہے جو کبھی بدر و حنین کے میدانوں میں دکھائی دیا تھا۔ جب ایمان کی روشنی نے اندھیروں کو شکست دی اور کمزور سمجھی جانے والی جماعت نے بڑے بڑے جباروں کو سرنگوں کر دیا۔

اہل وطن، اہل ایمان! آج کی یہ نشست محض تجزیہ نہیں، یہ وہ لمحہ ہے جب تاریخ ہماری آنکھوں کے سامنے اپنی نئی تقدیر رقم کر رہی ہے۔ وقت کی عدالت میں ہم سے یہ سوال کیا جا رہا ہے، کیا تم زمین میں خلافت کے امین بن کر کھڑے ہو یا غلامی کے بوجھ تلے جھکے رہو گے؟ قرآن کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (الأنبياء 105)

ہم نے زبور میں لکھ دیا ہے کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

یہی آیت آج ہمیں یاد دلاتی ہے کہ زمین کی وراثت ان کے ہاتھ میں ہے جو ایمان و عمل کے چراغ روشن کرتے ہیں۔

یہ ایک تاریخ ساز لمحہ تھا جب وزیراعظم پاکستان شہباز شریف کے طیارے کو سعودی فضاؤں میں داخل ہوتے ہی شاہی فضائیہ کے جنگی جہازوں نے اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا۔ شاہی جنگی جہازوں نے اس کو اپنے آہنی پروں میں یوں لپیٹ لیا جیسے عقاب اپنے بچے کو طوفان سے بچاتا ہے، سعودی شاہی فضائیہ کے طیارے اپنے آہنی بازو پھیلائے، جیسے محافظ فرشتے مہمان کے گرد حصار باندھ لیتے ہیں تو یہ محض سفارتی پروٹوکول نہ تھا، یہ ایک عہد کی تجدید تھی۔

گویا یہ استقبال محض ایک پروٹوکول نہ تھا بلکہ ایک پیغام تھا، وفا، اعتماد اور اخوت کا۔ یہ محض ایک پروٹوکولری تقریب نہ تھی بلکہ ایک عہد کا اعلان تھا۔ جب شہباز شریف کا طیارہ سعودی فضاؤں میں داخل ہوا اور جنگی جہازوں نے اس کو حصار میں لیا تو یوں لگا جیسے قرآن کی یہ آیت عملی صورت اختیار کر گئی ہو: **هُوَ الَّذِي آتَاكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ (الأنفال: 62)** وہی ہے جس نے آپ کی مدد اپنی نصرت اور مومنوں کے ذریعے کی۔

کنگ خالد ایئر پورٹ پر 21 توپوں کی گونج اور ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کی پیش قدمی نے اس پیغام کو مزید جلا بخشی، تو اس منظر نے ایک نئے عہد کی پیش بندی کا اعلان کر دیا کہ پاکستان اب دوست نہیں بلکہ اہل بیت الام کی طرح ایک ہی خاندان کا رکن ہے۔ شہزادہ محمد بن سلمان کی خود پیش قدمی نے اس پیغام کو عالمگیر گواہی دی کہ پاکستان اب عرب دلوں کی دھڑکن ہے۔ کنگ خالد ایئر پورٹ پر اکیس توپوں کی گونج گویا ناقوسِ تاریخ تھا جو کہہ رہا تھا یہ اتحاد محض وقتی رسم نہیں، یہ مستقبل کا معاہدہ ہے۔

اے اہل وطن آج کے دن تاریخ نے ہمیں بتایا کہ پاکستان تنہا نہیں۔ سعودی عرب کی فضاؤں میں جب ہمارے وزیراعظم کا طیارہ داخل ہوا تو شاہی جنگی جہازوں نے اسے اپنے آہنی پروں میں یوں لپیٹ لیا جیسے عقاب اپنے بچے کو طوفان سے بچاتا ہے اور جب کنگ خالد ایئر پورٹ پر اکیس توپوں کی سلامی اور ولی عہد محمد بن سلمان نے خود آگے بڑھ کر استقبال کیا، تو یہ پیغام تھا کہ پاکستان اور سعودی عرب کے رشتے اب پاکیزہ خون کی سیاہی سے لکھے گئے ہیں۔

پاکستان اور سعودی عرب کے مابین طے پانے والا یہ معاہدہ خطے میں طاقت کے توازن کی نئی بنیاد رکھتا ہے۔ یہ معاہدہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ دونوں ممالک محض معاشی شراکت دار نہیں بلکہ مستقبل کی عالمی سیاست میں ایک دوسرے کے دست و بازو بننے جارہے ہیں۔ یہ معاہدہ کوئی خشک دستاویز نہیں، یہ خونِ صداقت کی تحریر ہے۔ یہ وہ اعلان ہے کہ اب ایک کا دکھ دونوں کا دکھ ہے، ایک کی حفاظت دونوں کی حفاظت ہے۔ جس طرح مدینہ کے انصار نے مہاجرین کے ساتھ بھائی چارہ باندھا تھا، اسی طرح یہ معاہدہ نئی اسلامی اخوت کی بنیاد ہے۔

یہ معاہدہ اسی میثاقِ مدینہ کی بازگشت ہے جو نبی اکرم ﷺ نے اہل مدینہ کے ساتھ باندھا تھا۔ وہاں بھی دفاع مشترک تھا، یہاں بھی۔ وہاں بھی دشمن پر حملہ سب پر حملہ تھا، یہاں بھی یہی اعلان ہے۔ یہ معاہدہ صرف ایک کاغذی معاہدہ نہیں، بلکہ ایک نئی میثاقِ مدینہ ہے۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے مہاجر و انصار کو ایک قوم بنایا تھا، اسی طرح یہ معاہدہ پاکستان اور عرب کو ایک جان، ایک جسم بنا رہا ہے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان جو معاہدہ طے پایا، اسے محض کاغذی سطور پر تحریر نہ سمجھا جائے، یہ ایک تاریخ کا نیا باب ہے۔ یہ عہد ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان اخوت کی بنیاد اب صرف جذباتی وابستگی نہیں رہے گی بلکہ عملی حکمتِ عملی اور اسٹریٹجک تعاون پر استوار ہوگی۔

یاد رکھو یہ شق بے مثال اور نہایت غیر معمولی ہے کہ اگر کسی ایک پر جارحیت ہوگی تو اسے دونوں پر جارحیت سمجھا جائے گا۔ ایک پر حملہ دونوں پر حملہ سمجھا جائے گا۔ گویا ایک جسم، ایک جان کی مانند یہ تعلق اب دشمن کے وار کے خلاف ڈھال بننے جا رہا ہے۔ یہ الفاظ معمولی نہیں کہ ایک پر حملہ دونوں پر حملہ ہے۔ یہ الفاظ گونجتے ہیں تو لگتا ہے کہ تاریخ کے اوراق پر نئی بیعت لکھی جا رہی ہے۔ یہ عالم اسلام کی نیٹو ہے، مگر ایمان اور اخوت کے رشتے سے جڑی ہوئی۔ یہ اعلان کہ ایک پر حملہ دونوں پر حملہ ہے۔ دراصل قرآنی اصول کی یاد دہانی ہے۔ یہ شق کہ ایک پر حملہ سب پر حملہ ہے اس آیت کی تفسیر ہے: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات: 10) مومن تو بس بھائی ہیں۔

گویا ایک پیکٹ آف فیٹ، ایک مشترکہ تقدیر۔ یہ وہ بات ہے جو نیٹو ممالک کے معاہدوں میں تو ملتی ہے، مگر مسلم دنیا میں پہلی بار کسی معاہدے میں اس صراحت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یہ بھائی چارہ اب تحریری معاہدوں سے نکل کر عملی میدان میں داخل ہو رہا ہے۔ یہ وہ بھائی چارہ ہے جو اب عملی سیاست میں ڈھل رہا ہے۔

یہ پیغام مغرب اور مشرق دونوں ایوانوں کیلئے ہے، یہ اعلان ہے اسرائیل کے قلعوں کیلئے، یہ تنبیہ ہے ان طاقتوں کیلئے جو سمجھتی تھیں کہ مسلم دنیا کبھی یکجا نہیں ہو سکتی۔ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ عالم اسلام بکھری ہوئی ریت نہیں بلکہ صحراؤں کی چٹان ہے۔ اب کوئی طاقت اس وحدت کو محض وقتی شور سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ہم ایک ہیں، اور ہمارا ارادہ ایک فولاد ہے۔

دنیا کے ایوانوں میں یہ صدا پہنچ گئی ہے کہ امت مسلمہ بیدار ہو رہی ہے۔ دنیا کے ایوانوں کو سن لینا چاہئے کہ امت مسلمہ بیدار ہو رہی ہے۔ مغرب کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ دور گزر گیا جب قومیں غلامی کے طوق پہنتی تھیں۔ وہ وقت گزر گیا جب ہم غلامی کے طوق پہنے پھرتے تھے۔ اب وہ لمحہ قریب ہے جب سورج مغرب سے نہیں بلکہ مشرق سے طلوع ہوگا۔ اب ہم وہی ہیں جنہوں نے کہا تھا:

قَوْمُ اللَّهِ شَهَدَاءُ بِالْقِسْطِ (النساء: 135) اللہ کیلئے انصاف پر قائم ہو جاؤ۔ یہ معاہدہ ایک غیر معمولی دفاعی بندوبست ہے، اور عالمی طاقتوں کیلئے ایک صریح پیغام۔ کہ مسلم دنیا اب بکھری نہیں بلکہ ایک نئی وحدت میں ڈھل رہی ہے۔

جب اسرائیل نے قطر پر یلغار کی تو مسلم دنیا کے اکثر ممالک خاموش رہے، مگر پاکستان نے پہلی کی۔ یہ وہی جذبہ تھا جو بدر کے میدان میں مہاجر و انصار نے دکھایا تھا: كَمْ مِّنْ فِتْنَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِتْنَةُ كَثِيرَةٍ بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرہ: 249) کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آگئیں۔ پاکستان کی موجودگی نے عرب دنیا کو یہ یقین دلایا کہ آج بھی بدر کے مجاہد زندہ ہیں۔

وزیر اعظم کے ہمراہ سپہ سالار کی موجودگی نے یہ تاثر دیا کہ پاکستان اب محض سیاسی تماشائی نہیں بلکہ عملی محافظ اور عملی مجاہد بھی ہیں۔ پاکستانی سپہ سالار کی موجودگی نے واضح کر دیا کہ یہ محض سفارتی ہمدردی نہیں، بلکہ ایک عملی عزم ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب عرب دلوں میں یہ یقین بیٹھ گیا کہ پاکستان صرف ایک ملک نہیں، بلکہ ایک حفاظت کا سایہ ہے۔ عرب دنیا کے دلوں نے محسوس کیا کہ پاکستان ان کیلئے صرف لفظوں کا ہمدرد نہیں بلکہ میدان کا ساتھی ہے۔ اسرائیل کے حملے کے بعد جب اکثر تخت خاموش تھے، پاکستان سب سے پہلے دوچہ پہنچا۔ وزیر اعظم کے ساتھ سپہ سالار کی موجودگی نے یہ اعلان کیا کہ ہم صرف ہمدرد نہیں، محافظ بھی ہیں۔ یہ منظر بدر کے غازیوں کی یاد دلاتا ہے۔



دوحہ میں ہونے والی حالیہ عرب کانفرنس میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ عرب دنیا اپنی عسکری اور دفاعی ضرورتوں کیلئے سب سے بڑھ کر پاکستان پر اعتماد کر رہی ہے۔ گویا اب اسلامی نیشنل گارڈ کی حیثیت پاکستان کو دی جا رہی ہے۔ دوحہ کانفرنس میں عرب دنیا کی نگاہیں جس طرف اٹھیں، وہ پاکستان

تھا۔ گویا عالم اسلام نے کہہ دیا ہمارا محافظ، ہمارا بھائی، ہمارا قلعہ، ہمارا محور — پاکستان ہے۔ دوحہ کانفرنس میں جب سب نگاہیں پاکستان پر ٹک گئیں تو وہ لمحہ دراصل تاریخ کا فیصلہ کن موڑ تھا۔ گویا امت نے کہہ دیا کہ ہماری تلوار پاکستان ہے، ہمارا قلعہ پاکستان ہے۔ دوحہ کانفرنس کے بعد عرب دنیا نے جس اعتماد کا اظہار کیا ہے، وہ ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اب اسرائیل کے مقابلے میں عرب دنیا نے جس ملک پر سب سے زیادہ بھروسہ جمایا ہے، وہ پاکستان ہے۔

سعودی عرب کی راہ پر چلتے ہوئے یہ امکان قوی ہے کہ مصر، امارات، اور دیگر خلیجی ریاستیں بھی پاکستان کے ساتھ اسی نوعیت کے معاہدوں پر آمادہ ہو جائیں۔ یہ وہ لہر ہے جو طوفان کی طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ ممکن ہے کہ کل یہ لہر ایک ایسی فوجی وحدت میں ڈھل جائے جس کا نام تاریخ اسلامی نیو رکھے۔ اہل عرب اب اس خواہش میں ہیں کہ یہ معاہدے صرف سعودی عرب تک محدود نہ رہیں بلکہ پورے عالم عرب کو اپنے حصار میں لے لیں۔ یہ وہی خواب ہے جو کبھی صلاح الدین ایوبی نے دیکھا تھا، اور آج اس خواب کی کرنیں اسلام آباد سے نکل رہی ہیں۔ وزیراعظم اور سپہ سالار کے ریاض میں شاندار استقبال کے بعد عرب دنیا میں یہ تاثر گہرا ہوا ہے کہ اب دیگر ممالک بھی پاکستان کے ساتھ اسی نوعیت کے معاہدوں کے خواہاں ہیں۔

اہل نظریہ سوال اب وقت کی عدالت میں کھڑا ہے کہ امریکا کیا کرے گا؟ یورپ کیا سوچے گا؟ امریکا، یورپ اور اسرائیل اس ابھرتے اتحاد کو کس نظر سے دیکھیں گے؟ کیا وہ اس کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کریں گے یا حالات کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے رویے میں نرمی لائیں گے؟ اسرائیل کس چال کی تیاری کرے گا؟ کیا وہ خاموش بیٹھیں گے یا سازشوں کے جال پھیلانیں گے؟ امکان یہی ہے کہ وہ اس اتحاد کو ایک نیا خطرہ سمجھیں گے، اور بالواسطہ دباؤ یا سازشوں کا سہارا لیں گے لیکن یاد رکھو جب ایک قوم بیدار ہو جائے تو دنیا کی بڑی بڑی سازشیں تنکوں کی طرح بکھر جاتی ہیں۔ یقیناً امریکا اور اسرائیل اسے اپنے لئے خطرہ سمجھیں، لیکن ہم کہتے ہیں:

وَلَا تَهْزُؤُوا وَلَا تَحْزَنْوُوا أَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (آل عمران: 139) ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان رکھتے ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ عالم اسلام کے اس اعتماد کے جواب میں دنیا کی متحارب قوتیں کیا لائحہ عمل اختیار کریں گی؟ کیا مغرب کو یہ نئی صف بندی ایک چیلنج کے طور پر دکھائی دے گی یا وہ محض تماشائی کا کردار ادا کرے گا؟ امریکا، یورپ اور اسرائیل اسے اپنے لئے خطرہ سمجھیں گے۔ مگر ہم قرآن کی آواز پر یقین رکھتے ہیں: إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ (العمران: 160) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

یہ کوئی دعویٰ نہیں، یہ تاریخ کی شہادت ہے کہ پاکستان نے جب بھی میدانِ جنگ میں قدم رکھا، دشمن کو چاروں شانے چت کر دیا۔ بھارت کو بارہا اس تلخ حقیقت کا سامنا ہوا کہ پاکستان محض دفاعی قلعہ نہیں بلکہ حملہ آور تلوار بھی ہے۔ پاکستان نے اپنی تاریخ میں بارہا یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے پاس محض دفاع کی نہیں بلکہ جارح دشمن کو پچھاڑنے کی قوت بھی موجود ہے۔ پاک-بھارت جنگوں میں دنیا نے دیکھا کہ کس طرح ایک نسبتاً چھوٹا ملک ایک بڑے ملک کو میدانِ جنگ میں چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔ یہ ماضی کا تجربہ مستقبل کے اعتماد کی اساس ہے۔

پاکستان کی تاریخ چنچ چنچ کر گواہی دیتی ہے کہ یہ قوم جب بھی میدان میں اتری، دشمن کو چاروں شانے چت کر کے دکھایا۔ پاک-بھارت جنگیں اس کا روشن ثبوت ہیں۔ پاک-بھارت جنگیں اس بات کی گواہی ہیں کہ یہ قوم ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کے اصول پر قائم ہے۔ یہ وہی قوم ہے جس نے بڑے بڑے ہاتھیوں کو اپنی چھوٹی چھوٹی غلیلوں سے بچھاڑ دیا۔ اقوامِ عالم کیلئے یہ کوئی راز نہیں رہا کہ پاکستان اپنے دشمن کو پے درپے شکست دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ماضی کی جنگوں میں بھارت کو چاروں شانے چت کر کے پاکستان نے دنیا کو باور کرا دیا تھا کہ یہ قوم محض دفاع ہی نہیں، فتح کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

ایس سی او اجلاس میں پاکستان، چین، روس اور شمالی کوریائی مشترکہ وکٹری پریڈر اصل ایک نئے عالمی بلاک کی نشاندہی ہے۔ یہ پیغام ہے کہ اب عالمی سیاست میں صرف واشنگٹن اور نیٹو ہی نہیں، بلکہ ایشیائی اتحاد بھی ایک ناقابلِ نظامد از قوت کے طور پر ابھر رہا ہے۔ پاکستان، چین، روس اور شمالی کوریائی مشترکہ وکٹری پریڈر نے خطے میں ایک نئے اتحاد کا پرچم لہرایا ہے۔ یہ منظر محض عسکری قوت کا مظاہرہ نہیں، بلکہ عالمی سیاست میں مشرق کے ابھرتے ہوئے محور کا اعلان ہے۔

پاکستان، چین، روس اور شمالی کوریائی ایک ساتھ ایک ہی پریڈر میں کھڑے ہوئے تو دنیا نے محسوس کیا کہ یہ مشرقی اتحاد کی ابتدائی تصویر ہے۔ ایک ساتھ کھڑا ہونا مشرقی اتحاد کی ابتدا ہے۔ یہ منظر تاریخ کو بتا رہا ہے کہ طاقت کا نیا محور مشرق ہے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب طاقت کا نیا مرکز نمودار ہوا۔ ان ممالک کا ایک ساتھ کھڑا ہونا دراصل اس آیت کی تعبیر ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (ال عمران: 103) اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ نہ ڈالو۔

یہی رسی آج مشرقی بلاک کو ایک ساتھ جوڑ رہی ہے۔ چین نے پہلی بار واضح اعلان کیا کہ تائیوان کو چین میں شامل کرنے کا وقت قریب ہے، تائیوان ہمارا ہے اور ہم اسے لے کر رہیں گے۔ اپنی بحری و فضائی طاقت کے مظاہرے نے دنیا کو یہ باور کرا دیا کہ اب مشرقی ایشیا میں کوئی فیصلہ ہماری مرضی کے بغیر نہیں ہوگا۔ یوں طاقت کا محور مغرب سے مشرق کی جانب کھسک رہا ہے۔ اپنی بحری اور فضائی طاقت دکھا کر چین نے دنیا کو باور کرا دیا کہ اب مشرق اپنے قدموں پر کھڑا ہے اور طاقت کا توازن مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔

دنیا نے دیکھ لیا کہ مشرق کی لہریں اب طوفان بن رہی ہیں۔ طاقت کا مرکز مغرب سے مشرق کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اپنی فضائی و بحری طاقت کا بے مثال مظاہرہ کر کے واضح کر دیا کہ اب طاقت کا محور مغرب سے مشرق کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ اپنی فضائی و بحری طاقت کا بے مثال مظاہرہ کر کے واضح کر دیا کہ اب طاقت کا محور مغرب سے مشرق کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ اور چین نے ثابت کر دیا کہ اب ایشیا کی ہوا رخ بدل رہی ہے۔

سعودی عرب کے بعد وزیراعظم پاکستان کا برطانیہ کا دورہ محض رسمی نوعیت کا نہیں، بلکہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ پاکستانی وفد کا برطانیہ پہنچنا محض روایتی سفارتکاری نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنی موجودگی کو اجاگر کرنے کی ایک نئی حکمت عملی اور ایک نئی سفارتی پیش بندی ہے۔ پاکستان کا برطانیہ کا سفر دراصل عالمی تخت و تاج کو یہ بتانے کیلئے ہے کہ ہم صرف مشرق ہی کے نہیں، مغرب کے دروازوں پر بھی اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہیں۔ تاہم یہ دورہ یورپ میں پاکستان کی حیثیت کو نئے زاویوں سے اجاگر کرے گا۔ اگرچہ صدر ٹرمپ وہاں پہلے سے موجود ہیں مگر ان کی وزیراعظم پاکستان سے ملاقات فی الحال متوقع نہیں۔ تاہم یہ دورہ برطانیہ اور یورپ میں ایک نئے مکالمے کی راہ ہموار کرے گا۔ تاہم دنیا کی نظریں اس دورے پر جمی ہوئی ہیں۔

برطانیہ کے بعد اقوام متحدہ کا اجلاس عالمی سیاست کا وہ میدان ہے جہاں پاکستان اپنی بات براہ راست پوری دنیا کے سامنے رکھے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پاکستان اپنی پکار پوری دنیا تک پہنچائے گا۔ یہاں پاکستان کا پیغام دنیا کے ایوانوں میں گونجے گا۔ اگر صدر ٹرمپ سے ملاقات ہوئی تو یہ ملاقات عالمی سیاست کے ایک نئے باب کی ابتدا ہو سکتی ہے۔ ٹرمپ سے ممکنہ ملاقات نہ صرف دوطرفہ تعلقات بلکہ عالمی طاقتوں کے توازن پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ملاقات ہوئی تو وہ صرف دو افراد کی ملاقات نہ ہوگی، بلکہ دو نظاموں، دو مستقبلوں اور دو راستوں کا مکالمہ ہوگا۔ یہ ملاقات عالمی سیاست کے نئے رخ کا تعین کر سکتی ہے جہاں ٹرمپ ایک مرتبہ پھر پاک بھارت جنگ میں سیز فائر کا کریڈٹ لیکر دنیا کو بتانے کی کوشش کریں گے کہ کس طرح انہوں نے خطے کو ایٹمی جنگ سے محفوظ رکھنے میں مدد کی۔

دنیا تیزی سے نئے سیاسی اور عسکری اتحادوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مغرب کی گرفت کمزور ہو رہی ہے اور مشرق میں ایک نیا مرکز قوت ابھر رہا ہے۔ اس سارے منظر نامے میں پاکستان ایک فیصلہ کن مقام پر کھڑا ہے۔ ایک طرف وہ عالم اسلام کا عسکری محور ہے۔ دوسری طرف وہ ایشیائی بلاک (چین، روس) کیلئے ایک کلیدی کھلاڑی ہے اور تیسری طرف مغرب اس کو نظر انداز کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ یوں پاکستان کی پالیسی، قیادت اور فیصلے آئندہ کئی دہائیوں کی عالمی سیاست کا رخ متعین کرنے والے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ پاکستان کہاں کھڑا ہے، بلکہ یہ ہے کہ دنیا کو مستقبل میں کہاں کھڑا ہونا پڑے گا؟

اے اہل وطن! وقت کی کروٹیں بدل رہی ہیں۔ دنیا بدل رہی ہے۔ مشرق کا سورج طلوع ہو رہا ہے۔ پاکستان اس سورج کی کرن ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے قلعے لرز رہے ہیں۔ مشرق کا سورج طلوع ہو رہا ہے اور مغرب کی روشنی ماند پڑ رہی ہے۔ پاکستان، جو کبھی ایک خطے کی چھوٹی سی ریاست سمجھا جاتا تھا، آج عالم اسلام کا قلعہ ہے، مشرقی اتحاد کا محور ہے، اور عالمی سیاست کی نئی تقدیر لکھنے والا ہاتھ ہے۔ یاد رکھو سوال یہ نہیں کہ دنیا پاکستان کے ساتھ کیا کرے گی، سوال یہ ہے کہ پاکستان دنیا کے ساتھ کیا کرنے جا رہا ہے اور اللہ کے دین کیلئے کیا کرنے جا رہا ہے؟ مگر ہمیں خوف نہیں کیونکہ ہمیں اپنے رب کا وعدہ یاد ہے: **إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ** (العمران: 160) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔

پاکستان آج عالم اسلام کا قلعہ ہے، ایشیائی بلاک کا محور ہے، اور عالمی سیاست کا نیا معمار ہے۔

یاد رکھیں! دنیا کی سیاست تیزی سے نئے موڑ لے رہی ہے۔ مشرق کی قوتیں ایک نئے اتحاد کی جانب بڑھ رہی ہیں۔ پاکستان، جو کبھی محض ایک خطے کی ریاست سمجھا جاتا تھا، آج عالم اسلام کے محور کے طور پر ابھر رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مغرب کے ایوان اقتدار اس بدلتی صورت حال کو کیسے دیکھیں گے؟ کیا وہ مزاحمت کریں گے یا نئے توازن طاقت کو تسلیم کر کے اپنی پالیسیوں کو از سر نو مرتب کریں گے؟

اے اہل وطن! آج ہم اُس وقت میں کھڑے ہیں جب دنیا کے نقشے بدل رہے ہیں، جب مشرق کا سورج طلوع اور مغرب کی روشنی مدھم ہو رہی ہے۔ پاکستان، جو کبھی ایک خطے کی چھوٹی ریاست تھا، آج عالم اسلام کا قلعہ، مشرقی اتحاد کا محور اور عالمی سیاست کی نئی تقدیر لکھنے والا ہاتھ ہے۔

قرآن ہمیں یہ یاد دلاتا ہے: **وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ** (آل عمران: 139)

ہمت نہ ہارو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان رکھتے ہو۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ایمان کو تلوار اور اپنے اتحاد کو ڈھال بنائیں، اور اس عہد پر قائم رہیں کہ کوئی طاقت ہمارے اتحاد کو توڑ نہ سکے، کوئی سازش ہمیں ہانٹ نہ سکے۔

اہل وطن! وقت بدل رہا ہے۔ پاکستان، مشرق سے طلوع ہونے والے سورج کی پہلی کرن ہے۔ یہود و ہنود کے ایوان لرز رہے ہیں، لیکن ہمیں ڈر نہیں۔ پاکستان آج عالم اسلام کا قلعہ ہے، مشرقی بلاک کا محور ہے، اور مستقبل کی تاریخ کا معمار ہے۔ یاد رکھو! اگر ہم نے اللہ کے دین کو تھام لیا تو آسمان کی قوتیں ہماری مددگار ہوں گی۔ فرشتے ہماری صفوں میں اتریں گے۔ اور وہی منظر پھر دہرایا جائے گا جو کبھی بدر کے دن دہرایا گیا تھا۔ پاکستان آج عالم اسلام کا قلعہ ہے، مشرقی بلاک کا محور ہے، اور مستقبل کی تاریخ کا معمار ہے۔ لیکن ہمیں ڈر نہیں۔ ہمیں اپنے رب کا وعدہ یاد ہے:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ (الروم: 47) ہم پر لازم ہے کہ ہم ایمان والوں کی مدد کریں۔

اے اہل وطن وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے ایمان کو تلوار اور سینوں کو ڈھال بنائیں۔ یہ عہد کریں کہ کوئی طاغوتی طاقت ہمارے اتحاد کو توڑ نہ سکے۔ کوئی سازش ہمیں تقسیم نہ کر سکے۔ یاد رکھو! اگر ہم نے اللہ کے دین کو تھام لیا تو آسمان کی قوتیں ہماری مددگار ہوں گی۔ فرشتے ہماری صفوں میں اتریں گے۔ اور وہی منظر پھر دہرایا جائے گا جو کبھی بدر کے دن دہرایا گیا تھا۔

اے اللہ ہمیں وہی غیرت دے جو حضرت عمرؓ بن خطاب کو عطا کی گئی۔ ہمیں وہی حکمت دے جو حضرت علیؓ المرتضیٰ کو بخشی گئی۔ ہمیں وہی شجاعت دے جو حضرت خالدؓ بن ولید کے دل میں ڈالی گئی۔ اے اللہ پاکستان کو امت کا قلعہ بنا دے۔ اے اللہ ہماری افواج کو دین اسلام کا علمبردار بنا دے۔ اے اللہ اس سرزمین کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا مرکز بنا دے۔

آمین یا رب العالمین۔

عہدِ نوکاسنگِ میل

تاریخ کے صفحات پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ امتیں صرف شمشیر و سناں سے نہیں بلکہ اتحاد و یکجہتی، بصیرت و حکمت اور باہمی اعتماد سے زندہ و تابندہ رہتی ہیں۔ حجاز کی سرزمین، جہاں سے کلمۃ اللہ کی صدا بلند ہوئی اور برصغیر کی خاک، جس نے اسلام کے رنگ میں اپنی تہذیب کو سنوارا، آج ایک ایسے سنگِ میل پر کھڑی ہیں جہاں دونوں کا ہاتھ ملانا محض ایک معاہدہ نہیں بلکہ تاریخ کے نئے باب کا آغاز ہے۔

پاک سعودی دفاعی معاہدہ محض دو ملکوں کا دفاعی اشتراک نہیں، بلکہ وہ آئینہ ہے جس میں امتِ مسلمہ اپنی اجتماعی طاقت کا عکس دیکھ سکتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جس پر اہل دانش کہتے ہیں کہ زمانہ اپنے نئے موڑ پر آن کھڑا ہوا ہے۔ ایک طرف ہندوستان کی نگاہیں اضطراب میں ہیں، دوسری طرف چین اور ترکی جیسے رفیق کار اس منظر نامے میں نئی جہتوں کا اضافہ کر رہے ہیں۔ گویا مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن بدل رہا ہے اور پرانے سانچے ٹوٹ رہے ہیں۔

یہ مقالہ انہی تغیرات کا تجزیہ ہے۔ سعودی-پاکستان دفاعی معاہدے کے محرکات، اس کے خطے پر اثرات، چین و امریکا کی بدلتی پالیسیاں، اور فلسطین و ایران کے تناظر میں اٹھتے سوالات۔ مقصد یہ ہے کہ ہم واقعات کو محض خبریں نہ سمجھیں بلکہ انہیں تاریخ کی اس کڑی کے طور پر پڑھیں جس کا انجام آنے والی نسلوں کے نصیب لکھنے والا ہے۔

ہندوستان کی سفارتی لغت میں دھچکا کوئی معمولی لفظ نہیں۔ جب سعودی عرب جیسی عظیم قوت، جس کی دولت، سیاست اور دینی حیثیت مسلمہ ہے، پاکستان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کرتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ دہلی کی خوابگاہوں میں اضطراب کی تیز ہوا چلنے لگتی ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ خطے کی طاقتوں کے توازن میں نئی ترتیب پیدا ہو رہی ہے، اور ہندوستان اپنی تنہائی محسوس کرنے لگتا ہے۔

ہندوستان کی سیاست کیلئے یہ معاہدہ کسی زلزلے سے کم نہیں۔ وہ سرزمین جسے دہلی کی نگاہ میں محض تیل کے ذخائر اور سرمایہ کاری کا مرکز سمجھا جاتا تھا، آج اپنی سلامتی کیلئے اسلام آباد کی طرف دیکھ رہی ہے۔ یہ دہلی کیلئے ایسا ہے جیسے صدیوں کے پرانے قلعے کی دیوار میں اچانک دراڑ پڑ جائے۔ پاکستان، جو اپنے اسٹیج ہتھیاروں اور تجربہ کار فوج کے سبب پہلے ہی عالمِ اسلام کی ڈھال سمجھا جاتا تھا، اب سعودی عرب کے ساتھ باقاعدہ دفاعی معاہدے کے ذریعے اپنی حیثیت کو مزید مضبوط کر رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دہلی کے خواب بکھر جاتے ہیں اور نئی حقیقتیں ابھرتی ہیں۔

دہلی کے ایوانِ حکومت میں ہلچل محض سیاسی نہیں بلکہ فکری بھی ہے۔ یہ صرف حکومتِ ہند نہیں جو بے چین ہے، بلکہ اس کے دفاعی ماہرین بھی اپنی تحریروں اور تقریروں میں اندیشوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہاں کے دفاعی ماہرین کے چروں پر پریشانی کی لکیریں کچھ اور ہی کہانی سنارہی ہیں۔ ایک طرف یہ اندیشہ کہ پاکستان کی جوہری حیثیت اس معاہدے کو غیر معمولی وزن دے رہی ہے، اور دوسری طرف یہ خوف کہ خطے کے عرب ممالک اب دہلی کی بجائے اسلام آباد کو اپنا محافظ سمجھنے لگیں گے۔

ان کے خدشے یہ ہیں کہ پاکستان کی جوہری طاقت اگر عرب دنیا کے ساتھ جڑ گئی، تو خطے میں طاقت کا توازن یکسر بدل جائے گا۔ خلیجی ممالک اب اپنی سلامتی کیلئے دہلی کی بجائے اسلام آباد پر انحصار کریں گے۔ ہندوستان کی سرمایہ کاری اور تعلقات کے باوجود سعودی عرب نے پاکستان کو منتخب کیا، جو دہلی

کیلئے ایک سیاسی شکست ہے۔ یہ سب کچھ دہلی کیلئے اس وجہ سے بھی پریشان کن ہے کہ یہ تبدیلی محض وقتی نہیں بلکہ مستقبل کیلئے ایک نئی سفارتی سمت متعین کر رہی ہے۔

یہ معاہدہ قطر پر اسرائیلی حملے کے بعد طے پایا۔ گویا تاریخ نے ایک نیا باب کھولا ہے کہ جب عربوں کی سلامتی پر حملہ ہو تو پاکستان نے اپنے بازو کھول دئے، یہ معاہدہ محض کاغذی کارروائی نہیں، بلکہ ایک جنگی فضا کے سائے میں وجود میں آیا۔ دوحہ پر حملہ نے عالم عرب کیلئے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ ایسے میں پاکستان نے اپنے دفاعی تعاون کی پیشکش کی۔ وزیر دفاع خواجہ آصف کا کہنا کہ اگر دیگر عرب ممالک چاہیں تو وہ بھی اس میں شریک ہو سکتے ہیں، اس حقیقت کا اعلان ہے کہ پاک، سعودی دفاعی معاہدہ محض دو ملکوں کا نہیں بلکہ ایک پورے خطے کیلئے سلامتی کی ڈھال بننے پر آمادہ ہے۔ دراصل یہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں ایک نیا دروازہ کھولنے کے مترادف ہے۔ یہ وہی جذبہ ہے جو صدیوں پہلے بغداد کے درودیوار پر حملہ ہو تو امت کا درد بیدار ہو گیا تھا۔ یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ ہر بڑا معاہدہ اپنی سرحدوں سے باہر اثر ڈالتا ہے۔ یہ معاہدہ صرف سعودی عرب یا پاکستان تک محدود نہیں رہے گا بلکہ مغربی اور جنوبی ایشیا، دونوں خطوں میں اس کے اثرات نہ صرف دیکھنے کو ملیں گے بلکہ اس کی واضح گونگ بھی سنائی دے گی۔ ایک طرف اسرائیل کی سیاست لرزاں ہے، دوسری طرف ہندوستان کی حکمت عملی میں رخنہ پڑتا ہے۔ مغربی ایشیا میں اسرائیل کو ایک نئی مزاحمت کا سامنا ہو گا، اور عرب ممالک اپنی اجتماعی طاقت کو محسوس کرنے لگیں گے۔ جنوبی ایشیا میں ہندوستان اپنی تنہائی کو مزید گہرا محسوس کرے گا، اور خطے کے ممالک یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ اصل طاقت کا مرکز اب کہاں ہے۔ یوں یہ معاہدہ تاریخ کے دھارے میں جہاں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے وہاں دو براعظموں کی سلامتی کا سنگ میل بن سکتا ہے۔

معاہدے کے متن میں صاف کہا گیا ہے کہ کسی بھی جارحیت کو دونوں ممالک کے خلاف جارحیت سمجھا جائے گا۔ یہ جملہ محض الفاظ نہیں بلکہ ایک عہد ہے۔ یہ جملہ دراصل عہد جدید کے میثاقِ مدینہ کی مانند ہے۔ جہاں مختلف قبائل نے ایک دوسرے کی سلامتی کو اپنی سلامتی قرار دیا تھا۔ یہ اعلان خطے کے ہر جارح کو پیغام دیتا ہے کہ اگر وہ ریاض پر نظر ڈالے گا تو اسلام آباد سامنے آجائے گا، اور اگر اسلام آباد کو لاکارے گا تو ریاض جواب دے گا۔ گویا پاکستان اور سعودی عرب نے اپنی تقدیروں کو ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ وزیر دفاع نے خاص طور پر واضح کیا کہ اس میں کوئی خفیہ شق نہیں، اور نہ ہی کوئی جارحانہ پہلو۔ یہ دفاعی ڈھال ہے، تلوار نہیں۔

سفارتکاروں کے بقول پاکستان اب مغربی ایشیا میں کلیدی حیثیت اختیار کر رہا ہے، جبکہ ہندوستان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہندوستانی سفارتکار خود اعتراف کر رہے ہیں کہ پاکستان مغربی ایشیا میں زیادہ مؤثر ہو رہا ہے۔ خلیجی ممالک اپنی سلامتی کیلئے ترکی، چین اور پاکستان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ حقیقت دہلی کیلئے دوہری ضرب ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ خطے کے فیصلوں میں غیر متعلق ہوتا جا رہا ہے۔ یہ منظر نامہ ہندوستان کیلئے کسی بھیانک خواب سے کم نہیں، کیونکہ کل تک جس دہلی کو عربوں کے ساتھ دوستی پر ناز تھا، آج وہ اجنبی دکھائی دے رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ تینوں ممالک (پاکستان، ترکی، چین) ہندوستان کی سفارتکاری میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ کارگل اور آپریشن سندور کے وقت سفارتی طور پر بھی یہ ممالک دہلی کے مقابلے پر دکھائی دیے تھے۔

یہ حقیقت کہ سعودی عرب جیسے ملک نے پاکستان کے ساتھ معاہدہ کیا جو کہ دہلی کا پراثر ناشر اکت دار بھی رہا ہے۔ بے حد معنی خیز ہے۔ تیل سے لیکر

سرمایہ کاری تک، ہندوستان نے اربوں ڈالر کے تعلقات قائم کر رکھے ہیں لیکن اب یہی ملک پاکستان کے ساتھ دفاعی بندھن باندھ رہا ہے۔ یہ دہلی کیلئے اس سے بڑھ کر دھچکا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا قریبی دوست اب اس کے حریف کا دفاعی ساتھی بن گیا ہے۔

تجزیہ کاروں کی آراء مختلف ہیں، لیکن یہ طے ہے کہ پاکستان ایک نئی اور بلند پوزیشن پر کھڑا ہو گیا ہے۔ البتہ یہ رائے بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ یہ معاہدہ ہر جنگ کو روکنے کا ضامن نہیں ہو گا مگر سفارتی توازن میں پاکستان کے پلڑے کو یقیناً بھاری کر دیا ہے اور مئی میں ہونے والی پاک بھارت جنگ کے بعد مودی کی یہ شکست فاش ان کے سیاسی کیریئر کے برے انجام تک پہنچا کر دم لے گی۔

وزارت خارجہ نے ایک محتاط بیان دیا ہے کہ وہ اس معاہدے کے مضمرات کا مطالعہ کرے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بیان میں طاقت نہیں بلکہ اندر سے خوف و اضطراب اور کمزوری جھلکتی ہے۔ یہ اس عاجز انسان کی مانند ہے جو طوفان کو دیکھ کر محض اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ یہ اعلان گویا ایک مدافعتی اور منافقانہ رویہ ہے، جو اپنی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

کنول سبل، انڈین سابق سیکریٹری خارجہ، نے صاف کہا کہ اب ہندوستانی اس معاہدے کو محض کاغذی نہیں سمجھتے۔ سعودی فنڈز اب پاکستانی فوج کو مزید مضبوط کریں گے۔ یہ بات دہلی کیلئے سب سے بڑا اندیشہ ہے، کیونکہ پاکستان کی فوج پہلے ہی دنیا کی ایک منظم اور تجربہ کار فوج ہے۔ اگر سعودی سرمایہ کاری اور وسائل اس کے ساتھ مل جائیں تو خطے میں طاقت کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے۔ دراصل دہلی کے اس اندیشے کا اعلان ہے کہ پاکستان خطے میں ایک عملی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے اور اسرائیل کے خلاف عربوں کو سیوری فرام کرنے کا امکان ہندوستان کیلئے ناقابل برداشت ہے۔

یہ معاہدہ محض موجودہ لمحے کا نہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کا آئینہ دار ہے۔ یہ معاہدہ محض ایک آغاز ہے، انجام نہیں۔ اس کے ممکنہ اثرات یہ ہو سکتے ہیں کہ پاکستان، ترکی اور چین کی مثلث مزید مضبوط ہوگی۔ اگر پاکستان، ترکی اور چین جیسے ممالک خلیجی دنیا کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے تو ہندوستان کیلئے اپنی حیثیت برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ عرب دنیا پاکستان کو اپنا محافظ سمجھے گی، اور دہلی کیلئے ان کے دروازے بند ہونے لگیں گے۔ مزید یہ کہ سعودی عرب کی قربت پاکستان کو نہ صرف دفاعی بلکہ اقتصادی محاذ پر بھی مستحکم کرے گی۔ یہی وہ بات ہے جو ہندوستان کیلئے سب سے بڑی پریشانی کا سبب بنے گی۔ اگر خلیجی ممالک ایک اجتماعی دفاعی ڈھانچہ قائم کر لیتے ہیں تو ہندوستان کی خطے میں موجودگی محض تماشائی کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔

چین نے مغربی ایشیا میں محض تجارت نہیں، بلکہ ایک ایسے ڈھانچے کی تعمیر کا بیج بویا ہے جو سفارت، تجارت اور ڈپلومیسی میں تیز رفتاری سے پھل پھول رہا ہے۔ چین کی سیاست کا مرکز فلسفہ ہمیشہ پر امن ترقی رہا ہے۔ بیجنگ نے اپنی عسکری طاقت کی بجائے معاشی قوت کو بطور ہتھیار استعمال کیا، اور یہی اس کی اصل قوت بھی ہے۔ بیجنگ نے سعودی۔ ایران مفاہمت میں ثالثی کر کے اپنے آپ کو وسط میدان پر کھڑا کیا۔ ایک ایسا کردار جو اضطراب کو کم کر کے اس خطے کو چین کے عالمی اقتصادی دھاگے سے باندھتا ہے۔ یہ عمل محض صلح صفائی نہیں بلکہ اثر و رسوخ کا نرم مگر مستقل اضافہ ہے۔ چین اب خطے میں امن کا مترجم بھی نظر آتا ہے اور سرمایہ کاری کا سب سے بڑا واسطہ بھی۔

چین نے اپنے تجارتی انفراسٹرکچر وژن کے ذریعے خود کو ایک لازم و ملزوم قوت کے طور پر منوایا ہے جو کسی تنازعہ میں بروقت مفاہمت کروا بھی سکتا ہے اور بحران میں اپنی معیشتی چھتری بھی فراہم کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستقبل مغربی ایشیا میں چین کا کردار غیر متکلم طاقت نہیں بلکہ فعال، باضابطہ اور



مستقل اتحادی کے طور پر ابھرنا دکھائی دیتا ہے۔ چین نے حالیہ برسوں میں نہ صرف سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کیا ہے بلکہ ایران کے ساتھ صلح کرانے میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ یہ قدم صرف مشرق وسطیٰ میں امن کی کوشش نہ تھا بلکہ دنیا کو یہ پیغام دینا تھا کہ اب امن کی ثالثی واشنگٹن کے ہاتھ سے نکل کر بیجنگ کے حصے میں آرہی ہے۔ مستقبل قریب میں چین مغربی ایشیا میں دورخوں سے طاقتور ہو گا۔

(1) سرمایہ کاری اور تکنیکی ترقی کے منصوبوں کے ذریعے، اور

(2) سفارتی ثالثی کے کردار کے ذریعے۔

اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہو گا کہ خلیجی ممالک کی سلامتی کیلئے صرف امریکا پر انحصار کم ہو گا اور وہ چین کو بھی اپنے سرپرست کے طور پر دیکھنے لگیں گے۔ چین اور ایران کے درمیان 25 سالہ اسٹریٹجک تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے، جس کی مالیت اربوں ڈالر ہے۔ اس معاہدے نے ایران کے ساتھ ہندوستان کی سرمایہ کاری اور تجارتی اثر کو کمزور کر دیا، کیونکہ دہلی امریکی دباؤ کے باعث اپنی منصوبہ بندی آگے نہ بڑھا سکا۔

چین اور سعودی عرب کے درمیان سرمایہ کاری اور تکنیکی شراکتیں محض افسانوی دعوے نہیں بلکہ زمینی حقیقت ہیں۔ سعودی عرب میں بھی چین تیزی سے جگہ بنا رہا ہے۔ نیوم سٹی، توانائی، تیل کی پروسسنگ، اور خاص طور پر ریلوے اور جدید انفراسٹرکچر میں چین کی فنی مہارت سعودی حکومت کی اولین ترجیح بنتی جا رہی ہے۔ ولی عہد محمد بن سلمان کے سعودی ویژن 2030 کا ایک بڑا حصہ چینی سرمایہ اور مہارت پر استوار ہے اور 2024-2025 کے دوران چینی اداروں کو سعودی انفراسٹرکچر کے اہم معاہدے ملے ہیں۔ جس نے ریاض کو چینی فنی مہارت اور سرمایہ کیلئے کھول دیا۔ اس پس منظر میں سعودی سرکار کا چین کے ساتھ ریلوے اور قومی انفراسٹرکچر کی بات چیت کرنا، محض لفظی گزر گاہ نہیں بلکہ تکمیل کیلئے عملی سطر نقشہ ہے۔ یوں سعودی عرب کی داخلی ترقی اور بیرونی سلامتی دونوں میں چین ایک لازم و ملزوم کردار بن چکا ہے۔ ہندوستان کیلئے یہ ایک بڑی سفارتی ناکامی ہے کیونکہ جس مقام پر وہ اپنے لیے اقتصادی مواقع دیکھ رہا تھا، وہاں چین نے سبقت لے لی ہے۔

یہ بھی لازم ہے کہ چین کا سرمایہ محض مواصلاتی تعمیر اور راستوں تک محدود نہیں۔ وہ ڈیجیٹل، توانائی اور لاجسٹکس میں بھی داخل ہو رہا ہے، جس کا اثر یہ ہو گا کہ سعودی معیشت کی تہہ میں چین کا نقش گہرا ہوتا جائے گا۔ اور جب فوجی یا سکیورٹی معاہدے بھی سامنے آئیں، تو یہ اقتصادی وابستگی سیاسی و سکیورٹی فیصلوں میں وزن ڈال سکتی ہے۔

چابہار بندر گاہ ہندوستان کیلئے ایک اسٹریٹجک گوہر کی حیثیت رکھتی تھی، کیونکہ یہ افغانستان اور وسطی ایشیا تک دہلی کی براہ راست رسائی کا ذریعہ تھی۔ حالیہ اطلاعات کے مطابق امریکی انتظامیہ انڈیا کو ایران کے چابہار بندر گاہ کے سلسلے میں جو سابقہ استثنائی رہی تھی، اسے واپس لینے کا اعلان کیا ہے۔ فیصلہ 29 ستمبر (نوٹس کے مطابق) سے مؤثر ہو گا لیکن اب اس استثنائے واپس لینے سے پہلا تجارتی رسد اور لاجسٹک نقصان یہ ہو گا کہ ہندوستان اب اس بندر گاہ کے ذریعے افغانستان تک رسائی برقرار نہیں رکھ پائے گا اور اسے درچونل متبادل راستے جو لمبے اور مہنگے تلاش کرنے ہوں گے جو بھارتی تجارت کی کمر توڑ کر رکھ سکتے ہیں۔

چابہار منصوبہ دہلی کے اس خیال کا جز تھا کہ ایران کے ساتھ بندرگاہی تعاون کے ذریعے افغانستان تک تجارتی اور سماجی اثر کو مضبوط کیا جائے؛ اشتنا ختم ہونے سے دہلی کی اس علاقائی رسائی اور اثر سوخ کمزور پڑ سکتا ہے۔ امریکا کی یہ پالیسی تبدیلی دہلی کیلئے دُور اندیشی کا سبب ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ واشنگٹن اپنے مفادات کے مطابق اشتنا واپس لے سکتا ہے، اور لہذا نئی سفارتی حکمت عملی یا متبادل اتحادی تلاش کرنا بھارتی خارجہ پالیسی کے سامنے ضروری بن جائے گا جس کیلئے مودی نے چین یا تراسے حاصل کرنے کی ممکنہ کوشش تو کی لیکن وکٹری پریڈ سے دور رکھ کر مودی کے دورے کی ناکامی سامنے آگئی ہے۔

سیاسی نقصان یہ ہے کہ یہ فیصلہ ظاہر کرتا ہے کہ واشنگٹن دہلی کے ساتھ تعلقات کو ہمیشہ اپنی شرائط پر رکھتا ہے۔ اس سے ہندوستانی سفارتکاری کو دھچکا لگا ہے۔ اور دہلی کو سٹریٹجک نقصان یہ ہو گا کہ جو حکمت عملی وسطی ایشیا میں اثر و سوخ بڑھانے کی تھی، وہ اب کمزور پڑ گئی ہے، جبکہ ایران مزید چین اور روس کی طرف جھک گیا ہے۔ مختصر یہ کہ چابہار سے متعلق امریکی اقدام نے ہندوستان کو مادی، اسٹریٹجک اور سفارتی طور پر نقصان پہنچانے کا امکان بڑھا دیا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں دہلی کی منصوبہ بندی کو دوبارہ ورق وار کرنا لازمی ہو جاتا ہے کہ مودی کے دہرے کردار پر کیسے پردہ ڈالا جائے۔

میڈیا رپورٹس، جو حالیہ دنوں میں آئیں، اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ شہباز شریف اور ٹرمپ کے درمیان اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کے دائرے میں ملاقات کے امکانات زیر غور ہیں۔ رپورٹس یہ بھی کہتی ہیں کہ پاک فوج کے سربراہ یا دیگر دفاعی اعلیٰ حکام بھی ممکنہ گفت و شنید میں شریک ہو سکتے ہیں مگر یہ ملاقات حتمی طور پر طے شدہ نہیں بلکہ ممکن کی صفت سے جڑی ہے؛ اگر یہ ملاقات ہوتی ہے تو پاک۔سعودی دفاعی معاہدہ لازماً زیر بحث آئے گا کیونکہ امریکا اس معاہدے کے خطے پر اثرات اور خاص طور پر اس کے اسرائیل و ہندوستان پر اثر کو سمجھنے کا خواہاں ہو گا۔

لہذا اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ مذاکرات کے ایجنڈے میں پاک۔سعودی دفاعی معاہدہ بطور موضوع ممکنہ طور پر آئندہ بات چیت کا حصہ بن سکتا ہے، خاص طور پر اگر امریکی انتظامیہ خطے میں اس معاہدے کے جیو پولیٹیکل پرسوالات اٹھائے جاسکتے ہیں۔ واشنگٹن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ سعودی عرب صرف اس کی چھتری کے نیچے رہے، لیکن اب جبکہ پاکستان اس کا دفاعی شریک بن رہا ہے، تو امریکا کو یقیناً خدشہ ہو گا۔ اس ملاقات میں پاکستان کے جوہری پروگرام پر بھی سوال اٹھ سکتا ہے، اور واشنگٹن یہ سمجھنے کی کوشش کرے گا کہ کیا اسلام آباد اپنی ایٹمی صلاحیت کو عرب دنیا کی طرف جھکا سکتا ہے یا نہیں۔

سیاسی حقیقت یہ ہے کہ ایسی ملاقاتیں فوری نتائج کی ضامن نہیں ہوتیں۔ مگر اگر ملاقات ہوتی ہے تو (1) امریکی مفادات، (2) خلیجی رشتے، اور (3) جوہری سکیورٹی کے موضوعات لازماً زیر بحث آئیں گے۔ اس میں پاک۔سعودی معاہدے کے دفاعی و سیاسی مضمرات پر واشنگٹن کی فکری جانچ پڑتال متوقع ہے۔

حالیہ دورے کے دوران صدر ٹرمپ نے برطانوی قیادت کی اس ممکنہ مرضی۔ کہ وہ فلسطینی ریاست کو تسلیم کرے۔ پر کھلے لفظوں میں اختلاف ظاہر کیا کہ یہ ایک متنازع اقدام ہے اور وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے؛ یہ اعتراض دراصل امریکا کی اس پالیسی کا تسلسل ہے جس میں وہ اسرائیل کے ہر اقدام کی پشت پناہی کرتا ہے اور فلسطینی ریاست کے قیام کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ برطانیہ میں داخلی سیاست کا دباؤ ہے کہ وہ فلسطین کے ساتھ انصاف کرے اور اسے ریاست تسلیم کرے لیکن امریکا اس کو امن کے خلاف اقدام قرار دے رہا ہے۔

برطانوی وزیر اعظم کی طرف سے خلاف توقع فلسطینی ریاست کی تائید پر غور نے عالمی طبقے میں بحث چھیڑ دی ہے۔ اس بیان پر عالمی و علاقائی ردِ عمل متعدد رنگوں میں آیا، ایک طرف برطانیہ کے داخلی سیاسی حلقے نے اپنے فیصلے کی حمایت کی، تو دوسری جانب اسرائیلی اور کچھ امریکی حلقوں نے تحفظات کا اظہار کیا؛ عرب دنیا اور فلسطینی قیادت نے عمومی طور پر اس رجحان کو خوش آئند سمجھا۔ اس اختلاف رائے نے عالمی سطح پر یہ واضح کر دیا ہے کہ فلسطینی مسئلے پر یورپ اور امریکا ایک صفحے پر نہیں ہیں۔ عرب دنیا کیلئے یہ امید کی کرن ہے کہ شاید یورپ میں کچھ ممالک فلسطینی عوام کی آواز سنیں گے، لیکن امریکا کا اعتراض اس بات کی علامت ہے کہ اسرائیل کے معاملے پر واشنگٹن کسی نرمی کا قائل نہیں۔

سیاسی معنویت یہ ہے کہ برطانیہ جیسا بڑا یورپی ملک اگر فلسطینی ریاست کو تسلیم کرے تو عالمی سفارتکاری ایک نئے مرحلے میں داخل ہو سکتی ہے۔ اور امریکی صدر کی مخالفت اس بات کی علامت ہے کہ اس معاملے میں عالمی دائرہ کار میں اختلافات عیاں ہیں۔ یہ جھگڑا فلسطینی مسئلے کے حل کی راہ میں نئی سیاسی محاذ آرائیاں کھڑا کر دے گا اور خطے کی سفارتی حکمت عملیوں پر نمایاں اثر ڈال سکتا ہے۔

پاک سعودی دفاعی معاہدہ محض دو حکومتوں کے درمیان کاغذی دستخط نہیں بلکہ تاریخ کے صفحات پر لکھا گیا ایک نیا باب ہے۔ اس میں خطے کی سیاست کا رخ بدلنے کی صلاحیت ہے۔ اگر ہم تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو ایسے معاہدے کبھی بھی وقتی نہیں رہے۔ یہ آنے والے زمانوں کی سیاست کے خدوخال تراشتے ہیں۔

تاریخ وہ آئینہ ہے جو آنے والے کل کے نقش پڑھاتی ہے۔ اسی طرح دیکھا جاسکتا ہے کہ چینی اقتصادی و سفارتی توسیعات، سعودی۔ پاکستان دفاعی بندھن، اور امریکی پالیسیوں کی تبدیل شدہ بیانیے کا ایک نیا جغرافیائی و سیاسی نقشہ تیار کر رہی ہیں۔ ہر نکتہ آزاد نثر کا ایک شفافہ ہے جہاں کا بڑھتا ہوا قبلہ، سعودی۔ پاکستان معاہدے کا ہندوستان پر اثر، امریکا کی غیر یقینی پالیسیاں اور برطانیہ کی ممکنہ سفارتی پیش رفت جیسے فیصلوں کے ذریعے ایسا منظر بناتے ہیں جو جنوبی اور مغربی ایشیا کی سیاست کو دشوار یا نیا رخ دے سکتے ہیں۔

یہ معاہدہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ تاریخ کا نیا موڑ ہے۔ یہ وہ لمحہ ہے جو آنے والے زمانے کی سیاست کو نئی راہیں دکھائے گا۔ اگر آج دہلی کو یہ معاہدہ دھچکا لگ رہا ہے تو آنے والے کل میں یہ اس کیلئے کمر توڑ بوجھ ثابت ہو سکتا ہے۔ پاکستان نے یہ پیغام دے دیا ہے کہ وہ محض ایک ریاست نہیں، بلکہ امت مسلمہ کی ڈھال ہے۔

ہر دور کی سیاست اپنے پیچھے نشان چھوڑتی ہے، اور قوموں کے فیصلے یا تو انہیں عظمت کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہیں یا زوال کی کھائی میں دھکیل دیتے ہیں۔ سعودی۔ پاکستان معاہدہ دراصل اس تاریخی سوال کا جواب ہے کہ امت مسلمہ اپنی اجتماعی سلامتی کے باب میں کس سمت بڑھ رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کیلئے یہ ایک بڑا دھچکا ہے، مگر اصل اہمیت اس حقیقت کی ہے کہ مسلمان ممالک اب اپنی تقدیر کے فیصلے خود کرنے لگے ہیں۔ چین کی ثالثی، سعودی عرب کی تعمیر نو، اور پاکستان کی دفاعی قوت یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ اگر دلوں میں اتحاد اور قدموں میں عزم ہو تو دنیا کی کوئی طاقت راہوں کی دیوار نہیں بن سکتی۔

اقوام متحدہ کی مجالس ہوں یا عالمی ایوانوں کی سیاست، فلسطین کا سوال ہو یا ایران کا بحران۔ سب اسی اٹل سچائی کی گواہی دیتے ہیں کہ طاقت اب یک رخی نہیں رہی۔ یہ وقت ہے کہ مسلم دنیا اپنی تاریخ کے سبق دہراتے ہوئے وحدت کی لڑی میں نظر آئے جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

ان نکات سے واضح ہوتا ہے کہ چین خطے میں نئی طاقت کے طور پر ابھر رہا ہے، جو صرف سرمایہ کاری ہی نہیں بلکہ سفارتی ثالثی بھی فراہم کر رہا ہے۔ سعودی عرب کی ترقی اور سلامتی کے منصوبوں میں چین کی گہری شمولیت ہندوستان کو مزید پیچھے دھکیل رہی ہے۔ امریکا کی پالیسیوں کا بدلاؤ دہلی کیلئے مسائل پیدا کر رہا ہے، خصوصاً چابہار جیسے منصوبے میں۔ اقوام متحدہ جیسے عالمی فورمز پر پاکستان کے پاس اپنی پوزیشن مزید مضبوط کرنے کا موقع ہے۔

فلسطین کا مسئلہ ایک بار پھر عالمی سفارتکاری میں مرکزیت اختیار کر رہا ہے، اور یورپ و امریکا کے درمیان اس پر اختلاف کھل کر سامنے آ رہا ہے۔ یہ معاہدہ محض آج کا واقعہ نہیں بلکہ آنے والے کل کا اشارہ ہے۔ تاریخ کے پتوں پر یہ باب اسی صورت میں سنہری ہو گا جب امت اس سے بیداری، اتحاد اور خود اعتمادی کا سبق لے کر آگے بڑھے۔ یہی وہ پیغام ہے جو اس مقالے کے ہر نکتے سے دینا مقصود ہے، اور یہی وہ چراغ ہے جس سے قاری کے دل میں روشنی کی لو پیدا کرنے کی ایک ادنیٰ کوشش کی ہے۔

رہے نام میرے رب کا، جو دلوں کی حال سب سے بہتر جانتا ہے!

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

تاریخ کے اوراق جب پلٹے جاتے ہیں تو کچھ صفحے ایسے نکلتے ہیں جن پر خون کے دھبے اور آنسوؤں کے داغ ثبت ہوتے ہیں۔ فلسطین کی داستان بھی انہی میں سے ایک ہے۔ ایک ایسا باب جس میں ظلمتوں کی سیاہی بھی ہے اور قربانیوں کا نور بھی۔ 70 برس سے زیادہ عرصہ بیت گیا، مگر اس قوم کے خواب اب تک ادھورے تھے۔ طاقتور ایوانوں نے اسے نظر انداز کیا، بڑے بڑے علمبرداروں نے اس کی آواز دبائی، لیکن صداؤں کی گونج کو دبانے والا کب کامیاب ہوا ہے؟

اور آج، وقت کے صحیفے پر ایک نئی سطر لکھی گئی ہے۔ کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور پرتگال نے اس مظلوم قوم کو تسلیم کر کے گویا یہ مان لیا ہے کہ تاریخ کا قرض ادا کرنا لازم ہے، اور انصاف کی شمع بجھائی نہیں جاسکتی۔ یہ لمحہ صرف فلسطین کا لمحہ نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے جاگ اٹھنے کا لمحہ ہے۔

یہ صدیوں کی بے قراری اور عشروں کی خونچکاں جدوجہد کے بعد تاریخ کا وہ موڑ ہے جب کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور پرتگال نے بالآخر فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ یوں لگتا ہے کہ ظلمت کی رات میں افق پر امید کا ایک چراغ روشن ہو گیا ہے۔ ان چار اہم ممالک کا یہ فیصلہ محض سفارتی کاغذ پر ثبت الفاظ نہیں بلکہ عالمی سیاست کی بساط پر ایک نئے خانے کی جنبش ہے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ طاقتور اقوام بھی اب فلسطین کے مسئلے کو نظر انداز نہیں کر سکتیں۔ یہ تبدیلی بتاتی ہے کہ دنیا کے سیاسی افق پر "طاقت کا بیانیہ" کمزور پڑ رہا ہے اور "انصاف کا بیانیہ" اپنی جگہ بنا رہا ہے۔

یہ فیصلہ عالمی سیاست کے طویل اور پر پیچ سفر میں ایک نئی کروٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ برسوں تک طاقت کے ایوانوں میں صرف ایک آواز گونجتی رہی: طاقت ہی حق ہے مگر آج پہلی بار وہی طاقتور اقوام انصاف کی دہلیز پر سجدہ ریز نظر آتی ہیں۔ یہ تبدیلی اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اب وقت آ گیا ہے جب عالمی ضمیر ظلم کے بوجھ تلے مزید دبنے سے انکار کر رہا ہے۔

کینیڈا، آسٹریلیا، اور پرتگال کے بعد برطانیہ کی فضا میں بھی ایک نیا اعلان گونجا۔ وزیر اعظم سر کیئر سٹارمر نے اپنے ویڈیو خطاب میں کہا کہ آج امن اور دو ریاستی حل کی امید کو زندہ کرنے کیلئے، میں واضح طور پر اعلان کرتا ہوں کہ برطانیہ فلسطینی ریاست کو باضابطہ طور پر تسلیم کرتا ہے۔ یہ اعلان محض الفاظ نہیں، صدیوں کے بوجھ تلے دبے دہلی ایک قوم کیلئے نئی زندگی کی نوید ہے۔

یہ اعلان صرف سفارتی میزوں پر نہیں ہوا، بلکہ مغربی شہروں کی گلیوں اور سڑکوں پر اٹھنے والی صداؤں نے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ مظاہرے، جلوس، یونیورسٹیوں میں طلبہ کے پرجوش عزم، اور انسانی حقوق کے کارکنوں کی جدوجہد نے حکمرانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کریں۔ ان ممالک میں فلسطین کو تسلیم کرنے کا فیصلہ صرف عالمی دباؤ کا نتیجہ نہیں، بلکہ مقامی عوامی رائے، احتجاج اور انسانی حقوق کی تحریکوں کی کامیابی بھی ہے۔ مغربی معاشروں میں فلسطینی عوام کیلئے ہمدردی اب سیاسی طاقت میں ڈھل رہی ہے۔ یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ رائے عامہ کا دباؤ اگر مسلسل اور منظم ہو تو ایوانِ اقتدار کے دروازے کھول سکتا ہے۔ یہ لمحہ یاد دلاتا ہے کہ عوامی رائے اگر مسلسل اور پرجوش ہو تو طاقت کے ایوانوں کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔

کینیڈا اور آسٹریلیا دونوں نے اس ہفتے نیویارک میں منعقدہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اتوار کے روز برطانیہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور پرتگال نے فلسطینی ریاست کے وجود کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا جبکہ مزید ممالک اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 80 ویں اجلاس کے دوران ایسا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ آنے والے چند گھنٹوں میں سلیکیم، فرانس، سان مارینو، لکزمبرگ، مالٹا اور اندورا بھی فلسطینی ریاست کو تسلیم کر لیں گے۔ یوں عالمی ادارہ ایک بار پھر مظلوموں کی آہ و زاری کا گواہ بنا اور بڑی طاقتیں اپنے دیرینہ تعصب کے پردے چاک کرنے پر مجبور ہوئیں۔

یہ فیصلہ اور اعلان مسلم دنیا کیلئے ایک کسوٹی اور آئینے کا درجہ رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کینیڈا، آسٹریلیا، برطانیہ اور پرتگال انصاف کیلئے کھڑے ہو سکتے ہیں تو مسلم حکمرانوں کے لب کیوں سل گئے ہیں؟ کیا مسلمان حکمران اس موقع پر محض تماشائی بنے رہیں گے یا امت کے اجتماعی شعور کو بیدار کر کے فلسطین کی عملی پشت پناہی کریں گے؟ کیا امت مسلمہ کا فریضہ صرف دعاؤں اور قراردادوں تک محدود ہے؟ یہ لمحہ مسلم ممالک سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ محض بیان بازی اور مذمتی قراردادوں پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے وسائل، سیاسی اثر و رسوخ اور سفارتی صلاحیت کو بروئے کار لائیں۔ اگر غیر مسلم ممالک فلسطین کے حق میں کھڑے ہو سکتے ہیں تو مسلم دنیا کی خاموشی تاریخ کے کتھرے میں اور زیادہ مجرم ٹھہرے گی۔ یہ وقت ہے کہ مسلم دنیا اپنے وسائل اور سفارتی قوت کو فلسطین کی عملی مدد میں صرف کرے، ورنہ تاریخ ہمیں مزید شرمندہ کرے گی۔

کینیڈا اس سفر کا پہلا مسافر ثابت ہوا اور فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے والا پہلا جی سیون ملک بن گیا۔ یہ اقدام گویا شمالی نصف کرۂ ارض میں انصاف کے نئے درتچے کھولنے کا پیغام ہے۔ برطانیہ کا یہ اعلان محض حالیہ پالیسی نہیں بلکہ ایک تاریخی بوجھ، تاریخی بارگراں اور احساسِ ندامت کا اعتراف بھی ہے۔ بالفور اعلامیہ اور فلسطین کی تقسیم وہ زخم ہیں جن میں برطانیہ کا کردار کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالفور اعلامیہ سے لیکر فلسطین کی تقسیم تک برطانیہ اس قضیے کے جنم میں شریک رہا۔ آج کا اعتراف گویا اس پرانے زخم پر مرہم رکھنے کی ایک کوشش ہے۔ اگرچہ زخم ابھی بھی گہرا ہے، مگر یہ قدم کم از کم یہ بتاتا ہے کہ تاریخ کے بوجھ سے آنکھیں ہمیشہ کیلئے نہیں چرائی جاسکتیں۔

آج کا یہ قدم گویا صدیوں بعد اس بات کا اقرار ہے کہ ظلم کی بنیاد پر تعمیر کی جانے والی عمارتیں زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتیں۔ یہ اعلان دراصل ماضی کے جرم پر تاخیر سے ادا کیا گیا اعتراف ہے، اگرچہ ابھی اس جرم کا کفارہ باقی ہے۔

کینیڈا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آسٹریلیا نے بھی اعلان کیا کہ وہ فلسطین کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ یوں جنوبی دنیا کی فضاؤں میں بھی امید کی ایک لہر دوڑ گئی۔ یہ تسلیم دراصل فلسطینی عوام کی صدیوں پر محیط قربانیوں کا اعتراف ہے۔ یہ لمحہ فلسطینی عوام کیلئے خون میں نہائی ہوئی ایک امید ہے۔ وہ بچے جو بلے تلے دب گئے، ان معصوم بچوں کا خون جو غزہ کی مٹی پر بہا یا گیا، وہ عورتیں جو لاشوں کے پاس نوحہ کرتی رہیں، ان عورتوں کی آہیں جو کھنڈرات کے بیچ اپنے شہیدوں کو دفناتی رہیں، اور وہ بزرگ جو مسجد اقصیٰ کے دروازے پر اللہ سے انصاف مانگتے رہے۔ اور ان بزرگوں کی دعائیں جو مسجد اقصیٰ کی دلیز پر سجدہ ریز ہیں، یہ اعلان ان سب کی قربانیوں کا ایک اعتراف ہے۔ فلسطینی عوام نے اپنے خون سے یہ تحریر لکھی ہے کہ ظلم کے ایوان ڈگمگاتے ضرور ہیں اور بالآخر یہ سب قربانیاں اب عالمی سطح پر تسلیم کی جانے والی حقیقت بن رہی ہیں۔

برطانیہ میں متعین فلسطینی مشن نے اس فیصلے کو تاریخی قرار دیا اور کہا کہ یہ لمحہ محض سیاسی اقدام نہیں بلکہ انصاف کی دیرینہ پیاس بجھانے کی طرف ایک قدم ہے۔ لیکن دوسری طرف اللہ کی اس زمین پر انسانیت کے سب سے بڑے دشمن اسرائیلی وزیر اعظم نے اسے "دہشتگردی کو نوازنا" قرار دیا، لیکن

حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کو تسلیم کرنا دہشتگردی کو نہیں بلکہ انسانیت کو نوازنا ہے۔ نیتن یاہو کی جانب سے اسے دہشتگردی کو نوازنا کہنا دراصل اس خوف کا اظہار ہے کہ سچائی کی دیواریں اب گرنے کو ہیں۔ دنیا جان چکی ہے کہ فلسطین کا تسلیم ہونا کسی گروہ کو نوازنا نہیں بلکہ ایک قوم کے ناقابل انکار حق کو ماننا ہے۔

دنیا نے یہ جان لیا ہے کہ ظلم کا تسلسل کسی قوم کو فنا نہیں کر سکتا۔ جب دنیا کے بڑے ممالک ایک کے بعد ایک فلسطین کو تسلیم کرنے لگیں تو اسرائیل کیلئے بھی انکار اور ہٹ دھرمی کے قلعے کو زیادہ دیر قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ظلم کا قلعہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، جب ضمیر کی فسیلیں اٹھتی ہیں تو دیواریں خود بخود گرنے لگتی ہیں۔

اب اقوام متحدہ کے دروازے پر تاریخ دستک دے رہی ہے۔ کینیڈا، آسٹریلیا برطانیہ اور پرنگال کے فیصلے کے بعد اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں پر بھی دباؤ بڑھے گا کہ وہ فلسطین کو باضابطہ طور پر رکنیت دیں اور اس کے حقوق کے تحفظ کیلئے عملی اقدامات کریں۔ ورنہ دنیا یہ سوال اٹھائے گی کہ اگر بڑی طاقتیں بھی انصاف کا ساتھ دینے لگیں ہیں، اگر بڑی طاقتیں بھی فلسطین کو تسلیم کر رہی ہیں تو عالمی ادارے اب تک خاموش کیوں ہیں اور کب جاگیں گے؟ کیا انصاف کا پرچم صرف قراردادوں میں ہی لہراتا رہے گا یا کبھی عملی صورت بھی اختیار کرے گا؟ اگر اقوام متحدہ اب بھی غفلت کی نیند سوئے رہا تو اس کا وجود ہی سوالیہ نشان بن جائے گا۔



آج کا دن صرف فلسطین کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ یہ دن برطانیہ کی ذمہ داری کے بوجھ کو سنجیدگی کے ساتھ قبول کرنے کا دن بھی ہے۔ گویا تاریخ کا پرانا قرض اب ادا ہونے لگا ہے۔ یہ دیرینہ مگر ناگزیر اعلان دراصل اس بات کا اقرار ہے کہ برطانیہ نے بالآخر فلسطینی عوام کے ناقابل انکار حق خود ارادیت، آزادی اور خود مختاری سے صرف نظر کا خاتمہ کر دیا ہے۔ آج غیر مسلم دنیا نے وہ قدم اٹھایا ہے جو ہماری ذمہ داری تھی۔ یہ لمحہ ہمیں آئینہ دکھاتا ہے اور ہماری کمزوریوں کو بے نقاب کرتا ہے۔

یہ لمحہ ایک تلخ حقیقت بھی یاد دلاتا ہے اور یہ فیصلہ ایک تلخ سچ بھی سامنے لاتا ہے۔ اگر مسلم دنیا متحد، باشعور اور مضبوط ہوتی تو فلسطین کو تسلیم کرنے کا آغاز اور اعلان سب سے پہلے مسلم ممالک کی زبان سے نکلتا، نہ کہ مغربی طاقتوں سے۔ مگر افسوس! ہم اپنی داخلی لڑائیوں میں الجھے رہے، اپنی تنگ نظری کے اسیر بنے رہے۔ یہ حقیقت ہماری سیاسی کمزوری، داخلی انتشار اور امت کی غفلت کا کھلا ثبوت ہے۔ آج اگر ہم خواب غفلت سے نہ جاگے تو کل ہماری تاریخ ہمیں مزید کڑی سزا دے گی۔

فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا مطلب محض ایک کاغذی کارروائی نہیں بلکہ ایسی حقیقت کا اعتراف ہے جسے خون کی ندیوں، آہوں کے بادلوں اور قربانیوں کے طوفان نے رقم کیا ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ مظلوموں کی آواز، اگرچہ دبائی جائے، مگر ایک دن یہ دہائی اپنی سچائی کے ساتھ جلوہ گر ہو کر رہتی ہے۔

یہ فیصلہ مشرق وسطیٰ کی سیاست پر گہرے اثرات ڈالے گا اور خطے کی سیاست میں ایک نئی جنبش پیدا ہوگی۔ اسرائیل پر سفارتی دباؤ بڑھے گا، امریکا کو بھی اپنی پالیسی میں تبدیلی پر مجبور ہونا پڑے گا اور دیگر مغربی ممالک بھی اس صف میں شامل ہونے پر مجبور ہوں گے۔ خطے میں طاقت کا توازن بدلنے کی یہ

پہلی کرن ہے، اگرچہ راستہ ابھی طویل اور کٹھن ہے۔ یہ ابتدائی کرن اگر مسلسل روشنی میں بدل گئی تو مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توازن بدل سکتا ہے، اور فلسطین کو اپنے خواب کی تعبیر کے قریب لاسکتا ہے۔

برطانوی وزیراعظم کے مطابق غزہ میں انسانوں کا پیدا کردہ بحران عروج کو پہنچ چکا ہے، اور یہ ظلم اب انسانیت کے ضمیر کو جھجھوڑ رہا ہے۔ یہ تسلیم دراصل تاریخ کے افتخار پر طلوع ہونے والی ایک نئی صبح ہے۔ ظلم و جبر کے اندھیروں میں امید کا چراغ جل اٹھا ہے۔ مگر یہ چراغ صرف اس وقت دائمی روشنی میں بدل سکتا ہے جب مسلم دنیا اپنی ذمہ داری پہچانے، جب عالمی ضمیر بیدار رہے، اور جب انصاف کو طاقت پر ترجیح دینے کا عہد زندہ رکھا جائے۔

یہ اعلان ایک نئی صبح کا اعلان ہے۔ ظلم کے اندھیروں میں ایک روشنی کا چراغ جل اٹھا ہے۔ مگر یہ چراغ کب شمع فروزاں بنے گا؟ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ مسلم دنیا اپنی ذمہ داری کو سمجھے، عالمی ضمیر جاگتا رہے، اور انسانیت کے نام پر یہ قافلہ آگے بڑھتا رہے۔ فلسطین کا اعتراف دراصل انسانیت کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ ان چاروں ممالک کے سربراہوں نے یہ بھی کہا کہ غزہ میں ہونے والے ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ اب بھوک اور تباہی کے دل دہلا دینے والے مناظر نے انسانیت کو شرمندہ کر کے رکھ دیا ہے اور اب ناقابل برداشت ہے۔

برطانوی وزیراعظم کے یہ الفاظ صرف ایک سیاستدان کی تقریر نہیں بلکہ انسانیت کے لہو میں ڈوبی ہوئی صدا ہیں۔ انہوں نے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے کہا کہ دسیوں ہزار افراد اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں، حتیٰ کہ وہ بھی جو محض روٹی اور پانی کے حصول میں نکلے تھے۔ یہ موت اور تباہی کے مناظر ہم سب کو خوفزدہ کر رہے ہیں، اگرچہ انسانی امداد میں اضافہ کیا گیا ہے لیکن صورتحال اب بھی ناگفتہ بہ ہے اور کوئی فرد خاطر خواہ امداد نہیں پارہا۔

برطانوی وزیراعظم نے اسرائیل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہم اسرائیلی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سرحدی پابندیاں ختم کرے، ظالمانہ ہتھکنڈے بند کرے اور انسانی امداد کے دروازے کھول دے۔ اس اعلان کے جواب میں کس ڈھٹائی سے نیتن یاہو نے کہا کہ اس طرح کے اقدامات دہشتگردی کو نوازنے کے مترادف ہیں۔ تاہم برطانیہ نے واضح کر دیا کہ فلسطین کو تسلیم کرنے کا مقصد کسی گروہ کو نوازنا نہیں بلکہ ایک قوم کے دیرینہ حق کو تسلیم کرنا ہے۔

ادھر دنیا کی نئی ابھرتی ہوئی عالمی طاقت چین بھی کھل کر میدان میں آگیا ہے۔ چین نے عالمی برادری سے پر زور اپیل کی ہے کہ وہ فلسطین کی اقوام متحدہ میں مکمل رکنیت کے حق میں آواز بلند کرے۔ یہ اقدام نہ صرف عالمی انصاف کی جانب ایک نشان راہ ہے بلکہ مظلوم فلسطینی قوم کے حق خود ارادیت کیلئے ایک سنجیدہ و اصولی موقف کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ جیسے تاریخ کے صفحات پر کمزور قومیں اکیلی ٹھہرتی آئیں، آج فلسطین بھی عالمی ضمیر سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہا ہے، اور چین اس مظلوم قوم کے ساتھ انصاف کی صدا بلند کر رہا ہے۔

چینی وزیر خارجہ وانگ یی کے مطابق چین غزہ میں جنگ بندی اور جنگ کے خاتمے کیلئے پُر عزم ہے۔ یہ الفاظ کسی محض سفارتی اعلان کا حصہ نہیں، بلکہ انسانی ہمدردی، عالمی استحکام، اور بین الاقوامی قانون کی پاسداری کا عملی عزم ہیں۔ گویا چین نے عالمی سیاست کے سحر و جادو میں پھنس کر نہیں بلکہ انصاف کے اصولوں کیلئے اپنی راہ ہموار کی ہے۔

وانگ یی نے اس بات کی جانب توجہ دلائی کہ "دو برس سے جاری غزہ جنگ نے بے مثال انسانی المیے کو جنم دیا اور اسرائیلی کاروائیاں بین الاقوامی قانون

کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتی ہوئی مشرق وسطیٰ کے استحکام کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔" جیسے دریا اپنی رفتار سے پتھروں کو تراشتا ہے، ویسے ہی طاقتور ممالک کے اقدامات انسانی تقدیر کے رخ کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخ کا انصاف بعد میں ان کے ظلم و ستم سے ٹکرا کر ان کو پاش پاش کر دیتا ہے اور ندامت کے پہاڑ کا بوجھ ان کو کچل کر رکھ دیتا ہے۔

چینی وزیر خارجہ نے زور دیا کہ "غزہ میں فوری جامع جنگ بندی، فلسطینی حکمرانی، اور دوریاستی حل کی مضبوطی، عالمی برادری کیلئے تین ناگزیر اقدامات ہیں۔" یہ تین ستون ایسے ہیں جو انصاف اور امن کے محل کو استوار کرتے ہیں، اور اگر یہ مضبوط نہ ہوں تو محض ظاہری جنگ بندی کسی حقیقی امن کا ضامن نہیں بن سکتی۔

وانگ یی نے مزید کہا "کہ عالمی برادری دوریاستی حل کے تحت فلسطین کی اقوام متحدہ میں مکمل رکنیت کی حمایت کرے۔" یہ مطالبہ نہ صرف دائمی انصاف کے اصولوں کا تقاضا ہے بلکہ اسلامی تعلیمات کی روح کا آئینہ بھی ہے، کہ مظلوم قوموں کی حمایت اور ظالم طاقتوں کے مقابل انصاف کی راہ پر چلنا ہر مؤمن کی ذمہ داری ہے۔

امریکا نے دیگر مغربی ممالک کے فلسطینی ریاست کے تسلیم کے اعلانات کو نمائشی اقدام قرار دیا۔ گویا طاقتوروں کے بیانات صرف کاغذ پر نقش ہیں، عمل کی حقیقت کچھ اور ہے۔ بہت بڑے داناوینا کی اصطلاح میں، یہ عالمی سیاست کی شطرنج کی وہ گھڑی ہے جس میں نقاب پوش طاقتیں اپنی منطق کیلئے دنیا کو دھوکہ دیتی ہیں، مگر تاریخ کا حساب ہر زوال و عروج کو محفوظ رکھتا ہے۔

یہ رپورٹ نہ صرف سیاسی فیصلے کی روداد ہے بلکہ تاریخ کے صفحات میں ایک نئے ورق کے کھلنے کا استعارہ بھی ہے۔ فلسطین کا اعتراف دراصل انسانیت کے اعتراف کا دوسرا نام ہے، اور ظلمت کی اس صدی میں یہ روشنی کا ایک چراغ ہے جس کے گرد اندھیروں کے بادل بھی ہمیشہ کیلئے چھٹنے لگے ہیں۔

اے اہل ایمان! اے صاحبانِ ضمیر! یہ اعلان تمہارے سامنے ایک سوالیہ نشان ہے۔ غیر مسلم اقوام انصاف کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں، تو تم کس انتظار میں ہو؟ کیا تم اپنی تلواریں نیام میں ڈال کر خوابِ غفلت میں پڑے رہو گے، یا اس چراغ کو بھڑکا کر روشنی کا قافلہ آگے بڑھاؤ گے؟

یاد رکھو! فلسطین کا اعتراف صرف ایک سیاسی فیصلہ نہیں، یہ انسانیت کی فتح ہے۔ یہ ان ماؤں کے آنسوؤں کا اعتراف ہے جو بیٹوں کی لاشوں پر نوحہ کرتی رہیں۔ یہ ان معصوم بچوں کے خون کا صدقہ ہے جو بلے کے نیچے مسکرا کر شہید ہو گئے۔ یہ ان بزرگوں کی دعاؤں کی قبولیت ہے جو مسجد اقصیٰ کے دروازے پر اس وقت تک سجدہ ریز رہے جب تک یہودیوں کی بمباری نے ان کے چیتھڑے تک نہیں اڑا دیئے۔

لیکن یہ ابھی آغاز ہے۔ ابھی منزل باقی ہے، ابھی القدس آزاد ہونا ہے، ابھی ظلم کی دیواریں گرنی ہیں۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اپنے ضمیر کو جگاؤ، اپنی صفوں کو سیدھا کرو اور اپنی زبان و قلم سے لیکر اپنے وسائل و طاقت تک سب کچھ فلسطین کے حق میں لگا دو۔

اٹھو! کہ وقت تمہیں پکار رہا ہے۔ تاریخ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ اور اگر آج بھی تم نے غفلت کی چادر اوڑھے رکھی تو کل تمہارا ذکر ان قوموں میں جنہیں تاریخ نے معاف نہیں کیا۔ فلسطین کا اعتراف دراصل تمہاری غیرت کا امتحان ہے۔ اے مسلمانو! اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کیا یہ ہو گا چراغِ بجھ جائے گا یا ایک دن سورج بن کر پوری انسانیت کو روشنی عطا کرے گا؟

نجانے کیوں مجھے آج مُرشد علامہ اقبال شدت سے یاد آرہے ہیں:
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

بروز ہفتہ 5 ربیع الآخر 1447ھ 27 ستمبر 2025ء

مفاد کے سوداگر اور اقتدار کے مسافر

دنیا کی سیاست دراصل ایک ایسا سمندر ہے جس کی موجیں کبھی سکوت میں نہیں رہتیں۔ یہاں طاقت کا تلاطم، مفاد کا بھنور، اور قوموں کی حرص و ہوس ہر لمحہ نئے مناظر تراشتی ہے۔ یہ وہی عالمی شطرنج ہے جہاں کل کامبرہ بادشاہ بن جاتا ہے اور آج کا بادشاہ محض ایک کمزور پیادہ رہ جاتا ہے۔ تاریخ کے اوراق پر نگاہ ڈالنے تو ہر صدی یہی سبق دہراتی ہے کہ عالمی سیاست میں کوئی دوستی دائمی نہیں اور کوئی دشمنی ہمیشہ کیلئے لکھی نہیں جاتی۔ قرآن حکیم نے ہمیں پہلے ہی یہ حقیقت سمجھادی تھی:

وَلَيْكَ الْآيَاتُ نَذَاوُلْهُابَيْنَ النَّاسِ (آل عمران: 140) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

یہی آیت گویا ہمارے سامنے تاریخ کی ابدی منطق رکھتی ہے۔ طاقت اور کمزوری، عروج اور زوال، یہ سب دنوں کا کھیل ہے۔ کل روم اور ایران دنیا کے فرماں روا تھے، آج ان کے کھنڈر تاریخ کے سیاحوں کیلئے عبرت کا سامان ہیں۔ کل سپین کی سلطنتِ غرناطہ کا چراغ پورے یورپ کو روشنی دیتا تھا، مگر آج اس کی محرابیں صرف خون کے آنسو بہاتی ہیں۔

دنیا کی سیاست دراصل طاقت کے توازن اور مفادات کے اول بدل کا ایک مسلسل کھیل ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ عالمی سیاست ایک شطرنج ہے۔ دوستیاں وقتی، دشمنیاں عارضی۔ اصل چیز مفاد ہے؛ جہاں کل کا دوست آج حریف اور آج کا مخالف کل شریکِ سفر بن سکتا ہے۔ برصغیر کے موجودہ حالات اس حقیقت کی جیتی جاگتی مثال ہیں۔

انڈیا آج اسی سچائی کے شکنجے میں ہے۔ اسی تسلسل میں آج ہم دیکھتے ہیں کہ انڈیا—جو اپنے آپ کو ابھرتی ہوئی عالمی طاقت قرار دیتا ہے—عالمی سیاست کے ایسے نازک موڑ پر کھڑا ہے جہاں ہر راستہ اسے آزمائش کے دریا میں دھکیل رہا ہے۔ امریکا، جو دہلی کا سب سے بڑا تجارتی و عسکری شراکت دار رہا ہے، اب اپنی رگوں میں سرد مہری دوڑا رہا ہے۔ چین، جو کل تک دشمن جان تھا، آج مسکرا کر مصافحہ بڑھا رہا ہے۔ اور روس، جو برسوں سے پرانا دوست تھا، اب کبھی نظر انداز اور کبھی پھر یاد کر کے دہلی کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

انڈیا کیلئے یہ سب کوئی معمولی صورت حال نہیں۔ ایک طرف وہ اپنے ملک کی معیشت کو سہارا دینے کیلئے امریکا پر انحصار کرتا رہا، مگر اب امریکی ٹیرف اور تجارتی رکاوٹوں نے اس کی معیشت کی سانسیں تنگ کر دی ہیں۔ لاکھوں نوکریاں داؤ پر لگ چکی ہیں اور سرمایہ دارانہ معجزے کا خواب ٹوٹنے لگا ہے۔ دوسری طرف چین کے ساتھ اس کی سرحدی تلخیاں ابھی تک تازہ ہیں، لیکن دہلی اسی چین سے دوستانہ باتیں کرنے پر مجبور ہے۔ اور پھر روس—جسے مودی حکومت نے ایک وقت نظر انداز کیا—اب دوبارہ روس کے تلوے چاٹ کر سیاسی مکالمے میں داخل ہو رہا ہے۔

یہ سب محض سفارتی تبدیلیاں نہیں بلکہ ایک بڑی سیاسی کہانی کے باب ہیں۔ کہانی یہ ہے کہ انڈیا نے امریکا کی دوستی پر اتنا اعتماد کیا کہ اپنے پرانے تعلقات ایران اور روس کے ساتھ بھی قربان کر ڈالے۔ ایران سے سستا تیل لینا بند کر دیا، روسی تعلقات کو ثانوی بنادیا، اور بیجنگ کے ساتھ محاذ آرائی کو ہوا دی مگر آج جب واشنگٹن نے دہلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ "ہماری ترجیح ہمارے تجارتی مفاد ہیں، تمہاری سلامتی نہیں"، تو دہلی کی سیاسی کاپلٹ گئی امریکا، جس پر دہلی نے اپنی معیشت کا سہارا رکھا، اب پیٹھ پھیر رہا ہے۔ تجارتی معاہدے معطل، ٹیرف کی تلوار لٹک رہی ہے، اور لاکھوں نوکریاں خطرے

میں ہیں۔ واشنگٹن نے دہلی کو یہ سبق دے دیا ہے کہ ”دوستی نہیں، صرف سودے بازی ہے۔ چین، جس کے ہاتھوں گوان کی وادی میں انڈین خون بہا، اب مسکرا رہا ہے۔ وزیر خارجہ وانگ یی دہلی آتے ہیں، معدنیات، پروازوں اور تجارت پر بات کرتے ہیں۔ دہلی سن بھی رہا ہے اور سوچ بھی رہا ہے۔ دشمن پر اعتماد؟ یہی وہ سوال ہے جو مودی حکومت کو پریشان کر رہا ہے۔

روس — پرانی رفاقت، مگر دھول جی ہوئی۔ کبھی نظر انداز، کبھی دوبارہ یاد۔ اجیت ڈوبھال اور بے شکرماسکو کے چکر لگا رہے ہیں۔ گویا دہلی اپنی پرانی غلطی پر پرہیز ڈالنا چاہتا ہے مگر نادام دکھائی نہیں دیتا کہ سیاست کی مکاری نے اسے یہ سکھایا ہی نہیں۔

ایران؟ کل تک قریب ترین سپلائر تھا۔ سستا تیل دیتا تھا مگر امریکا کے ایک اشارے پر انڈیائی نے اس سے منہ موڑ لیا انڈیائی نے 2019 میں امریکی دباؤ پر ایران سے تیل لینا بند کیا۔ یہ فیصلہ دہلی کی معیشت کیلئے ایک خودکشی کے مترادف تھا۔ ایران قریب تھا، تیل سستا تھا لیکن دہلی نے واشنگٹن کے اشارے پر قربانی دی۔ اب اگر یہی دباؤ روسی تیل پر بھی آگیا تو دہلی کی معیشت گویا اپنے پاؤں پر کلبھاڑی مار لے گی اور دہلی کی معیشت نہ صرف تاش کے پتوں کی طرح بکھر سکتی ہے بلکہ دہلی کی معیشت گھٹنوں پر آجائے گی۔ یہی وہ موقع ہے جب انڈیا کو احساس ہو رہا ہے کہ عالمی بساط پر ایک ہی طاقتور کھلاڑی پر انحصار کرنا خودکشی کے مترادف ہے۔ سیاست میں جسے ہم اتحادیوں کی تنوع کہتے ہیں، وہی حکمت عملی دہلی کیلئے ناگزیر ہو چکی ہے۔

مگر کیا یہ سب دہلی کے ہاتھ میں ہے؟ مگر سوال یہ ہے کہ کیا چین اور روس دہلی کیلئے وہ خلا بھر سکیں گے جو امریکا چھوڑ رہا ہے؟ اور کیا واشنگٹن کبھی دوبارہ وہی گرجو شی لوٹا سکے گا؟ کیا وہ اپنے پرانے دشمن چین پر اعتماد کر سکتا ہے؟ کیا چین مودی کے موجودہ کردار پر اعتبار کر سکتا ہے؟ کیا روس کے ساتھ دوبارہ وہی گرمی پیدا ہو سکتی ہے؟ اور کیا واشنگٹن کبھی پھر ویسا دوست بن سکے گا جیسا ٹرمپ کے دور میں تھا؟

ٹرمپ کے دور حکومت میں انڈیا جس قدر گرجو شی سے امریکا کے قریب آیا تھا اور دہلی اور واشنگٹن کے درمیان دوستی کے بڑے چرچے تھے اور مودی عوامی اجتماع میں خوشامداندہ انداز میں ٹرمپ کی دلجوئی کیلئے ”مائی میسٹ فرینڈ ٹرمپ“ کہہ کر مخاطب کر کے اقوام عالم کو اپنی کامیاب دوستی اور سیاست کا سرٹیفکیٹ وصول کرنے کی کوشش کرتا رہا، آج اس میں ایک سرد مہری اور دل شکستہ آہٹ آچکی ہے۔ امریکی قیادت نے انڈیا کو یہ احساس دلایا ہے کہ ”ہماری دوستی کسی غیر مشروط عشق کا نام نہیں بلکہ ایک تجارتی سودے بازی ہے۔ امریکا نے تجارتی گفت و شنید کو غیر معینہ مدت کیلئے مؤخر کر کے دراصل انڈیا کو بتایا ہے کہ ”دنیا کی طاقتوں کی بساط پر کوئی بھی شراکت داری ابدی نہیں ہوتی۔“ اس موقع پر انڈیا کی نظریں ایک بار پھر اپنے پرانے حریف — چین — کی طرف اٹھ رہی ہیں۔

امریکا کے حالیہ سخت فیصلے انڈیا کیلئے غیر متوقع تھے۔ دہلی کے حکمران اس سچائی کا سامنا کرنے کیلئے تیار نہ تھے کہ واشنگٹن محض دوستانہ لہجے میں بات نہیں کرتا بلکہ اپنے تجارتی مفاد کو سب پر مقدم رکھتا ہے۔ امریکا نے انڈیا کے ساتھ جاری تجارتی گفت و شنید کو غیر معینہ مدت کیلئے معطل کر کے جو جھٹکا دیا ہے، دہلی اس حقیقت کیلئے تیار نہ تھا کہ واشنگٹن کبھی بھی دوست کے چہرے کے پیچھے سوداگر کی آنکھیں دکھا سکتا ہے۔ یہ وہی انڈیا تھا جو کل تک سمجھتا تھا کہ وائٹ ہاؤس کی دہلیز اس کیلئے ہمیشہ کھلی رہے گی لیکن یہ مکافات عمل ہے، مودی نے جو بویا، وہی کاٹنا پڑے گا۔

تجارت کی بساط پر امریکا انڈیا کا سب سے بڑا پارٹنر ہے۔ 133 ارب ڈالر کی سالانہ تجارت میں دہلی اپنی معیشت کی سانسیں گنتا ہے۔ ہیرے، موتی، دوائیں، کپڑا اور الیکٹرانک سامان — یہ سب امریکی منڈی پر انحصار کرتے ہیں۔ لیکن اب وہی منڈی اپنے دروازے نیم وا کر کے مودی کی عقل کو ٹھکانے

پر لگا کر دہلی کو سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ ”کیا سب کچھ ایک ہی ٹوکری میں رکھ دینا عقلمندی تھی؟ اب جب ٹیرف اور تجارتی رکاوٹوں نے اس بہتے دریا پر بند باندھ دیا ہے تو لاکھوں روز گار داؤ پر لگ گئے ہیں۔

جب ٹیرف کی تیز دھار ان برآمدات پر گری تو کارخانوں کے پیسے سست پڑ گئے۔ نئے آرڈر منسوخ ہو گئے، اور لاکھوں مزدوروں کے سروں پر بیر وز گاری کی تلوار لٹکنے لگی۔ ایک وقت تھا جب دہلی اپنے معاشی معجزے پر فخر کرتا تھا، آج وہ معجزہ واشنگٹن کے ایک حکم سے بکھر تاد کھائی دے رہا ہے بلکہ منہ کے بل آن گرا ہے۔ نئے آرڈر منسوخ، برآمدات معطل، اور کارخانوں میں بے یقینی ”یہ وہ کیفیت ہے جو انڈیا کیلئے معاشی زوال کی دستک دے رہی ہے

گلو ان کی وادی میں بہنے والا خون آج بھی دونوں ممالک کے تعلقات کو زہر آلود کیے ہوئے ہے اور گلو ان وادی کے بر فیلے پتھروں پر بہنے والا خون دونوں قوموں کے تعلقات میں جم گیا ہے۔ وہ جھڑپ محض ایک واقعہ نہ تھی بلکہ ایک زخم تھا جو اعتماد کی رگ پر لگا لیکن سیاست کی منطق کچھ اور ہے؛ دہلی اب انہی ہاتھوں کو تھامنے اور انہی کے پاؤں چومنے پر آمادہ ہے جنہوں نے اس کے جوانوں کو مٹی میں سلا دیا تھا مگر عالمی سیاست کے بدلتے تیور دہلی کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ اسی چین کے دروازے پر دستک دے جسے کل تک اپنی سلامتی کیلئے سب سے بڑا خطرہ قرار دیتا تھا۔ یہی وہ مکافات عمل کے لمحات ہیں جب دہلی نے اپنی آنکھیں بیچنگ کی سمت دوڑائیں ہیں۔ اسی چین کی طرف جو کل تک سرحد پر خون بہا رہا تھا اور آج مفاہمت کے گیت گارہا ہے۔

مودی حکومت نے ایک وقت ایسا بھی دیکھا جب روس جیسا پرانا حلیف نظر انداز ہوا اور اس سے آنکھیں پھیر لیں لیکن آج دہلی کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ ماسکو کے بغیر اس کا سفر ترقی کمرہ ادھور ہے۔ اجیت ڈوول اور پھر وزیر خارجہ ایس جے شنکر کا دورہ ماسکو اسی پشیمانی کی علامت ہیں۔ اب دہلی چاہتا ہے کہ روسی دروازہ دوبارہ کھٹکھٹایا جائے، چاہے دیر ہی کیوں نہ ہو گئی ہو۔

چینی وزیر خارجہ وانگ یی کا دہلی آنا اور اعلیٰ سطحی مذاکرات اس امر کی علامت ہیں کہ انڈیا نئی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ وانگ یی کا دہلی آنا محض ایک رسمی ملاقات نہ تھی، یہ ایک پیغام تھا کہ ”ہم دشمن رہ کر بھی ہمسائے ہیں اور ہمیں ساتھ رہنے کی راہیں نکالنی ہوں گی۔“ دونوں ملکوں نے تجارتی تعلقات کی بحالی، معدنیات کی فراہمی، کھاد، براہ راست پروازوں اور ویزوں کے اجرا پر اتفاق کر کے ماضی کے زخموں پر مرہم رکھنے اور تعلقات کو نرم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ گویا سرد جنگ کے بر فیلے پانی پر پہلی نرم لہر تھی۔

چین اور انڈیا کی سرحد دنیا کی سب سے پیچیدہ سرحدوں میں شمار ہوتی ہے۔ انڈیا اور چین کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ اب بھی سرحدی تنازعات ہیں۔ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہو، اعتماد کا دریا نہیں بہہ سکتا۔ دونوں ممالک ایک جنگ لڑ چکے ہیں اور عدم اعتماد کی دیوار اب بھی کھڑی ہے۔ مذاکرات کی میز پر بارہا بیٹھنے کے باوجود کوئی فیصلہ کن پیش رفت نہیں ہوئی اور اعتماد کا درخت جڑ نہیں پکڑ سکا اور عدم اعتماد کا یہ سایہ اب بھی ان کے تعلقات پر چھایا ہوا ہے۔ یاد رہے، یہ وہی تنازعہ ہے جس نے دونوں کو ایک جنگ تک پہنچایا۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ امریکا میں آرایس ایس کے پیر و کار بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ لوگ دہلی اور واشنگٹن کے تعلقات کو کسی نہ کسی شکل میں زندہ رکھنے کیلئے دباؤ ڈالتے رہیں گے مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ دباؤ ان تعلقات کو وہی استحکام دے سکے گا جو کل کبھی ہوا کرتا تھا؟ سیاسی حقیقت یہی ہے کہ ماضی جیسی ہم آہنگی شاید اب برسوں تک واپس نہ آ سکے۔



امریکا دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور سب سے بڑی معیشت ہے۔ انڈیا اسے چھوڑ نہیں سکتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دہلی جتنی سرمایہ کاری امریکی نظام میں کر چکا ہے، اتنی اس نے کہیں اور نہیں کی۔ یہ سرمایہ کاری اب بوجھ میں بدل چکی ہے۔ دہلی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں؛ وہ واشنگٹن کی بے رُخی کو سہنے پر مجبور ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ استحکام اور اعتماد جو کبھی تھا، اب تحلیل ہو چکا ہے۔

یہ سوال نہایت اہم ہے کہ خطے میں ہونے والی اس ساری سفارتی ہلچل کے مقابلے میں پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ دہلی اگر چین اور روس کی طرف جھک رہا ہے تو کیا اسلام آباد اس موقع کو سفارتی سرمائے میں بدل رہا ہے؟ اب یہ معاملہ مقتدر قوتوں کیلئے ایک چیلنج ہو گا کہ اسلام آباد کو اپنے پتے کیسے کھیلنے ہوں گے؟ سوال یہ ہے کہ اس پورے کھیل میں پاکستان کہاں کھڑا ہے؟ قرآن ہمیں متنبہ کرتا ہے: **وَلَوْلَا الَّذِیْنَ اَلَّیْنٰهُمْ لَفُتُوْا لِهَآبِیْنِ النَّاسِ** (العمران: 140) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں۔

یہی آیت ہمیں بتاتی ہے کہ طاقت کے ایام کبھی ایک کے پاس اور کبھی دوسرے کے پاس ہوتے ہیں۔ پاکستان کو چاہیے کہ آنے والے دنوں کی تیاری کرے تاکہ یہ تغیر اس کے حق میں ثابت ہو۔ قرآن حکیم ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (انفال: 60) اور ان کے مقابلے کیلئے جو کچھ قوت تم جمع کر سکتے ہو اور باندھے ہوئے گھوڑے (تیار رکھو) تاکہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر رعب ڈال سکو۔

پاکستان کو اپنے سفارتی و دفاعی خطوط میں اسی الہامی اصول کو بنیاد بنانا ہو گا، تاکہ خطے کی بدلتی شطرنج میں وہ محض مہرہ نہیں بلکہ ایک باوقار کھلاڑی ثابت ہو۔ یہ سب سوالات صرف انڈیا کیلئے نہیں بلکہ پورے برصغیر کیلئے اہم ہیں کیونکہ دہلی کی ایک حرکت اسلام آباد کیلئے نئے مواقع بھی پیدا کر سکتی ہے اور خطرات بھی۔ پاکستان کیلئے یہ وہ لمحہ ہے جب اسے اپنی خارجہ پالیسی کے پتے درست ترتیب دینے ہیں۔ اگر دہلی چین کے قریب جاتا ہے تو اسلام آباد کو یہ دیکھنا ہو گا کہ بیجنگ کا توازن کس کے حق میں جھکتا ہے۔ اگر دہلی، ماسکو کا درکھٹکھٹاتا ہے تو پاکستان کو یہ سوچنا ہو گا کہ روسی تعلقات میں اپنی جگہ کیسے بنائی جائے۔ اور اگر دہلی واشنگٹن کے ساتھ دوبارہ گرمجوشی کی کوشش کرتا ہے تو اسلام آباد کو اپنی حکمت عملی نئے سرے سے ترتیب دینا ہو گی۔ یہ وہ وقت ہے جب امت مسلمہ کیلئے بھی ایک بڑا سبق ہے۔ دنیا کی سیاست محض الفاظ کا کھیل نہیں، طاقت اور تیاری کا امتحان ہے۔ جو قوم اپنی قوت تیار رکھتی ہے وہی بساط سیاست پر عزت سے کھیلتی ہے، ورنہ دوسروں کے فیصلوں کی دستاویز میں صرف تماشائی رہ جاتی ہے۔

انڈیا آج جس دورا ہے پر کھڑا ہے، وہاں ایک طرف امریکا کا حالیہ کردار اور دوسری جانب چین اور روس کی پیشکش ہے۔ مگر یہ فیصلہ دہلی کو کرنا ہو گا کہ وہ کس سمت رخ کرے۔ اور خطے کے دیگر ممالک، بالخصوص پاکستان، کو یہ موقع غنیمت سمجھ کر اپنی خارجہ پالیسی میں وسعت اور گہرائی پیدا کرنی ہو گی کیونکہ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو وقت کی کروٹ کے ساتھ اپنے قدموں کی سمت بدلنے کی حکمت رکھتی ہیں۔

انڈیا کی خارجہ پالیسی آج ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں ہر راستہ کسی نہ کسی خطرے کی طرف جاتا ہے۔ امریکا کی بے رُخی، چین کی مشروط دوستی اور روس کی دوبارہ دستک — یہ سب دہلی کیلئے ایک امتحان ہیں اور تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ ان کے حق میں ہوا ہے جو بدلتے وقت کے ساتھ اپنی بساط دوبارہ بچھانے

کا ہنر رکھتے ہیں۔ انڈیا کی موجودہ سفارتی پالیسی ایک ایسے مسافر کی مانند ہے جو بیابانِ سیاست میں بھٹک رہا ہے۔ اس کے سامنے تین راستے ہیں:

- ☆ امریکا، چین اور روس لیکن ہر راستے میں کانٹے بھی ہیں اور سراب بھی۔
- ☆ امریکا کا راستہ بظاہر دولت مند ہے مگر بے اعتباری کے ریگزار سے بھرا ہوا ہے۔
- ☆ چین کا راستہ امید دلاتا ہے مگر اس کے ساتھ خون کے دھبے بھی چپکے ہوئے ہیں۔
- ☆ روس کا راستہ پرانا ہے مگر اس پر دھول جمی ہے اور نئے سرے سے اس کی صفائی درکار ہے۔

یہ وہ لمحہ ہے جب دہلی کو یہ سمجھنا ہو گا کہ "طاقت کے کھیل میں مستقل دوست نہیں ہوتے، صرف مستقل مفاد ہوتے ہیں۔" یہ قول محض مغربی دانشوروں کا نہیں بلکہ اسلامی فکر کا بھی عین خلاصہ ہے۔

(لَنْ يَصْنُرُكُمْ إِلَّا أَدْحَىٰ وَإِنْ يُمَتِّلُوَكُمْ يُؤَلُّوْكُمْ أَلَّا يُدْبِرَ ثُمَّ لَا يَنْصُرُونَ) (ال عمران: 111)

وہ تمہیں بس کچھ ایذا ہی پہنچا سکتے ہیں، اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ پھیر جائیں گے اور پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ یہ آیت گویا ان سب قوتوں کیلئے اعلان ہے جو خود کو ناقابل شکست سمجھتی ہیں۔ اللہ کی بساط پر کوئی طاقت ابدی نہیں۔ پاکستان کیلئے یہ موقع ہے کہ وہ اپنی سفارت کاری کو محض ردِ عمل کی سیاست تک محدود نہ رکھے بلکہ ایک فعال اور حکمت آمیز کردار ادا کرے۔ اسلام آباد کو یہ سوچنا ہو گا کہ بدلنے والی عالمی توازن میں وہ کہاں کھڑا ہے۔ اگر دہلی ماسکو اور بیجنگ کی طرف بڑھتا ہے تو پاکستان کو اپنی جگہ مضبوط کرنا ہو گی تاکہ وہ کسی حاشیے پر نہ ڈالا جائے۔ اگر واشنگٹن دہلی کے ساتھ دوبارہ قریب آتا ہے تو پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی میں توازن قائم رکھنا ہو گا۔

یہ وہ لمحہ ہے جب "قومی خواب دیکھ کر نہیں بلکہ حقیقتوں کو پہچان کر جیتی ہیں"۔ پاکستان کو یہ پہچاننا ہو گا کہ حقیقت یہی ہے۔ عالمی سیاست کی بساط پر زندہ رہنے کیلئے ہمیں اپنے وسائل پر اعتماد، اپنے اتحاد پر یقین، اور اپنے ایمان پر کامل بھروسہ کرنا ہو گا۔ یقیناً انڈیا آج ایک دورا ہے پر کھڑا ہے۔ تین راستے: امریکا، چین، روس، ہر راستہ دشوار، ہر موڑ پر خطرہ۔

☆ امریکا: سب سے بڑی معیشت، مگر بے اعتباری کی دھند۔

چین: سب سے بڑا ہمسایہ، مگر خون کے دھبوں کے ساتھ۔ ☆☆

☆ روس: پرانا دوست، مگر اب پرانی دوستی پر زنگ چڑھا ہوا۔

یہی دہلی کی اصل آزمائش ہے۔ طاقت کے کھیل میں مستقل دوست نہیں ہوتے۔ صرف مستقل مفاد ہوتے ہیں۔ پاکستان کیلئے یہ موقع ہے۔ کیا اسلام آباد اس تبدیلی کو اپنے فائدے میں بدل سکے گا؟ یا پھر ہمیشہ کی طرح دوسروں کے فیصلوں کا تماشا بنی رہے گا؟

یاد رکھیے! وہی قومیں تاریخ میں زندہ رہتی ہیں جو اپنے وقت کے امتحانوں میں کامیاب ہوتی ہیں۔ انڈیا آج اس امتحان میں گرفتار ہے۔ پاکستان کیلئے سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس امتحان کو ایک موقع میں بدل سکتا ہے؟ اگر پاکستان نے اپنی حکمتِ عملی کو بروقت اور موثر طور پر ترتیب دیا تو یہ وقت ہمارے لیے ایک نئی تاریخ کا آغاز ہو سکتا ہے۔ اور اگر ہم نے اسے گنوا دیا تو ہم محض دوسروں کے فیصلوں کے صفحات میں ایک حاشیہ بن کر رہ جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے

إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنْ يَخْذَلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ (ال عمران: 160)

اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا، اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو تمہاری مدد کرے؟

یہی وہ آیت ہے جو ہمیں اصل سبق دیتی ہے۔ قوموں کی نجات صرف حکمتِ عملی سے نہیں بلکہ ایمان، اتحاد اور عزم سے ہوتی ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو پاکستان کو اختیار کرنا ہو گا۔ یہی اصل سبق ہے۔ قوموں کو بچانے والی چیز محض سفارت کاری نہیں، بلکہ ایمان، عزم اور تیاری ہے۔ انڈیا کیلئے یہ بحران ہے۔ پاکستان کیلئے یہ موقع ہے۔

بروز بدھ 9 ربیع الآخر 1447ھ بمقام اکتوبر 2025ء

دوحہ اجلاس: خون، سیاست اور امت کی تاریخی آزمائش

اے اہل ایمان! یہ داستان محض ایک خبر کی نہیں، یہ لہو سے لکھی گئی تاریخ کا ایک تازہ باب ہے۔ یہ وہ قصہ ہے جس کی جڑیں بیت المقدس کے محراب سے جالمتی ہیں، اور جس کی شاخیں غزہ کی گلیوں، دوحہ کی فضاؤں اور امت مسلمہ کے دلوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ نیتن یاہو کی للکار، قطر پر حملہ، حماس و منبر کی استقامت، عرب دنیا کی بے قراری اور امت کے اتحاد کی کوکھ میں چھپے امکانات — یہ سب مل کر ہمیں بتا رہے ہیں کہ یہ معاملہ اب محض سیاست یا جغرافیہ کا نہیں رہا، بلکہ ایمان اور ضمیر کا سوال بن چکا ہے۔

یہ خبر کوئی معمولی واردات نہیں کہ نیتن یاہو نے قطر میں گزشتہ ہفتے ہونے والے حملے کے بعد حماس کے رہنماؤں پر مزید حملوں کو خارج از امکان قرار دینے کی بجائے اس امکان کو تقویت دی۔ ان کے الفاظ گویا ایک اعلان جنگ ہیں کہ جہاں بھی حماس کے رہنما ہوں گے، ہم انہیں چھوڑیں گے نہیں، ان کا تعاقب کریں گے۔ یہ لہجہ اس طرز سیاست کی یاد دلاتا ہے جسے دنیا کے کمزور خطے ہمیشہ طاقت کے غرور میں لپٹے ہوئے حکمرانوں کے ہونٹوں سے سنتے آئے ہیں۔ یہ لہجہ دراصل ظلم کے نشے میں چور طاقت کی وہ للکار ہے جو کمزوروں کو للکارتی ہے اور دنیا کو چیلنج کرتی ہے۔

دراصل اسرائیل کی اس پالیسی کا عکاس ہے جو اپنی بقا کو جارحیت سے جوڑتی ہے۔ یہ اعلان صرف ایک فوجی کارروائی کی دھمکی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی اصول کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ کسی بھی ریاست کا یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے ملک کی خود مختاری کو پامال کرے اور اپنے مخالفین کو سرحد پار نشانہ بنائے۔ تاریخ کے اوراق گواہ ہیں کہ جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو مظلوم کے دل سے نکلنے والی آہ تخت و تاج کو ہلا دیتی ہے۔ آج فلسطین کے زخمی بچے، غزہ کی ماؤں کی سسکیاں، اور امت کی بکھری ہوئی صفیں ہم سے پکار پکار کر پوچھ رہی ہیں، کیا تم صرف قراردادوں کے اسیر رہو گے؟ یا وہ امت بنو گے جس نے کبھی بدروخیہ کی سرزمینوں پر باطل کے ایوان لرزادیے تھے؟

یروشلم کی فضاؤں میں امریکی وزیر خارجہ مارک کو رہو کے ساتھ پریس کانفرنس میں نیتن یاہو نے یہ استدلال پیش کیا کہ ہر ملک کو سرحدوں سے باہر بھی اپنے دفاع کا حق حاصل ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو کیا دنیا ایک لانتناہی جنگوں کی آماجگاہ نہیں بن جائے گی؟ کیا ہر ملک اپنے ہمسایوں کی زمین روند ڈالے؟ کیا دنیا لا محدود جنگوں کا میدان بن جائے؟ کیا ہر ریاست کو یہ اجازت دی جاسکتی ہے کہ وہ دفاع کے نام پر دوسرے ملک کی خود مختاری کو خون میں نہلا دے؟

کے خلاف ہوتی بین الاقوامی قانون (خصوصاً اقوام متحدہ کے چارٹر کا آرٹیکل 51) دفاعی کارروائی کی اجازت تو دیتا ہے، مگر وہ فوری اور ناگزیر خطرے سے ہے، نہ کہ جارحانہ عزائم کے تحت۔ اسرائیل اس اصول کو اپنی مرضی سے توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے تاکہ جارحیت کو دفاع کا لبادہ پہنا سکے۔

قطر میں حماس کے رہنماؤں کو نشانہ بنانے کے اقدام نے اسرائیل کو نہ صرف بین الاقوامی برادری کے غیظ و غضب کا سامنا کرنا پڑا بلکہ اپنے قریبی ترین حلیف امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے بھی دباؤ کا سامنا اور تنقید بھی برداشت کرنی پڑی۔ بظاہر تو ٹرمپ کی تنقید اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض اوقات اسرائیل کی پالیسی امریکا کیلئے بھی سیاسی طور پر نقصان دہ ہو جاتی ہے جس کی وجہ امریکا کو اپنی صفائی کیلئے ایسا بیان دینا پڑتا ہے۔ اس کارروائی

شہید ہو گئے مگر حماس کے رہنما محفوظ رہے۔ تاہم یہ سانحہ اس سوال کو مزید ابھارتا ہے کہ آخر خونِ انسانی کو کب تک سیاست کی بساط پر مہرہ میں 6 افراد بنا کر کھیلا جائے گا؟ یہ رویہ اسرائیلی کارروائی کی اخلاقی ناکامی کو جہاں واضح کرتا ہے وہاں اس کی پشت پناہی کرنے والوں کے منہ پر بھی طمانچہ ہے۔

ٹرمپ کی قطر کو یقین دہانی کہ ایسا دوبارہ نہیں ہوگا، محض سفارتی بیان ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسرائیل کے خلاف امریکا کبھی عملی اقدام نہیں کرتا۔ یہ وعدہ قطر کے زعموں پر مرہم رکھنے کی کوشش تو ہو سکتا ہے مگر حقیقت میں یہ ایک عارضی سیاسی مصلحت ہے لیکن اے دنیا والو! تاریخ شاہد ہے طاقت کی سیاست میں وعدے اکثر کاغذی گواہی اور لفظوں کی چادر میں لپٹے ہوئے بھولی ب سری حکایت بن کر رہ جاتے ہیں۔

جب نیتن یاہو سے دریافت کیا گیا کہ آیا امریکا اس حملے میں شریک تھا تو ان کا دو ٹوک جواب تھا: یہ ہم نے اپنے بل بوتے پر کیا۔ یہ گویا اعلان ہے کہ اسرائیل اپنے آپ کو کسی قانون یا ضابطے کا پابند نہیں سمجھتا۔ یہ جملہ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اسرائیل اپنی کارروائیوں کو آزادانہ فیصلے کے طور پر پیش کرتا ہے تاکہ دنیا میں یہ تاثر قائم کیا جاسکے کہ وہ امریکا یا کسی اور طاقت کا محتاج نہیں، وہ خود ہی جج ہے اور خود ہی جلا د لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کی فوجی اور مالی طاقت بڑی حد تک امریکا اور مغربی ممالک کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔

دوسری طرف، دوحہ میں عرب اور مسلم ممالک کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ قطری وزیر اعظم نے لاکار کر کہا اے عالمی برادری! اپنے دوہرے معیار کو ترک کرو، اور اسرائیل کو اس کے کیسے کی سزا دو۔ عالمی برادری کا انصاف طاقتور اور کمزور کے حساب سے بدلتا ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو کمزور کے دل سے نکلی اور طاقتور ایوانوں تک گونجی۔ ان کا یہ بیان اس کڑوے سچ کی غمازی کرتا ہے کہ طاقت ور کیلئے قانون کچھ اور ہے، کمزور کیلئے کچھ اور۔ فلسطین کے حق میں قرار دادیں محض کاغذی رہتی ہیں، جبکہ اسرائیل کے حق میں فیصلے فوری عمل میں آجاتے ہیں۔

اجلاس میں ایک غیر معمولی منظر یہ تھا کہ سعودی ولی عہد محمد بن سلمان اور ایرانی صدر مسعود پز شکیان کی ملاقات ہوئی۔ یہ مصافحہ گویا تاریخ کے صفحات پر ایک نئے باب کا اشارہ ہے، اگرچہ اس کے پیچھے پوشیدہ فکری اور سیاسی کشمکش بھی اپنی جگہ موجود ہے لیکن یہ لمحہ گویا تاریخ کی کروٹ بدلنے کا اشارہ تھا۔ محمد بن سلمان اور مسعود پز شکیان کی ملاقات نہ صرف علامتی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس امر کی غمازی بھی کرتی ہے کہ فلسطین کے مسئلے نے دونوں بڑے مسلم ممالک کو قریب لانے پر مجبور کیا ہے۔ اگر یہ تعلقات آگے بڑھتے ہیں تو یہ امت مسلمہ کے اتحاد کی ایک نئی شروعات ثابت ہو سکتا ہے۔

ایرانی صدر نے کہا کہ دوحہ پر اسرائیلی حملہ ڈھٹائی اور سفارت کاری پر حملہ ہے۔ اس کا مقصد غزہ میں نسل کشی روکنے کی سفارتی کوششوں کو ناکام بنانا تھا۔ یہ بیان اعلان کرتا ہے کہ اسرائیل امن کی میز کو بھی خون میں ڈبونا چاہتا ہے۔ ان کے بقول اس اقدام کا مقصد غزہ میں نسل کشی کے خاتمے کیلئے جاری سفارتی کوششوں کو سبوتاژ کرنا تھا۔ مسعود پز شکیان کا یہ بیان صرف اسرائیل کی مذمت نہیں بلکہ یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ اسرائیل امن کے کسی بھی عمل کو کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتا۔ اس کا مقصد ہمیشہ بحران کو جاری رکھنا رہا ہے تاکہ وہ اپنی بالادستی قائم رکھ سکے۔

یہ بیان اس صداقت کا آئینہ ہے کہ اسرائیل محض میدانِ جنگ ہی نہیں بلکہ مذاکرات کی میز کو بھی خون آلود کر دینا چاہتا ہے۔ ایرانی صدر کا یہ کہنا کہ یہ سب امریکا اور مغرب کی ملی بھگت ہے، کسی حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسرائیل کی بیشتر فوجی کارروائیاں مغربی طاقتوں کی خاموش یا علانیہ حمایت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتیں۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض اوقات اسرائیل کے اقدامات مغربی دنیا کیلئے خود بھی سیاسی بحران پیدا کر دیتے ہیں۔



انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ سب امریکا اور مغربی ممالک کی ملی بھگت سے ہوا ہے اور اسرائیلی رہنماؤں کے خلاف بین الاقوامی عدالتوں میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کیا وہ عدالتیں، جو طاقتور کے آگے جھکتی ہیں، مظلوم کیلئے کبھی انصاف لاسکیں گی؟ عالمی عدالت انصاف، جس کی دستاویزات الماریوں میں بند ہیں، کیا واقعی ان مظالم کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہے؟

ایرانی صدر کا یہ بھی کہنا تھا کہ دوحہ پر حملہ ثابت کرتا ہے کہ کوئی بھی عرب یا

اسلامی ملک اسرائیلی جارحیت سے محفوظ نہیں۔ یہ وارننگ محض قطر کیلئے نہیں، پوری امت مسلمہ کیلئے ہے۔ ایک تلخ مگر سچائی پر مبنی انتباہ ہے۔ اسرائیل کی حکمت عملی یہ رہی ہے کہ اپنے مخالفین کو کسی بھی ملک میں، کسی بھی وقت، نشانہ بناسکتا ہے۔ اس نے ماضی میں تیونس، لبنان اور حتیٰ کہ یورپی ممالک میں بھی اپنے مخالفین کو نشانہ بنایا۔

اجلاس کے آغاز میں قطر کے امیر شیخ تمیم بن حمد الثانی نے نیتن یاہو کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا کہ اسرائیل عرب دنیا کو اپنے زیر اثر لانا چاہتا ہے۔ یہ کلمات اس اندیشے کو حقیقت کا لبادہ پہنادیے ہیں کہ مشرق وسطیٰ کی سیاست رفتہ رفتہ اسرائیلی اثر و نفوذ کی گرفت میں جا رہی ہے۔ اے عرب حکمرانوں! کیا تم اپنی خود مختاری کے سوداگر بننے پر تیار ہو؟ شیخ تمیم بن حمد الثانی کا یہ کہنا کہ اسرائیل عرب دنیا کو غلام بنانا چاہتا ہے، اس بات کا اعتراف ہے کہ اسرائیل کی اصل حکمت عملی صرف فلسطین تک محدود نہیں بلکہ پورے خطے پر سیاسی اثر و نفوذ قائم کرنا ہے۔

انہوں نے کہا کہ دوحہ پر حملہ غزہ مذاکرات کو روکنے کی کوشش قرار دینا حقیقت سے بعید نہیں، غزہ مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کیلئے کیا گیا ہے۔ یہ وہی پرانا ہتھکنڈہ ہے۔ امن کو دفن کرو تا کہ جنگ کا سودا مہنگے داموں بکے۔ اسرائیل ہمیشہ ایسے وقت کارروائی کرتا ہے جب کوئی امن عمل آگے بڑھنے لگتا ہے تاکہ مذاکرات ناکام ہو جائیں اور وہ دنیا کو یہ دکھاسکے کہ امن ممکن ہی نہیں۔ یہ وہی حربہ ہے جو سامراجی قوتیں ہمیشہ استعمال کرتی رہی ہیں۔ امن کی راہیں مسدود کرو، تاکہ جنگ کا سودا زیادہ دنوں تک بکتا رہے۔

پاکستانی وزیراعظم شہباز شریف کا مطالبہ کہ اسرائیل کے خلاف بین الاقوامی کارروائی ہو، بجا سہی، مگر عملی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے پاس اس مطالبے کو آگے بڑھانے کیلئے نہ معاشی قوت ہے نہ سفارتی دباؤ۔ یہ بیان زیادہ تر علامتی اور اخلاقی پوزیشن ہے۔ سوال یہ ہے کیا یہ آواز عالمی ایوانوں میں گونجے گی یا محض ایک قرارداد کے کاغذ پر لکھی رہ جائے گی؟ کیا اقوام عالم کے ایوانوں میں پاکستانی آواز کو محض رسمی قرارداد سمجھ کر نظر انداز نہیں کر دیا جائے گا؟

عرب اور اسلامی کانفرنس کا اعلامیہ آیا۔ کیا یہ عوام کے دل کو مطمئن کر سکا؟ یا پھر یہ بھی ناکام ڈرامہ ثابت ہو گا جیسا کہ ماضی کے کئی اجلاس؟ یہ سوال بار بار اٹھتا ہے کہ کیا مسلم دنیا کے اجلاس عوام کو مطمئن کر سکتے ہیں؟ ماضی کے تجربات بتاتے ہیں کہ ایسے اجلاس عموماً خطبات اور قراردادوں پر ختم ہو جاتے ہیں، اور عملی میدان میں کوئی نتیجہ خیز قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ عوامی شکوک و شبہات اسی تلخ حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں۔ عرب اور اسلامی کانفرنس کا اعلامیہ کیا عوام کو مطمئن کر سکا؟ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم سربراہی اجلاسوں کے بیانے اکثر قول فیصل سے زیادہ قول محض ثابت ہوئے ہیں۔ عوام کے دل میں یہ خدشہ بجا ہے کہ یہ اجلاس بھی محض ایک کاغذی کارروائی کے طور پر دفاتر میں محفوظ ہو جائے گا۔

ملائیشیا کے رہنما نے شکوہ کیا کہ عوام قراردادوں پر یقین نہیں رکھتے، وہ عمل چاہتے ہیں۔ یہ شکوہ نہیں، یہ پوری امت کی فریاد ہے۔ یہ شکوہ دراصل پوری امت کا کرب ہے جو صرف الفاظ سے نہیں بلکہ عمل کی پیاسی ہے۔ دراصل امت مسلمہ کے اجتماعی ضمیر کی پکار ہے۔ اب امت صرف الفاظ نہیں، عملی اقدامات چاہتی ہے جس کا اظہار آج تک ہم کرنے سے قاصر ہیں۔

ترکی کے صدر رجب طیب اردگان نے واضح اعلان کیا کہ اب بڑھ کر اسرائیل کو ظلم سے روکنا ہو گا اور عالمی برادری کے منافقانہ رویے کا خاتمہ کرنا ہو گا۔ یہ الفاظ ایک نعرہ نہیں، ایک عہد ہیں۔ ان کے الفاظ ایک طوفان کی مانند ہیں جو اگر عمل میں ڈھل جائے تو سیاسی جغرافیہ بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ یہ بیان ترک خارجہ پالیسی کے تسلسل کا عکاس ہے۔ ترکی عرصہ دراز سے فلسطین کے مسئلے پر نسبتاً زیادہ فعال کردار ادا کرتا رہا ہے۔

اور آخر میں! فرانس، برطانیہ اور کینیڈا میں فلسطین کو تسلیم کرنے کی بات پر مظاہرے اور سیاسی بحران اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ مغربی عوام بڑی حد تک فلسطین کے ساتھ ہیں۔ یہ سوال پوری دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑتا ہے کہ کیوں فرانس، برطانیہ اور کینیڈا میں فلسطین کو تسلیم کرنے کی بات پر مظاہرے شروع ہو جاتے ہیں؟ فرانس کے وزیر اعظم کی برطانی اس سوال کو اور پیچیدہ بنا دیتی ہے مگر ایک منظم لابی — صہیونی اور سرمایہ دارانہ — ان کوششوں کو سبوتاژ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کی آواز اکثر لابی کی آمریت کے نیچے دب جاتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عوام تو فلسطین کے ساتھ ہیں، مگر ایک مخصوص طبقہ — جسے ہم سرمایہ دارانہ لابی، صہیونی اثر و سوخ اور عالمی سازشوں کا جال یا گلوبل اسٹیبلشمنٹ کہہ سکتے ہیں — ان آوازوں کو دبانے کیلئے گڑبڑ کرواتا ہے۔ یہی وہ کھیل ہے جو جمہوریت کے نام پر استبداد کی حفاظت کرتا ہے۔ یوں جمہوریت کے ایوانوں میں عوام کی آواز دب جاتی ہے اور طاقت کے سوداگر میدان مار لیتے ہیں۔

یہ سارا منظر نامہ محض ایک خطے کی کشمکش نہیں بلکہ انسانی ضمیر کا امتحان ہے۔ آج امت مسلمہ ایک ایسے موڑ پر کھڑی ہے جہاں قراردادوں کی گونج کمزور پڑ چکی ہے اور عمل کی صدائے بازگشت بلند ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان حکمران اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے تاریخ کا دھارا موڑ سکیں گے یا پھر یہ باب بھی ماضی کے اوراق میں شامل ہو کر رہ جائے گا؟

اے اہل اسلام! یہ تمام تفصیلات ہمیں ایک بڑی حقیقت تک لے جاتی ہیں فلسطین کا مسئلہ محض ایک جغرافیائی تنازع نہیں، بلکہ یہ انصاف، طاقت اور ضمیر کا امتحان ہے۔ یہ معاملہ محض قطر یا غزہ کا نہیں، یہ پوری امت کا امتحان ہے۔ قراردادوں کا زمانہ گزر گیا، اب عمل کا وقت ہے۔ اگر ہم نے اتحاد نہ کیا، تو تاریخ ہمیں بھی ماضی کے صفحات میں دفن کر دے گی۔ اب فیصلہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کب الفاظ سے نکل کر عمل کے میدان میں اترے گی۔

اے اہل اسلام! یہ وقت ہے کہ ہم اپنی تاریخ کے اوراق پلٹیں، اور دیکھیں کہ جب امت نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہا تھا تو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں بھی مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ آج دو حو، غزہ اور یروشلم ہم سے پکار کر مطالبہ کر رہے ہیں کہ اٹھو! کیونکہ صرف بیانات اور اجلاس کافی نہیں۔ امت کے رہنماؤں کو سوچنا ہو گا کہ کیا ہم پھر سے وہی کردار ادا کریں گے جو ماضی کے سربراہی اجلاسوں نے کیا — محض زبانی جمع خرچ؟ یا پھر اس بار تاریخ کا دھارا موڑیں گے؟

یاد رکھو! اگر ہم نے عمل کی راہ نہ اپنائی تو تاریخ ہمیں بھی ان قوموں کی طرح دفن کر دے گی جنہوں نے اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑ لیا لیکن اگر ہم نے

اتحاد کی ڈور تھام لی، ایمان کے چراغ کو جلایا اور ظالم کے مقابلے میں عملاً صف بستہ ہو گئے، تو یہ عہدِ ظلم بھی ٹوٹے گا، اور فلسطین کی فضاؤں میں اذانِ حق کی صدا پھر گونجے گی۔

— آؤ ایک صد بلند کریں کہ اب فلسطینیوں اور کشمیریوں کا خون رائیگاں نہیں جائے گا!

اللہ اکبر! اللہ اکبر

بروز جمعرات 10 ربیع الآخر 1447ھ / اکتوبر 2025ء

شطرنج کی بساط اور تاریخ کا فیصلہ

تاریخ کے اوراق میں بعض اوقات ایسے ابواب آتے ہیں جو قلم سے نہیں بلکہ حالات کے تیز دھار نیزوں سے لکھے جاتے ہیں۔ جنوبی ایشیا کا موجودہ منظر نامہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ایک ایسی شطرنج کی بساط جس پر مہرے بھی غیر روایتی ہیں اور چالیں بھی۔ زمانے کی گرداڑتی ہوئی بساط پر کچھ مہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو ظاہرِ خاموش کھڑے رہتے ہیں، مگر ان کا اثر پوری کھیل کی سمت بدل دیتا ہے۔ آج برصغیر کی سیاسی و عسکری فضا میں جو ہوا چل رہی ہے، وہ محض موسمی جھونکا نہیں بلکہ ایک آنے والے طوفان کی پیشگی آہٹ ہے۔ دلی اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ اب نہ دریاؤں میں ناپا جاسکتا ہے نہ سڑکوں کے میلوں میں — یہ فاصلہ مزاج، مفاد اور حکمت کا ہے۔

دلی اور اسلام آباد کے درمیان فاصلہ اب صرف زمینی میلوں کا نہیں رہا؛ یہ سوچ، مفاد اور حکمتِ عملی کا فاصلہ ہے۔ اسی بساط کے ایک گوشے اور کونے پر واشنگٹن میں امریکا کا وہ صدر بیٹھا ہے جو کبھی مسکراتا ہوا دوست نظر آتا ہے اور کبھی سوداگر کی مانند رخ توڑتا ہے۔ یہ تحریر انہی بدلتے تعلقات، سفارتی اشاروں، عسکری حکمتِ عملیوں اور سیاسی رمزوں کا جائزہ ہے، جہاں ہر واقعہ محض خبر نہیں بلکہ ایک کہانی ہے، اور ہر کہانی کے پیچھے ایک پوشیدہ حکمت۔ یہ تحریر انہی بدلتی چالوں، سفارتی اشاروں، عسکری حکمتِ عملیوں اور تاریخی رمزوں کی ایک گرہ کشائی ہے، جہاں ہر واقعہ ایک داستان ہے اور ہر داستان ایک حکمت کا دریا، اور یہ قلمی جولانیوں کی انتہائی احتیاط کا تقاضہ بھی ہیں۔

زمانہ شاہد ہے کہ جغرافیہ محض زمین کے نقشے پر کھنچی ہوئی لکیروں کا نام نہیں، بلکہ قوموں کے درمیان تعلقات کی ایک نازک کڑھائی ہے، جس کے تانے بانے سیاست، معیشت اور دفاع کے دھاگوں سے بنے جاتے ہیں۔ اور تاریخ اس کی بھی گواہ ہے کہ جغرافیہ صرف مٹی اور پتھر کے ڈھیر کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قوموں کی امیدیں، خوف اور عزائم جھلکتے ہیں۔

پاکستان اور امریکا کے تعلقات کی تاریخ اتار چڑھاؤ کی داستان ہے۔ ایک وقت تھا جب اسلام آباد، واشنگٹن کا قریبی اتحادی کہلاتا تھا۔ افغان جہاد کا دور، اقتصادی امداد، اور فوجی تعاون۔ پھر نائن الیون کے بعد دہشتگردی کے خلاف جنگ میں ایک نئی شرکت لیکن حالیہ برسوں میں یہ تعلقات سرد مہری کا شکار ہوئے، خصوصاً ٹرمپ انتظامیہ کے ابتدائی بیانات کے بعد۔ اب بائڈن دور میں تعلقات کی نوعیت پھر بدل رہی ہے، مگر اس بار انداز مختلف ہے — براہِ راست ضرورت سے زیادہ علاقائی مفادات اس قربت کو چلا رہے ہیں۔

آج پاکستان ایک ایسے موڑ پر کھڑا ہے جہاں اس کا سامنا ایک غیر روایتی امریکی صدر سے ہے — ایسا صدر جو روایتی سفارتی جملوں کے بجائے تجارتی سودے بازی کے لہجے میں بات کرتا ہے، اور جس کے ہر جملے میں یا تو پیشکش چھپی ہوتی ہے یا دھمکی کی جھلک۔ یہ امریکی تاریخ کا پہلا صدر ہے، جس کی زبان میں کبھی موم کی نرمی اور کبھی فولاد کی سختی پائی جاتی ہے۔ اس کی گفتگو میں سفارت کی روایتی خوشبو کی بجائے بازاری سودے بازی کی مہک آتی ہے، اور ہر جملہ یا تو ایک پیشکش ہے یا ایک پوشیدہ دھمکی۔

یہ اصول پرانا ہے کہ ممالک کبھی صرف ضرورت کے سبب قریب نہیں آتے؛ اصل کشش مفادات کا مقناطیس پیدا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ عالمی منظر نامے میں امریکا کو براہِ راست پاکستان کی فوجی یا اقتصادی مدد کی فوری ضرورت نہیں، مگر سفارت کا اصول ہمیشہ یہی رہا ہے کہ قومیں کبھی حقیقی

ضرورت کے سبب قریب نہیں آتیں، بلکہ مفادات کی کشش انہیں ایک دوسرے کی مجلس میں لا بٹھاتی ہے۔

امریکا کو اس وقت پاکستان سے براہ راست فوجی مدد نہیں چاہیے، مگر تین بڑے عوامل اس تعلق کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ واشنگٹن جانتا ہے کہ افغانستان میں استحکام کا دروازہ اسلام آباد سے ہو کر گزرتا ہے۔ بیلٹ اینڈ روڈ منصوبہ اور سی پیک خطے میں امریکی اثر کو چیلنج کرتے ہیں۔ دہلی اور واشنگٹن کی تجارتی کشیدگی امریکی پالیسی سازوں کو پاکستان کے قریب آنے پر مجبور کرتی ہے۔ واشنگٹن اس بات سے بھی واقف ہے کہ افغانستان، پاکستان، ایران اور خطے کے دیگر ممالک کا سیاسی اور تجارتی مستقبل چین کے ساتھ مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان کی قیمت پر بھارت کے ساتھ امریکی تعلقات نے خاصا نقصان پہنچایا ہے، پاکستان اور خطے کے دیگر ممالک اس بات سے واقف ہیں کہ امریکا اپنے فوائد کی تکمیل پر انہی دوستوں کی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا۔

پاکستان اور افغانستان کے بعد بھارت نے بھی امریکی دوستی کا مزہ چکھ لیا ہے۔ آج سے 15 برس قبل اپنے کاموں میں بر ملا اس کا تذکرہ کیا تھا کہ پاکستان تو امریکا کی دوستی کے نتائج بھگت چکا لیکن انڈیا خود کو سنبھال نہیں پائے گا کیونکہ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان میں جاری علیحدگی کی تحریکیں ایک مرتبہ پھر پورے زور و شور سے اپنے حقوق کیلئے میدانِ عمل میں اتریں گی اور انڈیا کی فوج اور دیگر عسکری ادارے پہلے ہی اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ انڈین فوج میں بڑھتے ہوئے خود کشیوں کے اعداد و شمار سے بھی پتہ چل رہا ہے کہ اب انڈین فوج میں بھرتی ہونے کا شوق بھی ختم ہو چکا ہے۔

اس لئے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ امریکا کو پاکستان کی "ضرورت" نہ ہونے کے باوجود تعلقات کی وجہ صرف یہی ہے کہ افغانستان سے امریکی افواج کا انخلا، خطے میں چین کا بڑھتا ہوا سایہ، اور بھارت کے ساتھ واشنگٹن کی تجارتی چپقلش۔ یہ سب مل کر امریکا کو اسلام آباد کی دہلیز پر لے آئے ہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ سب مل کر واشنگٹن کو اسلام آباد کے دروازے پر دستک دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ یہ قربت بظاہر ناپ تول کی ہے، مگر دراصل یہ ایک شطرنجی چال ہے، جہاں ایک غلط قدم پوری بازی الٹ سکتا ہے۔

امریکی سر زمین پر پاکستانی آرمی چیف کالب ولجہ محض کلمات نہ تھے بلکہ گویا ایک نئے صفحے کا عنوان تھا۔ امریکی سر زمین پر پاکستانی آرمی چیف کی تقریر گویا خاموش تالاب میں پتھر پھینکنے کے مترادف ثابت ہوئی۔ پاکستانی آرمی چیف کا امریکی تھنک ٹینک میں خطاب محض ایک روایتی تقریر نہیں تھی؛ اس میں ایسے نکات شامل تھے جو واشنگٹن میں اعتماد کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب رہے، اسلام آباد نے اسے تعلقات میں نئے باب کے آغاز کی بشارت اور خوش آئند شروعات جانا، مگر دہلی نے نہ صرف اسے شک اور تشویش کی نظر سے دیکھا بلکہ دہلی کے دل میں یہ بات تیر کی مانند پیوست ہو گئی کہ مودی جو خود کو خطے کا سپر پاور سمجھ کر امریکا کو اپنی اہمیت کیش کروانے کے پروگرام جلدی میں طے کر رہا تھا، امریکا کو چین کے خلاف محاصرہ میں خود کو عین ضروری سمجھ کر کوآڈ کی رکنیت حاصل کر کے خود کو دنیا کی تیسری قوت جان رہا تھا، ایک معمولی جھٹکے نے تکبر کے غبارے سے ہوا نکال دی اور مودی کا چاپلوسی میں مائی فرینڈ کہہ کر ٹرمپ کو مخاطب کرنا بھی کسی کام نہ آیا اور اسی نے دنیا بھر کے میڈیا کے سامنے انڈین معیشت کو بھی مردہ قرار دے کر "شاننگ انڈیا" کو گہری اور اندھی کھائی میں پھینک دیا ہے۔

مودی نے انتہائی مکاری کے ساتھ ایک مرتبہ پھر روس اور چین کی بلائیں لینے کا کام شروع کر دیا ہے لیکن روس اور چین دونوں اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ روس کو پہلے ہی ہی شکایت رہی ہے کہ "سوویت یونین سے روس کے سفر تک" میں سب سے پہلے انڈیا نے آنکھیں پھیر کر امریکی صدر کے سامنے سجدہ



ریز ہو گیا جبکہ کشمیر اور بنگلہ دیش کے معاملے پر سوویت یونین ہی اس کی مدد کو ہمیشہ پہنچ کر اس کو مشکل سے بچانے کا کام کر چکا تھا لیکن اب چند برسوں سے وہ خود کو امریکا اور چین کے بعد خود کو دنیا کی تیسری قوت سمجھ بیٹھا تھا۔ پاکستان کے ساتھ چند دنوں کی جنگ میں بری طرح ہزیمت اور حالیہ امریکی اقدامات نے خطے میں طاقت کے ترازو پر مودی کے سینے پر ایک ایسا نیا وزن لا دیا ہے کہ جس نے پرانے توازن اور برابری کے ساتھ مودی کے تکبر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

وہ وقت یاد کیجیے جب نریندر مودی نے امریکی صدر کو "مائی فرینڈ" کے لقب سے نوازا تھا، مودی اور ٹرمپ کے ابتدائی تعلقات بہت گرم جوش تھے، مودی کے لبوں سے کبھی "مائی فرینڈ" کے پھول ہی نہیں جھڑتے تھے بلکہ تکبر سے اکڑی گردن بھی خطے کے ممالک کو پیغام دے رہی ہوتی تھی، مگر وقت کا پھیر ایسا گھوما کہ امریکی تجارتی پالیسی میں بھارت کیلئے دی گئی مراعات ختم کرنے اور ٹریف بڑھانے سے رشتے میں ایسی دراڑ پڑ گئی کہ مودی جی منہ کے بل گر کر رام رام بھی نہ پکار سکے۔ چند ہی مہینوں میں یہی دوستی، یہی زبان "ٹریف کنگ" طعنے پکار میں بدل کر حلق میں کانٹے لے آئی۔ ایف۔ 35 طیاروں کی پیشکش اور پاکستان کے ساتھ واشنگٹن کی براہ راست بات چیت نے دہلی اور وائٹ ہاؤس کے درمیان وہ رستی ڈھیلی کر دی جو کبھی تنی ہوئی تھی۔

مودی کی 100 منٹ کی تقریر گویا ایک لمبا کارواں تھی، مگر اس میں نہ ایف۔ 35 کا ذکر آیا، نہ ٹرمپ کی ثالثی کی نفی یا تردید کرنے کی ہمت ہوئی۔ انہوں نے نہرو کانام 14 بار لیا مگر چین کا ایک بار بھی نہیں، گویا اصل حریف کے خیمے کو دیکھ کر بھی آنکھیں چرا لیں۔ جان بوجھ کر بڑے تنازع کو نظر انداز کیا گیا۔ یہ سفارتکاری کا وہ پہلو ہے جہاں خاموشی بھی ایک بیانیہ ہوتی ہے لیکن اپوزیشن نے اسے مودی بلنڈر کو مودی سرنڈر کانام دیکر پارلیمنٹ میں اس کاناک میں دم کر دیا۔ گویا ایک بڑا فیلڈ مارشل دشمن کے خیمے کو نظر انداز کر کے چھوٹے مورچوں پر گولہ باری کرے۔ یہی وہ مودی کی مکار سیاست ہے جسے "خاموش اعتراف" کہا جاسکتا ہے لیکن اپوزیشن مودی کے منہ سے یہ کہلوانے پر بضد ہے کہ مودی اپنی غلطیوں اور شکست کا اعتراف اور سینڈور کے اجڑنے کی ذمہ داری قبول کرے۔

بنیان مرسوم، قرآن حکیم میں یہ وہ مثال ہے جو ایمان والوں کی صف کو مضبوط عمارت سے تشبیہ دیتی ہے، ہمیشہ جس کی اینٹیں باہم جبی اور جڑی ہوئی ہوں۔ اور اہل یقین کیلئے الہام کا سرچشمہ رہا ہے۔ فوجی دائرے میں اس کا مطلب ایک ایسی یکجا قوت ہے جو اندرونی اتحاد اور بیرونی طاقت دونوں رکھتی ہو۔ اسی قرآنی تصور سے متاثر ہو کر ایک جدید عسکری آپریشن کو یہ نام دیا گیا، اسی سے متاثر ہو کر ایک جدید عسکری مہم کانام رکھا گیا، جس کا مرکز "فتح" میزائل تھا۔ گویا جدید جنگی ٹیکنالوجی کو قرآنی استعارے کے سائے میں پرو کر ایک نئی معنویت دی گئی۔ جس میں "فتح" میزائل گویا اس عمارت کی سب سے بلند فصیل تھا۔ اس طرح آپریشن بنیان المرسوم، ایمان اور عسکریت کا ایسا امتزاج بن گیا جس کو رب کائنات نے فتح مبین دلا دی۔

پاکستان فوج نے راکٹ فورس کمانڈ کا قیام ایک ایسے وقت میں کیا جب خطے میں ہتھیاروں کی دوڑ نے نئی شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ محض ایک عسکری شاخ نہیں بلکہ مستقبل کے معرکوں میں فیصلہ کن کردار ادا کرنے والی قوت اور اتش فشاں ہے جو دشمن کو جلا کر راکھ کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ راکٹ فورس کمانڈ ایک مخصوص عسکری یونٹ ہے جس کا مقصد میزائلوں اور راکٹ سسٹمز کی کمان اور آپریشن سنبھالنا ہے۔ اس میں مختلف رینج اور صلاحیتوں والے ہتھیار شامل ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ جدید جنگ محض بندوق اور ٹینک کی لڑائی نہیں، بلکہ میزائل، ڈرون، اور راکٹ سسٹم کے

امتزاز کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا قیام اس حقیقت کا اعلان ہے کہ آنے والی جنگیں صرف توپ و تفنگ سے نہیں بلکہ زمین و فضا کی مشترکہ یلغار سے جیتی جائیں گی۔

چین، روس، امریکا، اور شمالی کوریا میں راکٹ فورس کئی دہائیوں سے موجود اور سرگرم ہے۔ بھارت نے ڈرون ہٹلین کو وسعت دی، اور پاکستان کا جواب راکٹ فورس کمانڈ کی شکل میں زمین پر مجاہدین کی یلغار تیار کر لی گئی ہے۔ اگر ڈرون فضا کے شکاری پرندے ہیں تو راکٹ فورس زمین کے غیظ و غضب کے آتش فشاں ہیں۔ دونوں کا تقابل اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جدید جنگ میں آسمان اور زمین دونوں کو اپنے اپنے سپاہی چاہیے۔ حالیہ پاک بھارت جنگ نے ڈرون ٹیکنالوجی پر اپنی مہارت کا اظہار کر کے ساری دنیا کو مبہوت کر دیا ہے اور بالخصوص اسرائیلی کامی کار ہاروپ ڈرونز کی تباہی اور انہیں زمین پر بحفاظت اتار لینے کے بعد اسرائیل کے ہاتھوں کے طوطے بھی اڑ گئے ہیں کہ وہ تو اپنے ان ڈرونز کو ناقابل تسخیر سمجھتے ہوئے سینا گون کو بھی خاطر میں نہیں لارہا تھا لیکن پاکستان کے اس معرکے کے بعد جب اسے اطلاع ملی کہ آدم پور میں سے اس کے 20 آپریٹرز کے تابوت بھی رات کی تاریکی میں تل ایب پینچ رہے ہیں تو اس نے فوری طور پر امریکا کو مدد کیلئے پکارا کیونکہ پاکستان کی طرف سے یہ سنگل پینچ گیا تھا کہ اب براہ راست اسرائیل ہماری زد میں ہو گا۔

سوال یہ ہے کہ آخر پاکستان کو اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ دراصل بھارت کے جدید ہتھیاروں کا جواب، خصوصاً سیلسٹک میزائل اور ڈرون ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ خطے میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کیلئے جدید جنگی حکمت عملی میں زمینی اور فضائی ہتھیاروں کی ہم آہنگی کیلئے اس یونٹ کی اشد ضرورت ہے تاکہ دشمن کے عزائم کا پوری قوت سے جواب دیا جاسکے۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمان الہی ہے کہ:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرَبِّوْنَ بِهِمُ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَغْلُمُونَ (الانفال: 60)

اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے مقابلے کیلئے مہیا کرکھو تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے اعداء کو خوفزدہ کر دو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدل تمہاری طرف پلٹایا جائے گا اور تمہارے ساتھ ہر گز ظلم نہ ہو گا۔

یہ سب واقعات بتاتے ہیں کہ جنوبی ایشیا کی بساط پر ہر چال شطرنج کی طرح حساب سے کھیلی جا رہی ہے۔ دلی اور اسلام آباد کے بیچ کا فاصلہ محض میلوں کا نہیں بلکہ پالیسیوں اور ترجیحات کا ہے، اور واشنگٹن کی قربت محض سفارت کی گرمی نہیں بلکہ مفادات کی آگ ہے۔ تاریخ کی رفتار کبھی آہستہ چلتی ہے، مگر بعض اوقات وہ دوڑتی ہوئی گزر جاتی ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتی۔ آج جنوبی ایشیا ایک ایسے دہانے پر کھڑا ہے جہاں ہر فیصلہ آنے والی دہائیوں کی سمت متعین کر سکتا ہے۔

دلی اور اسلام آباد کے بیچ پھیلا یہ فاصلہ، اور واشنگٹن کی بدلتی قربت، گویا ایک نئے عہد کی تمہید ہے۔ یہ وہ عہد ہے جہاں عسکری قوت صرف توپ و تفنگ سے نہیں بلکہ ذہانت، ٹیکنالوجی اور سفارت کے امتزاج سے جانی جائے گی۔ ہماری بساط بچھ چکی ہے، مہرے اپنی جگہ پر ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگلی چال کس کے ہاتھ میں بازی لے جاتی ہے، اور کون اس پیچیدہ کھیل میں اپنی تاریخ کا فاتح باب لکھتا ہے۔

وقت کا قافلہ رکتا نہیں، یہ یا تو معرکے جیتنے والوں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے یا ہارنے والوں کو گردِ راہ میں چھوڑ دیتا ہے۔ آج جنوبی ایشیا کی بساط پر جو چالیں

کھیلی جا رہی ہیں، وہ محض لمحاتی سیاست نہیں بلکہ آئندہ نصف صدی کی بنیاد ہیں۔ یہ سب مل کر ایک نئے عہد کی تمہید ہیں، جہاں علم، ٹیکنالوجی اور عزم ہی حقیقی ہتھیار ہیں۔ شطرنج کے مہرے اپنی جگہ سنبھال چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگلی چال تاریخ کا فاتح کون لکھتا ہے۔ میرے بہت ہی عزیز دوست جناب ریٹائرڈ جنرل نعیم لودھی صاحب جن کی خطے کی سیاسی اور عسکری حالات پر گہری نظر ہے، ایک اہم سوال پوچھا ہے کہ کیا فلپک شپ پروجیکٹ سی پیک اور بی آر آئی، جو افغانستان، ایران اور بیشتر ممالک میں چینی اثر و رسوخ کے ساتھ اپنے تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے، تو کیا خطے (خصوصاً پاکستان) میں امن کیلئے کام کرنا امریکا کے مفاد میں ہے؟ تو کیا دہشتگردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے ساتھ امریکی تعاون، کوئی سیاسی معنی رکھتا ہے؟ بہت ہی اہم اور انتہائی اہمیت کے حامل اس سوال کا جواب اگلے کالم میں ان شاء اللہ دینے کی کوشش کروں گا۔ ان شاء اللہ

بروز جمعہ المبارک 11 ربیع الآخر 3 / اکتوبر 2025ء

شطنج سیاست اور تقدیر کا فیصلہ

دنیا کی سیاست محض معاہدوں اور اجلاسوں کا نام نہیں؛ یہ تقدیر کے کاغذ پر لکھی جانے والی وہ تحریر ہے جسے وقت کی انگلیاں اور قوموں کے فیصلے مل کر رقم کرتے ہیں۔ کبھی تخت اور تاج دوست بن جاتے ہیں اور کبھی برادرانِ ملت بھی ایک دوسرے کے حریف ہو جاتے ہیں۔ یہی سیاست کا المیہ اور مکافاتِ عمل بھی ہے اور یہی تاریخ کا حسن۔

آج ایشیا کی فضاؤں میں بھی ایک نیاباب کھل رہا ہے۔ تیانجن کی زمین پر جب دنیا کی دو قدیم تہذیبوں کے نمائندے، مودی اور شی جن پنگ، آمنے سامنے ملاقات بیٹھے تو سفارت کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ کچھ نے کہا یہ نئی شروعات ہے، کچھ نے کہا یہ وقتی ضرورت کا دھوکا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر لمحہ تاریخ کی ندی میں ایک پتھر پھینکتا ہے، جس کی لہریں دور تک جاتی ہیں۔ پاکستان کیلئے سوال یہی ہے: کیا دہلی اور بیجنگ کا یہ قرب ہمیں اندیشوں میں ڈالنے کیلئے ہے یا امکانات کے نئے دروا کر نے کیلئے؟ کیا یہ سیاست کی وہی شطنج ہے جہاں دوستی اور دشمنی بس ایک چال کا نام ہے؟

دنیا کی سیاست کبھی سیدھی راہوں پر نہیں چلتی۔ یہ بازی گاہِ ہستی ہے، جہاں ہر کھلاڑی کبھی بادشاہ بنتا ہے، کبھی محض پیادہ رہ جاتا ہے۔ آج کا منظر نامہ بھی کچھ ایسا ہی ہے؛ دہلی اور بیجنگ کی ملاقات نے خطے کی فضاؤں میں ایک نئی ہلچل ڈال دی ہے۔

مودی اور شی جن پنگ کی ملاقات ایک ایسا واقعہ ہے جس نے پورے خطے کی فضاؤں میں سوالیہ نشان ثبت کر دیا ہے۔ مودی اور شی جن پنگ کی ملاقات کو بعض لوگ نئی شروعات کا نام دیتے ہیں، مگر تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بڑے زخم محض ایک مصافحے سے مندمل نہیں ہوتے۔ یہ ملاقات سفارتی نوعیت کی تھی، لیکن خطے کے توازن کے اعتبار سے اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کیا دہلی کی بیجنگ سے بڑھتی قربت اسلام آباد کیلئے کسی اندیشے کی خبر لاتی ہے؟ یا یہ صرف سفارتی بساط پر وقتی چال ہے، جسے تاریخ کی ہوائیں بہالے جائیں گی؟ سوال یہ ہے کیا یہ قربت پاکستان کیلئے کسی اندیشے کی گھنٹی ہے یا ایک نئے موقع کی نوید؟ پاکستان کیلئے اصل سوال یہ ہے کہ کیا یہ قربت بیجنگ-اسلام آباد تعلقات پر منفی اثر ڈالے گی؟ یا یہ دہلی کا وقتی سفارتی حربہ ہے جو امریکی دباؤ کے جواب میں اختیار کیا گیا ہے؟

تیانجن کی فضا میں شگنائی تعاون تنظیم کے اجلاس سے گونج اٹھیں۔ شگنائی تعاون تنظیم کا اجلاس، جس میں برصغیر کے دونوں ہمسایہ ممالک شریک ہوئے، تیانجن کی فضاؤں کو سیاست کے شور سے بھر دیا گیا۔ ایک طرف مودی نے چینی صدر سے ملاقات کیلئے جب ہال میں پہنچتے ہی جو نبی مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھایا لیکن چینی صدر اس ہاتھ کو تھام نہ سکے اور آگے بڑھ گئے، دوسری طرف پاکستان کے وزیراعظم نے اسی شہر کی جامعہ میں دوستی اور اخلاص کی ایک لازوال داستان دہرائی، پاکستان کے وزیراعظم نے اسی شہر کی جامعہ میں پاک-چین دوستی کے چرچے کو نئی تازگی عطا کی۔ ایس سی او، خطے کی بڑی طاقتوں کا ایک پلیٹ فارم ہے۔ اس میں دہلی اور اسلام آباد دونوں کی موجودگی بذاتِ خود ایک علامت ہے کہ علاقائی سیاست کا مرکز ایشیا کی سرزمین ہے، نہ کہ مغرب کے ایوان۔ پاکستان کے وزیراعظم نے جہاں پاک-چین دوستی کو اجاگر کیا، وہیں دہلی نے بیجنگ کے ساتھ براہِ راست رابطے کی راہ نکالنے کی کوشش کی، یوں یہ اجلاس محض رسمی نہیں رہا، بلکہ خطے کے بدلتے توازن کا ایک آئینہ بن گیا۔ یہ منظر گویا دو متوازی خطوط تھے، جو تاریخ کے کاغذ پر ایک ساتھ کھینچ گئے۔

چینی صدر شی کا ابتدائی جملہ ہی عالمی منظر نامے کی لرزتی بنیادوں کا عکاس تھا۔ ان کے لبوں سے نکلا ہوا جملہ "دنیا فراتفری کا شکار ہے" کسی خطیب کا وعظ نہیں، وقت کے آئینے میں جھلکتی ہوئی حقیقت تھی۔ یہ جملہ بین الاقوامی سیاست کے موجودہ بحرانوں کا عکاس ہے۔ یہ الفاظ محض ایک سفارتی بیان نہ تھے، بلکہ آنے والے دور کے ہنگاموں کی خبر بھی تھے۔ گویا قرون وسطیٰ کا وہ دور یاد آگیا جب سلطنتیں زوال پذیر تھیں اور نئی سپر پاورز جنم لی رہی تھیں۔ یوکرین کی جنگ، مشرق وسطیٰ میں کشیدگی، اور معاشی عدم استحکام؛ سب اس بیان میں جھلکتے ہیں۔

شی نے یاد دلایا کہ چین اور انڈیا دو قدیم تہذیبوں کے وارث ہیں، ڈریگن اور ہاتھی کو دشمنی نہیں بلکہ رقص میں شرکت دار بننا چاہیے۔ یہ جملہ کسی شاعر کی استعاراتی پرواز معلوم ہوتا ہے۔ چین اور بھارت دونوں قدیم تہذیبوں کے امین ہیں۔ شی نے "ڈریگن اور ہاتھی" کی رقص کی مثال دیکر تعلقات کو مثبت رنگ میں پیش کیا مگر یہ استعارہ دراصل ایک سوال بھی ہے: کیا یہ رقص ہم آہنگی کا ہو گا یا رقابت کا؟ یا پھر زمین لرزے والے زلزلے؟

مودی نے بھی جواباً 2.8 ارب نفوس کی تقدیر کو اس تعاون کے ساتھ وابستہ بتایا۔ مودی نے بھی اربوں عوام کے مفادات کی بات تو کی، لیکن تاریخ کا سبق یہ ہے کہ محض آبادی طاقت کی ضامن نہیں ہوتی۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ محض تعداد سے قومیں نہیں بنتیں؛ ایمان، استقلال اور قربانی سے قوموں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ رقص دوستی کا ہو گا یا طاقت کے توازن کی تلواروں پر ایک نازک کرتب؟

ملاقات کے ایجنڈے میں سب سے نمایاں امریکا کا ٹیرف تھا۔ اصل پس منظر تو یہ ہے کہ روسی تیل کی خریداری پر امریکا نے انڈیا کی مصنوعات پر 50 فیصد ٹیرف لگا کر بھارت پر معاشی شکنجہ کسا ہے۔ یہ صرف ایک تجارتی قضیہ نہیں بلکہ استعمار کی وہ پرانی چال ہے جو کبھی کپاس کے دھاگے سے لگی تھی اور آج توانائی کے چشموں پر آکر رُکی ہے۔ یہ اس نے دہلی کو نئے دوست ڈھونڈنے پر مجبور کیا۔ یوں مودی کا بیجنگ کا رخ کرنا، واشنگٹن سے کشیدگی کا سیدھا نتیجہ ہے۔

ماہرین کی رائے ہے کہ یہ ٹیرف دہلی کی برآمدات اور صنعتوں کیلئے کسی آسیب سے کم نہیں اور امریکی ٹیرف دہلی کی برآمدات اور مینوفیکچرنگ سیکٹر پر کاری ضرب ہے۔ یہ بھارت کی اندرونی سیاست اور عوامی روزگار پر براہ راست دباؤ ڈال سکتا ہے۔ یہ ٹیرف دہلی کی صنعتوں کو گھن کی طرح چاٹ جائے گا اور یہی مسئلہ بیجنگ کے خوابوں کو بھی گدلا رہا ہے۔

یہی ٹیرف چین کے عالمی منصوبوں کیلئے بھی رکاوٹ بن رہا ہے۔ یوں یہ قضیہ صرف دہلی تک محدود نہیں بلکہ بیجنگ کو بھی متاثر کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ منصوبے جو عالمی سطح پر تجارت اور توانائی کے بہاؤ کو بہتر بنانے کیلئے ہیں۔ اس لیے چین بھی بھارت کو اپنے قریب لانے میں دلچسپی رکھتا ہے لیکن وہ انڈیا کے اس مکافاتِ عمل سے بھی باخبر ہے اور وہ اس بات سے بھی واقف ہے کہ مودی اس وقت روس اور چین کے کندھے پر بیٹھ کر امریکا کی دوبارہ قربتوں کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں قدیم تہذیبیں محض ضرورت کے تحت اکٹھی ہو رہی ہیں یا واقعی دلوں کو قریب لانا چاہتی ہیں؟

1962ء کی جنگ اور گوان وادی جیسے سانحات آج بھی تعلقات پر سایہ ڈالے ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ماضی کے خونریز تنازعات اور سرحدی جھگڑوں کے بعد اب بیجنگ اور دہلی واقعی نئے سرے سے تعلقات قائم کرنے میں سنجیدہ ہیں؟ یا یہ محض وقتی ضرورت کی ڈور ہے جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتی ہے؟ بعض تجزیہ نگار اسے "ٹرننگ پوائنٹ" کہتے ہیں مگر ٹرننگ پوائنٹ اور دھوکہ دہی کی یوٹرن میں صرف ایک لمحے کا فاصلہ ہے۔ سوال یہ ہے کیا دونوں ممالک اب حقیقتاً تعلقات کو نئی بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں یا یہ محض وقتی ضرورت ہے؟

بعض حلقے مودی کے اس دورہ چین کو "ایک ممکنہ ٹرننگ پوائنٹ" قرار دیتے ہیں، مگر تاریخ کے صفحات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ٹرننگ پوائنٹ اور یوٹرن میں صرف ایک لکیر کا فاصلہ ہوتا ہے۔ کچھ مبصرین اسے "اہم موڑ" کہتے ہیں، مگر اس میں خطرہ یہ بھی ہے کہ یہ محض یوٹرن ثابت ہو کیونکہ دہلی کی پالیسی ہمیشہ "موقع پرستی" سے عبارت رہی ہے۔ پانی کے ذخائر پر تنازع، دلائی لاما کا قضیہ، اور سرحدی جھگڑے... یہ سب اس تعلق کے چہرے پر چھپے ہوئے زخم ہیں۔ کوئی بھی زخم بنا علاج کے نہیں بھرتا۔

دنیا کی نظریں ہمیشہ چین-امریکا تعلقات پر رہتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر بیجنگ اور دہلی ہاتھ ملا بھی لیں تو کیا ان کے زخم مندمل ہو جائیں گے؟ یا دشمنی کی چٹکاری خاکستر میں چھپی رہے گی؟ پاکستان کی فضا میں سوال یہ ہے: کیا دہلی اور بیجنگ کا یہ میل اسلام آباد کیلئے خطرے کا پیغام ہے؟ یا الٹا، یہ موقع ہے کہ بیجنگ دہلی کو قریب لا کر اسلام آباد اور نئی دہلی کے بیچ برف پگھلانے کی کوشش کرے؟ دنیا کی سیاست زیادہ تر واشنگٹن اور بیجنگ کے تعلقات کے گرد گھومتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس دائرے میں ماسکو اور بیجنگ دہلی کو کتنا قریب آنے دیں گے کیونکہ وہ مودی کے مکارانہ کردار سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں بالخصوص روس جو اس کا کئی دہائیوں سے ساتھ دے رہا تھا، اس کا ساتھ چھوڑ کر جس طرح مودی امریکا کے تلوے چائنا شروع ہو گیا تھا، اس کے بعد روس کیلئے بھی مودی پر یقین کرنا بڑا کٹھن ہے۔



پانی کے مسائل، دلائی لاما، اور دریاؤں پر منصوبے... یہ وہ فالٹ لائنز ہیں جن پر اعتماد کی عمارت قائم کرنا آسان نہیں۔ دلائی لاما کا مسئلہ دہلی اور بیجنگ میں ہمیشہ سے کانٹے کی مانند ہے۔ اسی طرح دریاؤں پر بڑے منصوبے مستقبل کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر سکتے ہیں۔ پانی کی سیاست آئندہ صدی کی سب سے بڑی جنگ

کا سبب بن سکتی ہے۔ دوسری طرف پاکستان کے وزیر اعظم کی تقریر ایک اعلانِ وفا تھی۔ انہوں نے کہا: "ہماری دوستی ہر امتحان میں کھرے سونے کی طرح ثابت ہوئی ہے۔" یہ الفاظ سفارت کے تھے، مگر اس کے پیچھے تاریخ کی گواہی ہے؛ جب چین تنہا تھا تو پاکستان اس کے ساتھ کھڑا تھا، اور جب پاکستان پر دباؤ آیا تو بیجنگ نے دوستی نبھائی۔

مبصرین کہتے ہیں کہ دہلی اور بیجنگ کے تعلقات وقتی ہیں۔ ان میں وہ گہرائی نہیں جو پاک-چین رشتے میں ہے۔ پاکستان اور چین کی دوستی کسی تجارتی معاہدے کا نتیجہ نہیں، یہ دلوں کی ہم آہنگی اور ضرورتوں کی یکسانیت کا نچوڑ ہے۔ اسی طرح پلوامہ کے بعد کی تلخی اب بھی دہلی اور اسلام آباد کے بیچ دیوار کی مانند کھڑی ہے۔ پلوامہ حملے اور بعد کی صورتحال نے دہلی-اسلام آباد تعلقات کو مزید مشکل بنا دیا۔ یہ کشیدگی دہلی-بیجنگ تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتی ہے، کیونکہ چین پاکستان کو ایک اسٹریٹجک شراکت دار سمجھتا ہے۔

خطے کا المیہ یہ ہے کہ بھارت کے بیشتر ہمسایوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ ہیں جبکہ چین کی دوستی پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا اور افغانستان تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے برعکس چین نے پورے خطے میں تجارت اور سرمایہ کاری کے ذریعے اپنے رشتے مضبوط کیے ہیں۔ دوسری طرف بھارت کبھی واشنگٹن کے در پر دستک دیتا ہے، کبھی ماسکو کا دامن تھام لیتا ہے، اور کبھی بیجنگ کے دربار میں جا بیٹھتا ہے۔ لیکن قرآن کا قانون یہ ہے:

"مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنَ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوتِ"

یعنی جنہوں نے اللہ کے سوا سہارا لیا، ان کا سہارا مکڑی کا جالا ہے، جو ذرا سی ہوا سے بکھر جاتا ہے۔

سوال یہ ہے: کیا دہلی اور بیجنگ کی قربت اسلام آباد کیلئے خطرے کی گھنٹی ہے؟ یا محض وقتی شور ہے جس کی بازگشت زیادہ دیر باقی نہیں رہتی؟ دہلی-بیجنگ قربت اسلام آباد کیلئے لازمی طور پر خطرہ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ بیجنگ دہلی پر اثر انداز ہو کر پاکستان کیلئے بھی "ورکنگ ریلیشن" کی راہ نکالے۔ پاکستان کیلئے اس میں سبق یہ ہے کہ اندیشوں کے بجائے امکانات پر نظر رکھی جائے۔ اگر چین دہلی کو اپنے قریب کرتا ہے تو یہ دہلی کو اسلام آباد سے دور کرنے کیلئے نہیں بلکہ خطے کو امن اور استحکام کے قریب لانے کیلئے بھی ہو سکتا ہے۔

سوشل میڈیا پر تو سوال یہ ہے کہ تیانجن میں کس سربراہ کا استقبال زیادہ شایان شان ہوا—مودی یا شہباز شریف؟ تیانجن میں کس سربراہ کو زیادہ عزت دی گئی؟ مگر اصل امتحان استقبال کے نعروں کا نہیں، پالیسیوں کے فیصلوں کا ہے۔ یہ بحث عوامی سطح پر نمایاں رہی۔ مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ عزت پروٹوکول سے نہیں، تعلقات کی گہرائی سے ماپی جاتی ہے۔ آخر کار اصل حقیقت یہی ہے کہ قوموں کی تقدیر نہ بیجنگ کے دربار میں لکھی جاتی ہے، نہ واشنگٹن کے ایوان میں۔ قرآن نے فیصلہ کن اصول دے دیے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔۔۔ اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود کو بدلنے کی خواہش نہیں رکھتے۔
یعنی تقدیر وہی بدلتی ہے جو اپنے عزم، اپنی غیرت اور اپنے ایمان سے اپنی حالت بدلنے کا حوصلہ رکھیں۔

پاکستان کے وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ پاک-چین دوستی الفاظ کا ہیر پھیر نہیں بلکہ اعتماد، محبت اور قربانی کی ایک زندہ داستان ہے، جو ہر آزمائش میں کامیاب اتری ہے۔ شہباز شریف نے اپنی تقریر میں پاک-چین دوستی کو "ہر آزمائش میں کامیاب" قرار دیا۔ یہ محض سفارتی جملہ نہیں بلکہ پچھلے کئی عشروں کی تاریخ کا نچوڑ ہے۔ ماہرین متفق ہیں کہ انڈیا کے چین کے قریب آنے سے پاکستان کے تعلقات متاثر نہیں ہوں گے، کیونکہ چین-پاکستان کا رشتہ محض "تجارتی" نہیں بلکہ "تقدیری" ہے۔ زیادہ تر ماہرین کا خیال ہے کہ دہلی-بیجنگ قربت اسلام آباد-بیجنگ تعلقات پر اثر انداز نہیں ہوگی۔ یہ رشتہ "اسٹریٹجک اور گہرا" ہے، کسی وقتی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوتا۔

مبصرین کا کہنا ہے کہ انڈیا اور چین اسٹریٹجک شراکت دار نہیں بن سکیں گے۔ ان کا ساتھ زیادہ دیر پا نہیں، ماضی کے تنازعات، سرحدی مسائل، اور بنیادی مسابقت اس تعلق کو ہمیشہ ناپائیدار رکھے گی کیونکہ گہرے زخم صرف مہندی کے رنگ سے نہیں چھپتے۔

مودی نے کئی برس ایس سی او اجلاسوں میں خود شرکت سے گریز کیا، مگر اب جب واشنگٹن کے ساتھ کشیدگی بڑھی ہے تو دہلی کو بیجنگ کا راستہ یاد آیا اور چین کے ساتھ ماسکو کی دلیز پر سجدہ ریز ہو گئے ہیں۔ یہ دہلی کی "متبادل تلاش" کی حکمت نہیں مکاری کا عمل ہے۔ مودی واشنگٹن کو پیغام دینا چاہتا ہے کہ یہ دہلی کے پاس متبادل آپشنز بھی ہیں لیکن ٹرمپ نے اس کا بروقت جواب دیکر اقوام عالم کی سیاست میں مودی کا بھیانک چہرہ دکھانے میں لمحہ بھر تاخیر نہیں کی۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا کے ساتھ تعلقات میں تناؤ کی بنیاد معاشی ہے۔ امریکی ملازمتوں کی منتقلی، روسی تیل، اور پاک-بھارت جنگ بندی میں واشنگٹن کو نظر انداز کرنا، یہ سب عوامل ٹرمپ حکومت کو ناراض کر گئے۔ یوں یہ سب زیادہ تر دکھاوے کے اقدامات ہیں؛ دہلی اور بیجنگ کے تعلقات کی جڑیں گہری نہیں۔ اب بھی اصل تجارتی تعلقات دہلی اور واشنگٹن کے بیچ زیادہ مضبوط ہیں۔ چین اور بھارت میں اسٹریٹجک نوعیت کے جو بنیادی اختلافات ہیں وہ "دیر پا" ہیں۔ یہ تعلق کبھی مکمل اعتماد پر مبنی نہیں ہو سکتا اور یہ تعلقات ہر وقت بارود کے ڈھیر پر کھڑے ہیں۔

بھارت خود کو عالمی طاقت دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس خواب کی سب سے بڑی رکاوٹ وہ چین ہی کو سمجھتا ہے۔ اس لیے وہ کبھی مغرب کی گود میں جا بیٹھتا ہے اور کبھی مشرق کی دہلیز پر دستک دیتا ہے۔ اس لیے دہلی کبھی بھی مکمل طور پر ماسکوا اور بیجنگ کے ساتھ صف آرا نہیں ہو گا۔ بھارت نے اپنے بیشتر پڑوسیوں کے ساتھ کشیدہ تعلقات قائم رکھے ہیں اور یہی کشیدہ تعلقات دہلی کی اس حکمت عملی کو مزید کمزور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس چین نے پورے خطے کو اپنی تجارتی زنجیر میں باندھ دیا ہے اور بالخصوص پاکستان کے سی پیک نے دنیا کی تجارتی منڈیوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا ہے اور چین کا مستقبل کی معاشی قوت کا خواب بھی سی پیک سے جڑا ہوا ہے اس لئے خطے میں جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کا نعم البدل ممکن نہیں اور یہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ وہ نعمت ہے جس پر پاکستانی مقتدرہ طاقتوں کو سوچ سمجھ کر اپنی پالیسیوں کو مرتب کرنا ہو گا اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہو گا۔

سات برس بعد مودی کا چین کا دورہ زیادہ تر "سیاسی مجبوری" کے تحت ہے۔ اس سے پہلے مودی صرف امریکی خوف سے چین جانے سے گریز کرتے رہے اور کوڈا کا ممبر بن کر چین کو بھی آنکھیں دکھا کر خود کو چین سے کہیں برتر عالمی قوت بننے کی خوش فہمی مبتلا رہے لیکن اب جب ٹرمپ نے بیج چوراہے میں لٹیا ڈبودی تو ماسکوا اور بیجنگ کا طواف خود پر لازم کر کے معافی کے خواستگار بن کر نئی چالوں سے محبت کے گیت ترنم سے گانے شروع کر دیئے لیکن ماسکوا اور بیجنگ کے تمام سیاسی اور دفاعی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ حالیہ ملاقات کے اثرات محض وقتی ہیں، اس کے گہرے اثرات کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔

یہ قربت اسلام آباد کیلئے امکانات بھی رکھتی ہے۔ چین خطے میں استحکام چاہتا ہے ممکن ہے کہ دہلی۔بیجنگ مکالمہ پاکستان اور بھارت میں ورکنگ ریلیشن کی بحالی کی راہ ہموار کرے۔ الٹا، انڈیا کی یہ نزدیکی پاکستان کیلئے مثبت پہلو بھی رکھتی ہے کیونکہ چین استحکام اور امن چاہتا ہے، اور ممکن ہے کہ وہ دہلی اور اسلام آباد کے بیچ "ورکنگ تعلقات" کی بحالی میں کردار ادا کرے۔

یوں کہیے کہ عالمی سیاست کی یہ بساط ایک پیچیدہ کھیل ہے جس میں ہر کھلاڑی اپنی چال بدلتا رہتا ہے۔ بھارت کبھی واشنگٹن کا سنگی بنتا ہے اور کبھی بیجنگ کی چوکھٹ پر سلامی دیتا ہے مگر پاکستان کیلئے اصل سبق یہ ہے کہ اپنی شطرنج اپنی قوت سے کھیلی جائے۔ یعنی تقدیر کے صفحے پر وہی لکھا جاتا ہے جسے قوم اپنے عمل اور عزم سے لکھوانا چاہے۔ یوں کہیے کہ سیاست کی یہ شطرنج ہر روز نئی چالیں چلتی ہے، لیکن آخری چال ہمیشہ تاریخ کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور تاریخ کا قانون یہی ہے کہ وہ قومیں کامیاب ہوتی ہیں جو اپنی بقا کا سامان اپنے اندر سے پیدا کرتی ہیں، نہ کہ دوسروں کے سائے میں۔ پاکستان کیلئے اصل پیغام یہی ہے: اندیشوں کی زنجیر توڑو، امکانات کے چراغ جلاؤ، اور اپنی تقدیر کا صفحہ خود لکھو۔

یہ تمام تفصیلات بتاتی ہیں کہ دہلی۔بیجنگ قربت وقتی اور مجبوری کے تحت ہے۔ پاکستان کو اندیشہ کے بجائے امکانات پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ اسلام آباد اور بیجنگ کا رشتہ محض سفارت کا نہیں بلکہ تقدیر کا ہے، جسے کوئی وقتی چال بدل نہیں سکتی۔

تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے کہ طاقت کا اصل سرچشمہ نہ واشنگٹن کی گلیوں میں ہے، نہ بیجنگ کے محلات میں۔ اصل قوت اس قوم میں ہے جو اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرے، اپنے وسائل پر بھروسہ کرے اور اپنے رب کے وعدوں پر یقین رکھے۔ چین اور بھارت کا یہ قریب آنا ایک تماشہ بھی ہو سکتا ہے اور ایک امتحان بھی لیکن پاکستان کیلئے اصل راستہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کے فیصلوں کا تماشائی نہ بنے بلکہ اپنی تقدیر کا معمار خود ہو۔ قرآن نے فیصلہ کن اصول دے دیا ہے: ﴿إِنْ يَنْصَرِكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ (آل عمران: 160) اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔ لہذا ہمیں اندیشوں سے زیادہ امکانات پر نظر رکھنی چاہیے۔ دہلی اور بیجنگ کی قربت وقتی ہے، مگر پاکستان اور چین کی دوستی ایک عہد و وفا ہے۔ سیاست کے اس بدلتے

منظر نامے میں یہی دوستی ہماری ڈھال بھی ہے اور ہماری قوت بھی۔ یوں سیاست کی یہ شطرنج آخر کار پاکستان کیلئے ایک پیغام چھوڑتی ہے۔
اندیشے زنجیر ہیں، امکانات چراغ ہیں؛ جو قوم چراغ جلانے گی وہی اندھیروں سے نکل کر روشنی کی منزل پائے گی۔

بروز اتوار 13 ربیع الآخر 5 / اکتوبر 2025ء

طلوعِ مشرق: عالمی طاقت کا نیا محور

اے اہل علم و دانش، اے تاریخ کے گواہ! آج ہم اس منظر نامے کے دہانے پر کھڑے ہیں جہاں عالمی طاقت کے ترازوئے محور کی طرف جھک رہے ہیں۔ مغرب کی برتری، جو صدیوں سے دنیا کے مقدر کی حکمرانی کرتی رہی، اب مشرق کے افق پر طلوع ہونے والے نئے سورج کے سامنے جھکنے لگی ہے۔ یہ طلوع صرف عسکری قوت کا مظاہرہ نہیں بلکہ تہذیبی بیداری، سیاسی حکمت اور تاریخی شعور کا پیغام ہے۔

پاکستان، روس، چین اور شمالی کوریا کے رہنماؤں کی ملاقاتیں، فرنٹ سٹیج پر یکجا ہونا، اور عالمی تعلقات کے نئے نقشے کی تشکیل، یہ سب محض اعداد و شمار اور پروٹوکول کی رسمیات نہیں بلکہ ایک نئے عہد کی پیش گوئی ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے ارشاد فرمایا:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (الانفال: 60) اور ان کے مقابلے کیلئے اپنی طاقت کی ہر استطاعت تیار رکھو۔

یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ عالمی تعلقات اور قوموں کی بقاء کیلئے قوت اور حکمت دونوں ضروری ہیں۔ آج ہم ایک ایسے لمحے کے گواہ ہیں، جہاں پاکستان اور مشرقی اتحاد کے نئے توازن نے دنیا کے نقشے کو بدلنے کا اعلان کیا ہے۔

تاریخ کے صفحات پر جب کبھی مشرق و مغرب کے درمیان تعلقات کی تحریر لکھی جاتی ہے، تعلقات کے خطوط کھینچے جاتے ہیں، وہ لمحہ بھی ایسا ہی ایک تحریر کی مانند ہوتا ہے۔ روس کے صدر ولادیمیر پوتن اور پاکستان کے وزیراعظم شہباز شریف کی حالیہ ملاقات نے واضح کیا کہ عالمی سیاست کا محور صرف طاقت کے محاذ پر نہیں بلکہ تعلقات، اتحاد اور مشترکہ مفادات کے گرد بھی گھوم رہا ہے۔ پوتن اور شہباز شریف کی حالیہ ملاقات نے یہ واضح کیا کہ عالمی سیاست کی چال اب صرف طاقت کے محاذ پر نہیں بلکہ تعلقات کے جال میں بھی حرکت پذیر ہے۔ یہ ملاقات ایسے وقت میں ہوئی جب مودی چین سے واپس آئے تھے، اور عالمی سیاسی محاذ پر متعدد متغیرات حرکت میں تھے۔ اس ملاقات کے بعد عالمی منظر نامہ ایک نئی سمت اختیار کرنا دکھائی دیا۔ اس ملاقات نے نہ صرف دو ممالک کے تعلقات کو مضبوط کیا بلکہ خطے میں طاقت کے نئے توازن کی سمت بھی واضح کی۔ اس ملاقات کے بعد عالمی منظر نامہ ایک نئی سمت اختیار کرنا دکھائی دیا، اور یہ واضح ہوا کہ پاک، روس اور چین اتحاد بھارت کیلئے سب سے بڑا چیلنج بن سکتا ہے۔

اس ملاقات میں یہ واضح ہوا کہ پاکستان اب روس کے ساتھ اپنے روایتی تعلقات کو نہ صرف برقرار رکھے گا بلکہ انہیں نئے مفاہمتی معاہدوں، تجارتی روابط اور دفاعی تعاون کے ذریعے مزید مستحکم کرے گا۔ یہ منظر نامہ اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ عالمی سیاست میں طاقت کا محور صرف عسکری قوت یا اقتصادی طاقت سے نہیں بلکہ اتحاد، تعلقات، اور عالمی اعتماد کے گرد بھی گھومتا ہے۔ ایسے لمحے، جن میں دو ممالک کے سربراہ اپنے موقف کو واضح کرتے ہیں، تاریخ کے صفحات پر ایسے نوٹس کے مترادف ہوتے ہیں جو مستقبل میں عالمی محاذ کا نقشہ بدلنے کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: 2)

اور نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ و زیادتی میں مدد نہ کرو۔

یہ آیت اس بات کی یاد دہانی کرتی ہے کہ حقیقی طاقت اور تعلقات نیکی، انصاف، اور استوار اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں، نہ کہ محض مفادات اور عسکری دباؤ پر۔ جہاں ہاتھ بڑھیں، وہاں اثر چھڑ جائے۔

پہلے ماضی کا وقت یاد آتا ہے، 1955ء کے زمانے میں، جب سوویت یونین اپنی جڑوں پر مستحکم تھا، نیکیتا خروشیف نے سرینگر میں بھارت کو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ ہر مشکل گھڑی میں بھارت کے شانہ بشانہ کھڑا رہے گا، یہاں تک کہ اگر پہاڑ کی چوٹی سے بھی پکارا جائے۔ مگر وقت کا پیہر رکنے والا نہیں۔ سوویت یونین اب وجود میں نہیں، اور عالمی توازن بدل چکا ہے۔ خروشیف کا بھارت کیلئے وعدہ ایک تاریخی یادگار بن کر رہ گیا ہے، لیکن اب نیا دور، نئے محاذ، اور نئے مفاہمت کے اصول نافذ ہیں۔ مگر اب وہ 1955ء نہیں، نہ ہی سوویت یونین کی وہ قوت موجود ہے۔ تاریخ کے جغرافیے اور عالمی سیاست کی چالاکیاں بدل گئی ہیں، تاریخ کے جغرافیے بدل چکے ہیں۔ اس جملے کی ماضی کی صدائیں آج کے روس اور بھارت کے تعلقات میں عکاس نہیں ہوتیں۔ پرانے پل نئے طوفانوں میں برقرار نہیں رہتے۔

یہ بیان ہمیں یاد دلاتا ہے کہ طاقت کی پالیسی، مفادات، اور اتحادی تعلقات ہمیشہ متغیر ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ ماضی کی کہانی ہے، اور موجودہ روس اپنی قومی اور عالمی پالیسی کو اپنی ترجیحات کے مطابق متعین کرتا ہے۔ وقت کی موج کبھی پہاڑوں کو نہیں دیکھتی، بس ساحل بدل دیتا ہے۔
يُغَيِّرُ اللَّهُ مَا يَفْقُومُ حَتَّى يُغَيِّرُوا أَمَانًا أَنْفُسَهُمْ (الرعد 11) اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں۔
یہ آیت اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ عالمی اور علاقائی سیاست کے رخ بدلنا محض خارجی قوتوں کی بجائے قوموں کی داخلی حکمت عملی اور فیصلوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد کشمیر کے مسئلے پر روس کی پالیسی میں واضح تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی کشمیر کے مسئلے پر روس کی پالیسی میں جو تبدیلی آئی، وہ ماضی کی خروشیف کی باتوں کی تقلید نہیں کرتی۔ ماضی میں روس انڈیا کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ تھا مگر آج وہ بھارت کے چانکیہ سیاسی مفادات کو بھی سمجھنے لگا ہے، کیونکہ بھارت کی چانکیہ سیاست اسے کبھی بھی اپنے مفاد کیلئے راہیں بدلنے کی صلاحیت دیتی ہے اور روس بھارت کی اس بے وفائی کا دکھ سہہ چکا ہے اور وہ مودی کا کسی بھی صورت ایسا عمل دہرانا گوارہ نہیں کرے گا۔

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد، روس کے موقف میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ ماضی میں روس پاکستان اور بھارت دونوں کے تعلقات میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن آج کی دنیا میں روس نے بھارت کے مفادات اور چانکیہ سیاست کو بہتر طور پر سمجھا ہے۔ بھارت اپنی چالاک اور عالمی کھیل میں حکمت عملی کے ذریعے اپنی پوزیشن مضبوط کرتا رہا، جس سے روس نے بھی اپنے رویے میں تطبیق پیدا کی۔ آج روس بھارت کو بہتر سمجھ رہا ہے، مفادات کی راہوں پر کبھی بھی نظریں پھیرنا مودی کی خاصیت ہے۔ دنیا کا کھیل کبھی بھی ایک ہی سطر پر نہیں چلتا، ہر طاقت اپنی پوزیشن بدلتی ہے۔

یہ چانکیہ سیاست کا حصہ ہے، جہاں ہر حرکت مکاری کے حساب سے کی جاتی ہے۔ یہ حقیقت عالمی سیاست کی پیچیدگی کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ طاقت کے محور کی تبدیلی صرف عسکری یا اقتصادی نہیں بلکہ سیاسی عقل، چالاک اور مفادات کی ترجیح کے زیر اثر ہوتی ہے۔ دھیرے دھیرے پہاڑ بھی اپنی چھاؤں بدل لیتے ہیں۔

پوتن اور شہباز شریف کی حالیہ ملاقات نے خطے میں تعلقات کی ایک نئی تہہ کھولی ہے۔ ملاقات میں پوتن نے واضح کیا کہ پاکستان اب بھی روس کا روایتی ساتھی ہے۔ پوتن نے پاکستان کو اپنا روایتی شریک قرار دیا، اور دونوں رہنماؤں نے دوطرفہ تعلقات، تجارتی روابط، اور خطے میں تعاون پر تبادلہ خیال کیا

۔ اس موقع پر شہباز شریف نے اعتراف کیا کہ پاکستان روس کے ساتھ مضبوط تعلقات استوار کرنا چاہتا ہے، اور یہ بات کہتے ہوئے پوتن اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔

دفتر خارجہ کے بیان کے مطابق، پوتن نے حالیہ سیلاب اور قدرتی آفات کے تناظر میں پاکستان کے عوام کیلئے دکھ کا اظہار کیا اور شہباز شریف کی قیادت کو سراہا۔ یہ اجلاس عالمی سیاست میں طاقت کے نئے توازن کا پیش خیمہ تھا کیونکہ پاکستان اور روس کے درمیان تعلقات مضبوط ہونے سے بھارت کیلئے ایک نیامحاذ کھل گیا ہے۔ جہاں دو کنارے ملیں، وہاں دریا کی روانی بدل جاتی ہے۔

پوتن نے شہباز شریف کو روس میں نومبر میں ہونے والے ایس سی او اجلاس میں شرکت کی دعوت بھی دی۔ اس پر شہباز شریف نے کہا پاکستان اور روس مشترکہ طور پر تعلقات کو مضبوط بنانے کی جانب بڑھ رہے ہیں تاکہ ہمارے عوام کے مفاد کے ساتھ ساتھ خطے میں امن اور خوشحالی کو بھی فروغ دیا جاسکے۔

"دوستی کی راہ میں پہاڑ بھی سرنگ بن جاتے ہیں اور مشکل وقت میں دوست کا ہاتھ سب سے قیمتی ہوتا ہے"۔ شہباز شریف نے پوتن سے کہا کہ پاکستان روس کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنا چاہتا ہے، جبکہ بھارت اور روس کے تعلقات کا احترام بھی کرتا ہے۔ پوتن نے اثبات میں سر ہلا کر اس عزم کی توثیق کی۔ "اثبات میں سر ہلانا، اعتماد کی بنیاد ہے"۔ یہ مکالمہ عالمی سیاست میں توازن اور مفاہمت کا ایک عملی مظہر تھا، جو خطے میں امن اور تعاون کے نئے امکانات کھولتا ہے۔

نئی عالمی ترتیب میں طاقت کا مرکز اب گلوبل ساؤتھ کی طرف منتقل ہو چکا ہے۔ اس منظر نامے میں بھارت کیلئے ضروری ہے کہ وہ پاکستان، چین، روس، ایران اور دیگر ممالک کے ساتھ تعاون کرے تاکہ خطے کی اجتماعی ترقی ممکن ہو۔ مئی 2025ء کی حالیہ پاک بھارت جنگ سے مودی ابھی تک سبق حاصل کرنے کی بجائے اپنی ہزیمت کا ادھار چکانے کیلئے بے تاب نظر آتا ہے کیونکہ پاکستان نے چند دنوں میں اس کے دماغ سے عالمی طاقت بننے کا خناس خاک میں ملا دیا ہے۔

ادھر دوسری طرف پیش رفت سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان نے یہ سمجھ لیا ہے اور عالمی تعلقات میں نئے کردار کیلئے تیار ہے۔ اسی لئے روس کے صدر نے پاکستان میں حالیہ سیلاب اور دیگر قدرتی آفات سے ہونے والے نقصانات پر دکھ کا اظہار کیا، اور وزیر اعظم شہباز شریف کی قیادت میں پاکستان کی بحالی کے عزم کی تعریف کی۔ یہ عالمی تعلقات میں انسانی ہمدردی اور سیاسی شعور کی ایک جھلک تھی، جو دکھ اور الم کے درمیان بھی حکمت عملی کی ضرورت کو اجاگر کرتی ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنَّا (الشوریٰ: 30)

جو بھی مصیبت تم پر آئے، وہ تمہارے اپنے اعمال کے سبب ہے، اور اللہ بہت کچھ معاف کرتا ہے۔

پوتن نے شہباز شریف کو نومبر میں روس میں ہونے والے ایس سی او اجلاس میں شرکت کی دعوت دی، جس سے تعلقات کو مضبوط بنانے کی نئی راہیں مزید کھل گئیں ہیں۔ یہ دعوت محض رسمی تعارف نہیں بلکہ خطے میں طاقت کے نئے توازن اور عالمی تعلقات کیلئے ایک اہم پیغام تھی۔ روس کی اس دعوت



سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان اب عالمی منطقے میں اپنی اہمیت کے ساتھ کھڑا ہے اور خطے میں مستحکم تعاون کیلئے ایک فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ ملاقات اس بات کی بھی غمازی کرتی ہے کہ عالمی طاقتیں صرف عسکری یا اقتصادی نہیں بلکہ سیاست، اتحاد اور باہمی اعتماد کی بنیاد پر اپنی پوزیشن مستحکم کرتی ہیں۔ دعوت ایک چراغ ہے، جو اندھیروں میں بھی رہنمائی کرتا ہے۔

پاکستان اور روس مشترکہ طور پر تعلقات کو مضبوط بنانے کی جانب بڑھ رہے ہیں تاکہ ہمارے عوام کے مفاد کے ساتھ ساتھ خطے میں امن اور خوشحالی کو بھی فروغ دیا جاسکے۔ سوشل میڈیا پر وڈیو میں دکھایا گیا کہ شہباز شریف، صدر شی، پوتن اور کم جونگ ان سابق چینی فوجیوں سے ملاقات کر رہے ہیں۔ یہ علامت ہے کہ پاکستان اب عالمی منظر نامے پر فرنٹ سٹیج پر کھڑا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پاکستان اب فرنٹ سٹیج پر کھڑا ہے، اور یہ عالمی منظر نامے میں اس کی موجودگی کی علامت ہے۔ تاریخ کے اس محاذ پر پاکستان وہ کشتی ہے جو طوفان میں بھی اپنی راہ بدلتی نہیں۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ بھارت کو فوری طور پر ایک تعلیم یافتہ اور عالمی حالات سے باخبر وزیر اعظم کی ضرورت ہے۔ موجودہ خارجہ پالیسی نے بھارت کو محدود اور خطے میں غیر مستحکم کر دیا ہے۔ دفاعی ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اب طاقت کا مرکز گلوبل ساؤتھ کی طرف منتقل ہو چکا ہے، اور تجزیہ کاروں کا اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ بھارت کو فوری طور پر ایک تعلیم یافتہ اور عالمی حالات سے باخبر وزیر اعظم کی ضرورت ہے تاکہ صحیح قیادت کے ذریعے نہ صرف داخلی مسائل حل کیے جائیں بلکہ خطے میں مؤثر کردار ادا کیا جاسکے۔ موجودہ خارجہ پالیسی نے بھارت کو غیر مستحکم اور محدود کر دیا ہے۔ بھارت کیلئے ضروری ہے کہ وہ چین، پاکستان، روس اور دیگر ممالک کے ساتھ تعاون کرے تاکہ خطے کی اجتماعی ترقی ممکن ہو۔

وزیر اعظم نے ملاقات کے بعد کہا کہ پاکستان اور روس مشترکہ طور پر تعلقات کو مضبوط بنانے کی جانب بڑھ رہے ہیں تاکہ عوام کے مفاد کے ساتھ ساتھ خطے میں امن و خوشحالی کو فروغ دیا جاسکے۔ یہ بیان عالمی سیاست میں نئے توازن کی ضرورت اور پر امن تعاون کے اصول کی نشاندہی کرتا ہے۔ طاقت کا استعمال ہمیشہ عسکری قوت یا دھونس کے ذریعے نہیں ہوتا، بلکہ مشترکہ مفادات، تعلقات کی مضبوطی اور اعتماد کی فضا قائم کرنے سے بھی ممکن ہے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: 103) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامو اور فرقہ بندی نہ کرو۔

یہ آیت اس بات کی یاد دہانی ہے کہ عالمی تعلقات میں اتحاد اور اشتراک سے ہی استحکام ممکن ہے۔

دفاعی ماہرین اور تجزیہ کاروں کے مطابق، عالمی طاقت کا نیا محور گلوبل ساؤتھ کی جانب منتقل ہو رہا ہے۔ یہ تبدیلی بھارت سمیت دیگر ممالک کیلئے چیلنج اور موقع دونوں ہے۔ نئی عالمی معیشت اور سیاسی توازن میں طاقت کی مرکزیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ملاقات میں شہباز شریف نے پوتن کو بتایا کہ گزشتہ سال دو طرفہ تجارت میں اضافہ روس سے تیل کی درآمد کی وجہ سے ہوا۔ زراعت، اسٹیل، ٹرانسپورٹ اور بیلاروس۔ پاکستان کوریڈور میں نئے معاہدے بھی طے پائے۔ یاد رہے کہ تجارت کے پل ہمیشہ دوستی کے پل کے ساتھ جڑتے ہیں اور سورج ہمیشہ اپنی جگہ پر نہیں رہتا، کبھی مغرب تو کبھی مشرق میں طلوع ہوتا ہے۔ یہ استعارہ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ طاقت کے دورانے مستقل نہیں، بلکہ وقت کے ساتھ محاذ بدلتے اور اتحاد قائم ہوتے ہیں۔

پاکستان اور روس کے تعلقات کی مضبوطی خطے میں توازن اور امن کیلئے ایک نئی روشنی ہیں۔ یہ ملاقات صرف دور ہنماؤں کا اجلاس نہیں بلکہ عالمی سیاست کے نئے باب کا اعلان ہے۔ تاریخ کے آئینے میں یہ منظر نامہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ طاقت کے توازن اور عالمی قیادت کی سمت اب مشرق کی جانب جھک رہی ہے۔

اس نئے منظر نامے میں بھارت کو سمجھنا ہو گا کہ گلوبل ساؤتھ کے ترقیاتی راستے میں پاکستان، چین، روس، ایران اور دیگر ممالک کے ساتھ تعاون لازمی ہے۔ عالمی سیاست میں ایک طرفہ حکمرانی ممکن نہیں رہی، اور تعاون کی فضا قائم کرنا ہی خطے کے امن اور خوشحالی کا ضامن ہے۔ یہاں یہ بات بھی بھارت کیلئے اہم ہے کہ غزہ اور اسرائیل کے خونی معرکے میں مودی کا اسرائیل میں ایک ملین کے قریب ہندوؤں کا غزہ کے بے گناہ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنا ایران اور مشرق وسطیٰ کے تمام ممالک کیلئے ایک ایسا نسخہ ہے جس پر وہ بھارت کے اس عظیم گناہ کو کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ جہاں ہاتھ ملیں، وہاں دریا کی روانی بھی بدل جاتی ہے اور تاریخ میں یہود و ہنود کا یہ اتحاد ان کی آنے والی نسلوں کیلئے ہمیشہ شرمندگی کا باعث بنے گا۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ پاکستان نے اپنے رویہ سے ثابت بھی کر دیا ہے کہ وہ اب بھی خطے میں غربت کے خاتمے کیلئے بھارت کے ساتھ پر امن تعلقات کیلئے تیار ہے لیکن بھارتی چانکیہ سیاست میں مکاری سے متحارب فریق کو دھوکہ دینا عین جائز سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ سے مودی اب بری طرح اقوام عالم میں ننگا ہو چکا ہے جبکہ "ایکس" پر شہباز شریف کی وہ ویڈیو پوسٹ، جس میں وہ صدر رشی، پوتن، کم جونگ ان اور سابق چینی فوجیوں سے ہاتھ ملارہے ہیں، اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ منظر عالمی سیاست میں پاکستان کی فعال شمولیت اور خطے میں اعتماد سازی کا مظہر ہے۔

شہباز شریف فرنٹ سٹیج پر ان اہم رہنماؤں کے ساتھ کھڑے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان عالمی سیاست میں اپنی اہمیت کو بڑھا رہا ہے اور بھارت کے مقابلے میں اپنا موقف مضبوط کر رہا ہے۔ شہباز شریف نے ویڈیو پوسٹ میں لکھا کہ پاکستان پوتن، شی اور کم کے ساتھ فرنٹ سٹیج پر کھڑے ہو کر دنیا کو دکھایا کہ پاکستان خطے میں عالمی طاقتوں کے ساتھ برابر کا کھلاڑی ہے۔ یہ منظر مودی کی تباہ کن خارجہ پالیسی کے اثرات اور خطے میں نئے توازن کی عکاسی کرتا ہے۔ یاد رہے کہ فرنٹ سٹیج پر کھڑے ہونا، کسی کھیل میں مرکزی کھلاڑی بننے کے مترادف ہے۔ قیادت کا چراغ بغیر علم کے اندھیروں میں محو ہو جاتا ہے۔

وزیراعظم شہباز شریف ان خصوصی مہمانوں میں شامل تھے جنہیں وکٹری ڈے کی تقریب میں مدعو کیا گیا، جبکہ مودی کو اس تقریب میں مدعو نہیں کیا گیا جبکہ شہباز شریف، پوتن اور کم جیسے رہنماؤں کے ساتھ شریک ہوئے۔ یہ منظر عالمی سیاست میں بھارت کے محدود کردار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ واضح پیغام تھا کہ پاکستان عالمی تعلقات میں مؤثر شراکت دار کے طور پر کھڑا ہے۔

پاکستان نہ صرف روس اور چین کے ساتھ تعلقات قائم کر رہا ہے بلکہ امریکا کے قریب بھی ہے مگر عالمی اسٹیج پر روس اور چین کے ساتھ موجودگی نے اس کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ یہ حقیقت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ عالمی طاقتوں کے درمیان پاکستان کی اہمیت اور کردار قابلِ قدر ہو چکا ہے۔ دانشمندی سے بُنا ہوا رشتہ، عالمی سیاست کا سب سے زیادہ عمدہ اور مضبوط ہتھیار ہوتا ہے لیکن اس کی دیکھ بھال کیلئے ہمہ وقت چوکس اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوتی ہے وگرنہ لمحوں کی خطا، صدیوں کی سزا بن کر کارکردگی کو تنکوں کی طرح بہا لجاتی ہے۔ بھارت اور امریکا کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح

مودی سیدہ پھلا کر اور اکڑی گردن سے ٹرمپ کو "مائی فرینڈ" کہہ کر مخاطب ہوتا تھا کہ گویا مودی اور ٹرمپ ایک ہی گود میں پلے بڑھے ہیں لیکن مودی خود اپنی ہی تاریخ بھول گیا کہ کس طرح پانڈوں کی مفاداتی طویل جنگیں لاکھوں لوگوں کی زندگیاں نگل گئیں۔

تھنک ٹینک بروکنگز انسٹیٹیوشن کی سینئر فیلو تنوی مدن نے "ایکس" پر شہباز شریف اور پوتن کے درمیان مکالمے کا ویڈیو کلپ شیئر کیا اور لکھا "میسز اپنی جگہ، مگر حقیقت کی دنیا الگ ہے۔" یہ بیان عالمی سیاست میں تصاویر اور میمز کے پیچھے موجود حقیقت کو اجاگر کرتا ہے۔

پوتن بیک وقت کئی محاذوں پر متوازن کردار ادا کر رہے ہیں اور شہباز شریف سے ملاقات میں کہتے ہیں کہ وہ روس اور پاکستان کے تعلقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انہیں مزید مضبوط و متحرک بنانے کی بات کرتے ہیں۔ یہ حکمت عملی عالمی توازن اور خطے میں اعتماد سازی کا مظہر ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ پہلا گم کے بعد ٹرمپ کی وجہ سے روس کا موقف اکثر لوگوں کی نظر سے اوجھل رہ گیا تھا۔ روس نے پہلا گم کے حملے کے بعد بھارت کو مایوس کیا لیکن عالمی میڈیا اور عوام کی توجہ کم رہی۔ یہ عالمی سیاست میں نظر انداز کیے گئے لمحوں کی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس واقعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی سیاست میں حقائق ہمیشہ فوری منظر عام پر نہیں آتے، بلکہ پوشیدہ حکمت عملی حرکت کرتی ہے۔

تھنک ٹینک او آر ایف کے بھارت-روس تعلقات کے ماہر الیکسی زخاروف نے لکھا کہ مودی کے چین سے واپس جانے کے بعد، پوتن اور شہباز شریف نے دو طرفہ ایجنڈے پر تبادلہ خیال کیا جس کے پاک روس کے مستقبل کے تعلقات پر انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ یہ ملاقات تجارت، تعاون اور خطے میں استحکام کی علامت تھی جو آئندہ چل کر ایک مضبوط شراکت داری میں بھی تبدیل ہونے کا امکان ہے۔ یہ بات درست ہے کہ سیاست میں کوئی مستقل دوست اور دشمن نہیں ہوتے۔

پوتن نے پاکستان کو روایتی پارٹنر قرار دیا، تجارتی تعلقات بڑھانے اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں تعاون بڑھانے کا عزم ظاہر کیا، اور وزیراعظم کو ماسکو کے دورے کی دعوت بھی دی۔ شہباز شریف نے پوتن کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی اور جنوبی ایشیا میں متوازن کردار ادا کرنے کا موقع فراہم کیا، ساتھ ہی کہا، ہم آپ کے انڈیا کے ساتھ تعلقات کا احترام کرتے ہیں، یہ بالکل درست ہے، لیکن ہم بھی روس کے ساتھ بہت مضبوط تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔ طاقت کے میدان میں ہر باتھ کا وزن اہم ہوتا ہے، اور تعلقات کا پل سب سے مضبوط پل ہے۔ یہ بیان عالمی سیاست میں مفاہمت، احترام اور توازن کے اصول کی عکاسی کرتا ہے۔

اب آخری اور اہم بات یہ ہے کہ ابھی مودی کے چین کے دورے کی سیاہی بھی خشک نہ ہو پائی تھی کہ انڈین جنرل چوہان نے اس دورے کی ساری قلعی کھول دی ہے۔ مودی کی ایس سی او اجلاس میں شرکت محض ایک سفارتی عمل نہ تھا، بلکہ خطے کی بدلتی ہوئی بساط پر ایک شطرنجی چال بھی تھی۔ اس کے فوراً بعد انڈیا کے چیف آف ڈیفنس نے چین اور پاکستان کو "چیلنج" قرار دے کر دراصل یہ اقرار کیا کہ شنگھائی تعاون کی میز پر مسکراہٹیں کچھ اور تھیں اور سرحدوں پر خنجر کی چمک کچھ اور۔ یہ اعلان دراصل اندرونی اضطراب کا غماز ہے۔ جنرل انیل چوہان کا یہ کہنا کہ چین کے ساتھ سرحدی تنازع سب سے بڑا چیلنج ہے، اس حقیقت کی شہادت ہے کہ ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں پر لگی سرحدی لکیریں آج بھی ان کے دلوں میں آگ بھڑکاتی ہیں۔ گویا مستقبل کا منظر نامہ بھی اسی برفانی بارود کے گرد گھومے گا۔

پاکستان کے ساتھ پر کسی وار کو دوسرا بڑا چیلنج قرار دینا انڈین عسکری ذہن کی پرانی سوچ کا تسلسل ہے۔ پاکستان کو "ہزار زخموں" کی حکمت عملی کا طعنہ دینا، دراصل اپنے اندرونی زخموں کی پردہ پوشی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو قوم دوسروں کو زخموں کا طعنہ دیتی ہے، اس کے اپنے ناسور کبھی نہیں بھرتے۔

جنرل چوہان کا تبصرہ ایسے وقت میں سامنے آیا جب چین کے شہر تیانجن میں ہونے والی ایس سی او کانفرنس میں انڈیا اور چین کے تعلقات میں گرمجوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ مگر سفارت کی مسکراہٹ اور میدان جنگ کی تلخی دوا لگ حقیقتیں ہیں۔ اس اجلاس میں پاکستان کی نمائندگی وزیراعظم شہباز شریف نے کی اور عالمی مبصرین کے مطابق پاکستان نے سفارتی شطرنج میں ایسی چال چلی کہ بھارت کے مہروں کو بے بس کر دیا ہے۔

ڈپٹی آرمی چیف راجل سنگھ نے بھی اسی ساز کا ایک اور سرچھیڑا اور چین۔ پاکستان اتحاد کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کے بقول چین نے انڈیا۔ پاکستان تنازع کو ایک "لایو لیب" کے طور پر برتا، جہاں وہ یہ دیکھتا رہا کہ اس کے دیے گئے ہتھیار کس طرح کام کرتے ہیں۔ یہ بیان دراصل بھارتی عسکری قیادت کے اندیشوں اور ناکامی کی دستاویز ہے۔ آپریشن سندور کے بعد جنرل انیل چوہان نے شنگریلا ڈائیلاگ میں کہا کہ پاکستان نے ممکنہ طور پر چین کے کمرشل سیٹلائٹ کی مدد لی۔ یہ الزام دراصل اپنی ناکامی کا ملبہ دوسروں پر ڈالنے کا ایک اوجھا حربہ ہے۔ شواہد نہ ہونے کے باوجود یہ تاثر دیا گیا کہ ٹیکنالوجی کی مدد سے بھارت کو شکست ہوئی۔

بلومبرگ ٹی وی کو دیے گئے انٹرویو میں جنرل چوہان نے کہا: اہم یہ نہیں کہ طیارے مار گرائے گئے بلکہ اہم یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ گویا سوال کی دھند میں حقیقت چھپانے کی کوشش کی گئی۔ انہوں نے مار گرائے گئے طیاروں کی تعداد بتانے سے گریز کیا۔ یہ خاموشی خود ایک اعلان ہے، ایک ایسا اعتراف جو زبان سے ادا نہیں ہوا مگر خاموشی کی زبان میں سب کچھ کہہ گیا۔ تاریخ میں بعض اوقات نہ کہنا ہی سب سے بڑا اعتراف ہوتا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں کہا گیا جب چین بھارت کے تجارتی رویے پر اپنے تحفظات کا اظہار کر رہا ہے۔ پچاس فیصد ٹیرف کی مخالفت دراصل اس امر کی گواہی ہے کہ میدان جنگ کے ساتھ ساتھ بازار کی معیشت بھی دونوں ملکوں کے درمیان ایک نئی سرد جنگ کا محاذ ہے۔

اور اب، اے اہل نظر! وہ لمحہ آگیا ہے جب تاریخ نے اپنی کتاب کے صفحات پلٹے اور مستقبل کا باب مشرق کے ہاتھ میں لکھنے کی صدا بلند ہوئی ہے۔ طاقت کے نئے محور کی علامت، پاکستان اور مشرقی اتحاد کی یکجہتی، اور عالمی تعلقات میں توازن کی نوید، یہ سب ہمیں یہ باور کراتے ہیں کہ دنیا کی قیادت اب یکطرفہ نہیں رہی۔ ماضی کے زوال، جیسے رومی سلطنت کی شام، اندلس کی غروب آفتاب، اور برطانیہ کی سلطنت کا ڈھلنا، آج کی روشنی میں ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ہر قوم، ہر عہد اور ہر طاقت کا سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ آج کا مشرق ایک نئے عزم، مستقل مزاجی اور حکمت کی روشنی کے ساتھ طلوع ہوا ہے، اور یہ سورج نہ صرف مشرق کے رہنما بلکہ دنیا کیلئے نئے توازن کی علامت ہے۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (العمران: 139) اور نہ کمزور پڑو اور نہ غمگین ہو، تم غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو۔

یہ پیغام آج کے عالمی منظر نامے کیلئے بھی اتنا ہی موزوں ہے مشرق نے اپنی قوت، حکمت اور اتحاد کے ذریعے عالمی قیادت کے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ آج ہم ایک ایسے عہد کے گواہ ہیں جہاں تاریخ نے کروٹ لی، اور مستقبل کا فیصلہ اب مشرق کے ہاتھ میں ہے۔

پاکستان: امید اور نظریے کا چراغ

تاریخ نگار یا کبھی رکتا نہیں، اس کا بہاؤ صدیوں کی داستانوں اور قوموں کے عروج و زوال کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔ اس کے بہاؤ میں صدیوں کی کہانیاں اور قوموں کی تقدیریں ایک دوسرے کے ساتھ بہتی چلی آتی ہیں۔ کبھی ایک قوم عروج کی منزل پر فائز دکھائی دیتی ہے تو کبھی دوسری قوم زوال کی پاتال میں جا گرتی ہے۔ کبھی ایک قوم فلک بوس عمارتوں اور علم و فن کی روشنی سے دنیا کو منور کرتی ہے اور کبھی وہی قوم اندھیروں کی قید میں جا گرتی ہے لیکن ایک حقیقت ہمیشہ اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ طاقتور ہمیشہ اپنی طاقت کے نشے میں ہے۔ کمزور پر غالب آتا ہے اور اپنے ظلم کے جواز میں نت نئی تاویلات، کبھی تہذیب کی ترویج کے بہانے تراشتا ہے، کبھی جمہوریت کے پھیلاؤ کے نام پر اور کبھی دہشتگردی کے خاتمے کی اوٹ میں۔

دنیا کی تاریخ ایک عظیم کتاب ہے جس کے اوراق خون اور آنسوؤں سے لکھے گئے ہیں۔ ہر صفحہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچتا ہے تو مظلوم کے دل سے نکلی دعا کائنات کے توازن کو بدل دیتی ہے۔ ماضی کی تہذیبیں، سلطنتیں اور طاقتور حکمران آج مٹی کا رزق بن چکے ہیں، مگر ان کے مظالم کی داستانیں آج بھی اہل بصیرت کیلئے عبرت کا سامان ہیں۔ اس جہان رنگ و بو میں طاقتور ہمیشہ کمزور پر غالب آنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور اپنی جارحیت کو کسی نہ کسی نام سے مزین کرتا آیا ہے۔ کبھی تہذیب کا پرچم، کبھی جمہوریت کا نعرہ اور کبھی دہشتگردی کے خلاف جنگ کا بہانہ۔ آج بھی وہی کھیل جاری کا حالیہ بیان اسی پرانی داستان کا نیا باب ہے ایک ایسا باب جو خون کی سیاہی سے لکھا گیا ہے اور جس کے پس منظر میں پوری مسلم دنیا کو دھمکی ہے۔ نیتن یاہو کا پیغام دیا گیا ہے۔

جیسا کہ اقبال نے کہا تھا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

:اور حال کی صدائے دل بھی یاد آتی ہے

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے

مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

مگر ایک بات ہر دور میں مسلم رہی ہے کہ طاقتور اپنی طاقت کے نشے میں کمزور کو روندتا رہا ہے، اور اپنے ظلم کی تاویل میں نعرے تراشتا رہا ہے۔ کبھی تہذیب کا علم، کبھی جمہوریت کی مشعل، اور کبھی دہشتگردی کے خاتمے کا بہانہ۔ آج کے حالات بھی اس تاریخی تکرار سے الگ نہیں۔

گزشتہ چند دنوں سے نیتن یاہو کا ایک ویڈیو پیغام دنیا بھر میں موضوع بحث ہے۔ اس پیغام میں نائن الیون کے سانحے کا حوالہ دیکر قطر پر اسرائیلی حملے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ یہ بیان محض ایک سیاسی جملہ نہیں بلکہ عالمی سیاست کی نئی بساط پر رکھے گئے مہرے کی جھلک ہے۔ نیتن یاہو نے اپنے دو منٹ کے بیان میں کہا کہ اسرائیل نے وہی کیا جو امریکا نے نائن الیون کے بعد کیا تھا۔ امریکا نے افغانستان پر حملہ کر کے القاعدہ کے مراکز تباہ کیے اور پھر پاکستان میں گھس کر اسامہ بن لادن کو مار ڈالا۔ یہ الفاظ بظاہر ایک موازنہ ہیں مگر دراصل آئندہ کے خطرات کی نشاندہی اور پیش گوئی ہیں۔ قطر کو نشانہ بنا کر پاکستان کا حوالہ دینا گویا کل کی سازشوں کا دروازہ کھول دینا ہے۔ گویا قطر آج کا ہدف ہے اور پاکستان کل کا۔

یہ کوئی نئی روش نہیں، یہی تو طاقتور قوموں کی پرانی حکمتِ عملی ہے۔ تاریخ کے آئینے میں دیکھیں تو ہر طاقتور نے ظلم کیلئے کسی نہ کسی بہانے کو ڈھال بنایا ہے۔ وہ اپنے ظلم کیلئے کسی واقعے کو جو از بناتی ہیں، پھر اس جواز کو اتنا دہراتی ہیں کہ کمزور قومیں خود کو مجرم سمجھنے لگتی ہیں۔ صلیبی جنگوں میں مذہب کو بہانہ بنایا گیا، نوآبادیاتی دور میں تہذیب کے فروغ کا دعویٰ اور پرچار کیا گیا، اور اب دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر عالم اسلام کو نشانہ ہی نہیں بنایا جا رہا بلکہ کچلا جا رہا ہے۔

قطر نے بروقت فوری رد عمل دیا کہ حماس کے دفتر کی میزبانی اس کی اپنی مرضی سے نہیں بلکہ امریکی و اسرائیلی درخواست پر ثالثی کے تناظر میں تھی۔ گویا وہی طاقتیں جو کل قطر کے دروازے پر ثالثی کی بھیج مانگ رہی تھیں، آج اسی کو غداری اور دہشتگردی کا مرکز کہہ رہی ہیں۔ یہ وہی وعدہ شکنی اور سفارتی وعدہ شکنی ہے جو سفارتکاری کی بنیادوں کو کھوکھلا اور تعلقات کی بنیادیں متزلزل کر دیتی ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے کہ جب قطر میں امریکا کا سب سے بڑا فضائی اڈہ "العدید" موجود ہے، تو کیا یہ حملہ ٹرمپ یا امریکی انتظامیہ کی لاعلمی میں ہو سکتا تھا؟ تاریخ گواہ ہے کہ بڑی طاقتوں کے اشارے کے بغیر چھوٹی طاقتوں کی جرات نہیں کہ وہ ایسا قدم اٹھا سکیں۔ بڑی طاقتوں کی خاموشی اکثر ان کی رضامندی کا دوسرا نام ہوتی ہے۔ یہ خاموشی دراصل ایک پوشیدہ اقرارِ جرم ہے۔

نیتین یاہو کا جملہ کہ دہشتگردوں کو ہمارے حوالے کر دیا ہم کارروائی کریں گے محض قطر کیلئے نہیں بلکہ پورے خطے کیلئے ایک دھمکی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کل یہی زبان پاکستان کے خلاف استعمال ہو؟ کیا یہ بعید ہے کہ امریکا، بھارت اور اسرائیل کا اتحاد پاکستان کو اسی طرح نشانے پر لے جیسے عراق، شام اور لیبیا کو بنایا گیا؟

یہاں ایک تاریخی حقیقت بھی ہے کہ پاکستان قطر نہیں اور اسرائیل امریکا نہیں۔ پاکستان ایٹمی طاقت ہے، ایک نظریاتی ریاست ہے، اور ایک ایسی قوم ہے جو اپنی جڑوں میں دینی حمیت اور تہذیبی غیرت رکھتی ہے۔ اور ایک ایسی سرزمین ہے جو اپنے وجود میں ہی ایک انقلاب کی صدا رکھتی ہے۔ لیکن کیا دشمن ان حقائق کو نظر انداز نہیں کر سکتا؟ کیا وہ سازشوں کے جال میں پاکستان کو گھیرنے کی کوشش نہیں کرے گا؟ یہ حقیقت اس بات کی ضامن نہیں کہ دشمن خاموش بیٹھے گا۔ خاص طور پر ایسے وقت میں جب مودی اپنی شکست کے بعد بدلے کی آگ میں جل رہا ہے۔ مئی 2025 کی جنگ میں یہود و ہندو کی ہزیمت گویا ان کے دل پر داغ کی مانند ثبت ہو گئی ہے۔ پاکستان کے ہاتھوں عبرتِ شکست نے بھارت کے غرور کو توڑ ڈالا ہے۔ مودی بار بار دھمکی دے رہا ہے کہ وہ بدلہ ضرور لے گا اب اگر وہ اسرائیل اور امریکا کے کندھے استعمال کرے تو کیا یہ خطے کو ایک نئی آگ میں جھونکنے کے مترادف نہ ہو گا؟

یہی بات اقبال نے یوں کہی:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر

تاریخ صرف واقعات کی فہرست نہیں بلکہ ایک آئینہ ہے، جس میں اقوام اپنی غلطیاں اور کامیابیاں دیکھ کر اپنے مستقبل کا تعین کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ کی تاریخ بھی اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ جب ہم نے اتحاد اور ایمان کو اپنی بنیاد بنایا، دنیا کی کوئی طاقت ہمارے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ لیکن جب ہم تفرقے میں مبتلا ہوئے، دشمن نے ہمیں شکست دی اور غلامی کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔

خلافتِ عثمانیہ چھ صدیوں تک مسلمانوں کی عظمت اور طاقت کی علامت رہی۔ تین براعظموں پر پھیلی اس خلافت نے نہ صرف مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کیا بلکہ یورپ کی طاقتوں کو بھی کئی صدیوں تک اپنی پالیسیوں پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کیا لیکن جب اندرونی اختلافات، مغربی سازشیں اور قوم پرستی کے فتنے سراٹھانے لگے تو یہ خلافت کمزور ہوتی گئی۔ بالآخر پہلی جنگِ عظیم کے بعد خلافت کا زوال ہوا اور مسلم دنیا ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ اس زوال نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ اگر امت اپنی وحدت کھو دے تو اس کی عظمت بھی خاک میں مل جاتی ہے۔

صلیبی جنگوں کا زمانہ بھی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ جب صلیبی طاقتیں بیت المقدس پر قابض ہوئیں تو امت پر اندھیرا چھا گیا۔ مگر صلاح الدین ایوبی نے اپنے ایمان، اخلاص اور عسکری حکمتِ عملی کے ذریعے وہ کارنامہ انجام دیا جسے دنیا آج بھی یاد کرتی ہے۔ اس نے صرف بیت المقدس کو آزاد نہیں کرایا بلکہ امت کو یہ پیغام دیا کہ ایمان کی حرارت اور عزمِ صمیم سے ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ آج کے دور میں امت کو پھر اسی جذبے اور یکجہتی کی ضرورت ہے جو صلاح الدین کی قیادت میں ظاہر ہوئی تھی۔

برصغیر کی تاریخ میں جنگِ آزادی 1857 ایک عظیم موڑ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان اور ہندو دونوں نے مل کر انگریز سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اگرچہ یہ جنگ کامیاب نہ ہو سکی اور لاکھوں لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا، مگر اس نے آزادی کی بنیاد رکھ دی۔ یہ جنگ ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ قربانی اور عزم کے بغیر آزادی کی نعمت حاصل نہیں ہوتی۔ پاکستان کا قیام اسی جنگِ آزادی کی ایک طویل جدوجہد کا ثمر ہے۔



1258ء میں جب منگولوں نے بغداد پر حملہ کیا تو خلافتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اور اسلامی دنیا کا علمی و تہذیبی مرکز خاک میں مل گیا۔ مگر اسی بربادی کے بعد مسلمان دوبارہ اٹھے اور نئی سلطنتیں قائم کیں۔ یہ واقعہ اس بات کا غماز ہے کہ زوال کے بعد بھی اگر امت ایمان اور علم کو اپنا ہتھیار بنائے تو دوبارہ عروج حاصل کر سکتی ہے۔

1919ء میں جب خلافتِ عثمانیہ کے زوال کا خطرہ پیدا ہوا تو برصغیر کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کے ذریعے اپنی وابستگی اور غیرت کا اظہار کیا۔ اگرچہ یہ تحریک سیاسی طور پر کامیاب نہ ہو سکی مگر اس نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور بالآخر تحریکِ پاکستان کی راہ ہموار کی۔ یہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ امت کا درد اور مشترکہ مقصد افراد کو نئی جدوجہد پر آمادہ کر دیتا ہے۔

یہ تمام مثالیں ہمیں ایک ہی نکتہ سمجھاتی ہیں: اتحاد، قیادت اور قربانی کے بغیر امت کی بقا ممکن نہیں۔ چاہے وہ خلافتِ عثمانیہ کا زوال ہو، صلاح الدین کی فتوحات ہوں، یا جنگِ آزادی 1857، ہر واقعہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ جب مسلمان اپنے ایمان اور نظریے پر قائم رہتے ہیں تو دنیا ان کے قدموں میں ہوتی ہے۔ مگر جب وہ تفرقے اور خود غرضی کا شکار ہو جاتے ہیں تو ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ آج پاکستان اور مسلم دنیا کو انہی مثالوں سے سبق لینا ہو گا۔ اگر ہم نے ماضی سے کچھ نہ سیکھا تو مستقبل کی تاریخ بھی ہمیں محض عبرت کے طور پر یاد کرے گی۔ یاد رہے کہ امریکا-بھارت-اسرائیل یہ سہ فریقی اتحاد اور گٹھ جوڑ محض وقتی نہیں بلکہ ایک دیرینہ منصوبہ ہے۔ امریکا کے نزدیک چین کا بڑھتا ہوا اثر سب سے بڑا خطرہ ہے۔ بھارت اپنی شکست کے داغ کو دھونا چاہتا ہے اور اسرائیل اپنی جارحانہ پالیسی کو پورے مشرق وسطیٰ میں نافذ کرنا چاہتا ہے۔ یہ سہ فریقی اتحاد محض وقتی نہیں بلکہ ایک گہری حکمت

عملی کا حصہ ہے۔ امریکا کی آنکھوں میں چین کا بڑھتا ہوا اثر، بھارت کی شکست اور اسرائیل کی علاقائی عزائم، یہ سب ایک ہی نقطے پر ملتے ہیں، پاکستان اور چین کی دوستی کو توڑنا اور مسلم دنیا کو تقسیم در تقسیم کرتے رہنا۔

یہی وہ پرانی تکنیک ہے جسے ٹرمپ اور اس جیسے رہنما استعمال کرتے ہیں۔ یہ اتحاد ایک ایسا جال ہے جو دہشتگردی کے نام پر پھیلا دیا گیا ہے لیکن اس کا مقصد مسلم دنیا کو منتشر کرنا اور ہر ابھرتی ہوئی قوت کو دبانا ہے۔ ٹرمپ کی پرانی تکنیک بھی یہی ہے، پہلے کسی ملک کو مذاکرات کی میز پر بٹھاؤ، پھر توجہ ہٹاؤ، اور آخر کار کسی اتحادی کے ذریعے اس پر وار کرو۔ افغانستان، عراق، شام اور لیبیا اس کے زندہ نمونے ہیں۔ آج قطر کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، کل پاکستان یا کوئی اور ملک بھی اس فریب کا شکار ہو سکتا ہے۔ پاکستان کے سامنے آج دو راستے ہیں، یا تو وہ مصلحتوں کے پردے میں چھپ کر وقت گزارے، یا اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک فعال حکمت عملی اپنائے۔ تاریخ یہ سکھاتی ہے کہ قومیں خواب دیکھنے سے نہیں بلکہ حقیقت پر عمل کرنے سے زندہ رہتی ہیں۔ یہاں سوال یہ ہے کہ پاکستان کیا کرے؟ کیا وہ محض بیانات پر اکتفا کرے یا عملی اقدامات اٹھائے؟ تاریخ یہ سکھاتی ہے کہ کمزور وہی قومیں ہوتی ہیں جو خوابوں میں مگن رہتی ہیں اور حقیقت کی زمین پر قدم نہیں رکھتیں۔

☆ پاکستان کیلئے سب سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی اندرونی صفوں کو درست کرے۔

☆ دوسرا اہم کام چین کے ساتھ سیاسی، اقتصادی اور عسکری تعلقات کو نئی جہت دینا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ سی پیک کو دوبارہ فعال کرنا، اس میں نئی سرمایہ کاری لانا وقت کی اہم ترین ضرورت اور اسے وسعت دینا ناگزیر ہے۔ سی پیک کو دوبارہ فعال بنانا اور اس میں نئی سرمایہ کاری لانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خطے میں نئے اتحاد بنانے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے نئے اتحاد تشکیل دینے ہوں گے جن میں برادر اسلامی ممالک اور ابھرتی ہوئی عالمی طاقتیں شامل ہوں۔

☆ سارک کو دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے، چاہے بھارت شریک ہو یا نہ ہو۔ اگر چین کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ اتحاد مزید مضبوط ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کو برکس میں شمولیت کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ عالمی معیشت اور عالمی سیاست میں ایک نئی جگہ بنا سکے۔

اگر ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر جگہ یہ سبق ملتا ہے کہ جب مسلمان ایک تھے تو دنیا پر ان کا سکھ چلتا تھا۔ اندلس میں علم و تہذیب کی روشنی پھیلتی تھی، بغداد علم و فن کا مرکز تھا، قسطنطنیہ سیاست کا محور تھا لیکن جب مسلمان ٹکڑوں میں بٹ گئے تو ہر طاغوت ان پر غالب آ گیا۔ آج بھی وقت ہے کہ ہم اپنی صفوں کو درست کریں۔ اگر ہم نے یہ موقع کھو دیا تو ہماری داستان بھی محض کتابوں میں باقی رہ جائے گی لیکن اگر ہم نے اپنے ماضی کی عظمت سے سبق سیکھا، تو پاکستان اس امت کیلئے امید کی کرن اور حوصلہ کا چراغ بن سکتا ہے۔ اقبال نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ڈھالا ہے:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یہ بھی حقیقت ہے کہ امت مسلمہ کے مسائل کا حل محض احتجاج اور قراردادوں میں نہیں۔ اگر ہمیں امریکا-بھارت-اسرائیل کے جال سے بچنا ہے تو ہمیں اپنے اختلافات ختم کر کے ایک مضبوط بلاک بنانا ہو گا۔ اسلامی تعلیمات ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ امت کا اتحاد ہی اس کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ قرآن کہتا ہے: یعنی سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اگر ہم نے اس حکم کو اپنی سیاست اور معیشت میں لاگو کیا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکتی۔ آج ہمیں ان کے الفاظ کو یاد رکھنا ہو گا کہ قومیں اپنے ماضی کے تجربات کو بھول جائیں تو حال بھی ان کا بے

وقت ہو جاتا ہے اور مستقبل بھی بے نور۔ پاکستان محض ایک ریاست نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے، اور یہ نظریہ ہمیں متحد کرنے کی سب سے بڑی بنیاد بن سکتا ہے۔

نیتن یاہو کا بیان محض ایک سیاسی جملہ نہیں بلکہ خطے کیلئے ایک نئے خطرناک طوفان اور شدید خطرہ کا عندیہ ہے۔ قطر پر حملہ دراصل ایک پیغام ہے کہ کل کسی اور کو بھی اسی طرح نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ اس خطرے کو محض قطر تک محدود نہ سمجھے بلکہ اپنی حکمت عملی اسی نظر سے مرتب کرے۔ یہ وقت ہے کہ ہم محض رد عمل نہ دکھائیں بلکہ ایک فعال اور مثبت حکمت عملی اپنائیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان ایک ایٹمی قوت ہے، ایک نظریاتی ریاست ہے، اور ایک ایسی امید ہے جو مسلم دنیا کیلئے روشنی کا چراغ بن سکتی ہے۔ اگر ہم نے اپنی صفوں کو درست کیا، اور اپنے دوستوں کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کیا، اپنی معیشت کو مستحکم کیا اور اپنی سیاست کو بصیرت بخشی، تو کوئی طاغوتی طاقت ہمیں شکست نہیں دے سکے گی۔

پاکستان کو یہ ثابت کرنا ہو گا کہ وہ صرف اپنی سر زمین کا محافظ نہیں بلکہ اپنے نظریے اور اپنی تہذیب کا بھی پاسبان ہے۔ یہی وقت ہے کہ ہم دنیا کو دکھادیں کہ پاکستان قطر نہیں اور اسرائیل امریکا نہیں بلکہ پاکستان وہ چراغ ہے جو اندھیروں میں بھی روشنی بانٹ سکتا ہے، اور وہ قلعہ ہے جو امت کی امیدوں کا محافظ ہے۔

آج کا وقت ہمیں ایک فیصلے کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ یا تو ہم خاموشی کی چادر اوڑھ کر تاریخ کے اندھیروں میں کھوجائیں، یا اپنے ماضی کی روشنی کو اپنے حال پر ڈھال کر مستقبل کو روشن کریں۔ نیتن یاہو کا بیان قطر پر حملے کا جواز نہیں بلکہ پورے خطے کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے۔ پاکستان کیلئے ضروری ہے کہ وہ محض تماشائی نہ بنے بلکہ تاریخ کے دھارے کو موڑنے والا کردار ادا کرے۔ یہ لمحہ پاکستان کیلئے امتحان ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم دنیا کو دکھادیں کہ پاکستان صرف ایک خطہ زمین نہیں بلکہ ایک نظریہ ہے، ایک امید ہے اور ایک چراغ ہے جو امت مسلمہ کیلئے روشنی کا پیغام لاتا ہے۔ ہمیں دنیا کو یہ بتانا ہو گا کہ پاکستان قطر نہیں اور اسرائیل امریکا نہیں۔ بلکہ پاکستان وہ قلعہ ہے جو امت کی امیدوں کا محافظ ہے اور وہ شمع ہے جو ظلمت کے سمندر میں بھی روشنی بانٹتی ہے۔

پاکستان کا وجود محض ایک ریاست نہیں، بلکہ ایک خواب کی تعبیر ہے۔ یہ خواب وہی ہے جو اقبال نے دیکھا تھا اور جسے قائد اعظم نے حقیقت کا روپ دیا۔ اب یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اس خواب کی حفاظت کریں اور اسے امت کی امیدوں کا مرکز بنائیں۔ آج کا وقت ہمیں ایک فیصلے کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ یا تو ہم خاموشی کی چادر اوڑھ کر تاریخ کے اندھیروں میں کھوجائیں، یا اپنے ماضی کی روشنی کو اپنے حال پر ڈھال کر مستقبل کو روشن کریں۔ نیتن یاہو کا بیان قطر پر حملے کا جواز نہیں بلکہ پورے خطے کے خلاف ایک اعلان جنگ ہے۔ پاکستان کیلئے ضروری ہے کہ وہ محض تماشائی نہ بنے بلکہ تاریخ کے دھارے کو موڑنے والا کردار ادا کرے۔

جیسا کہ اقبال نے کہا:

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں

غلامی ہے اسیر امتیاز ما تو رہنا

شکر کے خیمے اور احسان کی راکھ

کبھی یہ زمین گواہ تھی کہ جب کابل کی فضاؤں میں بارود کا دھواں چھایا تھا، تو پاکستان کے دشت و کوہ نے پناہ کے خیمے تان دیے۔ 40 برس تک پاکستان نے افغان مہاجرین کو نہ صرف جائے امن دی بلکہ اپنے رزق، تعلیم، اور زندگی کی سہولتیں بانٹ دیں۔ یہ محض سیاسی ہمدردی نہ تھی، بلکہ اسلامی اخوت اور انسانی جذبے کی ایک لازوال مثال تھی مگر آج وہی تاریخ ایک تلخ موڑ پر آکھڑی ہے جہاں سرحد کے اس پار سے دوستی کی بجائے گولیوں کی زبان بولی جا رہی ہے۔

کبھی یہ زمین گواہ تھی کہ جب کابل کے درودیوار پر بارود کی گرد چھائی تھی، تو پناہ کے خیمے پاکستان کے میدانوں میں نصب ہوئے۔ 40 برس تک یہ قوم افغان مہاجرین کی دستگیری کرتی رہی، اپنے گھروں کے دروازے کھولے، اپنے نوالے تقسیم کیے، اور اپنے شہروں کی فضا میں اجنبیوں کیلئے امن کا سایہ فراہم کیا۔ یہی پاکستان تھا جس نے لاکھوں افغانوں کو نہ صرف جائے پناہ دی بلکہ روزگار، تعلیم اور عزت و زینت بھی بخشی مگر افسوس! جب وقت نے وفا کا امتحان لیا تو احسان کے بدلے میں گولی چلی۔

آج وہی افغان جو کبھی ہمارے مہمان تھے، انہی سرحدوں پر بارود برسا رہا ہے جنہیں ہماری فوج نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر محفوظ رکھا اور المیہ یہ کہ یہ سب اس وقت ہو رہا ہے جب طالبان، جو خود کو اسلام کے علمبردار کہتے ہیں، مسلمانوں کے ازلی دشمن بھارت کے ساتھ رقص سیاست میں مشغول ہیں۔ یہ وہی بھارت ہے جس کے ہاتھ آج بھی غزہ کے معصوم بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ وہ بھارت جو اسرائیل کے شانہ بشانہ کھڑا ہو کر فلسطین کے مظلوم مسلمانوں پر گولہ باری میں شریک ہے۔ اطلاعات کے مطابق ایک ملین سے زائد بھارتی اسرائیلی فوج کے ساتھ مل کر اسلامی اصولوں کی کھلی نفی اور فلسطینیوں پر ظلم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں افغانستان کا دہلی کے ساتھ ہاتھ ملانا محض سیاسی بھول نہیں، امت مسلمہ کے زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

پاکستان نے جن خیموں کو سایہ دیا، آج انہی کی راکھ سے دشمنی کے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ اور یہ منظر تاریخ کو بتا رہا ہے کہ بعض اوقات احسان کی مٹی پر اگنے والے پودے بھی کفرانِ نعمت کی آندھیوں میں جھلس جاتے ہیں۔ یہ وہی افغانستان ہے جس کے دکھوں میں پاکستان نے اپنے زخموں کا مرہم پیش کیا اور یہ وہی پاکستان ہے جو اپنی حدود کی حفاظت میں ایک بار پھر میدانِ عزم میں صف بستہ ہے۔ طالبان حکومت کے کچھ اقدامات نے امت کے اہل وہ قوتیں جو خود کو اسلام کی نمائندہ کہتی ہیں، آج علاقائی سیاست کے اس دائرے میں کھڑی ہیں جہاں ایسے ممالک فکر دلوں میں تشویش پیدا کر دی ہے۔ سے روابط بڑھ رہے ہیں جنہوں نے حالیہ برسوں میں مسلم دنیا کے مصائب پر نہ صرف سرد مہری اختیار کی۔ بلکہ ظالم و جارح کو ظلم ڈھانے میں اپنی افرادی قوت بھی مہیا کی۔ یہ روش امت کے اتحاد سے زیادہ انتشار کو جنم دیتی ہے۔

مولوی مفتی کے دور ہند کے ساتھ ہی افغان سرحد پر کشیدگی نے نیارخ اختیار کیا۔ افغان فورسز نے انکوراڈہ، باجوڑ، کرم، دیر، چترال اور بلوچستان کے علاقوں میں بلا اشتعال فائرنگ شروع کی۔ پاکستانی فوج نے صبر اور تدبیر سے کام لیتے ہوئے فوری اور مشرجوابی کارروائی کی۔ اتوار کی علی الصبح ایک فیصلہ کن آپریشن کے دوران کئی افغان چوکیوں کو غیر مؤثر کر دیا گیا، اور 19 کلیدی مقامات پر پاکستان نے اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔

پاکستانی مسلح افواج نے یہ واضح پیغام دیا کہ وطن کی سرحد کوئی مفروضہ نہیں، ایک عقیدہ ہے۔ طالبان جنگجو متعدد مقامات پر مورچے اور لاشیں چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ بارود اور اسلحہ کے ڈھیر اس شکست کی گواہی دے رہے تھے جو بے تدبیری کے ساتھ سامنے آئی۔ دورانڈ میلہ، ترکمن زئی، شہیدان، جندوسر اور خرچر قلعہ جیسے مراکز میں شدت پسندوں کے کمانڈ سینٹرز کو مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔ یہ مقام طویل عرصے سے سرحد پار کاروائیوں کیلئے استعمال ہو رہے تھے۔ پاکستان کی عسکری قیادت نے اس آپریشن کو انتقامی نہیں بلکہ دفاعِ وطن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا۔

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، قطر اور دیگر خلیجی ممالک نے سرحدی تصادم پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے افغانستان پر زور دیا کہ وہ اپنی سرزمین کو دہشتگرد سرگرمیوں کیلئے استعمال نہ ہونے دے۔ یہ ردِ عمل امتِ مسلمہ کے اس مشترکہ احساس کی علامت ہے کہ داخلی انتشار صرف دشمنوں کیلئے راہ ہموار کرتا ہے۔



چند دن قبل منعقدہ ماسکوفارمیٹ کانفرنس میں خطے کے ممالک نے افغانستان کو واضح پیغام دیا تھا کہ وہ اپنی سرزمین دہشت گردی کیلئے استعمال نہ ہونے دے۔ تاہم افغان وزیر خارجہ کے دور ہند کے فوراً بعد سرحدی تصادم کا آغاز ہونا خطے میں نئے سفارتی توازن کی نشاندہی کرتا ہے۔ چین اور روس نے بھی اس صورتِ حال پر اپنی تشویش ظاہر کی ہے، کیونکہ یہ واقعات جنوبی ایشیا کی امن بساط کو غیر مستحکم کر سکتے ہیں۔

افغانستان کی بھارت سے بڑھتی ہوئی قربت ایک فکری و اخلاقی سوال ہے۔ انڈیا جو حالیہ برسوں میں مشرق وسطیٰ میں اپنے تعلقات کو ایسے انداز میں بروئے کار لا رہا ہے جو بعض اوقات مسلم دنیا کیلئے عدم اطمینان کا باعث بنتا ہے، اب کابل میں سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ یہ وقت ہے کہ طالبان قیادت غور کرے کہ اسلامی اخوت محض نعرہ نہیں بلکہ عملی اصول ہے۔ امت کے زخموں پر مرہم رکھنے کی بجائے ایسے ممالک کے ساتھ تعلق بڑھانا جو ان زخموں کے اسباب میں شریک رہے، اسلامی تشخص کیلئے باعثِ تشویش ہے۔ پاکستان نے ہمیشہ خطے میں امن، مفاہمت اور بھائی چارے کی پالیسی اپنائی ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ امن کا ہاتھ ہمیشہ مضبوط ہاتھ ہی بڑھا سکتا ہے۔ یہ وقت صرف عسکری چوکسی کا نہیں، بلکہ قومی یکجہتی، سیاسی استحکام اور فکری بیداری کا ہے۔ کیونکہ سرحدوں کی اصل حفاظت توپوں سے نہیں، بلکہ قوم کے اجتماعی ایمان اور عزم سے ہوتی ہے۔

تاریخ کے آئینے میں غیرت کا چراغ دہائی دے رہا ہے۔ 40 برس کی میزبانی، قربانی اور اخوت یہ سب پاکستان کی تاریخ کے وہ ابواب ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ افسوس کہ ان قربانیوں کا جواب وفا سے نہیں، بلکہ شک و شبہ اور سرحدی دشمنی سے دیا گیا مگر پاکستان کی تاریخ نے ہمیشہ دکھایا ہے کہ یہ قوم بدلے میں بھی صبر اور وقار کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ وقت الزام تراشی کا نہیں، بلکہ امت کے اجتماعی ضمیر کو جگانے کا ہے۔ افغان عوام اور ان کے رہنما اگر ماضی کی یادوں کو انصاف کی روشنی میں دیکھیں، تو شاید انہیں احساس ہو کہ پاکستان ان کا سب سے بڑا خیر خواہ رہا ہے۔

تاریخ کے صفحات بتائیں گے کہ پاکستان نے اپنے دشمنوں کے خلاف نہیں، اپنے ایمان کے دفاع میں تلوار اٹھائی۔ یہ سرزمین آج بھی اس یقین پر قائم ہے کہ امن، عدل اور برادری ہی امتِ مسلمہ کا حقیقی سرمایہ ہیں۔ یہ تحریر ایک یاد دہانی ہے کہ قومیں جب اپنے احسان فراموش ماضی کو بھول جاتی ہیں تو تاریخ انہیں دوبارہ اسی موڑ پر لاکھڑا کرتی ہے جہاں سے سبق اُدھورا رہ گیا تھا۔ پاکستان نے اپنا فرض ادا کیا۔ اب وقت ہے کہ دوسرا فریق بھی تاریخ کے

آئینے میں اپنی تصویر پہچانے۔

یہ واقعہ تاریخ کے صفحات پر ایک عارضی سرخی نہیں بلکہ ایک مستقل باب ہے۔ جو یہ یاد دلاتا ہے کہ سرحدیں صرف جغرافیہ نہیں ہوتیں، وہ قوم کی غیرت اور ایمان کا پیمانہ بھی ہوتی ہیں۔ اور جب کسی قوم کی غیرت کو لٹکا جائے تو خاموشی بھی ایک اعلان بن جاتی ہے، اور دفاع خود ایک دعا کا روپ دھار لیتا ہے۔ وقت کے طوفان آتے ہیں، مگر قوموں کی غیرت اگر زندہ ہو تو چراغ بجھتا نہیں اور پاکستان کا یہ چراغ چالیس برس سے جل رہا ہے۔ آج جب افغان سرحد پر فریب کی آندھی چل رہی ہے، پاکستان پھر صبر، ایمان اور وقار کے ساتھ کھڑا، سیلیکٹن تاریخ کے صفحات گواہ رہیں گے کہ پاکستان نے مہمان نوازی کو عبادت سمجھا، اور افغانستان نے اسے کمزوری جانا۔

طالبان اگر ذرا ٹھہر کر سوچیں تو انہیں یاد آنا چاہیے کہ اسلام دشمنوں کے ساتھ دوستی ایمان کے بنیادی شعور سے انحراف ہے۔ وہ بھارت جس نے فلسطینی مسلمانوں پر بم برسائے ہیں، یہودی کی مدد کی، وہی آج کابل کی مسندوں پر مسکراہٹیں بانٹ رہا ہے اور اسلام کا جھنڈا اٹھانے والے اس پر خاموش ہیں۔ پاکستان کو کسی دشمن کے بارود سے نہیں، اپنی احسان مندی کی بھول جانے والی تاریخ سے خطرہ ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ امت کا مستقبل ان قوموں کے ہاتھ میں ہے جو اپنی وفا کو سیاست کے ترازو میں نہیں تولتیں۔

یہ تحریر محض ایک واقعے کا بیان نہیں، بلکہ ایک دعائیہ التجا ہے کہ اے امت محمد ﷺ! یاد رکھ، جو قوم اپنے دوستوں کو بھول جائے اور دشمنوں سے مسکرا کر ملے، وہ اپنے ایمان کی چمک کھو بیٹھتی ہے۔ پاکستان اپنی سرحدوں کی حفاظت تو کرے گا ہی، مگر ساتھ ہی وہ اس خواب کو بھی زندہ رکھے گا جو کبھی برصغیر کے مخلص مسلمانوں نے امت واحدہ کے نام پر دیکھا تھا۔

ماسکوفارمیٹ: امن کے چراغ سے ایشیا کی صبح تک

تاریخ کے صفحات پر جب کبھی دو ہمسایہ قوموں کی مثالیں لکھی جائیں گی، تو افغانستان اور پاکستان کے رشتے کو خون اور ایمان کی قرابت کے عنوان سے جائے گا۔ ایک وقت تھا جب روسی توپوں کی گھن گرج کے بیچ، افغان مہاجرین نے اپنے گھر، مٹی، اور سکون سب کچھ کھو دیا، اور پاکستان نے انہیں یاد کیا اپنے دل کے دروازے کھول کر مہمان نہیں بلکہ بھائی سمجھ کر پناہ دی۔ ان ہی سرحدوں پر جہاں کبھی ”مہمانداری کا علم“ بلند تھا، آج بارود کی بو محسوس ہوتی ہے۔

پاکستان کے عوام کے دل آج زخمی ہیں، وہ زخم کسی دشمن کی گولی نے نہیں بلکہ اپنے بھائی کے غفلت بھرے رویے نے دیے ہیں۔ طالبان حکومت کے زیر سایہ، افغانستان کی سرزمین ایک بار پھر دہشتگردوں کے قدموں تلے روندی جا رہی ہے اور دکھ اس بات کا ہے کہ ان قدموں کی چاپ میں بھارت کی سرپرستی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر، ماسکوفارمیٹ کا اجلاس ایک امید کی کرن بن کر ابھرا ہے۔

روس، چین، ایران اور پاکستان نے ایک زبان ہو کر یہ پیغام دیا ہے کہ اگر امن کا چراغ بجھانے والے اپنے مفادات کی آگ سلگائیں گے، تو مشرق اپنی روشنی سے اندھیرا چیر دے گا۔ یہ اجلاس محض سفارتی نشست نہیں بلکہ ضمیر انسانی کی تجدید عہد ہے کہ اب کسی ملک کی سرزمین دہشتگردی کیلئے استعمال نہیں ہونے دی جائے گی، نہ طاقت کیلئے، نہ انتقام کیلئے۔

تاریخ عالم میں بعض اجلاس محض سفارتی گفت و شنید نہیں ہوتے، بلکہ آئندہ زمانوں کی سمت متعین کرتے ہیں۔ ماسکوفارمیٹ کا حالیہ اجلاس بھی اسی نوعیت کا مظہر ہے۔ ماسکوفارمیٹ محض ایک علاقائی فورم نہیں، بلکہ طاقت کے توازن کی نئی زبان ہے۔ اس کے اراکین، روس، چین، بھارت، پاکستان، ازبکستان، قازقستان، کرغزستان، ترکمانستان اور تاجکستان دراصل اُس تاریخی جغرافیے کے وارث ہیں جہاں کبھی سلک روڈ کی تہذیب رواں تھی۔ گویا برف کی چادر میں لپٹی ہوئی اُس آگ کے گرد بیٹھے تھے جسے افغانستان کی تقدیر کہتے ہیں۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ جس دروازے سے کبھی امریکا داخل ہوا تھا، اب اسی دہلیز پر پاکستانی اور افغان وزیر خارجہ کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ تبدیلی دراصل طاقت کے محور کی منتقلی کی علامت ہے۔ دنیا کا مرکزِ ثقل اب واشنگٹن سے ماسکو کی سمت جھک رہا ہے۔

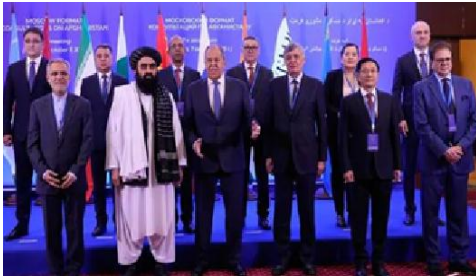
یہ اجلاس اس امر کا اعلان ہے کہ دنیا اب مغرب کے سنگھاس سے ہٹ کر ایشیا کی گود میں نئی سیاست جنم دے رہی ہے۔ اس اجلاس کی اہمیت اس لیے بھی دوچند ہو گئی کہ امریکا کو نظر انداز کر کے افغان وزیر خارجہ کو مدعو کیا گیا۔ یہ وہی افغانستان ہے جسے دو دہائیاں پہلے مغرب نے اپنے قبضے میں لے کر بربادی کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ اب ماسکو نے گویا تاریخ کا پانسہ پلٹ دیا ہے۔

روسی وزارت خارجہ نے جب یہ اعلان کیا کہ ماسکوفارمیٹ اب ایک ”رابطہ گروپ“ کے طور پر خطے کے امن کی بنیاد رکھے گا، تو دراصل یہ اس بات کا اقرار تھا کہ پاکستان اور افغانستان اب کسی ایک قوم یا نظریے کا مسئلہ نہیں بلکہ عالمی توازن کا امتحان ہے۔ سرگئی لاوروف نے افغان وزیر خارجہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے جس فراست سے تسلیم کیا کہ ”افغانستان کا استحکام خطے کے امن کیلئے لازم ہے۔“ یہ دراصل اُس حقیقت کا اعتراف تھا جسے مغرب نے ہمیشہ نظر انداز کیا کہ وسطی ایشیا کی رگوں میں امن کی دھڑکن کا بل سے گزرتی ہے۔

مغربی دنیا کی منافقت اس قدر عیاں ہے کہ جو قومیں ”انسانی حقوق“ کی علمبردار بنتی ہیں، وہی آج افغانستان کے اثاثے ضبط کر کے وہاں کے عوام کو بھوک، بیروزگاری اور مہاجرت کے عذاب میں مبتلا کر رہی ہیں۔ انجمادِ اثاثہ دراصل ضمیر کے انجماد کی علامت ہے۔ اگر عالمی انصاف کا کوئی تصور باقی ہے، تو وہ اسی وقت معتبر ہو گا جب مغرب اپنے مالی اور اخلاقی قرض افغانستان کو واپس کرے۔ لاوروف کی تنقید محض سیاسی الفاظ نہیں بلکہ اخلاقی بیداری کی صدا اور ضمیر کی گواہی تھی۔ انہوں نے مغرب کو یاد دلایا کہ افغانستان کو تنہا چھوڑ دینا، ایک قوم کو ریزہ ریزہ کرنے کے مترادف ہے۔

پاکستان نے اس اجلاس میں اپنی روایت کے مطابق محتاط مگر معنی خیز کردار ادا کیا۔ پاکستان کی موجودگی یہ باور کراتی ہے کہ پاکستان افغانستان کے معاملے میں محض ہمسایہ نہیں بلکہ شریکِ تقدیر ہے۔ یہ وہی ملک ہے جس نے چالیس برس سے زائد افغان بحران کے بوجھ تلے اپنے کندھے پیش کیے ہیں۔ پناہ گزینوں، معیشت، اور سرحدی سلامتی کے مسائل کے باوجود پاکستان نے ہمیشہ امن کے ساتھ وابستگی برقرار رکھی۔

اجلاس میں جب افغانستان کی سلامتی اور خطے میں دہشتگردی کے خطرات زیرِ بحث آئے تو گویا وقت نے ایک پرانا زخم دوبارہ چھیڑ دیا۔ اجلاس میں یہ اصول واضح کیا گیا کہ افغانستان کی سرزمین کسی ملک کے خلاف استعمال نہیں ہونی چاہیے۔ یہ جملہ سادہ ہے مگر اس کے پیچھے صدیوں کی جنگی نفسیات دفن



ہے۔ سب فریق متفق تھے کہ افغانستان کی سرزمین کسی ملک کے خلاف استعمال نہ ہو مگر اصل سوال یہ ہے کہ دنیا کب تک افغانستان کو بطور میدانِ جنگ استعمال کرتی رہے گی؟ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ افغان زمین خود اپنی امن کی پناہ گاہ بن جائے۔ افغانستان، جو ہمیشہ عالمی قوتوں کے تصادم کا میدان رہا، اب خود اس عزم کے ساتھ ابھرنے کی ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کی جنگ کا ایندھن نہیں بنے گا۔

اجلاس کا ایک اہم پہلو انسانی امداد کا تھا۔ افغانستان کے عوام جن معاشی مصائب سے گزر رہے ہیں، وہ کسی قدرتی آفت کا نتیجہ نہیں بلکہ سیاسی خود غرضی کا ثمر ہیں۔ روسی اور چینی نمائندوں نے اس بات پر زور دیا کہ انسانی ہمدردی کو سیاسی مفادات سے الگ رکھا جائے۔ یہ وہ پیغام ہے جو دنیا کو یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ اگر انسانیت کا مفہوم صرف مفادات کے تابع ہو جائے تو تہذیبِ محض ایک خالی خول رہ جاتی ہے۔ انسدادِ دہشتگردی کے ساتھ ساتھ جب انسانی امداد پر گفتگو ہوئی، تو میزبانوں نے یہ اقرار کیا کہ بندوق کے سائے میں انسانیت پنپ نہیں سکتی۔ افغان عوام بھوک اور محرومی سے لڑ رہے ہیں، اور ان کی امیدیں اب عالمی کانفرنسوں کی نہیں بلکہ جہاں پڑوس کے ضمیر کی محتاج ہیں وہاں اپنی سرزمین کو پڑوسیوں کیلئے راحت کا عملی کردار ادا کرنا ہو گا۔

روس، چین، ایران، بھارت، پاکستان اور وسطی ایشیائی ممالک اس اجلاس میں ایک نئی علاقائی شناخت کے ساتھ ابھرے۔ یہ اتحاد مغرب کے خلاف جنگ نہیں، بلکہ طاقت کے توازن کی بازیافت ہے۔ یہ وہی خواب ہے جو 1950 کی دہائی میں ”باندوگ کانفرنس“ نے دیکھا تھا کہ ایشیا اپنے مسائل خود حل کرے، اور اپنی تقدیر کا تعین اپنے ضمیر سے کرے۔ ماسکوفارمیٹ اسی خواب کی تعبیر کا پہلا قدم ہے۔ ان کا مقصد افغانستان میں امن ہی نہیں، بلکہ اس خطے کو مغربی اجارہ داری سے آزاد کرنا ہے۔ یہ دراصل نوآبادیاتی فکر کے خلاف فکری جہاد ہے، جس میں قلم اور مکالمہ دونوں ہتھیار ہیں۔

اجلاس کے دوران جب مستقبل کی تجاویز زیرِ بحث آئیں، تو روسی وزیرِ خارجہ نے بجا فرمایا کہ مغرب کی ناکام پالیسیاں اب پورے خطے کیلئے خطرہ بن چکی ہیں

۔ وہ حکومتیں جو خود اپنے وعدوں کی لاش اٹھا رہی ہیں، دوسروں کیلئے امن کا نسخہ نہیں لکھ سکتیں۔ لہذا اب ایشیا کو اپنی حکمت عملی خود تحریر کرنی ہوگی۔ چین کا افغانستان میں سفیر مقرر کرنا محض ایک سفارتی اقدام نہیں، بلکہ ایک تاریخی اشارہ ہے کہ کابل کی حکومت اب دنیا کی تنہائی سے نکل رہی ہے لیکن اس کیلئے کابل کو ایک مرتبہ پھر اپنے بردار محسن پاکستان کو اعتماد میں لینا ہو گا۔ چین نے دراصل یہ ثابت کیا کہ عالمی تعلقات میں اخلاقی جرات طاقت سے بڑی چیز ہے۔

یوکرین کی جنگ میں الجھا ہوا روس جانتا ہے کہ ایک اور محاذ کھولنا خود کشی کے مترادف ہو گا۔ اسی لیے ماسکوا براہ راست عسکری تنازع کے بجائے سفارتی برتری کو اپنی حکمت عملی بنا رہا ہے۔ روس سمجھتا ہے کہ ایشیا کی قیادت بدوق سے نہیں بلکہ مذاکرات اور معاہدوں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ احتیاط اس بات کی دلیل ہے کہ روس اب اُس سوویت روس سے مختلف ہے جو کبھی نظریاتی توسیع کا خوگر تھا۔ اب وہ تاریخی توازن اور معاشی استحکام کو فوقیت دے رہا ہے۔

آج کا افغانستان اُس مسافر کی مانند ہے جو اپنی منزل کھو چکا ہے، مگر راستے کی مٹی اب بھی اُس کے قدم پہنچاتی ہے۔ پاکستان اور خطے کے دیگر ممالک اُس کیلئے دعا اور تدبیر دونوں کا سامان لے کر بیٹھے ہیں کہ امن لوٹ آئے، اور تدبیر اس لئے کہ یہ امن پائیدار رہے۔ ماسکوا فرامیٹ میں شریک ممالک کا یہ متفقہ عزم دراصل تاریخ کے دھارے کو پلٹنے کی ایک سعی ہے۔

یہ فیصلہ کہ "افغان سرزمین کسی کے خلاف استعمال نہیں ہوگی محض ایک جملہ نہیں، بلکہ برسوں کی قربانیوں اور تلخ تجربات کی گواہی ہے۔ پاکستان کے عوام آج بھی اپنے افغان بھائیوں کیلئے خیر ہی چاہتے ہیں، مگر وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دوستی کا حق، اعتماد کے چراغ کو جلانے رکھنے میں ہے۔ اگر کابل اپنے دامن سے دہشتگردی کے کانٹے صاف کر دے، تو یہ خطہ ایک بار پھر امن کی وادی، تجارت کا سنگم، اور تہذیب کا مرکز بن سکتا ہے۔

وقت کا پیہر اب مشرق کی سمت گھوم رہا ہے اور اگر ماسکو، بیجنگ، تہران اور اسلام آباد اپنے عہد پر قائم رہے، تو آنے والی نسلیں اس دور کو نئی ایشیائی بیداری کے نام سے یاد کریں گی۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ امن اب ایک نعرہ نہیں، ایک مشترکہ ذمہ داری ہے۔

بگرام کی بازگشت

تاریخ کے اوراق پر کبھی کبھی ایسے باب کھلتے ہیں جن میں زمانے کے زوال و عروج کے مناظر ایک ساتھ جمع ہو جاتے ہیں۔ تاریخ اپنی جولانگاہ میں عجیب تماشا دکھاتی ہے۔ کبھی ایک شکستہ قلعہ عالمی طاقتوں کا مسکن بنتا ہے، اور کبھی ایک ویران گوشہ سلطنتوں کی سیاست کا مرکز۔ ایک ہی قلعہ کبھی کسی سلطنت کا فخر ہوتا ہے اور کبھی کسی سامراج کی شکست کی علامت۔ بگرام ایڑ بیس کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے، جہاں زمانے کے نشیب و فراز نے اپنے اپنے وقت کی جارج قوتوں کو باری باری خیمہ زن ہوتے دیکھا۔

بگرام ایڑ بیس بھی اسی نوعیت کا ایک باب ہے۔ جہاں سوویت یونین نے اپنے لوہے کے بازو پھیلائے، جہاں امریکا نے اپنی عسکری برتری کے نعرے بلند کیے، اور آج پھر ایک بار وہاں عالمی طاقتوں کی نگاہیں مرکوز ہیں۔ یہ محض ایک فوجی اڈہ نہیں، یہ تاریخ کی عدالت ہے جہاں ہر متکبر طاقت کی آزمائش ہوئی اور ہر سامراجی غرور خاک میں مل گیا۔ قرآن حکیم کی صدا آج بھی گونج رہی ہے:

﴿وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران 140) یہ دن ہم لوگوں کے درمیان گردش میں رکھتے ہیں۔

یعنی طاقتوں کا عروج و زوال کوئی حادثہ نہیں بلکہ خدائی سنت ہے۔ آج بگرام ایڑ بیس پر جو کشمکش جاری ہے، وہ دراصل اسی ازلی اور ابدی قانون کی ایک تازہ تفسیر ہے۔ اس منظر نامے میں سوال یہ ہے کہ پاکستان، مسلم دنیا اور امت اسلامیہ اپنی ذمہ داری کو کس بصیرت سے نبھائیں گے؟

ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر اعلان کیا اگر افغانستان نے بگرام ایڑ بیس اس کے اصل معمار یعنی امریکا کے حوالے نہ کیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ جملہ محض ایک سیاسی دھمکی نہیں بلکہ اس امر کا غماز ہے کہ امریکا آج بھی افغانستان کے قلب میں اپنی واپسی کے خواب بن رہا ہے۔ یہ بیان محض ایک سیاسی نعرہ نہیں بلکہ امریکا کی اندرونی کمزوری اور بیرونی عزائم دونوں کا پتہ دیتا ہے۔ ٹرمپ نے برطانیہ کے دورے میں بھی اپنے اس دھمکی کو دہراتے ہوئے اسے بریکنگ نیوز بھی قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ بیان محض دھمکی نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ امریکا آج بھی وسطی ایشیا میں اپنی واپسی کے درپے ہے۔ بگرام کو امریکا اپنے "حق" کے طور پر دیکھتا ہے حالانکہ اس کے انخلا کے بعد اب وہ افغان اقتدار کا حصہ ہے۔

امریکی صدر نے لندن میں برطانوی وزیراعظم سر کیئر سٹارمر کے ہمراہ نیوز کانفرنس میں اعتراف کیا کہ امریکا بگرام ایڑ بیس واپس لینے کی کوشش میں ہے۔ گویا کہ جو دروازہ بائیزن انتظامیہ نے خود بند کیا تھا، اب اسی کو دوبارہ کھٹکھٹایا جا رہا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ موجودہ حکومت بھی سابقہ پالیسیوں سے پیچھا نہیں چھڑا رہی۔ یہ اعلان اس تضاد کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک طرف انخلا کو کامیابی کہا گیا، دوسری طرف اسی مقام پر دوبارہ لوٹنے کی خواہش ظاہر کی جا رہی ہے۔ انخلا کو فتح قرار دینے والے آج واپسی کی منصوبہ بندی پر مجبور ہیں۔

ٹرمپ نے دلیل دی کہ بگرام چین کے جوہری ہتھیاروں کے مراکز سے محض ایک گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ اس کے پس پردہ یہ پیغام واضح ہے کہ امریکا کی اصل فکر افغانستان نہیں بلکہ چین ہے۔ بگرام ایک اسٹریٹجک نکتہ ہے جسے امریکا چین کے خلاف مستقبل کے معرکوں کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ گویا اصل ہدف افغانستان نہیں بلکہ چین کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بگرام ایڑ بیس مستقبل کی اس گریٹ گیم کا پیش خیمہ بننے

جارہا ہے جس میں چین کے ایٹمی منصوبے امریکی فکر کا اصل محور ہیں۔ ٹرمپ بارہا یہ کہہ چکے ہیں کہ امریکا کو افغانستان سے نکلنے کے وقت بگرام بیس نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ یہ بیان دراصل ان کی عسکری پالیسی کی ناکامی کا اعتراف ہے جو امریکی تاریخ میں ایک ”سقوطِ کامل“ کے نام سے درج ہو گئی ہے۔ یہ ندامت ایک ایسی اسٹریٹیجک غلطی کی طرف اشارہ ہے جس نے امریکی وقار کو طالبان کے ہاتھوں پامال کر دیا۔

بگرام محض ایک فوجی اڈہ نہیں بلکہ ایک شہر ہے جو 77 مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بیرکس اور رہائش گاہیں ایک وقت میں دس ہزار فوجیوں کو پناہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ خطے کا سب سے بڑا فوجی مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بیس دو دہائیوں تک القاعدہ اور طالبان کے خلاف امریکی جنگ کا اصل مرکز رہا۔

بگرام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ تین امریکی صدور (جارج بوش، براک اوباما اور ڈونلڈ ٹرمپ) اس کے مہمان رہ چکے ہیں۔ جو بائیڈن بھی 2011 میں یہاں بطور نائب صدر آچکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ اڈہ محض عسکری نہیں بلکہ سیاسی علامت بھی ہے۔ یہ بیس 1950 کی دہائی میں سوویت یونین نے پروان صوبے میں قائم کیا۔ 1980 کے عشرے میں یہ سوویت سامراج کا سب سے اہم مرکز اور بڑا گڑھ سمجھا جاتا تھا لیکن تقدیر نے دیکھا کہ جس قلعے سے سوویت طاقت نے دنیا کو لاکرا تھا، وہی قلعہ اس کے زوال کا پیش خیمہ بنا۔ لیکن تقدیر کی ستم ظریفی کہ وہی اڈہ بعد میں نہ صرف امریکیوں کے ہاتھ میں آگیا بلکہ اسی اڈے سے امریکی تابوت کا ایک برا سلسلہ اور انخلاء جیسی تذلیل کا ذکر بھی ان کے قلب و جگر کا حصہ بن گیا۔ اور آج پھر عالمی سیاست کا کونابن گیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اڈہ ہر سامراجی قوت کیلئے افغانستان کا دروازہ رہا ہے۔

سوویت یونین نے یہاں سے اپنی عسکری طاقت کا مظاہرہ کیا لیکن آخر کار شکست کھائی۔ امریکانے اسے دہشتگردی کے خلاف جنگ کا مرکز بنایا، جدید ٹیکنالوجی اور وسائل کے باوجود طالبان سے شکست کھائی مگر بالآخر رسوائی کے ساتھ انخلا کیا۔ اب امریکی توجہ کا اصل مرکز چین ہے اور بگرام کو اس کے خلاف استعمال کرنے کی خواہش کھل کر سامنے آرہی ہے۔ اب چین کے ابھرتے ہوئے کردار کے خلاف یہ اڈہ مستقبل کا مورچہ بن سکتا ہے۔ یوں ایک بار پھر عالمی طاقتوں کا قبرستان ثابت ہونے والا افغانستان ایک مرتبہ پھر عالمی سامراج کے میدان کا اکھاڑ بننے جا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ٹرمپ کے حالیہ بیان کے بعد پاکستان پر دباؤ بڑھے گا کہ وہ بگرام پر قبضے کیلئے امریکا کو زمینی راستہ فراہم کرے؟ قوی امکان ہے کہ پاکستان کو ایک بار پھر عالمی دباؤ کی چکی میں پیسا جائے لیکن سابقہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ افغانستان کے ساتھ لاکھ کشیدگی کے باوجود پاکستان اب کبھی امریکا کے فریب میں نہیں آئے گا لیکن کیا پاکستان امریکا کو انکار کر کے خطے میں ایک نئی کشمکش کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہے؟

پاکستان نے حالیہ کشیدگی میں کابل حکومت کو دو ٹوک پیغام دیا ہے کہ یا ٹی ٹی پی کا ساتھ چھوڑو یا پاکستان کو دشمن نہ بناؤ۔ اس کے پس منظر میں یہ سوال اہم ہے کہ کیا امریکا اور بھارت اس تنازع کے پردے میں اپنی شطرنج بچھا رہے ہیں؟ اس تناظر میں بھارت کے کردار پر سوال اٹھتا ہے کیونکہ وہ ٹی ٹی پی کو پر کسی کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ ٹی ٹی پی کے دہشتگردی کے شواہد اور اس میں انڈین ”را“ کے ملوث ہونے کے عملی ثبوت عالمی اداروں تک پہنچائے جا چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا امریکا بھی اس کھیل میں شریک ہے یا صرف تماشا بنی؟ اور یہ امر پاکستان کے خدشات کو حقیقت کے قریب لے جاتا ہے۔

ان حالات کے پیشِ نظر یہ سوال اہم ہے کہ کیا امریکا بگرام کی واپسی کیلئے پاکستان کو زمینی تعاون پر مجبور کرے گا؟ پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن اسے پھر عالمی طاقتوں کی آنکھ کا ٹاٹا بنا سکتی ہے۔ ٹرمپ کے بیان کے بعد یہ سوال اہم ہے کہ کیا پاکستان پر دباؤ بڑھے گا کہ وہ امریکا کو زمینی رسائی دے؟ پاکستان کی

جغرافیائی حیثیت اسے عالمی طاقتوں کے کھیل میں ایک ناگزیر فریق بنادیتی ہے۔ اگر پاکستان نے امریکا کو راستہ دیا تو اندرونی اور علاقائی مسائل بڑھ سکتے ہیں، اور اگر انکار کیا تو دباؤ اور بڑھ جائے گا۔

پاکستان اور سعودی عرب کے درمیان نئے دفاعی معاہدے کو امریکا، اسرائیل اور بھارت اپنی پالیسیوں کیلئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ یہ تینوں قوتیں خطے میں ایک ایسا توازن چاہتی ہیں جو مسلم دنیا کی باہمی وحدت کو پارہ پارہ کرے تاکہ خطے میں طاقت کا توازن اپنے حق میں رکھا جاسکے۔ سوال یہ ہے کہ کہیں بگرام بیس پر دوبارہ قبضے کی سازش اسی تناظر میں تو نہیں؟ ممکن ہے بگرام بیس کی بحالی کے پس پردہ یہی مثلث (ٹریکا) کار فرما ہو؟

ممکن ہے کہ اقوام متحدہ کے آئندہ اجلاس میں پاک امریکا ملاقات کے دوران بگرام بیس پر گفتگو ہو۔ عالمی سفارتکاری اکثر ایسے ایجنڈوں کو بند کمروں میں زیر بحث لاتی ہے جنہیں عوامی سطح پر بیان نہیں کیا جاتا۔ عالمی سازش اکثر آہنی بند دروازوں کے پیچھے لکھی جاتی ہے۔ عالمی سیاست کا دستور ہے کہ اصل فیصلے بند کمروں میں ہوتے ہیں اور ایجنڈے کبھی عوام کے سامنے نہیں آتے۔

امریکا نے بلوچستان میں معدنیات کی تلاش پر بھاری سرمایہ کاری کا اعلان کیا ہے۔ بلوچستان میں امریکی سرمایہ کاری پاکستان کیلئے ایک نیا امتحان ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جب بھارت کی سرپرستی میں بلوچستان میں دہشتگرد حملے جاری ہیں تو یہ سرمایہ کاری کس مقصد کیلئے ہے؟ معدنیات کی تلاش کے معاہدے کے باوجود پاکستان پر دباؤ بڑھنے کا امکان ہے۔ ممکن ہے امریکا اس سرمایہ کاری کو دباؤ کے طور پر استعمال کرے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا امریکا اپنی سرمایہ کاری کے بہانے پاکستان کو مجبور کرے گا کہ وہ اپنے دفاعی اور علاقائی فیصلے امریکی مفادات کے مطابق ڈھالے؟

زمینی حقائق تو یہ ہیں کہ پڑوس میں ایک ایسی عالمی طاقت سوویت یونین جس نے یورپ کے کئی ممالک کو گھنٹوں میں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور برسوں وہاں اپنی مسلط کردہ حکومتوں کے بل بوتے پر یورپ کو خوفزدہ رکھا لیکن خوفناک عسکری طاقت کے باوجود افغانستان میں ناکام رہا اور بری طرح ہزیمت کا ایسا شکار ہوا کہ اسے اپنا وجود سنبھالنا مشکل ہو گیا اور اس کے بطن کے چھ ٹکڑے ہو گئے۔ روس کے ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے بعد امریکا اکیلا عالمی طاقت کے تکبر میں ایسا مبتلا ہوا کہ اسی افغانستان کو اپنی اگلی جارحیت کا نشانہ بنالیا اور برسوں اپنے جدید اسلحے اور وسائل میں ٹریلین ڈالر زر آگ میں پھونک کر بھی ایک تاریخی شکست سے دوچار ہو کر راہ فرار حاصل کرنا پڑی۔ ٹرمپ نے اپنے پہلے دور اقتدار میں "تمام بموں کی ماں" جیسا خطرناک بم استعمال کرنے کا بدنام زمانہ عمل بھی اپنے نام کیا۔ یہاں ضروری ہے کہ قارئین کو اس ظالمانہ عمل کی مختصر تفصیل سے آگاہ کیا جائے:

13/ اپریل 2017 کو امریکی افواج نے افغانستان کے مشرقی صوبے ننگرہار کے عین ضلعی علاقے میں ایک بڑے، کنو نفل بم — جسے عوامی زبان میں "تمام بموں کی ماں" کہا جاتا ہے — کو ایک سرنگی / غاروں کے جال پر گرایا۔ یہ اس ہتھیار کا پہلی مرتبہ میدان جنگ میں استعمال تھا۔ یہ بم باضابطہ طور پر

بطور ایک خطرناک ترین مہلک ہتھیار سمجھا جاتا ہے۔ اس کا وزن تقریباً 21,600 پاؤنڈ (تقریباً 9.8 ٹن) کے آس پاس تھا اور یہ سب سے بڑا روایتی (غیر جوہری) فضا سے پھینکا جانے والا دھماکہ خیز بم تھا۔



اس کا مقصد اوپر سے ہوا میں پھٹ کر وسیع رینج میں کنکشن جھٹکا اور دباؤ پیدا کرنا ہوتا ہے، تاکہ گہری سرنگیں، غار اور مضبوط دفاعی احاطے متاثر ہوں۔ امریکی کمانڈ کے مطابق ٹارگٹ وہ

غاروں اور سرنگی جال تھے جو داعش کے جنگجو استعمال کر رہے تھے۔ ایسی جگہیں جہاں روٹین بم یا زمینی فورس آسانی سے داخل نہیں ہو سکتیں۔ امریکی حکام نے کہا کہ یہ اس نوعیت کا ہتھیار انہی خاص اہداف کیلئے موزوں تھا تا کہ زمینی اہلکاروں کے خطرے کو کم کیا جاسکے اور زیر زمین دفاعی ڈھانچوں کو ختم کیا جاسکے۔

امریکی فریق نے آپریشن کو انجام دینے کی اطلاع دی اور صدر ٹرمپ نے فوراً اس کارروائی کی تعریف کی؛ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ انہوں نے اپنی افواج کو مکمل اختیار دیا ہوا ہے۔ البتہ مختلف میڈیا رپورٹس میں یہ بحث موجود رہی کہ آیا صدر نے ذاتی طور پر ہر تفصیل پر باقاعدہ 'منظوری' دی یا کمانڈ چین کے اندر ممکنہ طور پر اعلیٰ فوجی قیادت نے عملی حکم جاری کیا۔ خبری و تجزیاتی حلقوں نے اس پہلو پر سوال اٹھائے کہ کتنا فیصلہ وائٹ ہاؤس کی سطح پر طے پایا۔

ابتدائی طور پر افغان فوجی حکام نے دعویٰ کیا کہ حملے میں کئی درجن جنگجو ہلاک ہوئے؛ بعد ازاں مختلف اعداد و شمار سامنے آئے۔ بعض رپورٹوں میں 36 کا ذکر آیا، جبکہ بعد میں بعض افغان حکام نے 90 کے قریب ہلاک ہونے کی بات کی۔ تاہم صحافتی اور تحقیقی جائزوں نے نشاندہی کی کہ حقیقی انسانی لاگت اور تباہی کا اندراج مقام واقعہ پر سائنسی اور آزاد معائنوں کے بغیر قطعی طور پر طے کرنا مشکل ہے، اور مقامی آبادی نے دھماکے کی شدید آواز اور خوفناک اثرات کی روداد سنائی۔ اس حملے نے بین الاقوامی برادری میں اخلاقی و قانونی بحث بھی بھڑکادی؛ بعض نے اسے دہشتگردوں کے خلاف ضروری قدم قرار دیا اور بعض نے کہا کہ اتنے بڑے روایتی ہتھیار کا استعمال انسانی سیکورٹی اور شہری حفاظت کے اصولوں کے مد نظر متنازع ہے۔

"تمام بموں کی ماں" جیسا خطرناک بم کو مخصوص طریقے سے طیارہ پر لاداجاتا ہے اور پھر وہ مخصوص انڈر آپ کے ذریعے گرایا جاتا ہے۔ بعد ازاں افسران نے اشارہ دیا کہ یہ بم خاص آپریشنل یونٹس کے جہاز سے روانہ ہوا۔ رپورٹس میں اس نوعیت کے بم کو سی/130 طرز کے کارگو طیارے کے ذریعے ڈیلیور کیا جاتا ہے اور مخصوص ڈراگ پیراشوٹ وغیرہ کی مدد سے ریلیز کیا جاتا ہے۔

دراصل ٹرمپ نے امریکی طاقت کے غرور میں اس بم کو گرا کر عالمی و علاقائی تسلط کو ثابت کرنے کیلئے یہ سٹریٹیجک پیغام دیا کہ امریکا اپنے عسکری آپشنز کو استعمال کرنے میں تاخیر نہیں کرے گا اور جنگجوؤں کو ہر اس زدہ کرنے اور میڈیا میں طاقت کی نمایاں نمائش کا نفسیاتی پیغام دیا لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سے انسانی حقوق کے گروپس اور بین الاقوامی اداروں کے سوالات اٹھانے پر اپنی اخلاقی و قانونی حیثیت کو بحال رکھنے کیلئے یہ جواب دیا کہ اتنا بڑا بم مقامی آبادی اور شہری ڈھانچے کیلئے خطرناک نہیں تھا۔ آئی سی آر سی اور دیگر کیس سٹڈی "نے اس استعمال کی اخلاقی اور قانونی جہتوں پر بحث کر کے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش بھی کی۔

عملی طور پر اس ایک ضرب نے داعش کے مخصوص ٹھکانوں کو نشانہ بنایا اور عارضی طور پر ان کے رکاوٹیں کم کی گئیں؛ مگر افغانستان میں وسیع سیاسی اور عسکری پیچیدگیاں برقرار ہیں۔ اس ضرب کا بڑا اثر علاقائی سیاست یا جنگ کے مجموعی توازن میں دیرپا تبدیلی لانے میں محدود رہا۔ یعنی اس نے میدان جنگ کی سمتی حرکات کو وقتی طور پر متاثر کیا مگر طویل المدت پائیدار امن یا استحکام کا ضامن ثابت نہ ہوا، اور میدان عمل میں امریکا کو شکست سے بچانہ سکا۔

تاریخ کے اس پل پر جب ہوانے شعلوں کی کیفیت بھری اور پہاڑوں نے گونجنا شروع کیا، تو یہ منظر محض عسکری کارروائی نہیں تھا بلکہ طاقت کی ایک نمائشی لہر بھی تھی۔ "بم ماں" نے اس لمحے اپنی دھمک دکھائی۔ ایک نشانِ ارادہ کہ جدید امپیریل قوتیں اب بھی صفِ اوّل پر اپنی ہوا بازی اور دھماکہ

خیزی کے ذریعے سیاست بولتی ہیں۔ مگر تاریخ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جو فوجی دھماکے بڑے ہوں، ان کے سیاسی، اخلاقی اور انسانی اثرات بھی بڑے ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ سوال ہے جو اس واقعے نے عالم انسانی کے ضمیر میں چھوڑا۔

امریکا بہادر 2021-2001ء تک افغانستان پر اپنے اتحادیوں سمیت ظلم و ستم ڈھاتا رہا اور اب ایک مرتبہ پھر 2025ء میں برطانیہ کے دورے پر ٹرمپ نے چین کو اپنا اصل ہدف قرار دیتے ہوئے بگرام میں پر دوبارہ قبضے کی بریکنگ خبر سے اقوام عالم کو آگاہ کیا ہے جبکہ تین سابقہ ادوار ظاہر کرتے ہیں کہ افغانستان عالمی طاقتوں کا قبرستان رہا ہے، مگر ہر نئی طاقت پھر بھی اس وادی میں قدم رکھنے کو مجبور نظر آتی ہے۔ یہ تقابلی اور زمینی حقائق تاریخ کا حصہ ہیں کہ طاقتیں آتی جاتی ہیں، لیکن افغان سرزمین کسی کیلئے ہمیشہ کی جاگیر نہیں بنی۔

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (ال عمران: 139) کمزور نہ پڑو اور غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان والے ہو۔ یہ آیت اہل ایمان کو یاد دلاتی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوتیں آتی جاتی رہتی ہیں، مگر اصل قوت ایمان اور عزم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَبِيرُ الْمَكْرِ﴾ (ال انفال: 30) وہ اپنی تدبیریں کرتے ہیں، اور اللہ اپنی تدبیر کرتا ہے، اور اللہ ہی سب سے بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ عالمی طاقتوں کے جال خواہ کتنے ہی پیچیدہ ہوں، اللہ کی تدبیر سب پر غالب ہے۔

اس لئے پاکستان کیلئے انتہائی ضروری ہے کہ اپنی خارجہ پالیسی میں امریکا کو راستہ دینے سے گریز اور خطے میں متوازن تعلقات پر بھرپور توجہ دی جائے۔ سعودی عرب اور دیگر مسلم ممالک کے ساتھ معاہدوں کو مزید مستحکم کرنے کیلئے دیگر مسلمان ممالک (ایران، ترکی اور خلیجی ممالک) کو بھی شامل کرنے کیلئے شب و روز کام کیا جائے۔

بلوچستان اور سرحدی علاقوں میں بھارتی پر کسی نیٹ ورک کو ختم کرنے کیلئے یقیناً سفارتی تعلقات کو اولیت دی جائے اور ایک مرتبہ پھر چین جیسے مخلص دوست کو شامل کر کے یہ واضح کیا جائے کہ بگرام کے معاملے میں ٹرمپ کے واضح اعلان جس میں چین کو ہدف قرار دیا گیا ہے، اب پاک افغان کشیدگی کا ایک واضح اور مستقل سنجیدہ حل درکار ہے جس میں انڈین پراسسیر کا باقاعدہ دوسرے ذرائع سے جواب دینا بھی ایجنڈے میں شامل کیا جائے۔

بگرام ایئر بیس کی کہانی دراصل عالمی سیاست کے عروج و زوال اور تاریخ کے فیصلوں کی کہانی ہے۔ بگرام ایئر بیس کی داستان ہمیں بتاتی ہے کہ طاقتور قومیں ہمیشہ کمزوروں کے وسائل پر نظریں جماتی ہیں، لیکن تاریخ کی بارگاہ میں کوئی زبردست بھی ہمیشہ کیلئے زبردست نہیں رہتا۔ سوویت یونین ہو یا امریکا، سب نے یہاں اپنی سلطنت کے خواب دیکھے مگر یہ خواب افغان خاک میں دفن ہو گئے۔ ہر طاقت نے یہاں اپنے خواب بننے چاہے، مگر انجام وہی ہوا جو تاریخ کے فیصلوں میں لکھا جا چکا تھا۔ آج پھر ایک نئی بازی سجنے جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان کس بصیرت اور حکمت سے اس شطرنج کی بساط پر اپنی چال چلے اور مستقبل کے اس نئے خطرناک منظر نامے کا سامنا کرے؟

بگرام کی داستان محض ایک فوجی اڈے کی تاریخ نہیں، بلکہ یہ اس عظیم اصول کی گواہی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے فرامین اور قیصر و کسریٰ اپنی تدبیروں کے باوجود اس سرزمین پر شکست کھا چکے ہیں۔ سوویت یونین اپنے ٹینکوں کے شور کے ساتھ آیا، مگر اس کا انجام ٹوٹے ہوئے بتوں کی طرح ہوا۔ امریکا

اپنے جدید ترین اسلحے اور اتحادیوں کے جتھوں کے ساتھ آیا، مگر رسوائی اس کے حصے میں آئی۔ اور آج جب وہ پھر پلٹ کر دیکھ رہا ہے تو گویا اپنی شکست کی راکھ میں چنگاریاں تلاش کر رہا ہے۔

پاکستان اور مسلم دنیا کیلئے یہ لمحہ ایک عظیم آزمائش بھی ہے اور ایک روشن موقع بھی۔ اگر ہم نے حکمت، بصیرت اور ایمان کے ساتھ اپنی راہیں متعین کیں تو یہ خطہ ہماری عزت اور وقار کا مینار بن سکتا ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (محمد: 7) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔

یہی وہ عہد ہے جو ہمیں تاریخ سے سیکھنا ہے۔ بگرام کی اینٹوں اور دیواروں میں دفن عبرت ہمیں یہ پیغام دیتی ہے کہ وقت کا دھارا بدل سکتا ہے، سامراجی تخت بل سکتے ہیں، مگر ایمان اور حکمت سے لیس قومیں ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔

تقدیر کے قافلے: پاکستان، ایمان اور تاریخ

تاریخ انسانوں کی محض داستان نہیں، یہ اقوام کی روح اور ملتوں کی تقدیر ہے۔ جب کبھی ہم پاک امریکا تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدیوں پرانی کوئی روداد ہے جو نئے کرداروں کے ساتھ بار بار دہرائی جا رہی ہے۔ یہ وہی سرزمین پاکستان ہے جو اللہ کے نام پر وجود میں آئی، جہاں کے باشندے "لا الہ الا اللہ" کے قافلے کے سپاہی ہیں۔ مگر افسوس! عالمی سیاست کی شطرنج پر یہ قافلہ اکثر طاقتوروں کے مہرے بنادیا گیا۔ قرآن ہمیں "یاد دلاتا ہے: وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمْ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ، کمزور نہ پڑو، غمگین نہ ہو، تم ہی غالب رہو گے اگر ایمان والے ہو۔

مگر افسوس! عالمی سیاست کی شطرنج پر یہ قافلہ اکثر طاقتوروں کے مہرے بنادیا گیا ہے۔ کبھی ٹرمپ کے الزامات کا طوفان، کبھی دوستی کے دعوے، کبھی سرمایہ کاری کی مسکراہٹ اور کبھی جنگ و امن کے فیصلے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ملتیں جب اپنی بنیاد بھول جائیں تو ان کے ساتھ وہی کچھ ہوتا ہے جو کبھی اندلس میں ہوا، کبھی بغداد کی گلیوں میں، اور کبھی دہلی کے کوچوں میں۔ اقبال کی صدا آج بھی ہمیں جھنجھوڑتی ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

سر آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی

پاکستان کا یہ سفر محض سیاسی معاہدوں کا نہیں بلکہ اپنی اصل، اپنی بقا اور اپنی عظمت کی بازیافت کا سفر ہے۔ اور یہی سوال ہے جس کے جواب پر آنے والی نسلوں کی تقدیر لکھی جائے گی۔

آج بھی ہمارے سامنے وہی سوال ہے: کیا ہم اپنی تقدیر کے معمار بنیں گے یا پھر دوسروں کی کٹھ پتلی؟ کبھی ٹرمپ کے الزامات کا طوفان، کبھی دوستی کے دعوے، کبھی سرمایہ کاری کی مسکراہٹ، اور کبھی جنگ و امن کے فیصلے۔ یہ سب کچھ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ملتیں جب اپنے اصول بھول جائیں تو تاریخ ان پر وہی کھیل دہراتی ہے جو کبھی اندلس میں ہوا، کبھی بغداد میں، اور کبھی دہلی کی گلیوں میں۔ پاکستان کا یہ سفر محض سیاسی معاہدوں کا نہیں بلکہ اپنی اصل، اپنی بقا اور اپنی عظمت کی بازیافت کا سفر ہے۔ اور یہی سوال ہے جس کے جواب پر آنے والی نسلوں کی تقدیر لکھی جائے گی۔

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں وزیراعظم پاکستان شہباز شریف نے اپنی تقریر کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ یہ آغاز محض روایتی نہ تھا بلکہ اس نے پوری دنیا کو یاد دلایا کہ پاکستان کی اصل بنیاد "لا الہ الا اللہ" پر ہے، اور ہماری سیاسی و سفارتی گفت و شنید بھی اسی روحانی سرچشمے سے جڑی ہے۔

حالیہ پاک-بھارت جنگ کے پس منظر میں پاکستان کی تاریخی فتح نے جنرل اسمبلی کے ایوانوں کو ایک نئی فضا بخشی۔ بھارتی طیارے جب آسمان پر لمبے کے ڈھیر میں تبدیل ہوئے تو یہ منظر محض عسکری کامیابی نہ رہا، بلکہ ایک عہد کی تبدیلی کا اعلان تھا۔ اسی لمحے ہال "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھا: یہ نعرہ محض حب الوطنی کا اظہار نہ تھا بلکہ ایک زخمی ملت کی روح کا ابھرتا ہوا ترانہ تھا۔ چین کے وزیراعظم نے شہباز شریف کی تقریر کی کھل کر تعریف کی۔ گویا مشرقِ بعید کی ایک بڑی طاقت نے اس اعلان کو سراہا کہ پاکستان اب محض ایک ملک نہیں بلکہ عالمی توازن میں ایک فیصلہ کن قوت ہے۔

کبھی یہی امریکا تھا جب ٹرمپ پاکستان کو دہشتگردوں کی پناہ گاہ قرار دیتا تھا، اور کبھی یہی ٹرمپ اپنے پہلے دورِ صدارت میں عمران خان کو "دوست" کے لقب سے نوازتا تھا مگر جو نہی تاریخ کی بساط پر مہرے بدلے، صدارت کی کرسی کا رنگ بدلا، جو بائیڈن کی باری آئی، اور ایک بار پھر دونوں ملکوں کے رشتے

سرد مہری کے برف زار میں جا پہنچے۔ نہ وائٹ ہاؤس میں ملاقات ہوئی، نہ فون کی گھنٹی بجی۔ گویا دو قافلے ایک ہی راہ پر چلتے ہوئے بھی اجنبی رہ گئے اور پاکستان و امریکا کے بیچ وہی پرانا بگڑا ہوا سا پھر بجنے لگا جس میں نہ ملاقات کی لے تھی نہ گفتگو کی تان۔

لیکن جمعرات کا دن ایک نیا ورق لے کر آیا۔ ٹرمپ نے شہباز شریف اور فیلڈ مارشل عاصم منیر کو "عظیم رہنما" اور "بہترین شخصیتیں" کہہ کر گویا وہ قفل کھولا جو برسوں سے خاموشی کے زنگ سے بند پڑا تھا۔ وہ بخ بستہ برف کو توڑ ڈالا جو عرصوں سے ان تعلقات پر جمی ہوئی تھی۔ بعد ازاں وائٹ ہاؤس میں ان کی ملاقات ہوئی جسے تاریخ ایک نیا موڑ قرار دے گی۔

ٹرمپ نے اس ہفتے مسلم ممالک کے رہنماؤں سے ایک خصوصی نشست بھی رکھی، جسے انہوں نے یادگار کہا۔ انہوں نے اسرائیل کے رویے پر کھل کر مایوسی کا اظہار کیا۔ ایک ایسا اعتراف جو کسی امریکی صدر کے لبوں سے بہت کم سننے کو ملا ہے۔ اس موقع پر ٹرمپ نے مسلم رہنماؤں کے سامنے مشرق وسطیٰ اور غزہ کیلئے 21 نکاتی امن منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے میں جنگ بندی، انسانی امداد کی فوری فراہمی، غزہ میں خود مختار انتظامیہ کی تشکیل، مقبوضہ علاقوں میں اسرائیلی توسیع پسندی کی روک تھام، بیت المقدس کی حیثیت پر مذاکرات، فلسطینی قیدیوں کی رہائی، اور اقوام متحدہ کی زیر نگرانی امن فوج کی تعیناتی جیسے نکات شامل تھے۔ یہ منصوبہ بظاہر امن کا پیغام ہے، مگر اس کے سیاسی اثرات آنے والے برسوں تک مشرق وسطیٰ کے نقشے پر ثبت ہوں گے ملاقات کے بعد وزیراعظم ہاؤس کی طرف سے جو پیغام آیا وہ سرمایہ کاری کی خوشبو سے لبریز تھا۔ امریکی کمپنیوں کو پاکستان کے کھیتوں کی زرخیزی، پہاڑوں کے خزانے اور توانائی کے دریاؤں میں سرمایہ کاری کی دعوت دی گئی۔ یوں لگتا ہے کہ پاکستان اپنے دروازے کھول رہا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے؟ کیا یہ دعوت ہمارے لیے نعمت ثابت ہوگی یا آزمائش؟

اس محفل گفتگو میں صرف دولت کا ذکر نہ تھا، بلکہ خطے کے حالات اور دہشتگردی کے خلاف تعاون پر بھی زور دیا گیا۔ امن کا چراغ بھی روشن کیا گیا۔ گویا یہ نشست ایک ایسا وعدہ تھی جہاں گویا امن کی شمع کو بجھنے نہ دینے کا عزم پھر سے دہرایا گیا۔ جس میں امن کی خوشبو اور مفادات کی بودونوں شامل تھیں۔

تاریخ کا پنہاں باب یہ بھی ہے کہ رواں برس مئی میں پاک و ہند کے درمیان جب جنگ کے بادل چھا گئے تو ٹرمپ نے اس آندھی کو تھامنے کا سہرا اپنے سر باندھا اور پاکستان کے رہنماؤں نے بھی ان کی اس کوشش کو "مین آف پیس" کہہ کر تسلیم کیا۔ مگر حقیقت کی زمین پر یہ ملاقات کیا معنی رکھتی ہے اور اس ملاقات کا حاصل کیا تھا؟ دونوں ممالک ایک دوسرے کی ضرورت کو بخوبی جانتے ہیں۔ دونوں ملک ایک دوسرے کی ضرورت کے اسیر ہیں، اور ہر ایک اپنی غرض کے چراغ جلائے ہوئے ہے۔

ٹرمپ کی نظر دنیا کی نایاب معدنیات پر ہے اور اس کی آنکھوں میں معدنیات کی چمک اس کی دوستی کا سبب ہے۔ دنیا کی نایاب دھاتیں ان کیلئے وہ خزانہ ہیں جن کے حصول میں وہ اپنی طاقت جھونک دینے کو تیار رہتے ہیں اور پاکستان کا دعویٰ ہے کہ اس کے دامن میں یہ خطیر دولت موجود ہے۔ حال ہی میں امریکی کمپنی یو ایس ایم ایم نے 50 کروڑ ڈالر کی سرمایہ کاری کے کاغذ پر دستخط کر کے اپنی دلچسپی کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے مگر تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ معدنیات کی کان کھلتی ہے تو دولت باہر نکلتی ہے مگر مقامی آبادی کے ہاتھ خالی رہ جاتے ہیں۔ خاص طور پر بلوچستان کا شورش زدہ خطہ اس المیے کا سب سے بڑا گواہ ہے۔ جو دہائیوں سے شورش کا گہوارہ ہے، ایک بار پھر اس شطرنج کی بساط میں قربانی کا پیادہ بن سکتا ہے۔

پاکستان نے بھارت کو بارہا مذاکرات کی پیشکش کی ہے اور امریکا سے ثالثی کی امید باندھی ہے۔ کچھ مبصرین کہتے ہیں کہ اگر پاکستان و امریکا کی قربت بڑھی تو اس کی بازگشت صرف جنوبی ایشیا ہی نہیں بلکہ مشرق وسطیٰ تک سنائی دے گی۔ لیکن دہلی کی سیاست ایسی ہے کہ وہ کسی غیر ملکی کردار کو اپنے اور پاکستان کے معاملات میں قبول کرنے سے انکار اور گریزاں ہے۔ دوسری طرف خود امریکا اور بھارت کے رشتے بھی اس وقت کشیدگی کا شکار اور ریت کی دیوار کی طرح ہیں۔ روسی تیل خریدنے پر امریکا نے بھارت پر پچاس فیصد ٹیرف عائد کیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ٹرمپ کے دل کے پردوں میں کون سا منصوبہ چھپا ہوا ہے اور دماغ میں کیا چل رہا ہے؟

پاکستان کی مشرقی سرحد کے جھگڑوں سے ہٹ کر مغربی محاذ پر امریکا کو اپنی ضرورت نظر آتی ہے۔ پاکستان جانتا ہے کہ اس کی مشرقی سرحد پر جھگڑے کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ شاید اسی لیے امریکا کو اس کی ضرورت مغربی محاذ پر زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ ایران کا مسئلہ امریکا کیلئے سنگینی ہوئی چنگاری نہیں بلکہ بھڑکنے والا انگارہ ہے اور وہ چاہتا ہے کہ پاکستان کے ساتھ مل کر اس کا کوئی حل تلاش کرے۔ اگر پاکستان ساتھ دے تو شاید یہ خطرناک آگ بجھائی جاسکے، اور اس کے بدلے میں پاکستان کو بلوچستان اور قبائلی شورشوں میں مدد مل سکتی ہے۔

اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو نے جب جہول اسمبلی سے خطاب کیا تو متعدد ممالک کے وفود احتجاجاً ایوان سے نکل گئے۔ یہ منظر بتا رہا تھا کہ اسرائیل کی جارحانہ پالیسیوں کو اب عالمی برادری مزید برداشت کرنے پر آمادہ نہیں۔



غزہ میں قتل عام کے پس منظر میں یورپی فٹ بال تنظیم "یو ایفا" نے اسرائیل کی رکنیت معطل کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ اگر یہ قدم اٹھایا گیا تو یہ اسرائیل کے عالمی کھیلوں کے محاذ پر ایک بڑی شکست ہوگی۔

یورپی ملک سلوونیائی نے اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو پر سفری پابندیاں عائد

کردی ہیں۔ یہ اعلان گویا یورپ کے ضمیر کی پہلی بیداری ہے، ایک اشارہ کہ اب عالمی برادری اسرائیل کے خلاف عملی اقدامات کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اسی دوران اسرائیلی فوج نے یمن کے دارالحکومت صنعاء پر شدید بمباری کی۔ یہ بمباری مشرق وسطیٰ میں آگ کو مزید بھڑکانے کے مترادف ہے اور یہ سوال جنم لیتی ہے کہ کیا عالمی امن منصوبے اس شعلے کو بجھاپائیں گے یا نہیں؟

مشرق وسطیٰ کے تذکرے میں پاکستان کا ذکر گویا ناگزیر ہے۔ سعودی عرب اور پاکستان کا حالیہ دفاعی معاہدہ امریکا کی نظر سے پوشیدہ نہیں، اس نے امریکا کو متوجہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرمپ عرب ممالک سے گفتگو کے ساتھ ساتھ پاکستانی رہنماؤں سے بھی بات چیت کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ٹرمپ کا عرب دنیا اور پاکستان دونوں سے گفتگو کرنا اس حقیقت کی دلیل ہے کہ واشنگٹن خطے میں پاکستان کی حیثیت کو ایک ناگزیر کھلاڑی سمجھتا ہے اور خاص اہمیت دیتا ہے۔

فیلڈ مارشل عاصم منیر وہ پہلے پاکستانی رہنما ہیں جنہوں نے وائٹ ہاؤس کے دروازے پر قدم رکھا اور ٹرمپ سے براہ راست ملاقات کی۔ ان کے حالیہ دورے — خواہ وہ خلیجی ممالک ہوں، وسطی ایشیا ہو یا شنگھائی تعاون تنظیم — سب اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں عسکری قیادت اب محض پس پردہ کردار نہیں بلکہ اگلی صف کی علم بردار ہے اور یہ اعلان ہے کہ پاکستان کی خارجہ پالیسی میں فوج کا کردار اب پردے کی اوٹ نہیں

بلکہ روشن اسٹیج پر ہے۔ جولائی کی کورکمانڈر کانفرنس میں عاصم منیر نے ان دوروں کو کامیاب سفارت کاری قرار دیا ہے۔ وزیراعظم شہباز شریف اور فوجی قیادت کے اشتراک کو دنیا نے ایک ذمہ دار سفارت کاری کا نمونہ قرار دیا ہے جس نے دنیا کو یہ باور کرایا کہ پاکستان ایک ذمہ دار ریاست کے طور پر ابھر رہا ہے۔

مبصرین بھی مانتے ہیں کہ خارجہ پالیسی کی لگام اور خارجہ پالیسی کے تمام اہم ہتھیاروں پر فوج کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہے اور وزیراعظم اس کھیل کے جو نیوز پارٹنر اور محض شریک سفر ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ فیلڈ مارشل عاصم منیر ڈرائیونگ سیٹ پر ہیں اور سولیلین حکومت ان کی معاون ہے۔ وزیراعظم کے ہمراہ ان کے غیر ملکی دورے فوج کے بڑھتے ہوئے عوامی و سفارتی کردار کی گواہی دیتے ہیں اور باہم تعاون کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سول اور ملٹری قیادت کی ہم آہنگی کھل کر سامنے آتی ہے۔ سیاسی مبصرین بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ فوج ہی پاکستان میں بالخصوص خارجہ پالیسی کی اصل ڈور سنبھالے ہوئے ہے۔ اب اس میں کوئی راز نہیں کہ پاکستان میں خارجہ پالیسی کا ساز فوج کے ہاتھ ہی بجاتا ہے۔

فیلڈ مارشل عاصم منیر اپنے پیش روؤں سے زیادہ محتاط اور پُر اعتماد دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں وہ توانائی ہے جو ممی کی جھڑپ کے بعد اور بھی نمایاں ہوئی ہے۔ دوسری طرف ٹرمپ کی سیاست کسی ایک دھارے پر نہیں بہتی۔ کبھی مودی کو "دوست" کہا اور پھر بھارت پر ٹیرف کی تلوار چلا دی۔ کبھی پوتن سے رشتہ جوڑا اور پھر یوکرین پر ان پر تنقید کے تیروں کی بارش کر دی۔ ٹرمپ کی پالیسی کا مدار ان ذاتی روابط پر ہے جو انہیں فائدہ پہنچا سکیں۔ ٹرمپ کا بیمانہ ذاتی تعلقات ہیں۔ وہ انہی کے ساتھ چلتے ہیں جو ان کے وعدوں کو نبھاتے ہیں۔ پاکستان کیلئے یہی پیغام ہے کہ اپنی قدر و قیمت کو سنبھالے رکھے، اور اپنی وقعت کو برقرار رکھے۔ ورنہ امریکا کی تاریخ یہی کہتی ہے کہ اس کا رویہ بدلتے لمحوں کی طرح ہے اور امریکا کے رویے میں تبدیلی آنا فنا آتی ہے۔ سنہ کل کی دوستی کی ضمانت دیتا ہے، نہ آج کی قربت کو کل تک پہنچاتا ہے۔

پاکستان اور امریکا کے تعلقات اس قافلے کی مانند ہیں جو کبھی سرسبز وادیوں سے گزرتا ہے اور کبھی سنگلاخ صحراؤں کی ریت پر بکھر کر ٹھٹک جاتا ہے۔ آج دونوں رفاقت کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان اس موڑ پر اپنی خود مختاری کو برقرار رکھتے ہوئے دنیا کی بڑی طاقتوں کے ساتھ توازن قائم کر سکے گا یا پھر طاقتور کی راہ میں اپنا ساز بجا کر ایک اور باب تاریخ کے اوراق میں چھوڑ دے گا؟ یا پھر یہ داستان بھی ماضی کی طرح عہد دوستی اور دوری کے نشیب و فراز کی کتاب میں ایک اور باب کا اضافہ بن جائے گی؟

اے اہل پاکستان! تاریخ کی گواہی سنو۔ یہ وہ سرزمین ہے جو کلمہ طیبہ کے نام پر بنی تھی، اور یہ وہ قوم ہے جسے اللہ نے اسلام کے پرچم کو بلند کرنے کی ذمہ داری دی ہے۔ لیکن کیا ہم نے اپنی اس ذمہ داری کو پورا کیا؟ کیا ہم نے اس مدد کو پانے کے لائق عمل کیا؟ یا اپنے فیصلوں کو کبھی واشگفتن اور کبھی دہلی کے ایوانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا؟ قرآن کہتا ہے: **إِنْ يَنْصُرْكُمْ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ**: اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔

یاد رکھو! قومیں سرمایہ کاری یا معاہدوں سے زندہ نہیں رہتیں، وہ اپنے ایمان، اپنی غیرت اور اپنے وقار سے زندہ رہتی ہیں۔ اگر ہم نے اپنی خود داری کو سنبھالا، اگر ہم نے اللہ کے دین کو اپنا سہارا بنایا تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکے گی لیکن اگر ہم نے تاریخ کے سبق فراموش کیے تو ہمارے حصے میں صرف غلامی کی زنجیریں رہ جائیں گی۔

آج پاکستان اور امریکا کے تعلقات ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ یہ موڑ صرف سفارت کاری کا امتحان نہیں بلکہ ہماری روح اور ہماری ملت کی آزمائش ہے۔ فیصلہ ہمیں کرنا ہے: کیا ہم اپنی خودی کو پہچان کر اقبال کے شاہین بنیں گے یا پھر دوسروں کے دسترخوان کے ٹکڑوں پر پلنے والے پرندے بن جائیں گے؟؟ اقبال نے ہمیں یہی سبق دیا تھا:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے

اے پروردگارِ عالم! تو ہی ہے جو قوموں کے دل بدل دیتا ہے، اور تو ہی ہے جو سلطنتوں کی تقدیر رقم کرتا ہے۔ ہماری کشتی وقت کے طوفانوں میں گھری ہوئی ہے، کبھی مشرق کے طوفان اسے دہلاتے ہیں اور کبھی مغرب کی ہوائیں اسے بہالے جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اے رب! ہمیں وہ حکمت عطا فرما جس کے بغیر طاقت محض ریت کا قلعہ ہے، اور ہمیں وہ استقلال دے جو ایمان کے چراغ سے جلتا ہے۔

یہ رپورٹ محض واقعات کی ترتیب نہیں، بلکہ ایک عہد کی گواہی ہے۔ یہاں سفارت کاری محض کاغذی بیانات سے آگے بڑھ کر ایک تاریخی موڑ پر کھڑی ہے۔ جہاں پاکستان کے کردار کو نئی مرکزیت مل رہی ہے، اور جہاں دنیا اسرائیل کے مظالم پر کھل کر سوال اٹھانے لگی ہے۔

اے اللہ! پاکستان کو اپنی پناہ میں رکھ، اس کو غلامی کی زنجیروں سے بچا، اور اس کے حکمرانوں کو وہ جرات دے کہ وہ تیرے دین کو سہارا بنائیں اور تیرے کلمے کو بلند کریں۔

اے مالک الملک! ہمیں وہ بصیرت عطا فرما جس سے ہم پہچان سکیں کہ کون سی دوستی خیر ہے اور کون سا تعلق محض دھوکہ۔
"رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ"

(اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دینا بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے۔)

وفا یا مفاد..... کابل اور دہلی کا ملاپ

جب تاریخ کے اوراق پر وقت کے قلم نے افغانستان کا نام لکھا تو اس کے ساتھ ہی تقدیر نے ایک مسلسل کشمکش کی داستان بھی رقم کر دی۔ ایک سرزمین جو کبھی سلطنتوں کی راہزور رہی، کبھی نظریات کی آزمائش گاہ، اور کبھی سامراجی قوتوں کیلئے شطرنج کی بساط۔ اسی خطہ خاک میں، جہاں ہندوؤں کی زبان نے صدیوں تک حکمرانی کی، آج سفارت کی نرمی نے آہستہ آہستہ سر اٹھانا شروع کیا ہے۔

طالبان کی حکومت، جو کبھی محض ایک عسکری وجود سمجھی جاتی تھی، اب سفارتی دروازوں پر سیاسی گفت و شنید کی بجائے دشمنوں کی زبان میں بات کر رہی ہے اور جب ان کے وزیر خارجہ امیر خان متقی، دہلی کی سمت قدم بڑھاتے ہیں، تو یہ محض ایک سرکاری دورہ نہیں، یہ تاریخ کے گہرے سمندر میں پھینکا گیا ایک نیالنگر ہے؛ ایک ایسی کوشش جو برصغیر کے دوازی حریفوں، انڈیا اور افغانستان کے درمیان ایک نئی فکری راہداری کھولنے جارہی ہے۔

تاریخ کے دھارے میں کچھ لمحے ایسے آتے ہیں جب قومیں صرف فیصلے نہیں کرتیں، بلکہ اپنے ماضی کے ساتھ مکالمہ کرتی ہیں۔ افغانستان اور بھارت کے مابین بڑھتی ہوئی قربت کا منظر آج پاکستان کے عوام کے دلوں میں ایک خاموش کرب پیدا کر رہا ہے۔ وہی پاکستان، جس نے چالیس برس تک افغان بھائیوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھا، جس نے اپنی زمین، اپنے وسائل، اپنے گھروں تک کو مہمان نوازی کے نام پر وقف کر دیا، آج وہی قوم یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ:

کیا یہ وقت کا الٹا بہاؤ ہے یا تاریخ کی ناقدری کا مظہر؟ پاکستانی عوام اپنے دل کے نہاں خانوں میں یہ سوال لیے بیٹھے ہیں کہ جن افغان بھائیوں کیلئے اس ملک نے اپنی معیشت، امن اور خون سب کچھ قربان کیا، آج وہی افغان زمین ٹی ٹی پی اور بی ایل اے جیسے گروہوں کیلئے پناہ گاہ کیوں بنی ہوئی ہے؟ کیوں وہی مٹی، جسے کبھی برادرانہ محبت کا استعارہ سمجھا جاتا تھا، اب دہشت اور عداوت کے لشکر وہاں سے روانہ ہو رہے ہیں؟ اور اس سارے منظر نامے کے پیچھے، وہی ازلی سیاسی مد مقابل، بھارت، جس نے گزشتہ دہائیوں میں طالبان کے خلاف ہر مخالف دھڑے کو سہارا دیا، اب انہی طالبان کے ساتھ مصافحے اور مفاہمت کا دعویدار بن بیٹھا ہے۔

یہ وہی بھارت ہے جو چند ماہ قبل مئی کی جنگ میں پاکستان کے ہاتھوں رسوائی کا مزہ چکھا ہے اب وہی بھارت، انتقام کی نفسیات کے زیر اثر، کابل کے راستے اسلام آباد کو زک پہنچانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جہاں پاکستان اپنے جذبہ اخوت کے سائے میں بیٹھا سوچ رہا ہے تاریخ ایک بار پھر دوستی اور دشمنی کے چوراہے پر کھڑی ہے کہ آخر محبت کی وہ فصل جو ہم نے برسوں اپنے لہو سے سینچی، آج اس کے کانٹے ہمیں ہی کیوں چبھنے لگے ہیں؟

پاکستان کی روایتی قربت، چین کا بڑھتا اثر، اور روس کی نرم مداخلت کے پس منظر میں یہ دورہ ایک خاموش مگر زلزلہ خیز سیاسی اشارہ ہے۔ یہ اس امر کا اعلان ہے کہ خطے کی سیاست اب صرف ہندوؤں کے دہانے سے نہیں، قلم اور مکالمے کے وقار سے بھی نہیں بلکہ سازشی اور انتقامی مزاج سے طے ہوگی۔ گو بھارت نے ابھی تک طالبان کو باضابطہ تسلیم نہیں کیا، مگر تسلیم کی بنیاد ہمیشہ دل کے نرم گوشے اور قلم کی شیریں مفاہمت کے الفاظ سے پھوٹی ہے مگر یہاں پاکستان کے ازلی دشمن انڈیا کے ساتھ سازشوں کے جھر مٹ اور احسان فراموشی سے اٹھتی دکھائی دے رہی ہے۔

یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے جنوبی ایشیا کی نئی سیاست کی ابتدا ہو رہی ہے جہاں دشمنی کی راہ سے مکالمے کا پہلا شعلہ ابھر رہا ہے۔ یہ لمحہ دراصل تاریخ کے اس موڑ کی مانند ہے، جہاں ماضی کے دشمن مستقبل کے معمار بننے کی تیاری کر رہے ہیں، اور سفارت، جسے کبھی کمزوری سمجھا جاتا تھا، اب حکمت کا سب سے مضبوط ہتھیار بننے کی بجائے اپنے مفادات کی تکمیل کیلئے تیاریاں ہو رہی ہیں۔

جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ ہمیشہ تغیر کے طوفانوں سے عبارت رہی ہے۔ یہاں اقتدار کا محور بدلتا رہا مگر طاقت کا جغرافیہ کبھی خالی نہیں رہا۔ اس خطے میں افغانستان ہمیشہ ایک دروازے اور دیوار دونوں کا کردار ادا کرتا آیا ہے۔ ایک ایسا دروازہ جو تہذیبوں کو جوڑتا ہے، اور ایک ایسی دیوار جو مفادات کی سرحدیں متعین کرتی ہے۔ آج جب طالبان کے وزیر خارجہ امیر خان متقی کے مجوزہ بھارتی دورے کی خبر منظر عام پر آتی ہے، تو یہ صرف ایک سفری اطلاع نہیں، بلکہ تاریخ کے دھارے میں بدلتی ہوئی سمت کا اعلان ہے کہ افغان بھائیوں پر اعتماد اور فخر کرنے والے ہم جیسے قہکار بھی برسوں کی محنت اور محبت کو بغض و عناد کے حوالے کا دکھ دیکھنے کیلئے زندہ ہیں۔

تاریخ کے صفحات پر ایسے لمحات کبھی کبھار رقم ہوتے ہیں جب سیاست محض اقتدار کی تدبیر نہیں رہتی، بلکہ تہذیبوں کے تصادم اور مفاہمت کے بیچ ایک فکری مکالمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ امیر خان متقی کا مجوزہ بھارتی دورہ اگر اسی نوع کی ایک پیش رفت ہوتا، جو بظاہر سفارتی، مگر درحقیقت علاقائی سیاست کے توازن میں ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتا تو یہ بھائیوں کے درمیان ایک شاندار موقع ہوتا لیکن افسوس یہ ہے کہ بالآخر افغان بھائی بھی شاطر ہندو برہمن کی چالوں کا شکار بنتے جا رہے ہیں۔

یہ دورہ دراصل علاقائی قوتوں کے باہمی رسہ کشی کے بیچ ایک نیا توازن پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ پاکستان اور چین، دونوں افغانستان میں اثر رکھنے والے ممالک ہیں۔ چین نے بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے تحت چینی سرمائے کی جڑیں گہری کی ہیں، جبکہ پاکستان تاریخی و جغرافیائی رشتے کی بنا پر طالبان پر اثر انداز رہا ہے۔ بظاہر ان حالات میں متقی کا بھارت جانا یہ پیغام دیتا ہے کہ طالبان کثیرالسمتی سفارت کی راہ پر گامزن ہیں یعنی وہ ایک ملک کے زیر اثر نہیں رہنا چاہتے لیکن صد افسوس کہ حالات کسی اور سمت کی چغلی کھا رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کی پابندیوں کے طویل پس منظر میں یہ دورہ اس وقت ممکن ہوا جب طالبان رہنماؤں کو محدود استثنایا گیا۔ امیر خان متقی کا انڈیا جانا نہ صرف طالبان حکومت کیلئے پہلا باضابطہ سفارتی تجربہ ہے، بلکہ افغانستان کیلئے عالمی سطح پر دوبارہ سیاسی تناظر میں واپسی کی علامت بھی ہے۔ یہ سفر اس لحاظ سے بھی غیر معمولی ہے کہ انڈیا تاحال طالبان حکومت کو تسلیم نہیں کرتا، مگر اس کی خارجہ پالیسی میں اب روابط کے نئے درجے کھلنے لگے ہیں۔

یہ دورہ اس وقت ممکن ہوا جب اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے طالبان رہنماؤں پر عائد سفری پابندیوں میں جزوی نرمی کی۔ یوں متقی کا یہ سفر محض ایک رسمی دورہ نہیں بلکہ افغان حکومت کے عالمی ادغام کی سمت پہلا قدم ہے۔ یہ دورہ ایک ایسے وقت پر ہو رہا ہے جب چین کا اثر و سوخ افغانستان میں تیزی سے بڑھ رہا ہے، روس طالبان سے براہ راست روابط قائم کر چکا ہے، امریکا بگرام ایئر بیس کی واپسی کے بعد خطے میں اپنا کردار محدود کر چکا ہے۔ یوں متقی کا انڈیا جانا دراصل جنوبی ایشیا میں طاقت کے محور کی از سر نو ترتیب کا مظہر ہو تو خطے کیلئے انتہائی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

طالبان رہنماؤں پر اقوام متحدہ کی پابندیوں کا خاتمہ نہیں، مگر جزوی استثنایک علامتی "اعتراف" ہے کہ دنیا طالبان سے مکمل انقطاع نہیں چاہتی۔ طالبان کو انڈیا کا دورہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عالمی برادری کو یہ پیغام دینا چاہئے کہ طالبان اب "محض ایک داخلی قوت" نہیں بلکہ علاقائی استحکام کے ضامن کے

طور پر خود کو منوانا چاہتے ہیں۔ انڈیا، جو کبھی طالبان کا شدید ناقد اور مخالف گروہوں کا حامی رہا، اب اسی طالبان حکومت سے مکالمے کی راہ تلاش کر رہا ہے۔ یہ منظر نامہ دراصل تبدیل ہوتے ہوئے جغرافیائی مفادات کی نئی کہانی سناتا ہے۔

طالبان وزارت خارجہ کے ترجمان نے متقی کے دورے کی تصدیق کی ہے مگر تفصیلات بیان کرنے سے احتراز کیا ہے۔ یہ احتیاط خود اس امر کا اشاریہ ہے کہ طالبان اپنی نئی سفارت کاری میں جہاں مصلحت اور وقار کو یکجا کرنا چاہتے ہیں وہاں پاکستان کو بھی ایک پیغام دینا مقصود ہے، نہ خاموشی میں کمزوری ہے، نہ اعلان میں جلد بازی۔ یہ "خاموش سفارت" دراصل ان کے نئے سیاسی بلوغت کی علامت ہے بلکہ وہ قوت ہے جو سیاست کے وقار اور مزیت کو سمجھ چکی ہے۔ متقی کا انڈیا جانا محض ایک خبر نہیں بلکہ خطے کے سفارتی نقشے پر ابھرتی ہوئی نئی لکیروں کی علامت ہے۔ انڈیا نے ابھی تک طالبان حکومت کو باضابطہ طور پر تسلیم نہیں کیا، مگر اس کے باوجود دونوں جانب سے رابطوں میں جو حرارت محسوس کی جا رہی ہے، وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ سفارت کاری کا دریا کبھی مکمل خشک نہیں ہوتا۔

سلامتی کونسل سے استناد دراصل طالبان حکومت کیلئے عالمی دروازوں کی نیم واپالیسی ہے۔ اگست 2021 میں اقتدار پر قبضے کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ایک طالبان وزیر بھارت کا باضابطہ دورہ کرنے والا ہے اور یہ محض سفارت نہیں بلکہ بحالی اعتبار کی ایک ابتدائی لہر ہے۔ یہ عالمی سطح پر طالبان حکومت کی بتدریج قبولیت کی طرف اشارہ ہے۔ گو تسلیم حکومت ابھی دور کی بات ہے، مگر یہ سفر قبولیت مکالمہ کی ایک ابتدائی منزل ہے۔

انڈیا کی افغان پالیسی ہمیشہ دو انتہاؤں کے درمیان معلق رہی ہے۔ ایک طرف طالبان سے تاریخی بدگمانی، دوسری جانب افغانستان میں اپنے سرمایہ کاری و اثر کے تحفظ کی مجبوری۔ انڈیا نے بظاہر طالبان سے فاصلہ رکھا مگر پس پردہ اعتماد سازی کی کوششیں بھی جاری رکھیں یعنی تسلیم کیے بغیر تعلقات، شراکت کے بغیر موجودگی، اور فاصلہ رکھتے ہوئے قربت کے راستے پر گامزن رہتے ہوئے چانکیہ سیاست پر عملدرآمد جاری رہے۔

مئی 2025 میں کشمیر کے علاقے پہلگام میں فالس فلیگ حملے کے بعد انڈین وزیر خارجہ ایس جے شنکر نے متقی سے براہ راست رابطہ کیا۔ پہلگام حملہ محض ایک سکیورٹی واقعہ نہیں تھا، بلکہ اس نے خطے میں اعتماد کی شکنگی کا منظر دوبارہ ابھرا۔ تاہم انڈیا کا طالبان وزیر خارجہ سے فون پر رابطہ اس امر کا غماز ہے کہ دشمنی کے باوجود مکالمہ زندہ ہے۔ یہ رابطہ دشمنی کے ایوان میں دوستی کی ہلکی سی سرگوشی تھی۔ ماہرین کے مطابق یہ لمحہ دونوں ممالک کیلئے ایک سفارتی وقفہ تنفس ثابت ہوا، جس نے ایک منجمد تعلق میں حرارت مکالمہ پیدا کی۔

اس دورے کی اہمیت اس وقت دوچند ہو جاتی ہے جب ہم اسے چین اور روس کے بڑھتے ہوئے طالبان تعلقات کے پس منظر میں دیکھیں۔ چین کا افغانستان میں سرمایہ کاری کے ذریعے اثر بڑھ رہا ہے، روس بھی سفارتی سطح پر متحرک ہے، اور پاکستان کا تاریخی کردار اب بھی زیر بحث ہے۔

انڈیا کیلئے یہ موقع ایک سیاسی توازن نو قائم کرنے کا ہے۔ گویا دہلی اب کابل کے ساتھ ایک نیا مکالمہ ترتیب دینا چاہتی ہے تاکہ بظاہر چین اور پاکستان کے بڑھتے ہوئے اثر کو سفارتی تدبیر کے پردے سے زائل کیا جاسکے۔ تاریخی طور پر انڈیا نے ہمیشہ ان افغان قوتوں کی پشت پناہی کی جو طالبان کے مخالف رہے خواہ وہ شمالی اتحاد ہو یا کابل کی سابقہ حکومتیں۔ طالبان کو ہمیشہ پاکستان کا آلہ کار سمجھا گیا لیکن طالبان کے اقتدار میں آنے کے بعد انڈیا نے یہ جاننا کہ اب انہیں نظر انداز کرنا خود کو ماضی میں قید رکھنا ہو گا۔ تاہم اب دہلی کا رویہ بدل رہا ہے؛ وہ جان چکا ہے کہ طالبان کو نظر انداز کرنا گویا افغان حقیقت سے



انکار ہے اور طالبان سے تعلقات کو بہتر بنانا اس کیلئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس وقت بھارتی فتنہ خوار جٹ ٹی ٹی اور بی ایل اے کی پشت پناہی کرنے میں مزید فری ہینڈ بھی مل جائے گا جو اس وقت افغان سرزمین سے پاکستان میں دہشتگردی میں مصروف ہیں۔

2010 سے ہی واضح تھا کہ طالبان افغانستان کے سیاسی منظر نامے پر دوبارہ ابھریں گے۔ دنیا کے کئی ممالک نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا مگر انڈیا نے دیر کی۔ تاہم 2022 میں دہلی نے ایک محدود سفارتی نمائندگی کے ساتھ کابل میں اپنا دفتر کھول کر نئے باب کا آغاز کیا۔ 2025ء میں دبئی میں وکرم مصری اور امیر خان متقی کی ملاقات، اور بعد ازاں فون پر رابطہ، اسی تدریجی اعتماد کی تعمیر کا تسلسل ہے۔

بگرام ایئر بیس سے امریکی انخلاء کے بعد چین، روس اور ایران پُر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چین کے بڑھتے ہوئے اقتصادی قدم، اور روس کے نئے روابط، افغانستان میں ان طاقتوں کی موجودگی بھارت کیلئے تیزویراتی دباؤ کا باعث ہے۔ یہ سب مل کر افغانستان کو ایک عالمی سفارتی میدان بنا چکے ہیں

۔ ایسے میں انڈیا کا محتاط مگر واضح قدم ایک نیا باب کھولتا ہے، جو چین پاکستان کے اثر کو محدود کرنے کی شعوری کاوش دکھاتا ہے۔

متقی کا دورہ اس دباؤ کا جواب ہے، ایک سیاسی پیش بندی کہ دہلی اب صرف دیکھنے والا نہیں، بلکہ کردار ادا کرنے والا فریق بننا چاہتا ہے۔ یہ دورہ محض تعلقات کی بحالی نہیں بلکہ ایک سفارتی اعتراف ہے کہ طالبان کی حکومت اب خطے کی سیاست میں ایک ناقابل نظر انداز حقیقت بن چکی ہے۔ اگرچہ طالبان پر اقوام متحدہ کی پابندیاں اب بھی موجود ہیں، مگر ان کا انڈیا کے ساتھ مکالمہ دراصل عالمی سفارت کاری کی نئی حقیقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔

انڈیا طالبان سے رابطے میں ہمیشہ دو قدم آگے، ایک قدم پیچھے کی پالیسی اپناتا رہا ہے۔ یہ محتاط رویہ اس کے تاریخی تجربے سے پھوٹا ہے کہ افغانستان کی زمین ہمیشہ دوستی کے ساتھ خطرہ بھی رکھتی ہے۔ مگر متقی کا دورہ ظاہر کرتا ہے کہ دہلی اب پاکستان سے بدلہ لینے کی آگ میں اس خطرے کو قبول کر چکا ہے۔ ادھر متقی کا دورہ یہ اشارہ دیتا ہے کہ دہلی اب عملی سطح پر تعامل چاہتا ہے، نہ کہ نظریاتی مخالفت۔ یہ بتدریج مگر مستقل صف بندی کا ثبوت ہے، ایک خاموش مگر دیرپا تبدیلی۔

مگر بعض ماہرین کے نزدیک انڈیا اور طالبان کی قربت افغانستان کے شہریوں میں یہ تاثر بھی پیدا کر سکتی ہے کہ ان کا ملک اب بھی بڑی طاقتوں کے کھیل کا میدان بنا ہوا ہے۔ یہ تاثر محض سیاسی نہیں بلکہ عوامی ذہن سازی کے زاویے سے بھی اہم ہے کیونکہ کسی ملک کی شبیہ اکثر حقائق سے زیادہ تاثرات سے بنتی ہے۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ 2010 سے ہی طالبان کے دوبارہ اُبھرنے کے آثار نمایاں تھے۔ دنیا نے اس حقیقت کو قبول کیا مگر انڈیا تاخیر کا شکار رہا۔ طالبان کے کابل پر قابض ہونے کے بعد انڈیا نے اپنے سفارت کار واپس بلا لیے، لیکن جلد ہی پس پردہ رابطوں کی راہیں کھول لیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ طالبان کے نائب وزیر داخلہ ابراہیم صدر کے خفیہ بھارتی دورے نے دونوں ممالک کے درمیان ایک خاموش مگر مؤثر مواصلاتی دروازہ کھول دیا ہے۔ "را" کے سربراہ سے ان کی ملاقات نے انڈیا کے نئے سفارتی رویے کی جھلک دکھائی، ایک ایسا رویہ جو مخالفت سے زیادہ مصلحت پر مبنی ہے۔

انڈیا اور طالبان کے مابین پس پردہ مذاکرات اس امر کی دلیل ہیں کہ سفارت کاری ہمیشہ اعلانیہ نہیں ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خطے کی سفارت اب نئے معانی اختیار کر چکی ہے۔ طالبان کا انڈیا کی جانب جھکاؤ اور انڈیا کی جانب سے ان کیلئے نرم گوشہ پیدا ہونا دراصل مئی کی پاک بھارت جنگ میں مودی کی بدترین ہزیمت کا نتیجہ بھی ہے۔ یہ عہد ماضی کی تلخیوں سے زیادہ مصلحتوں کے ادراک اور طاقت کے نئے توازن پر مبنی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ افغانستان ایک بار پھر تاریخ کے چوراہے پر کھڑا ہے جہاں ہر سمت سے آنے والے قدم اس کی زمین کو سفارتی دوستیوں اور مفادات کے نقش سے آراستہ تو کر رہے ہیں لیکن ہر حال میں اپنے اپنے مفادات کو اولیت دینا مقصود ہے۔

انڈیا کی طالبان پالیسی دراصل چانکیہ پالیسی کا ایک مکارانہ قدم ہے، نہ تسلیم، نہ انکار، نہ انکار سے نقصان، نہ اقرار سے انجام، نہ شراکت، نہ لاتعلقی۔ امداد کے ذریعے موجودگی اور مکالمے کے ذریعے اثر اندازی، یہی دہلی کا نیا دھوکہ دہی کا سفارتی منتر ہے کہ انڈیا کی افغان پالیسی "تسلیم کیے بغیر تعاون" کے فلسفے پر استوار ہے۔ یہ ایک ایسا توازن ہے جس میں عمل زیادہ، اور اعلان کم ہے۔ 2022ء میں طالبان نے دہلی میں اپنا ایک نمائندہ بھیجا اور محدود پیمانے پر کابل میں سفارت خانہ دوبارہ کھولا مگر انڈیا نے اسے افغان سفارت خانے کا باضابطہ چارج نہیں دیا۔

2024ء میں ممبئی قونصل خانے میں طالبان نمائندے کی موجودگی کی خبریں آئیں، مگر دونوں ممالک نے خاموشی کو سفارتی زبان بنائے رکھا۔ طالبان کے نمائندوں کا دہلی میں قیام ایک غیر اعلانیہ تسلیم شدگی کے مترادف ہے۔ انڈیا خاموش ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بعض فیصلے وقت کے ساتھ کہے جاتے ہیں،

الفاظ سے نہیں اور وہ فی الحال مغرب اور بالخصوص امریکا کی خوشنودی کو قربان کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ یہ خاموشی دراصل مکاری کی زبان ہے۔

اگرچہ روس اور چین طالبان حکومت سے قریب ہیں، لیکن اقوام متحدہ کی پابندیاں طالبان کی عالمی سرگرمیوں کو محدود رکھے ہوئے ہیں۔ طالبان عالمی نظام میں اب بھی "مشروط شمولیت" کے حامل ہیں۔ ان پر پابندیاں ہیں مگر دنیا جانتی ہے کہ ان سے کٹ کر کوئی علاقائی استحکام ممکن نہیں۔ اس صورت حال میں انڈیا کا دورہ طالبان کیلئے نئے امکانات کا دروازہ ہے گویا عالمی تنہائی میں ایک دستیاب سنگ میل۔ اسی لیے متقی کا بھارتی دورہ ایک نرم سفارتی دروازہ کھلا بھی ہے، مقفل بھی۔

انڈیا کے افغانستان میں کئی اقتصادی، دفاعی اور ثقافتی مفادات ہیں۔ طالبان مخالف دھڑے اب منتشر اور عالمی سطح پر غیر مؤثر ہو چکے ہیں۔ انڈیا اب افغانستان کو نہ صرف پاکستان پر دباؤ بڑھانے کیلئے دیکھ رہا ہے بلکہ اسے خطے میں اپنے طویل المدتی کردار کی توسیع کا میدان بھی سمجھتا ہے۔ افغانستان میں انڈیا کے کئی تعمیراتی، تعلیمی اور اقتصادی منصوبے ہیں۔ اس کیلئے طالبان سے قربت ایک سیاسی ضرورت ہے، اگرچہ یہ ضرورت احتیاط میں لپٹی ہوئی ہے۔

متقی کا دورہ بلاشبہ چین و پاکستان کے بڑھتے اثرات کے خلاف ایک سفارتی توازن سازی کی کوشش ہے۔ دہلی سرکار جانتی ہے کہ اگر وہ طالبان سے روابط قائم نہیں کرے گی تو کابل میں بیجنگ اور اسلام آباد کی موجودگی غالب آجائے گی اور اس کیلئے اپنی پرسکیز کی مدد کرنا بھی ناممکن ہو جائے گا۔ انڈیا طالبان سے تعلقات قائم کر کے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ کابل صرف ایک سمت کا دروازہ نہیں۔ یہ ایک علامتی اعلان ہے کہ دہلی اب خاموش تماشاخی نہیں، فعال شریک ہے۔ یوں متقی کا خیر مقدمی رویہ، دراصل سیاسی شطرنج کی ایک محتاط چال ہے۔

بعض ماہرین کے مطابق انڈیا اور طالبان کی قربت افغان عوام میں یہ تاثر پیدا کر سکتی ہے کہ افغانستان اب بھی دودشمن ہمسایوں کے بیچ کا میدان ہے اور افغان عوام کے خدشات بالکل درست ہیں کہ انڈیا افغان سرزمین کو پاکستان کے خلاف اپنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس تاثر سے طالبان کی داخلی ساکھ متاثر ہو سکتی ہے۔ بین الاقوامی سیاست کی دنیا میں تصویر سے زیادہ تاثر اہم ہوتا ہے، اور یہی دہلی کی نئی آزمائش ہے۔ یوں دونوں ممالک کو نہ صرف سیاسی بلکہ نفسیاتی سطح پر توازن قائم رکھنا ہمیشہ مشکل رہے گا۔

طالبان کے نائب وزیر داخلہ ابراہیم صدر کا خفیہ بھارتی دورہ ان تعلقات کی غیر علانیہ بنیاد تھا جس میں وہ "را" کے سربراہ سمیت اہم حکام سے ملے جو دراصل اعتماد کی پوشیدہ سازشوں کا حصہ ہے۔ یہ دورہ اس وقت ہوا جب پاکستان اور انڈیا کے تعلقات میں تناؤ بڑھ چکا تھا اور دونوں ممالک میں کشیدگی عروج پر تھی، اس لیے اس کے اشارے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ ان تمام اقدامات پر پاکستان کی نہ صرف گہری نظر ہے بلکہ پاکستان کیلئے باعث تشویش بھی ہے۔ ان حالات میں متقی کا دورہ مزید شبہات کو تقویت کا باعث بن سکتا ہے۔

ابراہیم صدر کو طالبان قیادت میں ملاہبت اللہ کے قریب ترین رفیق سمجھا جاتا ہے اور طالبان قیادت میں نہ صرف فوجی تجربے بلکہ سیاسی شعور کی بنا پر اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا بھارتی حکام سے ملنا دراصل طالبان کے اندرونی فیصلہ ساز حلقے کی نئی سمت کی نشاندہی کرتا ہے یعنی اب طالبان اپنی سفارت کو محدود مذہبی زاویے سے نکال کر علاقائی مصلحت کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں اور ان کے سامنے اپنے خاص محسن پاکستان کی قربانیوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں، جن کو فراموش کر کے وہ ہندو برہمن کے ساتھ گلے ملنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کی پالیسی سازی میں شرکت طالبان حکومت کے اسٹریٹیجک فیصلوں میں انڈیا کیلئے ایک کھڑکی کھولتی ہے۔

بھارتی ذرائع ابلاغ نے اس پیش رفت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ سنڈے گارڈین نے اسے طالبان سے مکالمے کے خفیہ مگر حقیقت پسندانہ اور عملی تعلقات کے آغاز سے تعبیر کیا۔ یہ اس بات کا اظہار ہے کہ انڈیا اب افغانستان کے ساتھ جذبات نہیں، مفادات کے آئینے میں تعلقات کی از سر نو تعبیر کر رہا ہے۔ یہ دراصل دہلی کیلئے سفارتی فتح کے نئے باب کی علامت ہے، جس کو پاکستان سے بدلہ لینے کیلئے اہم موقع سمجھا رہا ہے۔

یہ دورہ خواہ وقتی سفارتی تدبیر ہو یا مستقبل کے اشتراک کی بنیاد، مگر اس نے ایک بات واضح کر دی ہے کہ سیاست کے دروازے کبھی مکمل بند نہیں ہوتے۔ امیر خان متقی کا دورہ محض ایک سفارتی واقعہ نہیں، بلکہ جنوبی ایشیا کے سیاسی موسم کی تبدیلی کا اشارہ ہے۔ جہاں کبھی نظریات کی خندقیں تھیں، اب مصلحت کے پل تعمیر ہو رہے ہیں۔ طالبان اور انڈیا کے درمیان بڑھتی ہوئی گفت و شنید اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اب خطے کی سیاست آدرشوں سے زیادہ عملی ضرورتوں اور مفادات کے تابع ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب طاقت کے توازن بدلتے ہیں تو الفاظ بھی سمت بدل لیتے ہیں۔

یہی وہ لمحہ ہے جب کابل کی وادیوں سے نکلنے والی سفارت کی ہوا دہلی کے ایوانوں تک پہنچی ہے، اور شاید اسی ہوا میں خطے کی آئندہ سیاست میں چاکلیہ کی

مکاریاں بھی پنہاں ہے۔ جہاں مفاد اور مصلحت کی راہیں ملتی ہیں، وہاں قومیں ایک ایسے نئے باب کی تحریر شروع کر دیتی ہیں جہاں انسانیت کی تباہی کے باب نیا خون کشید کرنے کیلئے بے تاب نظر آتے ہیں اور شاید یہی باب، برصغیر کے دیرینہ تعلقات میں تباہی کی ایک اور نئی سیاہ رات کا آغاز ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہو گا کہ متقی کا یہ مجوزہ دورہ اس خطے کی تاریخ میں ایک ایسا باب کھولنے والا ہے، جس میں الفاظ کم ہوں گے، مگر معنی گہرے، اور خدا نخواستہ دنیا کی دائمی تاریکی کا سبب بھی۔

وقت گواہ ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ افغان بھائیوں کو برادرِ دینی و ہمسیاہ کی حیثیت سے دیکھا۔ ہم نے کبھی اقتدار نہیں چاہا، صرف امن اور احترام کے خواہاں رہے۔ مگر آج جب کابل کے دروازے دہلی کی جانب کھلتے دکھائی دیتے ہیں، تو اسلام آباد کے دروازوں پر حیرت اور دکھ کے سائے چھا جاتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سفارت کاری کے میدان میں مفاد اکثر احساسات پر غالب آ جاتا ہے، لیکن قوموں کے تعلقات صرف مفادات سے نہیں، بلکہ اخلاص کی تاریخ سے بنتے ہیں۔

جنہوں نے کبھی دونوں قوموں کے پاکستان کی سرزمین پر آج بھی لاکھوں افغانوں کی یادیں زندہ ہیں، وہ خیمے، وہ مہمان نوازی، وہ بھائی چارے کی شائیں درمیان فاصلوں کو مٹا دیتا تھا مگر اب جب افغان مٹی سے پاکستان مخالف تحریکوں کو طاقت ملتی ہے، اور بھارت اس پورے کھیل کا خاموش ہدایت کار بن کر ابھرتا ہے، تو پاکستانی عوام کے دل میں یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کیا یہ وہی افغانستان ہے جس کیلئے ہم نے اپنی نسلیں قربان کیں؟ بھارت کی جانب سے طالبان کو دی جانے والی مسکراہٹ دراصل انتقام کا نقاب ہے، اور افغان قیادت کو یہ سمجھنا ہو گا کہ جو ہاتھ دہلی آج بڑھا رہا ہے، وہ کل اسی کو اپنی سیاسی مصلحتوں کی قربان گاہ پر چھوڑ دے گا۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ دوستی کے خنجر ہمیشہ دشمن کے غلاف سے نکلتے ہیں۔

پاکستان آج بھی مکالمے اور امن کا خواہاں ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر محبت کی زمین پر نفرت کے بیج بوئے جائیں، تو موسم خواہ کتنا ہی بدل جائے، پھول کبھی نہیں کھلتے۔ اب فیصلہ کابل کے ہاتھ میں ہے کہ وہ محبت کے قرض کو وفا میں بدلتا ہے یا مفاد کے سود میں گم کر دیتا ہے۔ تاریخ خاموش نہیں رہے گی، وہ گواہی دے گی کہ کس نے بھائی چارے کے چراغ روشن کیے اور کس نے دشمنی کے ایندھن سے انہیں بجھا دیا۔

وقت کے افق پر ابھرنے والا ہر نیا دن اپنے ساتھ ایک نیا سوال لے کر آتا ہے کیا طالبان کا دہلی کی سمت سفر، تاریخ کے زخموں پر مرہم بنے گا یا محض ایک وقتی تدبیر؟ یہ سوال ابھی اپنی پوری صدا کے ساتھ گونجنے کو ہے۔ انڈیا اور افغانستان کے درمیان یہ نیا باب محض دو ممالک کی قربت نہیں، بلکہ خطے کی ذہنی نقشہ گری کی از سر نو تشکیل ہے۔ یہ تعلق اس سچائی کو ظاہر کرتا ہے کہ دنیا کی سیاست میں دشمنی ابدی نہیں ہوتی، مفاد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔

طالبان، جو کبھی دنیا سے کٹے ہوئے ایک نظریاتی گروہ کے طور پر جانے جاتے تھے، اب عملیت پسندی کے درپچوں سے جھانکنے لگے ہیں۔ اور بھارت، جو ہمیشہ طالبان کا مخالف رہا اور فاصلے پر کھڑا طالبان مجاہدین کے خون کے پیاسوں کا معاون بنا رہا، اب تاریخ کی دہلیز پر آکر سفارت کی زبان میں طالبان کے مستقبل کی بات کر رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بے رحم تاریخ ظالم سیاست سے ہاتھ ملارہی ہے، اور جغرافیہ مردود مفاہمت کی لکیروں سے خود کو دوبارہ رقم کر رہا ہے۔ متقی کا یہ دورہ شاید کسی معاہدے کی بنیاد نہ بن سکے، مگر یہ اس سوچ کی بنیاد ضرور رکھے گا کہ جس محسن ملک پاکستان کی مدد سے ہم آج اس مقام کو پہنچے ہیں، ان سے بات چیت کے دروازے بند کر کے اس کے ازلی دشمن بھارت کے ساتھ تعلقات استوار کر کے اپنی نسلوں کیلئے آخر ہم تاریخ میں کن الفاظ میں اپنا تذکرہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

تاریخ ایک بار پھر قلم سنبھال رہی ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ دہلی اور کابل کا ملاپ اس نئے باب میں دشمنی کا نوحہ لکھتا ہے یا مفاہمت کا عہد نامہ۔ میری اب بھی یہ دلی دعا ہے کہ ان دو برادر ملکوں کے وہ مخلص اکابرین جو مایوسی کی چادر میں منہ چھپائے اشک بہا رہے ہیں، ایک مرتبہ پھر فریقین کے دلوں کو جوڑنے کی کوئی ایسی سمیل نکالیں جس کیلئے غزوہ ہند کی بشارتیں منتظر ہیں۔

بروز ہفتہ 26 ربیع الآخر 1447ھ / 18 اکتوبر 2025ء

سرحد، ضمیر اور سیاستِ عہد کا المیہ

یہ تحریر قصدِ تحقیق اور قصدِ بیان کی ایک مشترکہ تلمیح ہے؛ جس کا مقصد محض واقعات کا سرسری ذکر نہیں بلکہ ان کے پس منظر، معنوی امواج، اور تاریخی صدائیں ضبطِ نثری میں سمو کر ایک جامع ادبی تصویر پیش کرنا ہے۔ ہم اس مطالعے میں ڈیورنڈ لائن، دوحہ کے مذاکرات کے لحظات، طالبان کے رہنماؤں کے بیانات، اور پاکستانی قومی حساسیت کی صدا کو ایک فکری تناظر میں کھول کر رکھیں گے۔

جب قوموں کی تقدیر کے فیصلے تاریخ کے صحن میں لکھے جاتے ہیں تو الفاظ نہیں، عہد بولتے ہیں۔ یہ وہ لمحے ہوتے ہیں جب امت کا ضمیر اپنی آزمائشوں سے گزرتا ہے اور ہر قول، ہر وعدہ ایک امانت بن جاتا ہے۔ دوحہ کی نشست بھی ایک ایسا ہی باب تھی۔ جہاں ماضی کے زخم، حال کے سوال اور مستقبل کی اُمید ایک میز پر جمع ہوئے۔ اسلامی اخوت کے پرچم تلے ہونے والی اس گفت و شنید نے نہ صرف سیاسی حرارت کو جنم دیا بلکہ امت کے فکری ارتعاش کو بھی عیاں کیا۔ یہ داستان دراصل امتِ مسلمہ کے اتحاد، صداقت اور وعدہ و وفا کی آزمائش کا وہ امتحان ہے جس میں تاریخ خود قاضی بن کر کھڑی ہے۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان واقع سرحد، جسے ڈیورنڈ لائن کہا جاتا ہے، جنوبی ایشیا کی سب سے اہم مگر متنازع جغرافیائی حد ہے۔ اس لائن کا قیام 1893ء میں برطانوی حکومت اور افغانستان کے حکمران امیر عبدالرحمن خان کے درمیان ایک معاہدے کے تحت عمل میں آیا۔ یہ سرحد نہ صرف دونوں ممالک کے باہمی تعلقات بلکہ خطے کی سیاست پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی آئی ہے۔ اس سرحد کی قانونی حیثیت، اس کے اطلاق اور اس کے نتیجے میں بننے والے سیاسی / نسلی تقسیم کے پس منظر پر افغانستان اور پاکستان کے درمیان دیرپا تنازع رہے ہیں۔ تاریخی کاغذات اور بین الاقوامی دستاویزات اس معاہدے کے وجود کو ثابت کرتی ہیں، جبکہ افغانستان کی مختلف حکومتوں نے متعدد ادوار میں اس کی قانونی / سیاسی حیثیت کو چیلنج کیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں برطانوی ہندوستان اور روسی سلطنت کے درمیان وسطی ایشیا میں اثرورسوخ کی جنگ جاری تھی، جسے تاریخ میں گریٹ گیم کہا جاتا ہے۔ برطانیہ نے گریٹ گیم کے دوران افغانستان کو روس کے اثر سے دور رکھنے کیلئے ایک بفر اسٹیٹ کے طور پر استعمال کیا۔ اس وقت افغانستان کی سرحدیں واضح نہیں تھیں، خاص طور پر مشرقی جانب برطانیہ کیلئے افغانستان ایک بفر اسٹیٹ کی حیثیت رکھتا تھا تاکہ روسی پیش قدمی کو جنوبی ایشیا کی طرف روکا جاسکے۔

ڈیورنڈ لائن دراصل پاکستان اور افغانستان کے درمیان وہ سرحد ہے جو 1893ء میں ایک معاہدے کے تحت قائم کی گئی تھی۔ اسی تناظر میں سر مورٹیمر ڈیورنڈ، جو برطانوی خارجہ امور کے سیکرٹری برائے ہندوستان تھے، کا بل پینچے اور امیر عبدالرحمن خان کے ساتھ 12 نومبر 1893ء کو ایک معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے پر افغانستان کے امیر عبدالرحمن خان اور برطانوی حکومت کے نمائندے سر مورٹیمر ڈیورنڈ نے دستخط کیے۔ اس معاہدے کے مطابق افغانستان اور برطانوی ہندوستان کے درمیان ایک سرحد مقرر کی گئی جو بعد میں ڈیورنڈ لائن کہلائی۔ اس سرحد کا بنیادی مقصد برطانوی ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سیاسی و انتظامی حدود کا تعین کرنا تھا تاکہ دونوں حکومتوں کے اثرورسوخ کے علاقوں میں وضاحت پیدا ہو سکے اور حدود طے کی جا سکیں۔

ڈیورنڈ معاہدہ 12 نومبر 1893ء کو طے پانے والے معاہدے کی نوعیت اور دفعات بالاتفاق یہ طے پائیں:

☆ دستاویزات، بشمول برطانوی اور بعد ازاں امریکی سرکاری آرکائیوز میں اس کے متن کا حوالہ موجود ہے۔ اس معاہدے کو بعد کی انگوٹھ بندیوں / معاہدات نے بطور حوالہ تسلیم کیا۔ معاہدے کے بعد سے یہ لائن تقریباً 2,600-2,640 کلومیٹر (1,600-1,640 میل) تک دکھائی جاتی ہے۔ روایتی ماخذ اس فاصلے، جغرافیائی حدود اور لمبائی کی حدود کے بارے میں یکساں ہیں۔

☆ سرحد (ڈیورنڈ لائن) کے دونوں طرف کے علاقوں کی سیاسی اور انتظامی حدود متعین کی گئیں۔ اس کے تحت افغانستان اور برطانوی ہندوستان کے درمیان ایک واضح سرحد قائم کی گئی۔ اس سرحد کے مشرقی حصے میں واقع قبائلی علاقے برطانوی عملداری میں شامل کیے گئے۔ افغانستان نے تسلیم کیا کہ خط کے مشرق میں واقع قبائلی علاقے برطانوی عمل داری میں آئیں گے۔

☆ معاہدے نے پشتون قبائل کو زمینی طور پر تقسیم کیا۔ قبائلی رابطے سچ مچ معمول کے مطابق رہے مگر طاقت اور سرحدی کنٹرول میں تبدیلی نے معاشرتی اور سیاسی تقسیم کو مستقل نوعیت دی۔ (تاریخی تجزیے اور علاقائی مطالعات دستیاب ہیں)۔

☆ بین الاقوامی شواہد برصغور کے مطابق راولپنڈی / انگلش افغان معاہدات (1919 اور 1921 حوالہ جات) میں ڈیورنڈ لائن کے وجود کا حوالہ رہا، جو تاریخی طور پر اس لائن کے ریکارڈ وجود کی تائید کرتا ہے۔

☆ معاہدہ کو "مستقل سرحد" کے طور پر تسلیم کیا گیا۔

☆ امیر عبدالرحمن خان کو برطانیہ کی جانب سے مالی امداد اور سیاسی حمایت کی یقین دہانی کرائی گئی اور اس پر عملدرآمد بھی ہوا۔

ڈیورنڈ لائن موجودہ پاکستان کے شمال سے لے کر جنوب تک پھیلی ہوئی ہے اس میں خیبر پختونخوا، قبائلی اضلاع، اور بلوچستان کے کچھ حصے شامل ہیں۔ یہ چترال، دیر، باجوڑ، مہمند، خیبر، وزیرستان، اور بلوچستان کے کچھ حصوں سے گزرتی ہے۔ یہ سرحد 34° شمالی عرض البلد کے قریب سے گزر کر بلوچستان تک جاتی ہے۔ پاکستان کا مؤقف ہے کہ 1893ء کا معاہدہ ایک ریاستی ڈیورنڈ لائن ایک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ قانونی سرحد ہے جو دو خود مختار ریاستوں کے درمیان طے پایا، اس لیے 1947ء کے بعد پاکستان نے برطانوی ہندوستان کے قانونی وارث کی حیثیت سے اس معاہدے کو برقرار رکھا، اس لیے یہ بین الاقوامی قانون کے مطابق آج بھی نافذ العمل ہے۔ مزید برآں، 1919ء میں ہونے والے راولپنڈی معاہدے کے ذریعے جب افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ امن قائم کیا، تو اس نے بالواسطہ طور پر ڈیورنڈ لائن کی حیثیت کو تسلیم کیا۔

پاکستان نے 1947ء میں آزادی حاصل کرنے کے بعد برطانوی ہندوستان کا قانونی جانشین ہونے کے ناطے اس معاہدے کی ذمہ داریاں اور حقوق اپنے ذمے لیے۔ اس بنیاد پر پاکستان کا مؤقف ہے کہ یہ سرحد بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ ہے اور کسی از سر نو معاہدے کی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف افغانستان یہ مؤقف اختیار کرتا ہے کہ یہ معاہدہ زبردستی کے حالات اور برطانوی دباؤ میں طے پایا تھا اور امیر عبدالرحمن خان کو اس پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا، اس لیے یہ غیر منصفانہ، غیر قانونی اور غیر مستقل تھا لہذا، کابل کے مطابق، اس معاہدے کی آئینی حیثیت مشکوک ہے، اور اس پر افغان عوام کی مرضی شامل نہیں تھی لہذا اسے از سر نو طے کیا جانا چاہیے۔ افغانستان کا کہنا ہے کہ یہ سرحد پشتون قبائل کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، جو ایک، ہی نسلی اور ثقافتی اکائی کے افراد ہیں۔ 1947ء میں پاکستان کے قیام کے بعد افغانستان نے اقوام متحدہ میں واحد ملک کے طور پر پاکستان کی شمولیت کی مخالفت کی، اور دعویٰ کیا کہ ڈیورنڈ لائن دوبارہ مذاکرات کی متقاضی ہے۔

ڈیورنڈ لائن نے پشتون قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ افغانستان میں اور دوسرا پاکستان میں۔ یہی تقسیم بعد ازاں پشتون قوم پرستی کی بنیاد بنی۔ اسی وجہ سے پشتون قوم پرست سیاست (جیسے خدائی خدمتگار تحریک یا بعد میں بعض افغان حکومتیں) ہمیشہ اس سرحد کو متنازع قرار دیتی رہیں۔ تاہم، عملی طور پر سرحد دونوں ممالک کے درمیان ڈی فیکٹو حد فاصل کے طور پر کام کر رہی ہے۔

افغان حکومتوں نے مختلف ادوار میں پختونستان کے تصور کو فروغ دیا جبکہ پاکستان نے اپنے قبائلی علاقوں کو بتدریج ملکی انتظامی ڈھانچے میں شامل کر چکا ہے۔ یہ سرحد اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس کے دونوں جانب قبائل صدیوں سے آزادانہ آمد و رفت کرتے رہے ہیں۔ تاہم، دہشتگردی اور اسمگلنگ کے بڑھتے خدشات کے باعث پاکستان نے 2017ء سے اس پر باڑ لگانے کا عمل شروع کیا، جس سے اب یہ سرحد عملی طور پر بند ہو چکی ہے۔

عملاً دیکھا جائے تو ڈیورنڈ لائن دونوں ممالک کے درمیان ڈی فیکٹو سرحد کے طور پر کام کر رہی ہے۔ پاکستان نے اس پر باڑ لگا کر اپنی انتظامی حدود کو مزید واضح کر دیا ہے جبکہ افغانستان میں بعض حلقے اب بھی اسے متنازع قرار دیتے ہیں۔ یوں ڈیورنڈ لائن ایک ایسی سرحد ہے جو نہ صرف جغرافیائی بلکہ تہذیبی لحاظ سے بھی خطے کی پیچیدہ حقیقتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ تاریخی، سیاسی اور

پاکستان سرحد پر باڑ لگا چکا ہے تاکہ سکیورٹی اور اسمگلنگ کے مسائل پر قابو پایا جاسکے۔ طالبان حکومت (2021ء کے بعد) باضابطہ طور پر ڈیورنڈ لائن کو تسلیم نہیں کرتی، لیکن عملی طور پر کئی مقامات پر پاکستانی کنٹرول کو قبول کرتی ہے اور باڑ لگاتے ہوئے بھی طالبان نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسری جانب پاکستان اسے اپنی بین الاقوامی سرحد قرار دیتا ہے اور اس کے تحفظ کو قومی سلامتی کا لازمی حصہ سمجھتا ہے۔ سرحدی جھڑپیں و قتل و قتل و قتل رہتی ہیں، خصوصاً چمن اور طورخم کے علاقوں میں، لیکن مجموعی طور پر یہ لائن دونوں ممالک کے درمیان حقیقت حال کے طور پر قائم ہے۔

ڈیورنڈ لائن نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ پورے وسطی ایشیا کے جغرافیائی توازن میں اہم مقام رکھتی ہے۔ اس کا تاریخی وجود ایک ایسے دور کی یادگار ہے جب سامراجی قوتیں اپنی جغرافیائی حدود قائم کر رہی تھیں۔ اگرچہ افغانستان اسے اب بھی متنازع سمجھتا ہے، لیکن بین الاقوامی قانون، تاریخی شواہد اور عملی حقیقت کے مطابق ڈیورنڈ لائن پاکستان اور افغانستان کے درمیان مستقل بین الاقوامی سرحد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ سرحد دونوں ممالک کے تعلقات میں کشیدگی کا باعث ضرور رہی ہے، مگر مستقبل میں خطے کے امن، تجارت، اور استحکام کیلئے اس کی باہمی قبولیت ناگزیر ہے لیکن بد قسمتی سے طالبان کی موجودہ رجیم کا پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کے ایماء پر فتنہ الخوارج اور فتنہ الہند کی سرکوبی کی بجائے انہیں اپنے محسن پاکستان کے خلاف استعمال کر کے بلیک میلنگ کیلئے استعمال کا بھانڈا بیچ بازار میں پھوٹ گیا ہے اور پہلی مرتبہ طالبان نے باقاعدہ پاکستان کے خلاف لشکر کشی کی فاش اور فحش غلطی کر کے خود اپنے اقتدار کے وجود کو شدید ترین زخمی کر لیا ہے۔



یاد رہے کہ اکتوبر 2025 میں دو طرفہ جھڑپیں شدت اختیار کر گئیں، جن کے بعد دوحہ اور ترکی کی ثالثی میں فوری سیز فائر پر بات چیت ہوئی جہاں اگلے ماہ اتنبول میں ہونے والی ملاقات تک جنگ بندی کا اعلان کیا گیا ہے جس میں پاکستان اور دیگر تمام اسلامی ملکوں کی طرف سے اس مطالبہ کو تسلیم کیا گیا کہ افغانستان اپنی سرزمین کو دہشتگردی کیلئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا یا درہے کہ اس سے قبل ماسکوفارمیٹ کانفرنس میں بھی خطے کے تمام اہم ممالک

کا مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا تھا جس میں افغانستان کو دہشتگردوں کی سہولت کاری کو بند کرنے کا کہا گیا تھا اور طالبان کے وزیر خارجہ ملا متقی نے اس کی حامی بھی بھری تھی لیکن بد قسمتی سے اس معاہدہ کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پاکستان پر چار مختلف علاقوں سے فتنہ الخوارج اور فتنہ ہند نے دہشت گردی کے حملے کئے اور افغانستان سے آئے ہوئے درجنوں دہشتگرد بھاری مقدار میں اپنی لاشیں اور اسلحہ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔

یاد رہے کہ پاکستان نے 2017 کے بعد سے سرحد پر باڑ / فینس لگانے کا عمل تیز کیا اور 2021-2024 میں متعدد درپور ٹس نے اس فریم کو دستاویزی شکل دی۔ طالبان کی حکومت نے بعض حوالوں میں بین الاقوامی دباؤ یا مذاکراتی فراہمی سے خود کو متعلقہ قرار دیا؛ دوحہ میں مذاکرات اور ثالثی کے ذریعے دونوں فریق نے جہاں جنگ بندی کے احترام کا یقین دلایا وہاں اس جھڑپوں کی بڑی وجہ افغانستان سے ہندوستان کی پراسیز کو مکمل ختم کرنے کی شرط سر فہرست ہے۔

اکتوبر 2025 میں دونوں ممالک نے قطر / ترکی میں ثالثی کے ذریعے عارضی سیز فائر اور فالو اپ مذاکرات طے کیے۔ تاہم نفاذ کا انحصار طالبان کی جانب عسکری گروہوں کے کنٹرول پر ہے۔ متعدد درپور ٹس نے واضح کیا کہ پاکستان کا مطالبہ یہی ہے کہ افغان طالبان اپنی سے افغان سرزمین پر موجود غیر ملکی / سرزمین سے پاکستان کے خلاف ہونے والی دہشتگرد تنظیموں "ٹی ٹی پی" اور "بی ایل اے" سمیت دیگر گروپوں کو اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہ دے۔

تاریخی طور پر ڈیورنڈ لائن کا وجود دستاویزی طور پر ثابت ہے، مگر اس کی سیاسی اور سماجی قبولیت متنازع رہی ہے۔ موجودہ منظر نامے میں تین چیزیں خاص پر خطرناک ہیں:

- (1) ٹی ٹی پی جیسی تنظیموں کی افغان سرزمین سے پاکستان کے خلاف کارروائیاں؛
- (2) طالبان انتظامی یکجہتی کا فقدان اور اندرونی گروہی اختلافات (جن میں حقانی نیٹ ورک کا مضبوط اثر شامل ہے)؛ اور
- (3) سیز فائر معاہدات کا ناقص نفاذ جو کشیدگی کو نئے مراحل میں داخل کر سکتا ہے۔ ان عوامل کے امتزاج سے خطے میں تشدد، بین الاقوامی مداخلت اور بڑے پیمانے پر انسانی و سیاسی نقصان کا خطرہ درمیانہ تا زیادہ درجے تک بڑھ جاتا ہے۔

دوحہ کی محفل نے ابتدا میں پندرہ گھنٹے کا صبر آزمائے تحفہ پیش کیا۔ ایک طویل انتظار جس میں ہر شخص کا حوصلہ اور ہر موقف کی فضا آزمائش میں مبتلا رہی۔ میزبان قطر نے روایتی سفارتی مہارت سے دونوں وفود کو الگ الگ سمجھایا، درجہ حرارت کو کم کرنے کی کوشش کی، گویا وہ ایک نازک بخاری کی طرح تھا جو گرمی کو برابر بانٹ کر تناؤ کو نرم کر دے۔ اس انتظار کے بعد جب براہ راست مکالمہ شروع ہوا تو محسوس ہوا کہ الفاظ کے بیچ میں ایک نئی شفافیت کی بجائے شقاوت نے جنم لے لیا ہے۔

ملا عمر کے فرزند ملا یعقوب نے ابتدا میں بلند لہجہ اختیار کیا؛ ایسی آواز جو بسا اوقات درخت کی شاخ کی طرح زور لگاتی ہے مگر جڑیں کمزور ہوں تو جھٹکے میں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی دھمکی کا انداز، جو اس امید پر مبنی تھا کہ خوف سے پالیسی بدل جائے گی، بطور حربہ ناکارہ ثابت ہوا۔ پاکستانی وفد نے خاموش وقار سے یہ پیغام دیا: "ہم واپس لوٹ سکتے ہیں، آپ دوسرا راستہ اپنالیں۔" یہ موقف دراصل ایک ایسے اخلاقی اور عملی توازن کی عکاسی کرتا ہے جس نے ملاؤں کے جغرافیے کے نیچے سے زمین کھینچ دی۔

طالبان نے معاملات کو اپنے ہاتھ سے رخصت ہوتے دیکھا تو فوری طور پر ملائیشیا کے وزیر اعظم کو مدد کیلئے پکار لیا۔ کبھی کبھار مذاکرات میں تیسرے فریق کو لانا بھی مفید ہوتا ہے؛ ملائیشیا کے وزیر اعظم کو درمیان لانے کی کوشش اسی شق پر مبنی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ معاملہ جنگ بندی اور افغان ٹرانزٹ کی بحالی تک محدود رکھا جائے، اور پیچیدہ سوالات مثلاً ٹی ٹی پی یا سرحدی دراندازی کو "پاکستان کا اندرونی معاملہ" قرار دے کر معاملے سے نکالا جائے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مذاکرات ایک حد بندی کی جانب دھکیلے گئے۔ مگر یہ حدود اسی وقت ناقابل قبول کہہ کر رد کر دیئے گئے کہ یہ اندرونی مسائل سے فرار کا کوئی حل نہیں۔

شہباز شریف اور پاکستانی وفد نے یکسوئی سے اس دلیل پر اصرار کیا کہ جنگ کی ابتدا ٹی ٹی پی اور بی ایل اے کی دراندازی سے ہوئی، اور جب تک یہ بنیادی سبب رفع دفع نہ ہوں، جنگ بندی کا موضوع قابل غور نہیں۔ یہ موقف صرف ایک سفارتی دعویٰ نہیں بلکہ سرحدی حق خودداری اور قومی سکیورٹی کے ایک ضابطے کا عملی اظہار تھا جس کو میزبان سمیت میز پر سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے دیگر تمام دوستوں نے جائز قرار دے دیا۔ دلچسپ نکتہ یہ کہ میز پر ہاری ہوئی بازی دیکھ کر ملائیتوب، جو دو روز قبل ڈیورنڈ لائن کو تسلیم کرنے سے انکاری تھے، بالآخر اس مقام پر پہنچے کہ "ہماری سر زمین پاکستان کے خلاف استعمال نہیں ہوگی اور ہم سرحدوں کا احترام کریں گے"۔ یہ تبدیلی صورت حال کی زرمت بھی تھی اور ممکنہ سیاسی بردباری کی غمازی بھی۔ طے پایا کہ بات چیت کا اگلا مرحلہ استنبول ترکی میں ہو گا اور وہاں نئے نکات کو چھیڑیں گے۔

پاکستان کی چند مذہبی جماعتیں افغان طالبان کی طرف ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اکساتی ہیں کہ پاکستان امریکا کا تابع ہے اور اسی وجہ سے افغانستان میں اس کے کردار پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔ یہ موقف جذباتی بنیاد پر مضبوط ہو سکتا ہے، مگر جب ہم منطق اور تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو تضادات نمایاں ہو جاتے ہیں۔

دل پر ہاتھ رکھ کر اس کا جواب دیں: طالبان نے گزشتہ دہائی میں جس ملک میں وفاداری کا دفتر کھولا، وہاں امریکا کا سب سے بڑا اڈا "العید" موجود ہے۔ وہیں سے افغانستان کے مشن کو کنٹرول کیا جا رہا تھا۔ اگر برادر اسلامی ملکیت کا اصول سچ تھا تو وہاں کی موجودگی پر طالبان کی خاموشی ایک سخت تضاد پر مبنی ہے۔ یہ معاملہ ایک اخلاقی آئینہ پیش کرتا ہے جس میں غیر واضح عزائم اور مفادات کے پیچیدہ رنگ نظر آتے ہیں کہ قطر کی سر زمین پر افغانستان میں جارحیت کرنے والے ملک امریکا کے سب سے بڑے فضائی اڈے پر تو ان کو کوئی اعتراض نہیں جہاں سے کئی مرتبہ افغانستان پر فضائی حملے بھی کئے گئے۔ ترکی، جو نیٹو کا رکن ہے اور بعض اوقات اس کے فوجی افغانستان میں متعین رہے، اب مذاکرات کا اگلا سٹیج ہے اور دوحہ کے ساتھ ترکی بھی پاک افغان مذاکرات میں حصہ لے رہے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر نہ طالبان نے ترکی پر "کافروں کے ساتھ دوستی" کا لطیف طنز کیا، نہ پاکستانی جماعتوں نے آج تک اردوان کے خلاف کڑوی زبان اختیار کی۔ یہ صورت حال اس حقیقت کی گواہ ہے کہ علاقائی سیاست میں شکوک و شبہات اکثر یک طرفہ نہیں بلکہ متوازن، اور کبھی کبھار معاملاتی ہوتے ہیں۔

نجانے کیوں مجھے تین دہائیاں قبل قندھار میں امیر ملا عمر کے وہ وعدے اور وہ الفاظ جو محض نوشتہ نعت نہ نہیں بلکہ روح کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، بے اختیار یاد آ رہے ہیں جو انہوں نے پاکستانی وفد کی موجودگی میں ایمان افروز خطاب میں کہے تھے: "میرے پاکستانی بھائیو! ہم قیامت تک آپ کے احسانات نہیں بھولیں گے... جہاں آپ کا پسینہ گرے گا وہاں ہمارا لہو گرے گا۔" یہ تقریر ایک دور کے اخلاقی سرٹیفکیٹ کی مانند تھی جس نے دو قوموں کے تعلق کو ایک مقدس روایت کی حیثیت دی اور پاکستانی قوم آج تک اپنے اس بھائی کے الفاظ کو اعتماد کے مضبوط قلعے کی طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

آج کا سربراہ اعلیٰ، ہیبت اللہ اخوندزادہ، جو اُس وقت محض 18 سالہ نوجوان تھا، یقیناً ان تالیفات اور بیانات کو اپنے ضمیر کے کسی گوشے میں سما کر رکھتا ہو گا۔ وہ داخلی چکاچوند اور بیرونی تقاضوں کے بیچ جو محاسبات محسوس کرتا ہو گا، وہ ان یادوں کی تپش سے متاثر ہو سکتا ہے مگر یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ سیاسی قیاس اور عملی تقاضے اکثر اخلاقی وعدوں کو کس طرح تولتے ہیں اور ان کا یہ امتحان دنیا و آخرت کی کامیابی و ناکامی کا فیصلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ یقیناً رات کے کسی پہلو میں ان کا ضمیر بھی ان سے یہ سوال تو کرتا ہو گا لیکن کیا وہ اس کو مطمئن کر پائیں ہیں؟ ملا یعقوب اس تقابلِ ماضی و حال کا زندہ چہرہ ہے؛ جب اس وقت وہ پانچ سال کا بچہ تھا، اس کے کانوں نے ممکنہ طور پر اپنے والد کے اخلاقی عہد سنے تھے۔ آج جب وہ خود حکومت کی نشست پر ہے، سوال یہ ہے کہ کیا وہ ان وعدوں کا صادقانہ جواب دے سکتا ہے یا وقت اور اختیار نے اسے مختلف راہ دکھائی ہے؟ تاریخِ آخری انصاف کرنے والی ہے، مگر یہاں نیز ان کیلئے بھی انسانی ضمیر کا سوال بھی سرفہرست ہے اور یقیناً وعدے کی میز سے اٹھ کر الجزیرہ ٹی وی پر انٹرویو دیتے ہوئے کوئی خلش تو محسوس کی ہو گی۔

دوحہ کے وعدوں کے فوراً بعد الجزیرہ ٹی وی کی پوشیدہ ذمہ داری یا روشنی نے وہ لمحہ دوبارہ زندہ کیا۔ گویا وعدے اور مفادات کی پیمائش میں کوئی دیر نہیں کی جاتی۔ میڈیا اکثر وہ آئینہ ہوتا ہے جو لمحہ حاضر کے عمل و عکس کو فوراً عوام کے روبرو رکھ دیتا ہے؛ اس صورت میں بھی یہی ہوا اور تاریخ نے یہ کردار اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں خود اس کا محاسبہ کریں گی۔

یہاں یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ سابق نائب صدر امر اللہ صالح نے واضح طور پر لکھا اور پوسٹ کیا کہ دوحہ مذاکرات میں طالبان کے پاس عملی طور پر انکار یا شرط لگانے کا آپشن نہیں تھا، اور پاکستان نے سفارتی طور پر طالبان کو تنہائی کا ایک ایسا دباؤ دیا کہ عالمی سطح پر یہ تاثر پیدا ہوا کہ طالبان یا تو افتنہ الجوارح کی حمایت کر رہے ہیں یا انہیں قابو نہیں کر پاتے۔

افغان وزیر دفاع (ملا محمد یعقوب) نے دوحہ معاہدے میں کارروائی نہ کرنے کی یقین دہانیاں دیں، مگر بعد ازاں مختلف پلیٹ فارمز (الجزیرہ) پر ان کے بیانات نے تشویشیں پیدا کی کہ سیٹ کے اندر مختلف آوازیں موجود ہیں۔ اس نے بین الاصلاح اعتماد کی کمی کو اجاگر کیا۔ یقیناً ان کا یہ رویہ اگلے مصالحتی دور میں ان کیلئے ایک شدید ترین دباؤ کی صورت میں ایک سوالیہ نشان بن کر مشکلات کا باعث بن سکتا ہے۔

یہ گفت و شنید ایک محض سفارتی واقعہ نہیں؛ یہ ایک آئینہ ہے جس میں خطے کے سیاسی اخلاقی، جغرافیائی مفادات، تاریخی یادیں اور ذاتی وعدے سب عکس انداز سے دکھائی دیتے ہیں۔ آخر میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ مذاکرات کا حقیقی محاسب عوام اور تاریخ کرے گی۔ جب الفاظ عمل میں بدلیں گے یا جب وعدے خاک میں ملیں گے۔ اسی روز ہو گا جب ہم اس باب کو بند کریں گے یا نئی شروعات کا اعلان کریں گے۔

تاریخ کی عدالت میں وعدے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں، اور قوموں کے ضمیر ان وعدوں کے محافظ ہوتے ہیں۔ دوحہ کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہ امت کے مستقبل کے باب کا دیباچہ ہے، جس کے حرف ہم سب کے عمل سے لکھے جائیں گے۔ وقت کا دریچہ کھل چکا ہے؛ اب یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس میں صداقت کی روشنی ڈالیں یا منافقت کا اندھیرا۔ جب امت اپنے وعدوں پر قائم رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال میں برکت عطا کرتا ہے، اور جب وہ ان سے روگردانی کرتی ہے تو تاریخ اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھینچ لیتی ہے۔ یہی پیغام دوحہ کے مذاکرات نے ایک بار پھر ہم سب کے سامنے رکھا ہے

زخم، امید اور امن کی راہیں

یہ تحریر کوئی محض سرخیوں کا مجموعہ نہیں؛ یہ اُن زخمیدہ داستانوں کا موجزن عکس ہے جو سرِ نوشتِ دو ہمسایہ اقوام کی رگِ جاں میں ابھر کر بولیں اور یہ تحریر محض خبروں کا مجموعہ بھی نہیں، بلکہ دو ہمسایہ اقوام کی تاریخ، قربانیوں، اور آزمائشوں کا عمیق عکس ہے۔ تاریخِ معاصر نے دونوں اطراف کے دلوں میں مہمان نوازی اور شبِ ہجرت کے کریم لمحات ثبت کیے ہیں، اور ساتھ ہی ایسے تلخ حادثات بھی رقم کیے ہیں جو سالِ تاریخ کی زنجیروں میں دہراتے گئے۔ تاریخِ معاصر نے ہمیں یہ بھی دکھایا کہ کبھی مہمان نوازی کے رشتے قائم ہوئے، کبھی سرحدوں پر تلخیاں ابھریں، اور بعض اوقات بیرونی سازشوں نے بھی دلوں کو زخمی کیا۔ اسلام نے ہمیں بھائی چارے، عفو و درگزر، اور انصاف کا درس دیا؛ یہی بنیادی شریعتِ انسانی ہمیں اس عہدِ امن کی طرف بلاتی ہے۔ عدل، اور انصاف کا یہی درس آج استنبول کی میز پر مذاکرات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

ہم اس تحریر میں امن کا پرچم اٹھا کر کہتے ہیں جو قومیں کل تک ایک دوسرے کے گھر کی چھت تلے انسانی ہمدردی کا خراج ادا کیا کرتی تھیں، آج جذباتِ زخمیدہ میں جب کوئی بیان بلند ہوتا ہے تو اس کا صلہ تشدد بن کر سامنے آتا ہے تو یہ دنیا کیلئے شرمندگی بھی ہے اور ہمارے لیے عبرت بھی۔ تاریخی زاویہ یہ ہے کہ جنوبی ایشیائی پیچیدہ داستان میں ذاتی قربانیوں اور ملی آزمائشوں کے ساتھ ساتھ بیرونی اثرات اور علاقائی سیاست نے بھی دلوں کو کھرچ ڈالا۔ اسلامی تقاضہ یہ ہے کہ جب خون بہا ہو، رنج و غم موجود ہو، تو فاتحہ و دعا کے ساتھ انصاف کی راہیں تلاش کی جائیں؛ نہ کہ انتقام کے احکامات کو عظمت سمجھا جائے۔ اسی لیے یہ جلسہ کلام اور مذاکراتی عمل ایک موقع ہے۔ زبانِ حکمت، قانونِ بین الاقوامی، اور شریعتِ انسانی کے امتزاج سے وہ راستے تلاش کیے جائیں جو خون ریزی کو نہ صرف روکیں بلکہ اعتماد سازی کا زینہ بھی بنیں۔

یہ وقتِ فکری اور اخلاقی امتحان ہے۔ جہاں ایک طرف دونوں ممالک کی افواج اور پولیس نے قربانی دی، وہاں ہمیں یاد رکھنا ہے کہ خلوص، صبر اور امن کے اصولوں کی پاسداری نہایت ضروری ہے۔ دشمنی کے زخم گہرے ہیں، مگر قرآن و سنت کی روشنی میں مذاکرات کو امن، انصاف، اور انسانی ہمدردی کے محور پر آگے بڑھانا ممکن ہے۔ اسلام نے ہمیشہ خونریزی، انتقام اور پر کسی وار کی مخالفت کی، اور امن، بھائی چارہ، اور صبر کی تلقین کی۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرو اور امن قائم کرو۔ (النساء: 125)

اس سلسلے میں استنبول مذاکرات ایک موقع ہیں کہ دونوں ممالک اپنے تاریخی تعلقات اور قربانیوں کو یاد رکھیں، اور امن، شفافیت، اور اعتماد سازی کی راہ اپنائیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق، پاکستان اور افغانستان نے دوحہ میں مذاکرات کے بعد فوری سیز فائر پر اتفاق کیا ہے، جو اس سے پہلے ہفتے بھر شدید سرحدی جھڑپوں کے بعد ہوا، جو دونوں ممالک کے درمیان 2021ء کے بعد سب سے بدترین تصادم تھے۔

پاکستانی فوج نے مطالبہ کیا کہ افغان سرزمین پر کارروائی کرنے والے عسکریت پسندوں کو قابو کرے۔ اس ضمن میں عسکری اور پولیس اہلکاروں کی ہلاکتیں اور زخمی ہونا سامنے آیا۔ اس صورت حال میں "ہماری افواج اور پولیس اپنی جانیں قربان کر رہی ہیں؛ ہم چین سے سوتے ہیں کیونکہ آپ کے محافظ جاگ رہے ہوتے ہیں" والا تصور ایک دفاعی ماحول کی تمثیل بن جاتا ہے، جہاں جانوں کی قربانی سلامتی کا حصہ شمار کی جاتی ہے۔ یہ فقرہ احساسِ ذمہ داری اور سرحدی سلامتی کے جذبات کا صوتی عکس ہے۔ اس بیان کو دو جہات سے سمجھنا ضروری ہے۔ ایک وہ مملکت کا اندرونی ہیرو خیال، جو اپنی حفاظت

کیلئے اپنی جان وقف کر دیتا ہے؛ دوسرا وہ عوامی عمل، جو سرحدی تناؤ میں ریاست کے دفاعی اقدامات کو جائز قرار دیتے ہوئے اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں۔

عسکری اور پولیس اہلکاروں کی شہادت اور قربانی کا حوالہ محض جملوں کا نہیں — یہ حالیہ واقعات کی بربادی اور فریقین کے درمیان جھڑپوں کا نتیجہ ہے، جنہوں نے تشویش کو بڑھایا۔ بین الاقوامی اور مقامی خبریں اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ حالیہ سرحدی کشمکش میں مرنے والے اور زخمی ہوئے افراد ہوئے ہیں اور مذاکرات سلامتی (دوحہ اور بعد ازاں استنبول) اسی پس منظر میں ہوئے۔

اقوام متحدہ کے ادارے برائے مہاجرین کی ایک دستاویز کے مطابق دسمبر 2024 کے وقت پاکستان میں افغان باشندگان کی تعداد دو کروڑ آٹھ لاکھ (2۸ ملین) سے زائد تھی۔ نیز جنوری 2025 تک اُس میں رجسٹرڈ مہاجرین اور ریفیو جی جیسا درجے میں افغان باشندگان شامل تھے، جن کی تعداد تقریباً 3 ملین تھی۔ گویا پاکستان کا یہ بیانیہ کہ اس وقت 40 لاکھ یا اس سے کم افغان پاکستان میں موجود ہیں حالانکہ دقیق تعداد مختلف ہے۔ یہاں مہمان نوازی کی طویل مدت (چار دہائیاں) کا حوالہ بھی دستاویز میں موجود ہے کہ پاکستان نے افغان پناہ گزینوں کیلئے طویل عرصے سے میزبانی فراہم کی ہے۔

پاکستان کے وزیر دفاع کا یہ دکھ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ سرد جنگ، سوویت یلغار، بین الاقوامی بحران، اور حالیہ دہائیوں کے نتائج کے طور پر لاکھوں افغان پاکستان میں آئے "ہم نے افغانستان کے لوگوں کی 40 برس مہمان نوازی کی... 40 لاکھ یا اس سے کچھ کم افغان یہاں بیٹھے ہیں... ان کی تین چار نسلیں یہاں جوان ہوئیں... جن لوگوں سے ہم دوحہ میں بات کر رہے تھے، وہ سارے پاکستان میں ہی جوان ہوئے ہیں"۔ یہ بیان حقائق کی سمت تاریخی یاد دہانی اور اخلاقی الزامات کا امتزاج ہے کہ پاکستان نے طویل عرصہ تک افغان مہاجرین کی میزبانی کی — اعداد و شمار کا حوالہ دینا اس لئے ضروری ہے کہ پاکستان جیسے ملک کی ایسی قربانی تاریخ میں کہیں بھی میسر نہیں۔

اس کلام میں دو تہذیبی نکات پوشیدہ ہیں — اول: مہمان نوازی کا تاریخی قرضہ؛ دوم: وہ اقتصادی و سماجی دباؤ جس سے میزبان قوم محسوس کرتی ہے کہ وسائل اور سلامتی پچھلے تناسب کے تحت متاثر ہو رہی ہے۔ بیانیہ میں یہ بھی شکوہ ہے کہ جن لوگوں کی مہمان نوازی کی گئی، وہی بعض جگہوں پر خلاف سلامتی سرگرمیوں کا محور ٹھہرے اور جس کے بارہا شواہد افغان طالبان حکومت کو بھی فراہم کئے گئے — طالبان کا ان تمام احسانات کو یکسر مسترد کر دینے کی پالیسی اس الزام کی سختی وجہ بحث اور مذاکرات کا باعث بنی۔

دوحہ مذاکرات کے دوران پاکستان نے تمام مصدقہ شواہد سب کے سامنے رکھ دیئے کہ افغان سرزمین سے پاکستان میں حملے کئے جا رہے ہیں یعنی مہمان نوازی کے پس منظر میں «امن و امان کی خلاف ورزیاں» بھی ہو رہی ہیں۔ اس تناظر میں سوال اٹھایا گیا ہے: اگر ایک قوم نے مہمان نوازی کی ہے، پھر اس کے خلاف دہشتگردی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ تمام ناقابل تردید شواہد اس اخلاقی اور عملی تضاد کی نشاندہی کرتے ہیں، کہ مہمان نوازی کا حق دفاعی تشویش سے ٹکرا رہا ہے جس کو روکنے کیلئے پاکستان کو گراں قدر جانی و مالی قربانیاں دینی پڑ رہی ہیں۔

ان حالات میں پاکستانی قوم یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس قوم نے آپ کی اتنی مہمان نوازی کی ہو، آپ اس کے خلاف دہشتگردی کو سپورٹ کیوں کر رہے ہیں اور وہ بھی پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کی پر کسی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ وہ بھارت جو حال ہی

میں پاکستان کے ہاتھوں بری طرح ہزیمت کا شکار ہو کر اقوامِ عالم میں اپنا چہرہ چھپا رہا ہے، وہ اب افغان طالبان کو بدلہ کیلئے اپنے پر کسی کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔

یہ سوال اخلاقی اور نفسیاتی دونوں سطحوں پر کھڑا ہے، مہمان نوازی کا تصور ایک تہذیبی فرض ہے، اور اسی تہذیب کے اندر قدیم احسان کا اور بطور مسلمان قرآنی نصوص کے مطابق اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ احسان کا بدلہ ماسوائے احسان کے اور کچھ نہیں ہوتا مگر بین الاقوامی سیاست میں احسان اور جغرافیہ کے بیچ پیچیدہ مفادات ہلتے رہتے ہیں۔ حقائق کی روشنی میں پاکستانی قیادت نے بار بار کہا کہ افغان سرزمین سے عسکری کارروائیاں پاکستان میں دہشتگردانہ حملوں کا منبع ہیں؛ کابل نے تردید کی یا وضاحتیں پیش کیں۔ یہی تنازع مذاکرات کی بنیاد رہا۔ اس نکتے کو محض اخلاقی سوال کہہ دینا آسان ہے، مگر عملی دنیا میں یہ الزام جنگ اور امن کی کسوٹی بن چکا ہے جس کی لپیٹ میں سیاسی بیانات اور فوجی کارروائیاں جاری ہیں۔

اس سے زیادہ دکھ کی بات کیا ہو سکتی ہے۔ افغانستان ہمارے خلاف بھارت کی پر کسی کے طور پر کام کر رہا ہے۔ یہ الزام سیاسی ردیفِ زبان میں طاقتور اور خطرناک بیانیہ ہے۔ ہمسائے پر بیرونی قوتوں کے پر کسی ہونے کے مضبوط شواہد، جس کا نشانہ علاقائی جغرافیہ اور تاریخ بنتا ہے۔ ایسے بیانات سفارتی سطح پر کشیدگی میں اضافہ کرتے ہیں۔

پاکستانی وزیر دفاع کا یہ بیان "افغان مہاجرین نے روزگار اور کاروبار پر قبضہ کیا ہوا ہے... ہمارا صرف ایک ایجنڈا ہونا چاہیے کہ ہم اخوت کے ساتھ ہمسائے کے ساتھ رہیں، پچھلے 45 روز سے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا... اگر مذاکرات سے معاملات طے نہیں پاتے تو پھر افغانستان کے ساتھ ہماری کھلی جنگ ہے"۔ یہ جملہ ایک ہی بیان میں دو متضاد کیفیتیں رکھتا ہے۔ یہ سماجی اقتصادی شکایت اور زمینی حقائق کی بنیاد پر ایک انتباہ بھی ہے۔

حالیہ وقفے میں دوحہ میں طے پائے ہوئے سیز فائر کے بعد (اوسطاً) چند روز تک بڑے واقعات کی اطلاعات کم تھیں، اور وزیر دفاع نے بھی چارپانچ روز کے سکوت کی طرف اشارہ کیا؛ مگر ساتھ ہی انہوں نے مذاکرات ناکام رہنے کی صورت میں «کھلی جنگ» کا راستہ کھلا رہنے کی دھمکی دی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا اگر اخوت اسلامی کا نعرہ کلامی استعارہ نہ رہے بلکہ اس کیلئے معاشی شفافیت، روزگار کے مواقع میں مساوات اور سرحدی تجارتی معاہدوں کی اہمیت پر زور دے کر یہ سمجھایا جائے کہ امن کے لفظی معاہدے جذباتی سطح پر دیرپا نہیں رہتے، ان کیلئے صدقِ دل سے دوطرفہ عملدرآمد ضروری ہے جبکہ افغانستان یہ بھی جانتا ہے کہ وہ ایک لینڈ لاک ملک ہے اور اس کا معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی دار و مدار پاکستانی سرزمین سے جڑا ہوا ہے۔ ان حالات میں بھارت کی پر کسی بن کر پاکستان پر دباؤ ڈالنے کی بلیک میلنگ پالیسی کن خطرات سے دوچار کر سکتی ہے۔

پاکستان اور افغانستان کے مابین شدید سرحدی جھڑپوں کے بعد، ایک فوری سیز فائر کا معاہدہ دوحہ (قطر) میں طے پایا۔ اس کے فوراً بعد، فریقین نے استنبول میں دوسرا دور شروع کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ معاہدے کے نفاذ کا طریقہ کار، نگرانی کا نظام، اور دیرپا امن کا ڈھانچہ وضع کیا جائے۔ ترک میزبانی میں ہونے والے اس اجلاس کا مقصد صرف مذاکراتی نشست نہیں بلکہ عملی امن کا آغاز تھا جہاں نمٹنے کیلئے تین مرکزی پوائنٹس پر گفتگو کی گئی۔

دوحہ معاہدے کے تحت دونوں ممالک نے یہ عہد کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی سرزمین کا احترام کریں گے، اور ایک دوسرے کے خلاف عسکری کارروائی یا حمایت نہیں کریں گے۔ اس پس منظر میں پاکستان نے براہِ راست افغانستان کو بھارت کی پر کسی کے طور پر کام کرنے کا الزام تو نہیں دیا مگر پاکستان ایسی



سرگرمیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کو بیرونی طاقت کی معاونت کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ بیان «سب سے زیادہ دکھ کی بات» کا تناظر اختیار کرتا ہے، جس میں مہمان نوازی کا تقابل تحفظاتی الزامات سے کیا جاتا ہے۔

خواجہ آصف نے استنبول مذاکرات کے موقع پر خبردار کیا کہ اگر مذاکرات ناکام ہوئے تو «کھلی جنگ» کا راستہ کھلا ہے۔ نیز روزگار، کاروبار اور مہاجرین کے معاملات نے سرحدی کشیدگی میں حصہ لیا ہے۔ اگرچہ دستاویز روزگار قبضے کا مخصوص اعداد و شمار نہیں دیتی، مگر «کاروبار پر قبضہ» جیسی اصطلاح تشویشی موقف کا حصہ ہے۔ اس میں یہ نکتہ چھپا ہے کہ مہاجرین کی معیشت اور معاشرتی انضمام سے متعلق مسائل تحفظاتی تناؤ کا سبب بن سکتے ہیں۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان ترکی میں مذاکرات کا دوسرا دور جاری ہے... جس میں قطر میں ہونے والے مذاکرات میں طے پانے والے نکات پر عمل درآمد کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ دوحہ (قطر) میں 19 اکتوبر 2025 کو ہونے والی گفت و شنید کے بعد ایک فوری فصلی / عبوری سیز فائر طے پایا؛ اب دونوں فریق ترکی میں مزید مذاکرات کے لئے اس معاہدے کی نفاذ، نگرانی، اور ایک مشترکہ نگرانی / نفاذی میکانزم پر بات کر رہے ہیں تاکہ بنیادی طور پر سیز فائر کو پائیدار، سرحدی احترام اور مشترکہ نگرانی میکانزم تشکیل دیا جاسکے۔

پاکستان اور افغانستان کے درمیان دوحہ میں ہونے والے مذاکرات میں سیز فائر اور دونوں ممالک کے درمیان ایک دوسرے کی سرحدوں کے احترام کی بات طے پائی تھی۔ تاہم ابھی تک کسی ٹھوس معاہدہ کی خبر نہیں۔ یہ ثالثی اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ فریقین امن کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ باضابطہ اعلامیہ جات اور ثالث ممالک (قطر، ترکی) کے بیانات نے اسی کی تائید کی البتہ، ان اعلانات کا «عملی نفاذ» نگرانی اور اعتماد سازی کے مرحلوں پر منحصر تھا اسی لئے استنبول میں مزید تفصیلی میکانزم کی بات ہوئی۔ مذاکرات کی دستاویزات کے مطابق درج ذیل تین بڑے نکات زیر گفتگو ہیں۔

(1) جڑی نگرانی اور عملدرآمد کا میکانزم: یعنی ایک مشترکہ مانیٹرنگ نظام قائم کرنا، جو سرحد پار سے آنے والے دہشت گردوں، عسکری عناصر کی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔

(2) قومی و بین الاقوامی سرحدی احترام: ایک ملک دوسرے کی سر زمین یا خود ساختہ عسکری سرگرمیوں کا میدان نہ بنے، اور بین الاقوامی معاہدات و سرحدی حدود کا لحاظ کیا جائے۔

(3) معاشی، پناہ گزینی اور تجارتی امور: مذاکرات اس جانب بھی گئے کہ مہاجرین، روزگار اور سرحدی تجارت کے مسائل امن کے پس منظر میں زیر غور آئیں۔

پاکستانی وفد کی قیادت دفتر خارجہ کے ایڈیشنل سیکرٹری برائے افغانستان اور ان کے دیگر اراکین جبکہ جبکہ افغان جانب سے وفد کی قیادت کیلئے نائب وزیر داخلہ حاجی نجیب کر رہے تھے۔ دوحہ اور ترکی کی معاونت شامل تھی، اور استنبول اجلاس اُس میکانزم کا حصہ تصور کیا گیا جو سیز فائر کو صرف وقتی نہیں بلکہ مستقل بنانے کیلئے اپنی کوششیں کر رہا ہے۔ مذاکرات میں سیز فائر کی صورت حال پر اثر پڑنے والے عوامل پر غور کیا گیا۔

مثبت سمت کی طرف بڑھنے کیلئے اہم نتائج اور ممکنات کے حصول کیلئے کوشش ہو رہی ہے کہ مانیٹرنگ میکانزم قائم ہو جائے، عسکری عناصر کی سرحد پار نقل و حرکت رُکے، اور دونوں ممالک قانون منظم انداز میں سرحدی احترام کریں تو امن کا پہلو مضبوط ہو سکتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ مذاکرات ناکام رہیں یا میکانزم قابل عمل نہ بن سکے، تو پاکستانی دفاعی حکام نے «کھلی جنگ» کا امکان ظاہر کیا ہے۔ جس سے فوری طور پر شدید ترین جاری اقتصادی نقصانات اور خطرات کا امکان بڑھ جائے گا۔ پہلے ہی گزشتہ چند دنوں سے سرحدی بندش اور تجارت کی رُکاوٹ سے دونوں جانب اثرات سامنے آرہے ہیں۔

اس وقت دونوں ممالک میں بھروسے کا فقدان موجود ہے۔ مؤرخانہ تناظر میں، دونوں فریقین ایک دوسرے پر دعوے کرتے رہے ہیں کہ دوسرے نے پہلے قدم اٹھایا جبکہ دوحہ اور استنبول میں پاکستان نے مضبوط شواہد کے ساتھ اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ بارہا طالبان حکومت کو افغان سرزمین اور افغان باشندوں کی دہشتگردی کے ثبوت فراہم کئے گئے لیکن طالبان نے اس پر کوئی کاروائی نہیں کی۔ اس دفعہ بھی افغانستان نے کہا کہ وہ اپنی سرزمین کسی دوسرے ملک کے خلاف استعمال نہیں ہونے دے گا جبکہ پاکستان نے مطالبہ کیا کہ حقیقی اثر پذیر اقدامات کیے جائیں جس کی ضمانت کیلئے پاکستان نے ایک واضح پروگرام بھی پیش کیا گیا ہے۔ افغان طالبان کی طرف سے یہ پیشکش کی گئی کہ ٹی ٹی پی اور دیگر گروپوں کو پاکستانی سرحد سے کہیں دور منتقل کر دیتے ہیں جبکہ پاکستان نے افغانستان کی طرف سے مکمل دراندازی کو ختم کرنے کی واضح ضمانت مانگی ہے۔

مہاجر اور پناہ گزین امور کے الجھاؤ سمیت معاشی، سماجی اور انسانی حقوق کے مسائل مذاکرات میں بیک گراؤنڈ کا حصہ ہیں۔ صرف عسکری سطح پر بات نہیں ہو رہی بلکہ مہاجرین، روزگار اور سماجی انضمام پر بھی نظریں ہیں۔ دوحہ اور استنبول کا سلسلہ ثالثی کے تحت چل رہا ہے، جو اس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ علاقائی تصادم کا حل طویل گفت و شنید اور نگرانی پر منحصر ہے، محض ایک سہ فریقی معاہدہ نہیں۔ یاد رہے کہ دوحہ میں پاک افغان امن مذاکرات میں تمام تفصیلات طے ہونے کے بعد ہی دوسرے دور کو استنبول میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

(1) دوحہ میں طے پائے جانے والے معاہدے (19 / اکتوبر 2025) کے بعد، باہمی رضامندی کے تحت فریقین نے استنبول میں دوسرا دور منعقد کیا تاکہ معاہدے کے عملی پہلوؤں، نگرانی کے طریقہ کار، اور دیرپا تقاضوں پر بات چیت کی جاسکے۔ یہ مذاکرات ترکی کی میزبانی میں ہوئے اور دونوں طرف کے اعلیٰ دفاعی و سیاسی نمائندے شریک ہوئے۔

(2) ایجنڈا (کلیدی نکات)۔۔۔ سیز فائر کی نگرانی اور فوری رپورٹنگ میکانزم کا قیام۔

سرحدی احترام اور ڈیوٹی باؤنڈریز کے احترامی ضوابط؛ عبوری طور پر سرحدی گشت اور معلوماتی تبادلے کا نظام۔
عسکری و نیم عسکری عناصر کی نقل و حرکت روکنے کے اقدامات؛ مشترکہ نگرانی یا تفتیشی میکانزم کا خاکہ۔

مہاجرین، نقل مکانی، اور گھریلو اقتصادی اثرات کا نرم گوشہ، اس پر فریقین اور بین الاقوامی اداروں کا تعاون طے کرنے کے اقدامات۔

(3) ثالثی کرنے والی ریاستوں (قطر، ترکی) کی طرف سے نگرانی اور فالو اپ کا طریق کار۔

(4) مذاکرات کا فنی ڈھانچہ (عملی پہلو)

(5) فوراً نافذ کی جانے والی سیز فائر کی رپورٹنگ کے بعد لاگو ہونے کے بعد دونوں اطراف کے پاس روزانہ / چند روزہ بنیادوں پر واقعہ نگاری کی سہولت رکھی گئی، اور کسی بھی خلاف ورزی کی صورت میں ثالثی والوں کو فوراً آگاہ کرنے کا طریقہ مقرر کیا گیا۔

(6) ایک عبوری مشترکہ تکنیکی کمیٹی یا نگرانی فورم بنانے کا مشورہ زیرِ غور تھا، جو سرحدی واقعات کی جانچ اور روایتی معلوماتی تبادلے کی ذمہ داری اٹھائے گی۔

(7) نتائج کی اہلیت کو پائیدار بنانے کیلئے مذاکرات کے نتائج باضابطہ دستاویز یا سمجھوتہ کی شکل میں ختم ہوئے یا ختم ہونے کی راہ پر تھے تاکہ ان پر عملدرآمد کی بین الاقوامی اور علاقائی نگرانی ممکن ہو۔

(8) مذاکرات کے ممکنہ نتائج اور خطرات کے مثبت امکان کیلئے ضروری ہے کہ اگر نگرانی میکانزم بخوبی چلے اور عسکری / نفی رضامندی برقرار رہے تو خطے میں سیز فائر دیرپا بن سکتا ہے، اور سرحدی تجارت، نقل و حمل، اور انسانی رواداری کو سہارا مل سکتا ہے۔ اور مذاکرات ناکام ہوئے یا عملدرآمد نہ ہوا، تو وزیرِ دفاع کی بلند ہوتی ہوئی دھمکیوں اور فوجی کارروائیوں کا خطرہ حقیقی طور پر موجود ہے، بعض بیانات میں «کھلی جنگ» تک کا ذکر آیا ہے، جس نے تشویش بڑھادی ہے۔

(9) ثالثوں کا کردار اور بین الاقوامی فریم ورک میں قطر اور ترکی نے ثالثی کی کوششیں کیں اور اس میں علاقائی و بین الاقوامی استحکام کا خدشہ شامل رہا۔ ان ثالثوں نے عارضی سیز فائر کو ممکن بنایا اور مذاکرات کی میز قائم رکھی۔ ثالثی کا تسلسل اس امر کی دلیل ہے کہ فریقین نے براہِ راست یکسر تصادم سے بچتے ہوئے سفارتی راستہ اختیار کیا۔

یہ دورِ گفت و شنید ایک ایسی کشمکش کا عکس ہے جس میں تاریخ نے مہمان نوازی کے حق میں ایک امن کا راستہ دکھایا، فنانشل ٹائمز کی وہ رپورٹ جو سیز فائر معاہدے کی تفصیل دیتی ہے کہ پاکستان اور افغان طالبان حکومت نے دوحہ میں معاہدہ کیا کہ وہ دشمنانہ کارروائی نہیں کریں گے، نہ ایک دوسرے کی سرزمین استعمال کریں گے، اور نہ ہی ایک دوسرے کے سکیورٹی اداروں یا انفراسٹرکچر پر حملہ کریں گے۔ یعنی سیز فائر اور سرحدی احترام دونوں کو معاہدے کا حصہ بنایا گیا، جو پہلی مرتبہ اس سطح پر باہمی اقرار کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ امن کیلئے زہرِ تاثیر دونوں طرف موجود ہیں: ایک طرف اخوتِ قدیم، دوسری طرف جغرافیائی و سلامتی کے حقائق۔ استنبول کا دورِ مذاکرات اس کشمکش کو لمحہِ توقف عطا کرتا ہے، یہ توقف یا تو نیکی نیت کا دروازہ کھولے گا یا پھر تشدد کی دلیلیز پر کھڑا کر دے گا۔

اب جب استنبول کی میز پر بات چیت کا پردہ اٹھا ہے تو ہمیں یاد رکھنا ہو گا کہ زخم اگرچہ گہرے ہیں، مگر امید کی جڑیں بھی ابھر سکتی ہیں۔ تاریخ کے طالبِ علم جانتے ہیں کہ ہر دوستی اور دشمنی کی جڑیں اکثر وہ تلخ تجربات اور غلط فہمیاں ہوتی ہیں جنہیں احلاص کے عمل سے سلجھایا جاسکتا ہے۔ استنبول مذاکرات ہمیں یہ سبق بھی دیتے ہیں کہ اگرچہ تلخیاں اور زخم گہرے ہوں، مگر صدقِ دل سے اخلاص کی جڑیں دوبارہ کاشت کرنے کی ضرورت ہے۔ مبینہ دعوے اور الزامات صرف تاریخی اور تنقیدی جائزہ کے طور پر دیکھے جائیں، نہ کہ بنیادِ عمل۔ امن، بھائی چارہ، اور انسانی ہمدردی کا تقاضہ یہی ہے کہ سرحدی جھڑپوں کو ختم کرنے کیلئے گفتگو کو جاری رکھیں۔ مذاکرات میں شفافیت اور بین الاقوامی نگرانی کے اصول اپنائیں۔ ماضی کے احسان اور رنجِ دونوں کا اعتراف کریں، اور اسلام کے امن پسند اصولوں کی روشنی میں آگے بڑھیں۔

کچھ مبینہ بیانات اور افواہیں بازارِ شہرت میں گردش کرتی رہتی ہیں، بعض شنیدیں مضبوط سیاسی اشارے یا شبہات کے طور پر سامنے آتی ہیں، مگر حقیقی عدل کی راہ میں ثبوت، حوالہ اور شفاف تفتیش کا عمل لازم ہے۔ یکطرفہ الزامات یا بلا ثبوت دعوے، امن کے عمل کو زہرِ آلود کر سکتے ہیں؛ اس لئے مذاکرات کا تقاضا یہی ہے کہ ہر فریق شفافیت، اعتماد سازی اور بین الاقوامی نگرانی کے ذمے داری کے ساتھ آگے بڑھے۔

اسلام ہمیں امن اور صبر کی تلقین کرتا ہے؛ حضور اقدس ﷺ کی سنتِ حسنہ یہی ہے کہ انسانیت کی بقاء میں بھائی چارہ اور عفو کا کیا مقام ہے۔ یہی مذہبی اور اخلاقی تقاضا ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ سر دست مذاکرات کو ایک مقدس فریضہ سمجھیں اور نفرت کی آگ کو بجھانے میں لبِ عمل آئیں۔ اگر آج ہم امن کو سچ میں چاہیں تو ہمیں ماضی کے احسان اور رنجِ دونوں کا اعتراف کرتے ہوئے، قرآنِ عظیم اور سنتِ طیبہ کی روشنی میں امن کے ایسے اصول وضع کرنے ہوں گے جن سے دونوں قومیں زندگی کے مشترکہ بوجھ کو بانٹ سکیں۔

تاریخ کے آئینے میں وہی قومیں تابناک رہیں گی جنہوں نے خنجر کی بجائے دلوں کو نرم کیا؛ اور یہی ہمارا فریضہ ہے کہ ہم گفتگو کو آخر تک زندہ رکھیں، تلواروں کو مٹاتے ہوئے امن کی فصل اگائیں، اور نقائص کی اصلاح کیلئے قانون اور شفاف طریقہ کار کو اپنائیں۔ تاریخ کے آئینے میں وہی قوم تابناک رہے گی جو تلوار کی بجائے دلوں کو نرم کرے، اور نقائص کی اصلاح کیلئے قانون اور شفافیت کو اپنائے۔ یہی ہمارا فریضہ اور اسلامی تقاضا ہے۔

بروز بدھ 7 جمادی الاول 1447ھ / 29 اکتوبر 2025ء

سفاکی کے سائے میں

ہندوستان کی تہذیب دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلم حکمرانوں کے دورِ حکومت میں اس سرزمین نے محبت، فلسفہ، اور روحانیت کے وہ سبق دنیا کو دیے جن پر انسانیت ہمیشہ نازاں رہی۔ مگر افسوس کہ اسی دھرتی کے سینے پر صدیوں سے ایک ایسا زخم بھی ہے جو مندمل نہیں ہوتا۔ برصغیر کی تاریخ میں ذات پات کا نظام ایک ایسا ناسور ہے جس نے انسانی مساوات کے چہرے سے روشنی چھین لی۔ اس دھرتی پر جہاں کبھی اونپشندی صدائیں، اہم برہما سنی ”کی برابری کا پیغام دیتی تھیں، وہیں وقت کی گرد میں انسانوں کو طبقوں، اونچ نیچ اور آلودہ خونی وراثتوں میں بانٹ دیا گیا۔

ذات پات کا زخم، ذات کا یہ تصور، جو کبھی مذہبی فہم یا معاشی تقسیم کے نام پر وجود میں آیا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ ایک منظم استحصال میں ڈھل گیا۔ انسان، انسان کا خدا بن بیٹھا، اور ”اچھوت“ وہ ٹھہرے جن کی رو حیں خالص تھیں مگر خون نچلے طبقے سے منسوب تھا۔ کسی نے کیا سوچ کہا تھا کہ انسان کی عزت کو پامال کرنا خدا کی زمین پر بغاوت کے مترادف ہے۔ موجودہ آرائیں ایس کے ہندوستانی سماج میں ”دلت“ محض ایک لفظ نہیں، بلکہ صدیوں کی محکومی، نفرت اور اجتماعی شرم کی ایسی داستان ہے جس کو آرائیں ایس کا سیاسی ونگ بی جے پی مودی پایہ تکمیل تک پہنچانے میں پیش پیش ہیں۔

مدھیہ پردیش کی زرخیز زمین، جہاں کبھی سنگیت اور سکون کے نغمے گونجتے تھے، آج مظلومیت کی چیخوں سے لرز رہی ہے۔ مدھیہ پردیش کے حالیہ واقعات اسی بغاوت کی تجدید ہیں۔ 33 سالہ گیان سنگھ، 26 سالہ راجکمار چوہدری، اور داموہ کاوہ خاموش دلت سیہ سب اُس تاریخ کی تسلسل ہیں جو صدیوں سے اپنی تکرار میں انسانیت کو شرمندہ کرتی آئی ہے۔ اکتوبر 2025 کے وسط میں مدھیہ پردیش کی سرزمین پر تین واقعات رونما ہوئے جنہوں نے ریاستی انصاف کے ستونوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ جب کسی قوم کے دل سے عدل کا احساس مٹ جاتا ہے تو ظلم صرف دوسروں پر نہیں، اپنے آپ پر بھی ہونے لگتا ہے۔

مدھیہ پردیش کی حالیہ زمین پر گرے ہوئے آنسو اس قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ 33 سالہ گیان سنگھ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ — جس میں اسے بندوق کی نوک پر مجبور کیا گیا کہ وہ پیشاب پئے — انسانی تاریخ کے اُن تاریک ابواب میں سے ایک ہے جنہیں پڑھ کر شرم بھی شرمندہ اور لرز جاتی ہے۔ یہ محض فرد کی تذلیل نہیں، بلکہ ایک پورے برہمن سامراج کے تکبر کا اعلان اور مظلوم طبقے کی نفی ہے۔ جب ایک انسان اپنی شناخت صرف اس لیے کھو بیٹھتا ہے کہ وہ دلت ہے، تو یہ ظلم کسی ایک ضلع یا ایک ریاست کا مسئلہ نہیں رہتا — یہ تہذیبی المیہ بن جاتا ہے۔

اکتوبر 2025 کے ایام مدھیہ پردیش کے دلتوں پر قیامت بن کر گزرے۔ بھنڈ، کٹنی، اور داموہ — تین اضلاع، تین دلت خاندان، اور ایک ہی المیہ، ذات کی بنیاد پر انسان کی تذلیل۔ گیان سنگھ کی فریاد — بھنڈ کی زمین پر انسانیت کی توہین، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعویٰ کرنے والی مودی سرکار کی ناک کے نیچے ہونے والا واقعہ جس نے دنیا بھر کی انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔

20 اکتوبر کی وہ گھناؤنی شام — جب سورج مغرب کے دامن میں چھپ رہا تھا — بھنڈ کے نواحی علاقے میں 33 سالہ گیان سنگھ کو اغوا کر کے اس پر بہیمانہ تشدد کیا گیا۔ بھنڈ کے ایک مجبور باسی، گیان سنگھ، اپنی بے بسی کی داستان سناتے ہوئے زار و قطار رو پڑے۔ اس نے اپنی لرزتی و کانپتی زبان سے آنسوؤں سے شرابور چہرے کی جھلک میں دل چیر دینے والے اور تیر بن کر دلوں کو چھیدتے ہوئے اپنے اوپر ہونے خوفناک ظلم کے بارے میں کہا: انہوں نے مجھے

بندوق کی نوک پر گاڑی میں بٹھایا، مجھ پر تشدد کیا، اور ایک بوتل سے پیشاب پینے پر مجبور کیا۔ اگر میں دلت نہ ہوتا تو کیا یہ ذلت میرے مقدر میں لکھی جاتی؟ کیا مجھے پیشاب پینے پر مجبور کیا جاتا؟ اگر میں دلت نہ ہوتا تو کیا مجھے یہ سب سہنا پڑتا؟

20/ اکتوبر کو ضلع بھنڈ میں 33 سالہ دلت ڈرائیور گیان سنگھ کو بندوق کی نوک پر اغوا کیا گیا، تشدد کیا گیا اور بالآخر ایک بوتل میں پیشاب پینے پر مجبور کیا گیا جرم ضعیفی—اور سزاء محرومی۔ گیان سنگھ کا جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ انہوں نے ایک مشتبہ جرائم پیشہ شخص، سونو باروا، کے ساتھ ڈرائیوری کرنے سے انکار کر دیا مگر انکار کے جواب میں اسے اغوا کیا گیا، مارا گیا اور انسانیت کی حدوں سے گزر کر رسوا کیا گیا۔ بستر علالت پر اس کی رندھی ہوئی آوازاں بھی سوال کرتی ہے "میں نے خوف کے سبب کار چلانے سے انکار کیا مگر کیا خوف بھی جرم ہے؟ اگر میں دلت نہ ہوتا تو کیا یہ ذلت سہنی پڑتی؟"

یہ محض ایک شخص کی فریاد نہیں، یہ اس سماج کی چٹان پر پڑی وہ دراڑ ہے جہاں انسانیت ذات پات کے اس خوفناک نظام کے قدموں تلے روندی جا رہی ہے۔ بھنڈ کے ضلعی اسپتال میں بستر مرگ پر پڑا گیان سنگھ، اپنے زخموں سے زیادہ اپنی بے حرمتی کے داغوں سے لہو لہان ہے۔ ذات پات کا عفریت اور قانون کی لاچاری کا یہ پہلا واقعہ نہیں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں واقعات تو مجبوری کے کفن میں دفن دیئے جاتے ہیں۔ صرف پندرہ دنوں کے اندر ایسے تین واقعات سامنے آئے ہیں—تین دلت گھرانے، تین چیچتی روہیں، اور مودی سرکار کے منہ پر ایک اور طمانچہ، ایک اور سوال ابھر آیا کہ کیا قانون محض طاقتور کیلئے ہے؟ بھنڈ پولیس نے اگرچہ تین ملزمان کے خلاف ایف آئی آر درج کر لی ہے، مگر یہ قانونی چارہ جوئی اس آگ پر پانی کے چند چھینٹوں سے زیادہ نہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ—انصاف کی راہ کب روشن ہوگی، جب اندھیرے کے دیو تا خود قانون کے دروازے پر پہرہ دے رہے ہوں؟ ذات پات کی تذلیل کا سلسلہ ابھی رکا نہیں۔ ایک اور زخم، ایک اور داستان بھی سن لیں۔ بھنڈ سے پانچ سو کلومیٹر دور، کٹنی کے 26 سالہ دلت کسان راجکمار چوہدری کی روداد بھی اسی خونی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ 13/ اکتوبر کو جب اس نے غیر قانونی کان کنی کے خلاف آواز اٹھائی—اور اس جرات کا انجام یہ ہوا کہ گاؤں کے سربراہ رامنوج پانڈے کے بیٹے پون پانڈے نے اس پر بہیمانہ تشدد کیا، اس کے چہرے پر پیشاب کیا، اور اس کی ماں کو بالوں سے گھسیٹا گیا۔ بھرے مجمع میں اسے روند ڈالا، ذات کے نام پر مغالطات برسائے گئے اور انسانیت کو ننگا کیا گیا۔ یہ ظلم صرف جسم پر نہیں، روح پر ہوا۔

رام بہاری، رامنوج پانڈے اور پون پانڈے—وہ نام جو انصاف کی کتاب میں جرم کے عنوان کے طور پر درج ہونے چاہئیں، آج بھی آزاد ہیں کیونکہ ان کی پشت پر ننگ انسانیت کی علمبردار سیاسی جماعت بی جے پی کے تحفظ کا سایہ ہے۔ پولیس کے مطابق "ملزمان کی تلاش جاری ہے" مگر اس تلاش کی رفتار مظلوم کے زخموں سے سست ہے۔ پولیس اب بھی کہتی ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں، لیکن انصاف کی ساعت اب بھی تعویق میں ہے، اور انصاف جب تاخیر سے آئے تو ظالم کیلئے سہولت اور مظلوم کیلئے مزید اذیت بن جاتا ہے۔

معاملہ یہاں بھی رکا نہیں، داموہ کی زمین پر بھی وہی کہانی دہرائی گئی۔ خوف کے سایے میں خاموشی لرز رہی ہے۔ داموہ میں ایک دلت کو ایک برہمن کے پاؤں دھونے اور وہی پانی پینے پر مجبور کیا گیا—یہ صرف ذلت نہیں، یہ روح کی توہین ہے اور جب اس مظلوم سے پوچھا گیا کہ وہ قانونی کارروائی کیوں نہیں کرتا، تو اس نے وہ جملہ کہا جو پورے نظام کو نہ صرف ننگا کر گیا بلکہ ذات پات کے اس نظام کے منہ پر طمانچہ اور پورے عدالتی نظام پر حرف بن گیا ہے "مجھے یہاں رہنا ہے۔ ایف آئی آر کٹوانے کے بعد میں کہاں جاؤں گا؟" یہ جملہ محض صرف ایک انسان کا خوف نہیں، یہ پورے سماج کی اخلاقی موت کا



اعلان ہے۔ اُس سماجی غلامی کی علامت ہے جسے قانون بھی اب تک آزاد نہیں کر سکا۔

مدھیہ پردیش کے ان تینوں واقعات نے آئین ہند کی روح پر کاری ضرب لگائی ہے۔ آئین کی دفعات 17، 15 اور 46 واضح طور پر ذات، مذہب، اور نسلی امتیاز کی نفی کرتی ہیں؛ مگر عملاً معاشرہ اب بھی ”منوسمِرتی“ کے سائے میں سانس لے رہا ہے۔

دفعہ 17 میں ”اُن ٹچلے بلیٹی“ (چھوت چھات) کو جرم قرار دیا گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ جرم آج بھی گلیوں میں زندہ اور قانونی کتابوں میں دفن ہے۔ انسدادِ مظالم برذاتوں کا قانون 1989، محض لفظوں کی زینت بن چکا ہے۔ جہاں مظلوم کی دہائی کو یا تو ”گاؤں کے جھگڑے“ کا رنگ دے دیا جاتا ہے، یا خود متاثرہ فریق کو ملزم بنا دیا جاتا ہے۔

وکیل اور سماجی کارکنان کے مطابق ”احتساب کی عدم موجودگی ہی اصل مسئلہ ہے۔ جب ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والا خود خطرے میں پڑ جائے، تو خاموشی معاشرتی مجبوری بن جاتی ہے۔ انصاف کی دیواروں پر خاموشی کے جالے اور مصلحتوں کا جبر طاری ہے۔ وکیل اور انسانی حقوق کے علمبردار چیخ کر کہتے ہیں کہ ان جرائم کی جڑ احتساب کی کمی میں ہے۔ اکثر مقدمات کو ”اپسی جھگڑا“ کہہ کر رفع دفع کر دیا جاتا ہے، یا الٹا متاثرین پر ہی مقدمے درج ہو جاتے ہیں۔ ایک سوشل ورکر کا بیان ہے کہ قوانین تو ہیں، مگر انصاف تک رسائی ایک خواب بن چکی ہے۔ جب انصاف کے دروازے پر اقتدار کے نگہبان کھڑے ہوں، تو مظلوم کی صدا فسیلوں سے سرنگر کر زخموں سے چور ناکامی کا دھبہ لئے واپس آ جاتی ہے۔

ذات پات کا نظام، جسے ہندو دھرم کے قدیم متون میں ”ورن آشرم“ کہا گیا، دراصل انسانی معاشرت کو منظم کرنے کا ایک ابتدائی فریم ورک تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ مذہبی تقدیس کے پردے میں طبقاتی استبداد میں بدل گیا۔ منوسمِرتی ”نے اس تقسیم کو مذہبی جواز عطا کیا، برہمن کو علم کا، ویش کو تجارت کا، اور شودر کو خدمت کا حق ملا، جبکہ دلت کو صرف خاموشی اور غلامی اور دیگر مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت کے ماننے والوں کو تو اس سے بھی کہیں زیادہ نفرت کا شکار بنایا جاتا ہے جس کی درجوں مثالیں موجود ہیں۔ تاہم تاریخ اُس جبر کے خلاف مسلسل آوازوں کی گواہ بھی ہے۔ بدھ مت نے ”کردنا“ (رحم) اور ”اہسا“ (عدم تشدد) کے ذریعے اس نظام کے خلاف روحانی بغاوت کی۔ بھکشی تحریک اور سنت کبیر نے ذات کی بیڑیاں توڑنے کا پیغام دیا۔ کبیر کی صد آج بھی گونجتی ہے ”جات نہ پوچھو سادھو کی، پوچھ لیجو گیان“۔

اسلام نے بھی مساوات کا تصور دیتے ہوئے اعلان کیا: اِنْ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (الحجرات: 13)

یعنی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

یہ آفاقی اصول آج کے ہندوستان کیلئے بھی آئین عدل کی بنیاد بن سکتے ہیں، اگر دل و دماغ تعصب کے غلاف سے آزاد ہوں لیکن صد افسوس کہ آریس ایس جیسا متعصب گروہ جو اسی سال اپنے سو سال مکمل کرنے جا رہا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ 100 سال گزرنے تک یہ سارا خطہ اکھنڈ بھارت اور یہاں صرف ہندو برہمن راج کرے گا اور باقی رہنے والے ان برہمنوں کی غلامی کیلئے رہ جائیں گے۔

1949ء میں منظور ہونے والے آئین ہند نے دلتوں کو مساوی شہری قرار دیا اور ذات پر مبنی امتیاز کو ممنوع ٹھہرایا۔ دفعہ 15 میں مذہب، نسل، ذات یا

جنس کی بنیاد پر امتیاز ممنوع قرار دیا گیا ہے جبکہ دفعہ 17 میں چھوت چھات کو جرم قرار دیا گیا اور دفعہ 46 میں ریاست پر لازم ہے کہ دلتوں اور پسماندہ طبقات کی تعلیمی و معاشی ترقی کو یقینی بنائے۔ 1989ء میں شیڈول کاسٹ اور شیڈول قبائل نافذ کیا گیا تاکہ ایسے تمام مظالم کا قانونی سدباب کیا جاسکے مگر عملاً یہ قانون اکثر طاقتور طبقات کے اثر میں کمزور پڑ جاتا ہے۔

انسانی حقوق کے کارکنان کے مطابق جب نظام عدل کے دروازے پر طاقت کے محافظ کھڑے ہوں، تو انصاف کا داخلہ ممکن نہیں رہتا۔ عدلیہ کے متعدد فیصلے خصوصاً سٹیٹ آف کرناٹکا بمقابلہ اپالو انگیل (1995) اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس ذات پات کے جرائم محض سماجی نہیں بلکہ آئینی بغاوت ہیں، تاہم قانون کی موجودگی کے باوجود، انصاف کی عدم دستیابی ایک مسلسل المیہ ہے۔

فکری و تہذیبی زاویہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو انسان کی حرمت، عدل اور ایمان ہی معاشرہ کی خوبصورت اقدار کی ضامن ہوتی ہیں اور انسان کی حرمت اور سماجی عدل کے علمبردار معاشرے ہی زندہ رہتے ہیں۔ اسلام نے غلامی کے ہر دروازے پر عدل کی دستک دی، اور انسان کو انسان ہونے کی بنیاد پر شرف عطا کیا ہے۔ زبان صرف اظہار کا ذریعہ نہیں، تہذیب کی امانت ہے۔ اور جب زبان میں عدل و انسانیت کا بیان مفقود ہو جائے تو معاشرہ اپنی تہذیب کھودیتا ہے اور عدل صرف قانونی نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی فریضہ ہے اور جو قوم ظلم برداشت کرتی ہے، وہ دراصل ظلم کو دوام بخشتی ہے۔ مدھیہ پردیش کے واقعات میں یہی فکری سبق چھپا ہے۔ جب مظلوم خوف سے خاموش رہتا ہے، تو ظالم کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ خاموشی بھی جرم ہے۔

مدھیہ پردیش کے تینوں واقعات نے ثابت کیا کہ انصاف کا مسئلہ محض قانونی نہیں بلکہ سماجی مرض ہے۔ ظلم کی جڑ احتساب کی کمی کی بناء پر معاشرہ کو تباہ و برباد کر دیتی ہے جس پر آج کی مودی سرکار ہندو اقتدار کے نشے میں بگڑ بھاگ رہی ہے۔ مدھیہ پردیش کے یہ واقعات محض پولیس کی نااہلی یا چند افراد کی سفاکی نہیں۔ یہ ایک ایسے معاشرتی زہر کی علامت ہیں جو نسلوں سے رگ و پے میں اتر چکا ہے۔ پولیس کارروائی اکثر متاثرین کے خلاف بھی درج ہو جاتی ہے۔ ملزمان کو سیاسی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے اور معاشرہ، جو کبھی بیدار ضمیر تھا، اب تماشائی بن چکا ہے۔ سوشل ورکرز کے مطابق، جب انصاف ایک طبقے کیلئے نایاب اور دوسرے کیلئے یقینی ہو جائے، تو وہ سماج خود اپنا دشمن بن جاتا ہے، یہی موجودہ ہندوستان کا المیہ ہے جہاں دلت کا دراب بھی انصاف کے کٹہرے تک نہیں پہنچ پاتا۔

یہ مقالہ صرف چند واقعات کی رپورٹ نہیں، بلکہ پورے ہندوستانی ضمیر کا محاسبہ ہے۔ گیان سنگھ کے آنسو، راجکمار کی چیخ، اور داموہ کے دلت کی خاموشی — یہ سب اس قوم کیلئے آئینہ ہیں۔ ذات پات کا نظام دراصل انسانیت کے چہرے پر وہ دھبہ ہے جو صرف قانون سے نہیں، بلکہ ضمیر کی بیداری سے مٹ سکتا ہے۔ یہ سوال صرف مودی کی سفاک حکومت سے نہیں جو آراہیں ایس کا خوفناک خواب پورا کرنے کیلئے راج کر رہی ہے بلکہ یہ اقوام عالم سے ہے اور بالخصوص مغربی ممالک اور امریکا کے ان تمام اداروں سے بھی ہے جو انسانی حقوق کے چیمپیئن بننے کا دعویٰ کرتے ہیں کہ کیا ذات اور مذہب کی بنیاد پر انسان کی حرمت پامال کی جاسکتی ہے؟ اگر ہم نے ان آنسوؤں میں انسانیت کا عکس نہ پہچانا، تو آنے والی نسلیں ہم سب پر لعنت بھیجیں گی۔ یہ وقت ہے کہ قانون کا قلم طاقت کے سائے سے آزاد ہو، اور عدل کا ترازو رنگ، نسل یا ذات نہیں بلکہ انسانیت کے پیمانے پر تول جائے۔

مدھیہ پردیش کے واقعات نے ہمیں پھر یاد دلایا ہے کہ عدل جب خوف کے تابع ہو، تو ظلم حکومت کرتا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم سماج کے اس زہر کو ایمان، تعلیم، اور قانون کے عزم سے صاف کریں۔ یاد رکھیں جب قومیں عدل کھودیتی ہیں تو ان کے معبود و مندر باقی رہ جاتے ہیں، مگر روح فنا ہو جاتی

ہے۔ اگر آج بھی انسانی حقوق کا نعرہ لگانے والے ممالک نے عدل و انسانیت کی اس روح کو زندہ نہ کیا، اور عالمی پلیٹ فارمز پر مودی سرکار کو کھلی چھٹی دے دی تو تاریخ ایک بار پھر ہمیں ظالموں کے زمرے میں شمار کرے گی۔ میڈیا کی بھی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ ایسے واقعات کو محض خبری شہ سرخی نہیں بلکہ سماجی مکالمے کا موضوع بنایا جائے۔ یہ مقالہ نہ صرف ایک سماجی تحقیق ہے بلکہ ایک اخلاقی دعوت بھی کہ انسان، چاہے کسی بھی ذات، مذہب یا نسل سے ہو، اس کی حرمت، اس کا وقار، اور اس کا حق عدل ایک آفاقی امانت ہے۔

بروز ہفتہ 10 جمادی الاول 1447ھ یکم نومبر 2025ء

خاکِ رفاقت سے اُٹھتے دھومیں

امریکا اور ہندوستان کے درمیان دس سالہ دفاعی فریم ورک — ایک نوشام امن یا جدید عسکری یگ کا آغاز؟ تاریخ کے افق پر کچھ قومیں ایسی ہیں جو خود کو آزادی کا علمبردار کہتی ہیں، مگر ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی قوم کی زنجیر رہتی ہے۔ امریکا کی تاریخ بھی ایسی ہی ایک داستان ہے — طاقت کے گرجتے مینار، آزادی کے نعروں کی گونج، مگر ہر باب کے نیچے ایک وفادار دوست کی قربانی رقم ہے۔

ایران کی مثال لے لیجیے وہی ایران جو کبھی امریکا کا سب سے مضبوط اتحادی، خلیج کا نگہبان، اور سرد جنگ کا قلعہ سمجھا جاتا تھا مگر جب بادشاہت کی شمع بجھی اور عوام کے ہجوم نے تاج و تخت کو گرا دیا، تو واشنگٹن کے دروازے جو کبھی فرشِ زر بنے تھے، اُس شہنشاہ کیلئے بند ہو گئے۔ امریکا نے اپنے سب سے پرانے رفیق کو پناہ تک دینے سے انکار کر دیا — وہی دوست جس کی سر زمین پر اُس کے فوجی اڈے قائم تھے، اور جس کے خزانے سے واشنگٹن نے دہائیوں تک توانائی لی لیکن اس سے اس طرح آنکھیں پھیر لیں جیسے کہ کبھی اس کو جانتا ہی نہیں، اور وہ ایرانی شہنشاہ مصر کے ایک عام ہوٹل کے کمرے میں اس دنیا سے رخصت ہو کر تاریخ میں امریکی بے وفائی کا استعارہ بن گیا۔ کاش کوئی اس سے ہی کوئی عبرت حاصل کر لے۔

پھر وقت نے کروٹ لی — اور امریکی مفاد کی مشعل اس بار پاکستان کے ہاتھ میں تھما دی گئی۔ روسی جارحیت کے دنوں میں پاکستان اُس چراغ کی مانند تھا جو اپنی روشنی سے دوسرے کا راستہ روشن کرتا رہا مگر خود اندھیرے میں جلتا گیا۔ افغان جہاد کے دنوں میں پاکستان نے اپنی سر زمین، اپنی معیشت، اپنے سکون اور اپنی نسلوں کو داؤ پر لگا کر امریکا کی اس جنگ کو لڑا جس کا میدان افغانستان تھا، مگر قیمت پاکستان نے چمائی اور جب سوویت یونین کا جنازہ نکلا اور امریکا دنیا کی واحد سپر پاور بن گیا، تو اس نے شکر یے کے بجائے دروازے بند کر لیے — امداد منقطع، پابندیاں عائد، اور وہی سر زمین جو کبھی "فرنٹ لائن اسٹیٹ" تھی، ایک دن اچانک "خطرناک خطہ" کہلانے لگی۔

پھر نائن الیون کا سانحہ آیا — اور ایک بار پھر تاریخ نے خود کو دہرایا۔ امریکا نے پاکستان کو دھمکی دی کہ "اگر ہمارا ساتھ نہ دیا تو تمہیں پتھر کے دور میں پہنچا دیا جائے گا۔" پاکستان نے پھر وہی کیا جو ہر بار کرتا آیا — اپنے بہترین ہمسائے افغانستان کے خلاف جنگ کیلئے اپنی فضا، اپنی زمین، اور اپنے فوجی اڈے کھول دیے لیکن جب امریکا نے کابل میں قدم رکھا تو اُس کے ساتھ بھارت بھی داخل ہوا — وہی بھارت جو کبھی واشنگٹن کے دائرہ اثر سے باہر سمجھا جاتا تھا اور امریکی موجودگی میں بھارت نے افغانستان کی زمین سے پاکستان کے خلاف دہشتگردی کے بیج بوئے جو آج بھی معصوم لوگوں کی زندگیوں کا شکار کر کے خونی کانٹوں کی پیداوار میں مصروف ہیں۔

اسی دوران واشنگٹن نے نئی دہلی کے ساتھ "سول نیوکلیئر معاہدہ" کیا اور پھر چین کے مقابلے میں ایک نئے اتحاد — "کواڈ" — میں بھارت کو شامل کر کے اسے اپنے منصوبوں کا مرکز بن کر بنا دیا۔ یوں امریکا نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا کہ اُس کی دوستی ہمیشہ مفاد کی زمین پر اُگتی ہے، اور جب فصل کٹ جاتی ہے تو وہ اپنے کسان کو تنہا چھوڑ دیتا ہے۔

کو الالمپور کے پس منظر میں منعقدہ دفاعی کانفرنس کے بعد امریکی وزیرِ دفاع پیٹ ہیگسٹھ نے اعلان کیا کہ واشنگٹن اور نئی دہلی نے ایک دہائی پر محیط دفاعی فریم ورک پر دستخط کیے ہیں — ایک ایسا طویل المدتی معاہدہ جو دونوں ملکوں کے مابین دفاعی تعاون کو ایک رسمی اور پالیسی سطح کا ڈھانچہ عطا کرتا ہے جسے

واشنگٹن اور نئی دہلی، خطے کے استحکام، دفاعی بازدارندگی اور باہمی ہم آہنگی کیلئے سنگ بنیاد قرار دے رہے ہیں۔ یہ محض نوشتہ دستخط نہیں، بلکہ خطے میں طاقت کے نئے خطوط کھینچنے کی کوشش ہے، امریکا کی یوریشیا میں حکمت عملی اور بھارت کی بڑھتی ہوئی عسکری اور سٹریٹیجک اہمیت کا ایک مشترکہ اظہار۔ ہیگسٹھ نے سوشل پلیٹ فارم پر کہا کہ یہ فریم ورک معلومات کے تبادلے، تکنیکی تعاون اور فوجی ہم آہنگی کو بڑھانے کیلئے بنایا گیا ہے۔ ایک بیان جو روایتی طور پر سفارتی زبان میں بھی سخت معنی رکھتا ہے۔ شکستِ جنگ کی بجائے طاقت کے توازن کو قائم کرنا جو خطے میں اضافی انتشار کو روک سکے، ہیگسٹھ نے سوشل پلیٹ فارم پر اپنے پیغام میں واضح کیا کہ یہ فریم ورک علاقائی استحکام اور ڈیٹرس، تکنیکی تعاون اور فوجی ہم آہنگی کو بڑھانے کیلئے بنایا گیا ہے یعنی ایک ایسا بیان جو روایتی طور پر سفارتی زبان میں بھی سخت معنی رکھتا ہے جو شور و غوغا کی بجائے فعالیتِ روابط پر زور دیتا ہے معلومات کے تبادلے، تکنیکی تعاون، اور فوجی ہم آہنگی۔ یہ اصطلاحات بظاہر خشک نظر آتی ہیں، مگر ان کے اندر وہ پیمانے چھپے ہیں جو بحر الکاہل کے جغرافیے کو نئے معنوں سے سنوارتے ہیں اور خطے میں اپنی بالادستی کیلئے اپنے ارادوں کی کہانی بھی بیان کرتے ہیں۔

جسمانی طور پر دستخط ہونے والا معاہدہ محض کاغذ نہیں؛ اس کے تحت مسلح افواج کی آپریشنل مطابقت، اڈوں اور لاجسٹکس تک رسائی، اور تکنیکی اشتراک وہ ستون ہیں جو ایک نئی عسکری معیشت کو جنم دے سکتے ہیں۔ بالخصوص اُس منظر نامے میں جہاں امریکا اور بھارت دونوں ہی چین کی بحری اور اسٹریٹیجک حرکات کو روکنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ (نیز واضح رہے کہ یہ بیانیہ خطے میں قوتِ مؤثرہ کے توازن کو سنوارنے کی کوشش ہے۔)

اس معاہدے کو وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو اس کا ایک بڑا مقصد چینی اثرِ رسوخ کے خلاف ایک مربوط مقابلہ تیار کرنا ہے۔ بیلٹ اینڈ روڈ انیشیٹیو کی اقتصادی بنیادوں کے ساتھ ساتھ چین کی فوجی توسیع کو روکنے کیلئے ایک عسکری و سٹریٹیجک بیانیہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ یوں یہ فریم ورک محض دو فریقوں کا معاہدہ نہیں بلکہ ایک علاقائی توازنِ طاقت کا حصہ بننے کی جستجو ہے۔

فریم ورک کی ساخت — کلیدی شقیں اور ان کا سیاسی مفہوم کی جو بنیادی شقیں منظر عام پر آئیں، وہ درج ذیل ستون تشکیل دیتی ہیں۔ بہتر ملٹری انٹر آپریبلٹی (اڈوں، لاجسٹک نیٹ ورکس، دیکھ بھال کی سہولیات تک باہمی رسائی)، مشترکہ پیداوار اور ٹیکنالوجی کی منتقلی (بھارت کی دفاعی صنعت کو مقامی سطح پر تقویت) اور علاقائی سیکورٹی کو مربوط کرنا۔ ان شقوں کا مطلب یہ ہے کہ جغرافیائی قربت کے بجائے آپریشنل قربت بڑھے گی۔ فوجی سازو سامان، تربیت اور عسکری رسائی میں باہمی ہم آہنگی لاحق ہوگی۔

معاہدے کے اہم پہلوؤں میں بہتر فوجی انٹر آپریبلٹی، یعنی اڈوں، لاجسٹک نیٹ ورکس اور دیکھ بھال کی سہولیات کا باہمی اشتراک شامل ہیں۔ مشترکہ پیداوار و ٹیکنالوجی کی منتقلی تاکہ ہندوستان کی دفاعی صنعت کو مقامی طور پر تقویت ملے؛ علاقائی سیکورٹی تعاون، خاص طور پر ہند۔ بحر الکاہل میں چین کی بڑھتی فوجی و اقتصادی پورٹ فولیو کے خلاف توازن قائم کرنے کے ارادوں کو روکنا سب سے اہم ہے۔

جاپان اور آسٹریلیا کے ساتھ عسکری قوت کو مربوط کر کے کو اڈا اتحاد کو مضبوط بنانا؛ اور بالعموم بی آر آئی جیسے اقتصادی منصوبوں کے اثرات کا تدارک۔ یہ شقیں ایک سیاسی مملکت نگاری کا نقشہ پیش کرتی ہیں جو محض فوجی نہیں بلکہ جغرافیائی سیاسی حکمت عملی کا اظہار بھی ہے۔ اس کیلئے معاہدہ کو اڈ کے اندر تجارتی و دفاعی روابط کو مزید مربوط کرنے، جاپان اور آسٹریلیا کے ساتھ مشترکہ حکمت عملی ترتیب دینے اور سمندری حفاظت میں تعاون بڑھانے کی سمت



میں مشترکہ کاروائیوں کا پلان بھی شامل ہے۔ اس کا مطلب کوئی نیا فوجی ہلاک نہیں بلکہ فوجی اور سیاسی مشقوں کے ذریعے ایک مشترکہ واضح حکمت بننے کا امکان زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔

شروع دن سے میں نے اپنے پروگرامز اور مضامین میں اشارہ کیا تھا کہ حالیہ مودی۔

امریکا کا ردِ باری تنازعے محض ایک نوراکشتی ہیں اور اس کی آڑ میں زیادہ تر اکثر پردہ نقاب

کے پیچھے باقی رہ جاتا ہے۔ یہ معاہدہ اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ تضادِ منظر نامہ میں بھی گہری سٹریٹیجی غالب رہ سکتی ہے۔ یہاں ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ سفارتی منظر ناموں میں دکھاوے کی ہم کشتی اکثر عملِ پالیسی کے ساتھ مطابقت اختیار کر جاتی ہے۔ اس نوراکشتی کو سمجھنے کیلئے چاہا بہار بندرگاہ کے مسئلے میں امریکی رعایت ایک نازک اور معنی خیز شق ہے۔ امریکانے بعض مواقع پر ایران میں بھارت کے اس بندرگاہی پروجیکٹ کے سلسلے میں نرم رویہ اختیار کیا، جس سے نئی دہلی کو وسطی ایشیا اور افغانستان تک کمرشل واسٹریٹجک رسائی برقرار رکھنے میں مدد ملے گی۔ اس رعایت کا مطلب یہ ہے کہ دفاعی تعاون کے ساتھ ساتھ واشنگٹن بعض اوقات اقتصادی واسٹریٹجک مفادات کے تقاضوں کے پیشِ نظر چلک دکھانا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ بھارت کو ایران اور افغانستان میں مکمل رسائی رہے۔

چاہا بہار کے سلسلے میں اس مہینے واشنگٹن نے نئی دہلی کو کچھ مدت کیلئے رعایت عطا کی ہے، جس نے ایران میں بھارت کے مفادات کو وقتی طور پر سانس لینے کی گنجائش مل گئی ہے۔ یہ رعایت اس بات کی علامت بھی ہے کہ اقتصادی اور فوجی مفادات ایک دوسرے کے متوازی چل رہے ہیں، اور واشنگٹن بعض شرائط دار سمجھ کر نرم چلک دکھانا اس لئے بھی ضروری سمجھتا ہے تاکہ خطے کے ممالک یعنی ایران اور اوقات علاقائی نیٹ ورکس میں ہندوستان کو پاکستان پر دباؤ رہے کہ امریکا اپنے سارے انڈے ایک ہی برتن میں نہیں رکھتا بلکہ اپنے مفادات کیلئے کبھی بھی آنکھیں پھیر لینا اس کا تاریخی و طیرہ ہے۔

غزہ میں پاکستانی افواج کی تعیناتی کی افواہیں حالیہ دنوں میں گرم ہیں اور آرمی چیف کے اردن و مصر دوروں نے قیاس آرائیوں کو مزید ہوا دی ہے البتہ قومی سطح پر ایسے کسی باضابطہ اعلان یا پیغام تک رسائی محدود رہی؛ بعض ذرائع اس بارے میں بیانات یا رپورٹس دے رہے ہیں مگر سرکاری طور پر حتمی فیصلہ یا پارلیمانی منظوری جیسے عمل کا ذکر لازم ہے۔ یعنی فیصلہ متعلقہ اداروں اور پارلیمنٹ کے ذریعے لیا جائے گا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاملہ ابھی مکمل طے شدہ نہیں۔

تاہم بین الاقوامی سطح پر ایسی افواہوں کے بارے میں احتیاط لازم ہے بعض اوقات باضابطہ اعلانات، بعض اوقات میڈیا تذکرات، اور بعض اوقات محض ذرائع کی افواہیں ہی منظرِ عام پر آ جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے، دعوؤں اور باضابطہ دستاویزات میں فرق کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ اور جب تک مستند بیانات نہ ہوں، انہیں بیانیہ یا قیاس خالص قرار دینا علمی دیانت کے خلاف ہو گا۔ (مزید برآں، صدر ٹرمپ کی جانب سے جزل عاصم کی تعریف کی خبریں بھی منظرِ عام پر آئی ہیں؛ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ فوراً فوجی تعیناتی کا منصوبہ اسی تعریف کا منطقی نتیجہ ہے۔

یو این یا امریکی۔ منظور کردہ کسی بھی 'امن فورس' کی بابت اردن کے شاہ نے واضح کیا ہے کہ اردن اپنی فوجی شمولیت کے خطرہ کو مول لینے کا متحمل نہیں ہو گا؛ اس بیانہ میں ایک تاریخی وجہ بھی پوشیدہ ہے۔ اردن کے سماجی و نسلی ڈھانچے میں فلسطینی آبادی کا بڑا حصہ شامل ہے، لہذا اثرانی سیاسی فیصلہ آسانی

سے نہیں لیا جاسکتا۔

اردن کے شاہ عبداللہ دوم نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ اردن خود براہ راست غزہ میں 'نفاذ امن' کیلئے فوجی شمولیت نہیں کرے گا، اور اگر کوئی بین الاقوامی فورس تعینات ہوتی بھی ہے تو اسے 'نفاذ امن' کی بجائے امدادی و تربیتی کردار میں ہونا چاہیے۔ ان کے بیانات کا پس منظر یہ ہے کہ اردن کی سیاسی سماجی ساخت اور علاقائی حساسیت اس طرح کی فورس کو قبول نہیں کرتی۔ شنید یہ ہے کہ امریکا اور اسرائیل سمیت دیگر مغربی ممالک غزہ میں پاکستانی فوج کے ذریعے حماس کو اسلحہ سے بالکل پاک اور بیدخل کرنے کا کام لینا چاہتے ہیں جو کہ ایک خونریز جنگ کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

امریکی سیاسی رہنماؤں کی جانب سے پاکستانی فوجیوں یا جرنیلوں کی تعریفیں کبھی کبھار سفارتی یا پالیسی سازانہ آرزوؤں کی عکاسی کرتی ہیں، مگر یہ تعریفیں خود کار انداز میں کسی فوجی تعیناتی یا مداخلت کا ثبوت نہیں ہوتیں۔ اگر ٹرمپ یا دیگر رہنماؤں نے جنرل عاصم کی تعریف کی ہو تو اسے ایک الگ سفارتی اشارے کے طور پر لینا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ فوراً زمین پر فوجی مشن پارلیمانی منظوری اور علاقائی رضامندی کے بغیر عمل میں آئے گا۔

پاکستانی فوج کی عالمی اسٹیج پر کسی کردار کے امکان کو محض ایک ریاستی معاہدے سے نہیں ناپا جاسکتا۔ اندرونی سیاسی میل جول، سول۔ملٹری تعلقات، اور علاقائی مفادات سب مل کر فیصلہ ساز فضا قائم کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سرکس میں کسی فوجی شمولیت کے اشارے جب سنائے جاتے ہیں تو انہیں مقامی بنیاد اور بیرونی دباؤ دونوں کے تناظر میں سمجھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ٹرمپ یا دیگر لیڈرز کی تعریفیں الگ، اور رسمی دستاویزات و تعینات الگ معاملہ ہوتے ہیں۔

یہ دور مسلح تعاون اور سفارتی پیچیدگیوں کا دور ہے، جہاں کاغذ پر دستخط ایک نئے باب کا آغاز بھی ہو سکتے ہیں اور محض بیانیہ بھی۔ دس سالہ دفاعی فریم ورک، چابہار پر امریکی رعایت، اردن کے شاہ کا انکار، اور پاکستان کے تعلقات — یہ سب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے دھاگے ہیں جو ہمیں بتاتے ہیں کہ جنوبی ایشیا اور ہند۔بحرالکابل میں طاقت کی نئی ترتیبات وجود میں آرہی ہیں۔ ہمیں محتاط حقیقت نگاری کی ضرورت ہے انواہوں اور باضابطہ بیانات میں فرق واضح رکھیں، اور یاد رکھیں کہ سیاسی بیانیہ اکثر ظاہری کشاکش کے پیچھے طویل المدتی مفادات کو فروغ دیتا ہے۔

آج جب امریکا اور بھارت کے درمیان دس سالہ دفاعی معاہدہ طے پایا ہے، تو تاریخ کے وہ سارے زخم پھر سے تازہ ہو گئے ہیں۔ یہ منظر ہمیں بتاتا ہے کہ سامراج کبھی نہیں بدلتا — صرف اُس کے لبادے بدلتے ہیں۔ ایران کبھی امریکا کا محور تھا، مگر تخت الٹتے ہی وہ بوجھ بن گیا۔ پاکستان نے امریکی مفادات کی حفاظت کیلئے اپنے لاکھوں جوانوں، اپنے امن، اپنی معیشت، اور اپنے نظریے تک قربان کیے، مگر بدلے میں اُسے الزام، مشکوک نظروں اور دہشت گردی کا طوق ملا اور آج جب امریکا نئی دہلی کے ساتھ ترویجی رشتہ استوار کر رہا ہے، تو یہ ہمیں اُس پرانی مثل یاد دلاتا ہے کہ "باز جب جھپٹتا ہے تو شکر کی تلاش میں نہیں، شکر کی نیت سے جھپٹتا ہے۔"

دنیا کے نقشے پر طاقت کا مرکز بدل رہا ہے، مگر امریکا کی سیاست کا اصول اب بھی وہی ہے اپنے کام کیلئے دوستی کرو، اور کام نکلنے کے بعد دوستی دفن کر دو۔ ایران سے لے کر پاکستان تک، افغانستان سے عراق تک — ہر جگہ ایک جیسی کہانی لکھی گئی۔ پہلے امیدوں کے چراغ روشن کیے گئے، پھر انہی چراغوں سے ماضی کو رکھ کر دیا گیا۔ آج پاکستان ایک نئے دورا ہے پر کھڑا ہے۔ تاریخ ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔ کیا ہم پھر کسی اور کے مفاد کا ایندھن بنیں

گے؟ یا اس بار ہم اپنے مفاد، اپنی خود مختاری، اور اپنی تاریخ کے سائے میں فیصلہ کریں گے؟ یہ فیصلہ پاکستان کے اہل فکر، اہل سیاست، اور اہل قلم کے ہاتھ میں ہے۔

اگر ہم نے ماضی کی خاک سے سبق نہ لیا تو آنے والا وقت ہمیں بھی اُن دوستوں کی صف میں لکھ دے گا جنہیں امریکا نے اپنے مقصد کے بعد تاریخ کے کچرے دان میں پھینک دیا۔

بروز سوموار 12 جمادی الاول 1447ھ 3 نومبر 2025ء

قربانیوں کی خاک سے اٹھتے سوال

خطہ افغانستان اور پاکستان کی داستانِ قربت و کشمکش صدیوں پر محیط ہے۔ تاریخ نے بار بار دیکھا کہ جب بھی اس خطے کے آسمان پر امن کے بادل گھنے ہونے لگتے ہیں، کوئی نہ کوئی آندھی سازشوں کی سمت سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ کبھی یہ شعلے بیرونی قوتوں کے ایندھن سے بھڑکتے ہیں اور کبھی اندرونی گروہوں کے جوش و جنون سے۔ آزادی کے سورج نے جب جنوبی ایشیا کی پیشانی چوم کر نئی قوموں کو دنیا کے نقشے پر جگہ دی، اُس وقت بھی افغانستان و پاکستان نے برادرانہ رشتوں کا دم بھرا تھا۔ لیکن خانہ جنگیوں، مفادات اور طاقت کی تدبیروں نے اس رشتے کو غلط فہمیوں کے تناؤ میں لپیٹ دیا۔

پاکستان نے دہشتگردی کے خلاف دہائیوں پر محیط جہاد میں وہ قربانیاں دیں، جن کی نظیر کم ملتی ہے مگر آج بھی دہشتِ مسلسل اپنی جڑیں گہری کرنے کے درپے ہے۔ اسی تلخ حقیقت کے پیشِ نظر پاکستان اور افغان طالبان کے مابین مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تاکہ جنگ کے میدانوں میں بہنے والا خون گفتگو کی میز پر ختم سکے۔ لیکن دوحہ اور استنبول کی فسیلوں پر لگی امید کی روشنی، تعنت، مایوسی اور نظریاتی تعصب کی آندھی میں مدھم ہوتی گئی۔

استنبول میں ہونے والے مذاکرات کا مقصد تھا کہ جنگ وجدل کے اس مسلسل المیے کو کوئی سمت ملے۔ لیکن نہ کسی تجویز کی صورت بنی نہ کسی معاہدے کی فصل اُگی۔ افغانستان کی خاموشی ایک اجنبی سوال ہے۔ سرحدی کشیدگی کی دھوپ ابھی مدھم نہ ہوئی تھی کہ پاکستان نے افغان طالبان کے ساتھ مذاکراتی حجرے کے دروازے بند ہونے کا اعلان کر دیا۔ استنبول کی فضاؤں میں اٹھنے والی "بات چیت" کی گرد بار آور ثابت نہ ہوئی۔ نہ کوئی لائحہ عمل بنا، نہ کسی سمت کی نشاندہی ہوئی۔ کابل کی خاموشی ایک اور سوال بن کر فضا میں معلق ہے۔ آیا یہ خاموشی اتفاق ہے یا اعلانِ لا تعلقی؟ کیا اس کے پیچھے مصلحت ہے یا معاندت؟ آخر دوحہ میں بڑھتی ہوئی امیدیں استنبول میں کیوں دم توڑ گئیں ہیں؟ اور نتائج بے ثمر ہونے کے خوفناک نتائج کا کون ذمہ دار ہے؟

آج کا یہ آرٹیکل اسی کشمکش کی تاریخی، سیاسی، نظریاتی اور علاقائی پرتوں کو کھولنے کی ایک ادبی و تحقیقی کاوش ہے۔ بسا اوقات حقائق کو محض اعداد کی زبان میں بیان کرنا کافی نہیں ہوتا۔ قوموں کی داستانیں، جذبات، امیدیں اور خوف بھی اُن کے فیصلوں کے سایے میں شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ تجزیہ، تاریخ اور ادب ایک ہم آہنگ طرز میں قارئین کے سامنے آئے۔ یہ تحریر نہ تو مایوسی کا مرقع ہے اور نہ محض تنقید کا آئینہ۔ یہ ایک خبردار کرتی صدا ہے کہ اگر ہم نے خطے کے امن کو مضبوط اصولوں، باہمی اعتماد اور حقیقت پسندانہ تدابیر کے ساتھ نہ سنبھالا تو آنے والے کل میں تاریخ کے صفحات پر اور بھی سیاہ دھبے قدرے گہرے تحریر ہوں گے جو یقیناً ہماری آنے والی نسلوں کیلئے ندامت کا سبب بن سکتے ہیں۔

بھارت عرصہ دراز سے پاکستان کو عسکری مصروفیت میں مبتلا رکھنے کی تدبیریں کرتا آیا ہے۔ مئی 2025ء میں پاکستان کے ہاتھوں بری طرح ہزیمت اٹھانے اور عالمی دنیا میں شکست خوردہ مودی اب خطے کی بساط پر پاکستان کو ایک چھوٹے پیمانے کی مستقل جنگ میں الجھائے رکھنا چاہتا ہے، اور کابل کی موجودہ حکمتِ عملی اسی ساز کے تاریخی چھپرتی محسوس ہوتی ہے۔ افغان طالبان کا طرزِ عمل بسا اوقات بھارتی مفادات کی تکمیل میں مہرہ بننا دکھائی دیتا ہے۔ خطے میں طاقت کے توازن کی کشمکش صرف بندوق کا کھیل نہیں۔ یہ معیشت، سفارت اور ذہنی جنگ کا مجموعہ ہے۔

یہ سوال اب ہر گفتگو کی پہلی سطر بن چکا ہے کہ افغان طالبان تحریکِ طالبان پاکستان کے خلاف اقدام سے ہچکچاہٹ کیوں برتنے ہیں؟ آخر وہ ہاتھ کیوں

لرزاں ہے جو دہشت کے اژدھے کو دبائے کیلئے بلند ہونا چاہیے؟ افغان طالبان کے اندرونی حلقے تاحال سمجھوتے کے اس نکتے پر الجھن کا شکار ہیں کہ کب، کیسے اور کس قیمت پر ٹی ٹی پی کے خلاف اقدام کیا جائے؟ ان کے نزدیک یہ معاملہ صرف سیکورٹی نہیں۔ نظریہ، وفاداری اور تاریخی احسانات بھی دخل رکھتے ہیں۔

پاکستان نے ناقابل تردید دستاویزی شواہد اور ثبوت فراہم کیے، نہ صرف افغان طالبان نے، بلکہ ثالثی کرنے والے میزبان ممالک نے بھی ان کی صحت کی تصدیق کرتے ہوئے صحیح مانگر افغان وفد نے یقین دہانی کے باب کو مقفل رکھا اور اصل موضوع سے انحراف کا رویہ نہ چھوڑا۔ گویا اصل مدعا مذاکرات کے حاشیے میں گم ہوتا گیا گویا حقیقت کے بچوں بچ کھڑی دیوار کو نظر انداز کر کے یہ سمجھ لیا جائے کہ دیوار گر چکی ہے۔

پاکستان نے چار برس کے اندر جو نقصان اٹھایا، وہ محض اعداد و شمار نہیں۔ ہر شہید کی کہانی میں ایک گھر کا چراغ گل ہوا۔ چار برس تک جانی و مالی قربانیوں کا بوجھ اٹھانے کے بعد پاکستان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ عوام کی سلامتی اس ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ لہذا ریاست نے یہ اعلان کیا کہ دہشت کے ہر سانپ کو ایک ایک کر کے کچلا جائے گا۔ لہذا یہ عہد کیا گیا ہے کہ دہشت و وحشت کی ان خازن راہوں سے وطن کو پاک کرنے کیلئے ہر ممکن اقدام اٹھایا جائے گا۔ نہ پناہ گاہ بچے گی، نہ سرپرستی اور نہ اعانت۔

سیکورٹی ماہرین یہ سمجھتے ہیں کہ افغان طالبان کسی متوازی منشور پر چل رہے ہیں جو خطے کے امن کیلئے خطرہ ہے۔ اگر نیتوں کے زاویے بدل جائیں تو راستے بھی بدل جاتے ہیں۔ باخبر ذرائع کی رائے میں افغان طالبان کے دلائل نہ زمینی حقیقت سے سازگار ہیں نہ منطقی تدبیر سے۔ گویا پس پردہ کوئی اور ایجنڈا ہے جو خطے کے امن کیلئے سم قاتل ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر نیتوں کے زاویے بدل جائیں تو راستے بھی بدل جاتے ہیں۔ پیش رفت اب طالبان کی نیت اور رویے کی آزمائش پر موقوف ہے۔

خواجہ آصف نے بے ساختہ کہا کہ امن کی خواہش کمزوری نہیں۔ اگر اسلام آباد پر حملہ کرنے کا خط پالنے والوں نے سر اٹھایا تو ان کی بینائی چھین لی جائے گی۔ یہ صرف دھمکی نہیں، ریاست کا قانونی حق ہے۔ خواجہ آصف کی لاکار اعلان بن کر ابھری ہے کہ اگر بات سے بات نہ بنی تو جنگ بھی کوئی دور کی آہٹ نہیں۔ اسلام آباد پر کسی یلغار کی کوشش کی گئی تو حملہ آور کو اس کی آنکھوں کی روشنی تک بھلا دی جائے گی۔

افغان ماہرین کا خیال ہے کہ طالبان قیادت ٹی ٹی پی کو اپنا نظریاتی ہمزاد سمجھتی ہے۔ آٹھویں اور نویں دہائیوں کی مشترکہ جدوجہد نے ان کے رشتوں کو ایسا جوڑا ہے کہ جدا کرنا محض سیاسی فیصلوں کا کھیل نہیں۔ دونوں تحریکوں نے تاریخ کی پیچ پر ایک ہی روش سے بینک کی، اسی لیے طالبان کیلئے ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی کرنا انہوں پر ہاتھ اٹھانے کے مترادف محسوس ہوتا ہے۔ یہی نظریاتی قربت طالبان کو ٹی ٹی پی کے خلاف کارروائی سے باز رکھتی ہے۔ دل و دماغ اگر ایک قبلے پر ٹھہر جائیں تو ہاتھ تلوار پکڑتے لرزتے ہیں۔ یہ قربت بسا اوقات ظلم کی توجیہ بن جاتی ہے۔ جب حق و باطل کی لکیر دھندلی ہو جائے تو اسی اجتہادی غلطی سے تشدد کو بھی جہاد کا نام ملنے لگتا ہے۔ یہی المیہ ہے جو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

پاکستان نے ماضی میں افغان جہاد کو اپنا دینی و تزویراتی قلعہ سمجھا، اسی لئے پاکستان نے طالبان کو پناہ اور سیاسی سہارا دیا۔ مگر تاریخ کی طنزیہ مسکراہٹ یہ کہ آج اسی پالیسی کے منفی اثرات قومی سلامتی کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں اور اب تاریخ کے دروازے پر وہ اس فیصلے کے بھاری قرض کا تقاضہ کرنے آگئی ہے۔ وقت کی عدالت میں ہر فیصلے کا حساب ہوتا ہے۔

طالبان کے حقانی دھڑے کے ٹی ٹی پی سے عملی تعلق رہے ہیں۔ ٹی ٹی پی کے ساتھ ان کے روابط ایسے بندھن ہیں جنہیں توڑنا آسان نہیں۔ اگر زور زبردستی کی گئی تو داعش کا دروازہ ٹی ٹی پی کیلئے زیادہ کشادہ نظر آنے لگے گا۔ انہیں خوف ہے کہ سخت کارروائی ٹی ٹی پی کو داعش کی آغوش میں دھکیل نہ دے۔ یہ وہ خوف ہے جو طالبان کو فیصلہ کن قدم سے روکتا ہے۔ یوں فساد ایک نئے دھارے میں بہہ نکلے گا اور خود طالبان کو کابل کے تخت سے دستبردار ہونے کا خدشہ ہے اور اس سلسلے میں طالبان کے اپنے کئی گروہ پہلے سے تیار بیٹھے ہیں جو موجودہ طالبان رجیم کو انجام تک پہنچانے کیلئے اشارے کے منتظر اور بے تاب بیٹھے ہیں۔

قندھار کی قیادت پاکستانی اقدامات—ملا برادر کی گرفتاری اور ملا منصور کی امریکی حملے میں ہلاکت—کو ماضی کی تلخ یاد سمجھتی ہے، جو آج بھی پالیسی کے سینے میں کانٹا بنی ہوئی ہے۔ قندھار کے اقتدار کی رگوں میں یہ واقعات آج بھی ہلاکت کے درد کے ساتھ یاد کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے پالیسی کے صفحات میں آج احتیاط اور ناراضگی، ہم سفر ہیں۔

پاکستان کی طرف سے سرحد پار افغان سرزمین پر موجود ٹی ٹی پی کے مراکز کو نشانہ بنایا گیا، افغان مصنوعات پر تجارتی بندش، تجارتی راہداریاں معطل ہوئیں اور غیر قانونی افغان مہاجرین کے خلاف کریک ڈاؤن جاری ہے۔ یہ سب الفاظ سے زیادہ مبلغ پیغام ہے کہ برداشت اب حد درجہ سے آگے بڑھ چکی ہے۔ یہ سب پیغام عمل ہے، محض لفظوں کی جنگ نہیں۔

سیاست کے کنگرے پر یہ سوال ہمیشہ کھڑا رہے گا اور یہی وہ سوال ہے جس کا جواب سیاست کی تلاش میں سرگرداں ہے کہ کیا طاقت و معاشی دباؤ طالبان کو ٹی ٹی پی کے خلاف صف آرا کر دے گا؟ کیا پاکستان کے یہ اقدامات طالبان کو عملی اقدام پر مجبور کر پائیں گے؟ یا وہ پھر کسی نئی تاویل کا سہارا لے کر اصل راستے سے بھٹک جائیں گے؟

افغان طالبان ریاستی ذمہ داری کو اب بھی شرعی تعبیر کی عینک سے دیکھتے ہیں—اسی لیے وہ ٹی ٹی پی کو دشمن نہیں، “قابل اصلاح ساتھی” سمجھتے ہیں اور یہ سوچ امن کے رستے میں سب سے بڑا مغالطہ ہے۔ 40 سالوں تک میزبان ملک میں پاکستان کے ازلی دشمن مودی کے ہاتھوں پر کسی کے طور پر استعمال ہونا شرعی طر پر جائز کہا جاسکتا ہے۔ اس غیر اسلامی اور انسانیت کے خلاف قبیح جرم سے روکنا بھی تو انہی طالبان کے عین فرض منصبی میں شامل ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ پاکستان کی پالیسی واضح ہے—مگر طالبان خود کو ایک ریاستی ذمہ داری کے ساتھ نہیں دیکھتے۔ داعش کی سرگوشیاں اور اندرونی اختلافات انہیں تذبذب میں مبتلا رکھتے ہیں—انہیں داعش اور فرقہ وارانہ دھڑوں کا خوف ہے، اسی لیے ٹی ٹی پی کے خلاف ضرب کاری اب بھی ملتوی ہے جس کے انتہائی خطرناک نتائج سامنے آسکتے ہیں۔

✓ نتائج

1 افغان طالبان کی فیصلہ سازی اب بھی تحریک کے مزاج کے زیر اثر ہے، ریاستی ذمہ داری کے تحت نہیں۔

2 ٹی ٹی پی اور طالبان کے روابط محض عسکری نہیں، نظریاتی و جذباتی گانٹھیں بھی شامل ہیں۔

3 خطے میں دہشتگردی کے بڑھتے حملوں کے پیچھے مخصوص علاقائی قوتوں کی حکمت عملی کارفرما ہے۔

4 پاکستان کے اقدامات سے سیاسی و معاشی دباؤ میں اضافہ ہوا ہے، مگر فی الحال خاطر خواہ تبدیلی نہیں آئی۔



مذاکراتی میز پر پیشرفت کا انحصار افغان طالبان کے سیاسی بالغ نظری اور بین الاقوامی ذمہ داری کے ادراک پر ہے۔ **5**

مندرجہ ذیل نکات بھی اس پیچیدہ صورتحال سے نکلنے کیلئے لیے قابل عمل اور دوراندیش حکمت عملی کی نمائندگی کرتے ہیں:

الف — علاقائی امن کیلئے سفارتی حکمت عملی
☆ عالمی برادری، او آئی سی اور شنگھائی تعاون تنظیم کے پلیٹ فارم پر مسئلے کو اجاگر کیا جائے

☆ افغانستان کی معاشی بحالی میں تعاون کے بدلے سلامتی کی ضمانت طلب کی جائے
☆ سرحدی انتظام میں دو طرفہ مشترکہ فورس کی تشکیل پر غور

ب — ہشگردی کے خاتمے کیلئے عملی اقدامات

☆ اعلیٰ انٹیلی جنس اشتراک اور رینک ٹائم کو آرڈینیشن
☆ ٹی ٹی پی کے دہشتگرد ڈھانچے کو تکنیکی اور مالی لحاظ سے منقطع کیا جائے
☆ سرحد پار لائچنگ پیڈ ز اور محفوظ پناہ گاہوں کا نیست و نابود ہونا یقینی بنایا جائے
ج — عوامی و فکری سطح پر بیانیہ سازی

☆ جہاد اور تشدد کے غلط بیانیے کو علمی انداز میں بے نقاب کیا جائے
☆ مدارس اصلاحات اور نوجوانوں تک امن پر مبنی دینی تعلیم کی رسائی
☆ میڈیا کے ذریعے قومی یکجہتی اور متفقہ بیانیہ سازی

د — افغان مہاجرین کی منصفانہ واپسی

☆ انسانی حقوق کے تقاضوں کے ساتھ قانونی نظم کی بحالی
☆ پاکستان کے معاشی و سماجی بوجھ میں کمی
☆ واپسی کے عمل کیلئے عالمی اداروں کی مالی معاونت ضروری

ہ — اعتماد سازی کی تدابیر

☆ مشترکہ کمیٹیاں، بارڈر میکائزم، تیز رفتار رابطہ کانفرنسیں
☆ غلط فہمیوں کی کھڑکیوں کو مسلسل کھلا رکھنا
☆ طالبان قیادت میں اعتدال پسند عناصر کے ساتھ گاڑھا تعلق

اس کے ساتھ ساتھ خواہش امن کیلئے راہنمائی کے طور پر چند ممکنہ حل اور سفارشات پر غور کرنے کی دعوت دے رہا ہوں، شائد کہ ترے دل میں اتر جائے میری بات:

- 1- پاکستان کو اقوام عالم کے ساتھ سفارتی مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنا ہوگی۔
- 2- افغانستان میں سیاسی و معاشی استحکام کیلئے باہمی تعاون بڑھایا جائے
- 3- مدرسہ اصلاحات اور سرحدی نگرانی میں تیزی لائی جائے۔
- 4- عالمی قوتوں کو باور کرایا جائے کہ دہشتگردی صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں، پورے خطے کا ناسور ہے۔
- 5- اس دہشتگردی کے محرک انڈیا کے متعصب ہندو مودی کو اقوام عالم میں ثبوت و شواہد کے ساتھ ننگا کیا جائے اور بالآخر اقوام متحدہ میں اپنے دوستوں کے توسط سے اس مسئلہ کو اٹھایا جائے۔
- 6- سماجی سطح پر بنیاد سازی کے ذریعے جہالت کے اندھیروں میں علم کا چراغ جلایا جائے۔

اور آخر میں اے میرے وطن! تیری فضائیں خون و عرق سے تر ہیں، مگر تیری شانِ سخاوت بھی ایسی ہی جلملاتی ہے۔ ایک طویل دور ہجرت اور مصیبت میں، تو نے لاکھوں بے گھر حریف و ہمنشینوں کو اپنے لہجے اور لہجہ و خون میں جگہ دی۔ 40 برس کے عرصے تک تو نے صرف چھت نہیں دی بلکہ روزگار زندگی کے ہر سامان کے سامنے ہاتھ بڑھایا، کھیتی، درس گاہ، محلہ، اور بازار سب دروازے کھلے رکھے۔ یہ وہ عظیم نرم دلی تھی جس نے عفو و احسان کو اپنا مہرہ بنایا اور انسانی ہمدردی کو اپنے دستورِ اول قرار دیا۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے مہاجرین کا طویل عرصہ مہمان رکھنے کا ریکارڈ اس عہد کی دستاویز آج بھی موجود ہے۔

یاد کیجئے: وہ دور جب سرحدیں رقت میں لپٹی تھیں، جب خاندانوں نے امید کے ساتھ پناہ لی تھی، اور جب بچوں کے قدمی نقشِ راہ اسی دھرتی پر بنے جن پر آج چال قدم بدل کر کھڑی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ، جنہوں نے اس مٹی میں اپنی پرورش پائی، وہی آج اس قدیم تعلق کو بھول کر باہر سے آنے والی سازشوں کے سازوں پر نغمہ سُر اہیں۔ اور یہ حقیقت دل بے قراری کو چیر دیتی ہے۔ یاد کریں ایک وقت میں عالی مقام رہنما ملا عمر کے یہ کلمات: "ہم پاکستان کے احسانات کا بدلہ قیامت تک چکا نہیں سکتے؛ جہاں آپ کا پسینہ گرے گا، وہاں ہم اپنا خون قربان کر دیں گے۔" یہ تقریر ایک پل کا عہد نہیں بلکہ ایک رگِ جان کی صدائیں تھیں جن میں اخلاص اور وفا کا دعویٰ بندھا ہوا تھا۔ آج طالبان کے امیر ہیبت اللہ جو اس وقت 20 برس کے نوجوان تھے، کیا آج اپنے امیر کے خطاب کی گواہی سے انکار کر سکتے ہیں اور آج افغان طالبان کے وزیر دفاع ملا یعقوب اپنے والد کے ان الفاظ کی گونج کو آج بھی اپنے کانوں میں محسوس تو کرتے ہوں گے۔

اس کریناک تماشہ میں تلخ بات یہ ہے کہ وہ نسلیں جن کو بچپن سے جوانی تک اسی اہل سخاوت نے پروان چڑھایا، بعض اوقات ماضی کی شان کو فراموش کر کے نامرادانہ راستوں کو اپناتی ہیں۔ وہی کردار آج ایسی اقدار کے منافی ٹھہرتے ہیں جن کی اصل جڑیں اس سرزمین کی مہربان یادوں سے بندھی تھیں۔ اور جب بین الاقوامی محاذ پر نئے دوستی کے رنگ جم رہے ہیں۔ پانی کے منصوبے، سفارتی ہاتھ جو قریب آرہے ہیں۔ تو سوال اٹھتا ہے: کیا یہ تغیرات تسلسلِ رنج سے نکالنے کی راہ ہیں یا ایک نئے وبال کی شروعات؟

ہماری داستانِ ہمدردی کا روشن باب آسانی سے بند نہیں ہو گا، اور نہ اس کی عظمت کبھی چھپ سکتی ہے۔ وہ قوم جو 40 برس تک کٹھن موجوں میں ہاتھ بڑھا کر دوسرے کی آغوش بنی، آج بھی ان احسانات کی میراث اور محبتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ وفا کی قیمت وقتی مفادات سے نہیں، باہمی اعتماد، ذمہ داری اور

حقیقت پسندی سے تولی جائے۔ اگر ہم نے ماضی کی سخاوت کو صرف یادِ ماضی سمجھ لیا اور عملی کفایت اور احتیاط سے کام نہ لیا تو پھر وہی تاریخ ہمیں کس نام سے یاد رکھے گی۔

یہ بھی لازم ہے کہ جن روایات نے کبھی اتحاد و انسیت کو جنم دیا تھا، انہیں محض لب و لہجہ میں نہیں بلکہ عملی روایات میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ سرحد کے وہ لوگ جن کے لہجے یہاں کے ہیں، جن کے تعلیمی اور پیشہ ورانہ نشو و نما اسی مٹی نے کی۔ ان کے مستقبل کے بارے میں روشن، منصفانہ اور انسانی فیصلے کیے جائیں۔ نہ صرف قوانین بلکہ ہمدردی کے انسانی تقاضے بھی حکم کار ہوں۔ تبھی ہم امن کی ایسی عمارت تعمیر کر سکتے ہیں جو دیر پا ہو۔

آخری نوید یہ ہے: دشمنی کے موسم میں انسانیت کی گرمی کو فراموش نہ کیا جائے۔ آج بیرونی قوت یا اس کے سہولت کار، ہمارے احسان و ہمدردی کے بدلے ہمیں دھوکہ دے رہیں تو بھی ہمیں اپنی بنیادیں مضبوط رکھنی ہوں گی۔ یعنی اوّل تو دفاع، پھر گفت و شنید، اور آخر کار انصاف۔ مگر جہاں عقل اور شجاعت دونوں درکار ہوں، وہاں ہمیں ہمت کے ساتھ کھڑا ہونا ہو گا، اور اپنے گھر کی حفاظت کیلئے ہر قانونی اور اخلاقی ذریعہ بروئے کار لانا ہو گا۔ امن کی جنگ وہ تنہا معرکہ ہے جس میں دونوں طرف کے سپاہی جیت سکتے ہیں۔ پاکستان اپنا فرض ادا کرنے کیلئے پر عزم ہے لیکن امن ایک ایک طرفہ عہد سے نہیں بلکہ باہمی یقین اور عملی ذمہ داری سے قائم ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ خطہ ایک دن جنگ کی دھواں بھری فضا سے نکل کر علم، تعمیر، تجارت اور انسانیت کی روشنی میں نہا اٹھے۔ آمین

آخر میں ایک بار پھر دل سے یہی عرض میری درد مندانہ التجا یہ ہے کہ تاریخ کی آنکھ کھلی رہے، عفو کی روشنی گرم رہے، اور انصاف کا پیمانہ انصاف پسندی سے چلے؛ تبھی ہم اس عظیم انسانی امتحان کو عزت و احترام کے ساتھ یاد رکھ سکیں گے۔ ہماری تاریخ ہمیں جلاتی بھی ہے اور سنبھالتی بھی۔ آئیں ہم اُس روشنی کو ضائع نہ ہونے دیں، اور اپنے فرائض کو ایسے پورا کریں کہ آنے والی نسلیں ہمارے بارے میں فخر سے لکھ سکیں کہ ہم نے بدلے کی قوت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دینے کا راستہ اپنایا۔

جبر سے بغاوت تک

تاریخ کے صفحات پر بعض اوقات برف پوش علاقے وہ صدائیں جنم دیتے ہیں جو آگ کے الاؤ سے بھی زیادہ گرم ہوتی ہیں۔ تاریخ کے افق پر جب بھی ظلم کی دھوپ اپنی تمازت سے انسانیت کو جھلسانے لگتی ہے، کہیں نہ کہیں بغاوت کا ایک بادل اٹھتا ہے۔ برصغیر کی مٹی نے بھی ایسی ہی صدائیں کو بار بار جنم دیا۔ کبھی وہ گاندھی کے عدم تشدد کی صورت تھی، کبھی بھگت سنگھ کے انقلابی نعرے کی، کبھی خالصتان کی فکری لاکر کی اور کبھی ناگالینڈ، منی پور اور دیگر درجن بھران مزاحمتی تحریکوں کی جو سارے بھارت میں ہندو سامراج سے جان چھڑانے کیلئے چل رہی ہیں۔ آج وہی صدائیں ایک نئے نام کے ساتھ برف زاروں میں گونج رہی ہے۔

لداخ — وہ خطہ جو ہمالیہ کی برقیلی چوٹیاں اوڑھے بیٹھا تھا۔ اب احتجاج، بغاوت اور خودی کی بیداری کا استعارہ بن چکا ہے۔ یہ وہی لداخ ہے جہاں کبھی قوم پرستی کی نیند کے خواب دیکھے گئے تھے، مگر آج اس نیند کی تعبیریں مودیکے ڈراؤنے خواب کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ یہاں کے پہاڑ اب گونگے نہیں رہے، وہ دہلی کی سیاست کے خلاف صدائیں بن چکے ہیں۔ آرٹیکل 370 کی منسوخی نے جس آئینی شاخ کو کاٹا تھا، اب وہاں پہلے سے مضبوط نئی جڑیں پھوٹنے لگی ہیں مگر لداخ کی بغاوت اکیلی نہیں۔ بھارت کی فضاؤں میں آج کم از کم دو درجن تحریکیں اسی صدا کو دہرا رہی ہیں۔

مشرق میں ناگالینڈ، میگھالیہ، میزورم اور منی پور کے قبائل دہلی سے خود مختاری مانگ رہے ہیں۔ جنوبی ہند میں تامل ناڈو کے نظریاتی گروہ اور آندھرا پردیش کے علاقائی اتحاد وفاقی اختیارات کی نئی تعبیر چاہتے ہیں۔ پنجاب میں خالصتانی تحریکوں کی بازگشت دنیا بھر میں پھر زندہ ہے۔ تمام مغربی ممالک اور امریکا سمیت کینیڈا میں خالصتان کی آزادی کے حق میں سکھ برادری ریفرنڈم میں اپنا بار ہا فیصلہ دے چکی ہے۔ کیرالہ، آسام، چھتیس گڑھ اور جھارکھنڈ میں مقامی آزادی کے نعرے دبے لفظوں میں نہیں، کھلے عام سنائی دے رہے ہیں۔ دلت تحریکیں، کسان یونینز اور طلبہ محاذ — سب ایک نئے اجتماعی اضطراب کی علامت بن چکے ہیں۔

یہ سب محض سیاسی اختلافات نہیں بلکہ ہندوستان کے اندرونی ضمیر کی بغاوتیں ہیں — وہ ضمیر جو مودی سرکار کے مصنوعی اتحاد کے پردے کو چیر رہا ہے۔ مودی کی حکومت اب اُس مقام پر آچکی ہے جہاں اس کے وعدوں کا جادو پاش پاش ہو چکا ہے، اور جب جادو ٹوٹ جائے تو جابر اپنی شکست کو چھپانے کیلئے دشمن تراشتا ہے۔ اسی لیے آج دہلی کی زبان پر پاکستان کا نام ہے، اسی لیے سرحدوں پر جنگ کی دھمکی دی جا رہی ہے، تاکہ اندر کے شور کو دبایا جاسکے لیکن تاریخ کے کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ وہ سن رہی ہے کہ ہندوستان کے اندرونِ خاک اب آزادی کی نئی داستانیں لکھی جا رہی ہیں اور لداخ اُن میں سب سے تازہ اور خطرناک باب ہے۔

چین کی سرحد کے دامن میں واقع لداخ، جہاں صدیوں سے خاموش برفانی فضا دلوں کی سرد مہری کی تصویر بنی رہی، آج یکایک آگ بن گئی ہے۔ خاموش برف زاروں میں اچانک احتجاج کی وہ لہر اٹھی جس نے چار جانوں کی قربانی سے تاریخ کا نیا باب لکھ دیا۔ وہی برف پگھل کر اب احتجاج کی صورت میں پہنے لگی ہے۔ چین کی سرحد کے قریب، یہ مظاہرے محض سیاسی ردِ عمل نہیں بلکہ حکومتی کے خلاف انسانی غیرت کی فطری بغاوت ہیں۔ چار جانوں کی قربانی نے اس برف زار کو لہو کی گرمی عطا کر دی۔ ہندوستانی افواج کی گولیوں نے نہ صرف جسموں کو چھیدا بلکہ ریاستی جبر کی نقاب بھی چاک کر دی۔

آج کی یہ آگ اور یہ اضطراب دراصل اُس چنگاری کا تسلسل ہے جو 2019 میں دہلی کی پارلیمان کے ایوانوں میں بھڑکی تھی۔ جب پارلیمان نے آرٹیکل 370 کا جنازہ اٹھایا۔ آرٹیکل 370 کی تنسیخ کو جسے 'مودی کا ماسٹر اسٹروک' کہا گیا، وہی اب ریاستی بدن پر زخم بن کر ابھر رہی ہے اور وہ آج ریاستی زخم بن کر لہو بن گیا ہے۔ سیاست کی وہ بازی جس میں آئینی حقوق کو مہرے بنایا گیا، آج انسانی ضمیر کی عدالت میں زیرِ سماعت ہے۔

پانچ برس سے وادی کشمیر ظلم کی سیاہ رات میں ڈوبی ہوئی ہے، پندرہ ہزار کشمیری نوجوانوں کی گمشدگی نے اس خطے کے دل میں خاموش انتقام کی لوجلا دی ہے۔ کشمیر کے مظلوموں کے بعد اب لداخ کی خاموش فضاؤں نے زبان پائی ہے مگر لداخ میں یہ طوفان دے دے قدموں سے بغاوت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ پُر سکوت پہاڑوں کے نیچے بے چین دلوں کی دھڑکنیں سنائی نہ دیتی تھیں، مگر اب وہ صدائے احتجاج بن کر گونج رہی ہیں۔ پندرہ ہزار نوجوانوں کی گمشدگی صرف اعداد نہیں، بلکہ ضمیر کی قبر پر کھڑی شمشان کی مشعلیں ہیں۔

پانچ اگست 2019 کا دن ہندوستانی جمہوریت کے صفحات پر ایک سیاہ ترین اور بدبودار سنگ میل کے طور پر درج ہو چکا ہے۔ جموں و کشمیر کو دو حصوں میں بانٹ کر دہلی نے گویا اُس تاریخ کو دو لخت کر دیا جو کبھی ایک وحدت تھی۔ صرف جموں و کشمیر کو ہی نہیں بانٹا گیا بلکہ لداخ کو اسمبلی سے محروم کر دیا گیا۔ لداخ کو اسمبلی سے محروم ایک یونین ٹیریٹری بنانا ایسا ہی تھا جیسے کسی بدن سے روح نکال کر اُس پر نظم و نسق کے لبادے ڈال دیے جائیں۔ یہ محض انتظامی تقسیم نہیں تھی، بلکہ ایک تہذیبی شناخت کی توڑ پھوڑ تھی۔

لداخ کے لوگوں کی فریادیہ نہیں کہ انہیں کوئی نیا تاج دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ ان کی شناخت کی بقا کی ضمانت دی جائے۔ وہ شیڈول 6 کے سایے میں اپنے ماحول، اپنی ثقافت اور اپنی زمین اور اپنی فضا کی امان چاہتے ہیں۔ یہ مطالبہ دراصل بقا کی پکار ہے، نہ کہ بغاوت کی۔ یہ مطالبہ دراصل جینے کا حق ہے، سیاست کا نہیں لیکن مودی کے ظالمانہ رویہ نے لداخ کے عوام کو اپنی بنیادی زندگی کے حقوق کی پہچان کروادی ہے اور وہ اب اس ظالمانہ الحاق سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔

سونم وانگچک — ایک استاد، ایک مفکر، ایک فطرت دوست — اب تحریک کے محور بن چکے ہیں۔ وہ محض ایک ماہر ماحولیات نہیں، بلکہ ضمیر کی آواز ہیں۔ ان کی قیادت میں لیہہ کے بودھ اور کرگل کے مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہیں، گویا مذہب کی دیواروں کے پار انسانیت نے ہاتھ ملا لیا ہو۔ لداخ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ انسان نے مذہب پر سبقت حاصل کی۔ یہ اتحاد تاریخ کے جبر کے مقابلے میں فطرت کی زبان میں لکھی گئی نظم ہے۔

جب طاقت نے سنی ان سنی کی تو بھوک نے زبان پائی۔ جب بات دلیل سے نہ بنی تو وانگچک نے بھوک سے احتجاج کیا۔ وانگچک کی بھوک ہڑتال دراصل انسانی وقار کی علامت تھی۔ حکومت کے مذاکرات محض سیاسی چال ثابت ہوئے۔ دہلی تک کامارچ اور حکومت کے بے حاصل مذاکرات یہ ثابت کرتے ہیں کہ طاقت جب سننے سے انکار کر دے تو خاموشی خود ایک للکار بن جاتی ہے۔ یاد رکھیں کہ خاموشی احتجاجی آوازوں کی مرشد ہے اور تحریر بھی خاموشی کی روح اور زبان ہے۔ خاموشی اور سچائی کی بھوک بجھائی نہیں جاسکتی۔ حکومت کی خریدار نہ سیاست اُس ضمیر کو نہیں خرید سکی جو برف کے پتھروں میں بھی گرم اہلتا خون رکھتا ہے۔

ستمبر کی سرد راتوں میں شہید پارک کے روزے دار مجاہدین نے بھوک کو احتجاج کا استعارہ بنادیا۔ 23 ستمبر کو جب دوبزرگ بھوک سے نڈھال، گر کر رہے ہوش ہو گئے، یہی لمحہ عوامی صبر کی آخری حد تھا۔ بھوک کا احتجاج اب عوامی شعور کی آگ میں ڈھل گیا تو دلوں میں جو جذبہ تھا، وہ آتش فشاں بن گیا۔

انسان جب اپنے وجود کے انکار پر مجبور ہو، تو بھوک بھی انقلاب کا ہتھیار بن جاتی ہے۔

24 ستمبر کو لیہہ کی گلیوں میں نوجوانوں کے قدم گویا تاریخ کی چاپ بن گئے۔ عوام نے مارچ کیا تو ریاست نے جواب گولی سے دیا۔ ہر گولی دراصل ایمان، انصاف اور وعدے پر چلائی گئی ایک گولی تھی۔ گولیاں چلیں، خون بہا، اور سرکاری عمارتیں اُن آنسوؤں کی قبریں بن گئیں جنہیں ریاست نے کبھی پونچھنے

کی زحمت نہیں کی۔ ہر گولی ایک وعدے کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔

چار زندگیاں اپنے جائز مطالبات کیلئے خاک میں مل کر قربان ہو گئیں۔ ایک سابق سپاہی بھی اُن میں تھا، جو کبھی اسی پرچم کا محافظ تھا اور جس نے شاید کبھی اسی ترنگے کیلئے جان دینے سے بھی گریز نہیں کیا تھا مگر اب وہ پرچم اُس کے خون سے تر ہو گیا۔ وانگچک کی گرفتاری نے گویا انصاف کو زنجیر پہنادی۔ وانگچک کی گرفتاری نے انصاف کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔ ریاست کی سلاخیں جب اہل فکر کو قید کریں، تو دیواروں سے صدائیں اٹھتی ہیں، خاموشی شور بن جاتی ہے۔



لداخ کے بام فلک پر کر فیو کا سناٹا چھا گیا۔ موبائل، انٹرنیٹ، حتیٰ کہ گفتگو کے دھاگے تک کاٹ دیے گئے۔ کر فیو نے زبانیں بند کیں، مگر دلوں کی صدائیں گونج بن گئیں، مگر دلوں کی موجوں اور روشن جذبوں کو کون روک سکتا ہے؟ ریاست نے جسم قید کیے، مگر روح آزاد کر دی۔ عوام کا اضطراب اب فضا میں پھیل چکا ہے، اور پہاڑ بھی اس خاموش چیخ کے گواہ ہیں۔

چیرین دورے کی پکار میں آئینی روح بولتی ہے، چیرین دورے لا کر گ کی زبان میں جو آگ ہے، وہ مایوسی نہیں، ایمان ہے۔ وہ کہتا ہے: ہم جرم نہیں کر رہے، وعدہ یاد دلار ہے ہیں، وعدہ خلافی کے جواب میں گولی نہیں، انصاف چاہیے۔ یہ صدا گویا آئین کے بطن سے اٹھتی ہے۔ وہ حکومت سے نہیں، انصاف سے مخاطب ہیں۔ کہ وعدے پورے کرو، ہم صرف وعدے مانگتے ہیں، رعایتیں نہیں۔

6 اکتوبر کے مذاکرات کے آغاز سے پہلے ہی چار افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ جب ظلم کے بعد مذاکرات کی میز بچھائی جاتی ہے تو الفاظ محض رسمی تعزیت بن جاتے ہیں۔ ظلم کے بعد مذاکرات، انصاف نہیں، تمسخر ہوتا ہے۔ لداخ کے رہنماؤں نے بائیکاٹ کر کے عزت نفس کا پرچم بلند رکھ کر بتادیا کہ عزت کی سیاست سودے بازی سے بلند ہے۔ نوجوان اب دہلی کے وعدوں پر نہیں، اپنی خودی کے عزم پر یقین رکھتے ہیں۔ لداخ کے نوجوانوں کی آنکھوں میں اب وہ خواب نہیں جو دہلی نے دکھائے تھے، بلکہ وہ عزم ہے جو خود ان کے دل نے تراشا ہے۔ وہ سونم وانگچک کو ایک رہنما نہیں، اپنے وجود کی علامت سمجھتے ہیں۔ وانگچک اُن کیلئے ایک تحریک نہیں بلکہ ایک آئینہ ہیں۔ یہی نوجوان تحریک کے حقیقی ترجمان ہیں۔ زندہ ضمیر کی دھڑکن۔

جب مطالبات آئینی اور قانونی ہوں، اور جواب میں گولی ملے، تو سوال یہ نہیں رہتا کہ حکومت ظالم ہے یا نہیں بلکہ آئین خود سوال بن جاتا ہے کہ آئین کس کا ہے؟ عوام کا یا اقتدار کا؟ یہی لداخ کی داستان ہے۔ جو حکومت آئین کا سہارا لے کر ظلم کرے، وہ دراصل آئین کی روح سے بغاوت کرتی ہے۔ لداخ کے نوجوان اپنی زمین، اپنے آکاش، اپنے دریا کے محافظ ہیں۔ ان کا مطالبہ محض قانون نہیں بلکہ فطرت کے حق کی بازگشت ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جو ہوا، جو پانی، جو مٹی ہماری ہے، اُس پر غیر کا حکم کیسے چلے؟ ان کا نعرہ: "ہمارا آسمان، ہمارا قانون۔" یہی وہ صدائے خودی ہے جسے دہلی سننا نہیں چاہتی۔ یہی شیڈول 6 کا فلسفہ ہے—خود مختاری نہیں، خودی کی حفاظت۔

لداخ کا یہ خوف بجا ہے کہ سرمایہ داری کا سیلاب اُس کی تہذیب اور لداخ کے پہاڑوں کو بہانہ لے جائے۔ تین لاکھ کی آبادی اگر لالچ کی سیاست میں پس گئی تو یہ پہاڑ انسانیت کی قبریں بن جائیں گے۔ یہ خطہ اگر کارخانوں کی دوڑ میں پس گیا تو فطرت کا ایک حسین ورق مٹ جائے گا لہذا اُن کی پکار دراصل زمین کے حق میں زمین کی آواز ہے۔

دیسکت انگلو کی بات میں عورت کی فطری بصیرت جھلکتی ہے۔ وہ کہتی ہیں، "ہم تشدد کے نہیں، سچ کے طلبگار ہیں۔ ہم عدالتی تحقیقات چاہتے ہیں تاکہ سچ سامنے آئے۔" یہ جملہ لداخ کے ماتھے پر نسائی وقار کا تاج ہے، یہ جملہ محض مطالبہ نہیں، تہذیب کی فتح ہے—کہ احتجاج کے بیچ بھی اُنہوں نے عدم تشدد کا چراغ روشن رکھا اور عدم تشدد کی فتح کا پرچم تھام رکھا ہے۔

جب رائے عامہ دو حصوں میں بٹ جائے تو بیچ ہمیشہ زخم بن کر ابھرتا ہے۔ وانگچک کو دشمن کہنا آسان ہے، مگر سچ کا گلا گھونٹنا مشکل۔ بی جے پی کے حامی انہیں غدار کہتے ہیں، مگر عوام انہیں وطن کا ضمیر مانتے ہیں۔ وانگچک کو غدار کہنے والے دراصل اپنی خوفزدہ سیاست کے حصار میں ہیں مگر دوسری آواز جو اُنہیں قومی مفاد کا محافظ کہتی ہے، وہ دراصل انسانیت کی ضمیر کی گواہی ہے، جو اب عالمی میڈیا میں بھی حق کی آواز بن کر ابھر رہی ہے۔

چیرن دور جے کا اعتراف ایک تاریخی طعنے ہے۔ جنہوں نے آرٹیکل 370 کی منسوخی پر جشن منایا تھا، آج وہ پچھتاوے کے آنسو بہا رہے ہیں۔ آج وہی کہتے ہیں: ہم اس آرٹیکل کے سائے میں زیادہ محفوظ تھے۔ گویا تاریخ نے پلک جھپکتے میں جشن کو ماتم کدہ بنا دیا۔ آرٹیکل 370 ایک آئینی حصار تھا، جو ریاست کی شناخت کا نگہبان تھا۔ جب وہ گرایا گیا تو لداخ، جموں، کشمیر سبھی بے لباس ہو گئے۔ آرٹیکل 370 کا خاتمہ دراصل ریاستی خودی کی موت تھی۔ اب زمین بکتی ہے، خواب بیچے جاتے ہیں، اور انسانی شناخت نیلام یا گروی رکھ دی گئیں ہیں۔

پھونسوک ستوبدن کا انتباہ گونجتا ہے: یہ نہ بھولو، لداخ چین کی سرحد پر ہے۔ پھونسوک کا انتباہ محض تجزیہ نہیں، ایک فکری و جغرافیائی خطرے کی گھنٹی ہے۔ وہ یاد دلاتے ہیں کہ لداخ چین کی سرحد پر ہے—اور جو سرحدی نگہبان ہیں، اُنہیں ناراض کر کے کوئی ریاست محفوظ نہیں رہ سکتی۔ سرحدی عوام کو ناراض کرنا گویا آنکھوں پر پٹی باندھ کر جنگ میں کودنا ہے۔ یہاں اگر وفاداری ٹوٹی، تو برفانی پہاڑ گواہ ہوں گے کہ وفا کو زبردستی نہیں خریدا جاسکتا۔ جب کسی علاقے کے فیصلے اُس کے لوگوں کے بغیر کیے جائیں، تو حکومت نہیں، استبداد جنم لیتا ہے۔ غیر مقامی افسران کے ہاتھوں لداخ کا نظم و نسق سپرد کرنا گویا کسی اجنبی کو اپنے گھر کی چابیاں دینا ہے، دور دراز کے افسران کو لداخ کی تقدیر پر مسلط کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی اجنبی کو گھر کا سربراہ بنا دیا جائے۔ جمہوریت کے نام پر غلامی کا نیا باب رقم کر دیا گیا ہے۔ غیر مقامی حاکمیت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی یہ لداخ کی مجبوری کی علامت ہے۔

شیڈول 6 اب محض ایک سیاسی نعرہ نہیں رہا؛ یہ دلوں کا عہد اور عقیدہ بن چکا ہے۔ لداخ کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہماری زمین پر فیصلے دہلی نہیں، لیہہ کرے۔ لداخ کے عوام دہلی سے نہیں، اپنے حق خود ارادیت سے جڑے ہیں۔ یہ مطالبہ مرکز گریز نہیں، مرکز سے انصاف کی طلب ہے۔ 1949ء کی آئینی شقیں جن کا تعلق شمال مشرق سے تھا، اب لداخ کیلئے بھی امید بن گئی ہیں اور یہی آئینی اصول اب لداخ کیلئے رہنمائی کا چراغ ہیں۔ عوام چاہتے ہیں کہ قانون اُن کے ہاتھ میں ہو، اور فطرت اُن کی محافظ۔ یہاں کے لوگ وہی خود اختیاری چاہتے ہیں جو آسام اور میگھالیہ کو ملی—یعنی فطرت کے ساتھ ہم

آہنگ قانون سازی۔ وہ کہتے ہیں: ہمارے پہاڑ ہمارے قانون کے تابع رہیں۔

شیڈول 6 کی رعایتیں آئینی خودی کی روح ہیں۔ آرٹیکل 371 کا وعدہ دہلی نے کیا، مگر یقین دلانے کے باوجود مودی حکومت نے اعتماد پارہ پارہ کر دیا۔ آرٹیکل 371 کے وعدے ادھورے رہے، اسی لیے یقین بغاوت میں بدل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب رعایت نہیں، ضمانت مانگی جا رہی ہے۔ لدانخ کی بغاوت دراصل اُس یقین کی تلاش ہے جو سیاست نے چھین لیا۔ اب لدانخ کا مطالبہ رعایت نہیں، یقین کی بحالی ہے۔

جب اندر کی بغاوت کو دبایا نہ جاسکے تو بیرونی دشمن تراشے جاتے ہیں۔ مودی حکومت جب اندرونی محاذ ہارتی ہے تو بیرونی دشمنوں کے سائے بڑھا دیتی ہے۔ مودی کی زبان سے پاکستان کو گھن گرج دراصل داخلی ناکامی کی گونج ہے۔ پاکستان سے جنگ کی دھمکیاں سیاسی کمزوری کا لبادہ ہیں۔ جنگ کا شور، امن کی قبروں پر بجایا جانے والا طبلہ ہے۔

پاکستانی فوج کی جوابی لٹاکر خطے کی فضا کو پھر سے بارود آلود کرنے سے گریز کا مشورہ دیتے ہوئے متنبہ کر رہی ہے۔ اب اگر آگ لگی تو وہ صرف سرحدوں پر نہیں، دور دراز کا کوئی بھی کونہ محفوظ نہیں رہے گا اور بقول مودی کے دل میں بھڑکنی والی آگ جو اس کی روح پر قرض ہے، لیکن مودی یاد رکھے کہ اب آگ دلوں میں ایسی بھڑکے گی کہ دھڑکنیں اپنا راستہ بھول جائیں گی۔ لدانخ کے برف زاروں اور کشمیر کے چناروں سے لے کر غرہ کی گلیوں تک طاقت کے

ہاتھوں روندے ہوئے انسانیت کے زخم ایک جیسے ہیں، مودی اور اس کا وزیر دفاع اور جنرل چوہان، سب نے برف زاروں کے اس خطے میں اب بارود کی بُو گھول دی ہے اور امن کا جسم زخمی کر دیا ہے لیکن یاد رکھیں کہ اب یہ وہی منی والا پاکستان نہیں ہو گا کہ اپنے مربی اور آقا کے در پر دہائی دیکر سیز فائر کروا لیا تھا بلکہ اب یہ نوبت نہیں آئے گی اور دنیا میں فقط واحد ہندو ریاست کا نام و نشان مٹ جائے گا مگر درجنوں مسلم ممالک اس دنیا کے نقشے پر مزید ابھریں گے۔

سوال اب یہی ہے: کیا مودی اپنی اقتدار کی بقا کیلئے جنگ کی بازی کھیل سکتا ہے؟ جب حکمران اپنے عوام کے خلاف صف آرا ہو جائے تو پھر دشمن سرحد پار نہیں، محل کے اندر ہوتا ہے۔ جب حکمران عوام کی آواز دبانے لگیں، تو قومیں یا تو ٹوٹ جاتی ہیں یا جاگ اٹھتی ہیں۔ عالمی طاقتیں اس تماشے کو دیکھ رہی ہیں، مگر شاید بھول گئیں کہ برف جب پگھلتی ہے تو سیلاب بن جاتی ہے۔ اور کشمیر، لدانخ سمیت دودر جن سے زائد تحریکیں — لگتا ہے جاگ چکی ہیں۔ مودی کو برسوں پرانے دوست سوویت یونین کا نقشہ بھی ذہن میں رکھنا ہو گا۔

یہ لدانخ کے احتجاج کی وہ ادبی تفسیر ہے جو محض واقعات کا بیان نہیں بلکہ ضمیر کی بیداری کی داستان ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ظلم کے نیچے دبنے والا انسان کبھی ہمیشہ خاموش نہیں رہتا۔ برف دیر سے پگھلتی ہے، مگر جب پگھلتی ہے، تو سیلاب بولتا ہے اور لدانخ کا یہ سیلاب شاید نئی تاریخ لکھنے والا ہے۔ لدانخ کی داستان محض ایک خطے کی بغاوت نہیں، بلکہ ایک ملک کے بکھرتے ضمیر کی بازگشت ہے۔ یہ صرف برف پگھلنے کا منظر نہیں، بلکہ اقتدار کے غرور کے ٹوٹنے کی آواز ہے۔ ہندوستان، جو کبھی جمہوریت کا استعارہ سمجھا جاتا تھا، آج اپنی ہی جمہوری سانسوں پر بندوق تانے کھڑا ہے۔ آج مودی کے بھارت میں کسان دہلی کی سڑکوں پر مر رہا ہے، طلبہ یونیورسٹیوں میں قید ہیں، اقلیتیں خوف کے سائے میں سانس لے رہی ہیں، اور لدانخ کے پہاڑ، جو کبھی امن کے محافظ تھے، اب انقلاب کے قاصد بن گئے ہیں۔

مودی کا ہندوستان اب ایک نئی تقسیم کے دہانے پر کھڑا ہے۔ نہ مذہب کی بنیاد پر، نہ زبان کی، بلکہ انصاف اور نا انصافی کی بنیاد پر۔ ایک طرف وہ طبقہ ہے جو اقتدار کے طلسم میں مبتلا ہے، اور دوسری طرف وہ عوام جو بھوک، بے بسی، اور وعدہ خلافی کے بوجھ تلے کراہ رہے ہیں۔ ان حالات میں جب مودی پاکستان کو جنگ کی دھمکیاں دیتا ہے، تو یہ دراصل اندرونی شکست کے پردے پر لٹکایا گیا جنگی پردہ ہے۔ تو میں جب اپنے شہریوں کی آوازیں نہ سن سکیں، تو وہ دشمن کی سرحدوں پر نعرے لگانے لگتی ہیں۔ مگر لداخ کی برفانی ہوائیں دہلی کی گرم تقریروں سے متاثر نہیں ہوں گی۔

یہ بغاوت کوئی آنی جانی طغیانی نہیں۔ یہ فطرت کی طرف سے ایک پیغام ہے کہ جب زمین کو اس کے لوگوں سے چھینا جائے، جب ثقافت کو بازار میں بیچا جائے، اور جب وعدوں کو گولیوں میں بدل دیا جائے، تو برف بھی سیلاب بن جاتی ہے۔ لداخ اب بول اٹھا ہے، شاید جلد ہی ہندوستان کے دوسرے خطے بھی اپنی اپنی خاموشی توڑ دیں گے۔ تاریخ کی مٹی اب پھر ایک کہانی لکھنے کو ہے اور اس کہانی کا عنوان شاید یہی ہو "مودی کا ہندوستان۔ جبر سے بغاوت تک"

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

قویں ہمیشہ آسائش کے لحوں میں نہیں بلکہ آزمائش کے اندھیروں میں پہچانی جاتی ہیں۔ یہ وہ گھڑیاں ہیں جب دلوں پر مایوسی چھا جاتی ہے، آنکھوں سے خواب رخصت ہونے لگتے ہیں، اور سینے میں امید کا دیامدھم پڑ جاتا ہے۔ ہماری تاریخ بھی ایسے موڑوں سے گزری ہے۔ کبھی غلامی کے زنجیروں میں جکڑی ہوئی، کبھی تقسیم کے لیے میں، کبھی عالمی سازشوں کے زرخے میں۔ آج ہم ایک ایسی آواز کی گونج میں جمع ہیں جو ایک صدی پہلے بلند ہوئی تھی اور آج بھی زندہ ہے۔ وہ آواز ہے علامہ محمد اقبالؒ کی۔ آج کا موضوع ایک ایسے شاعر مشرق، حکیم الامت، اور مردِ درویش کے پیغام پر ہے، جن کے کلام نے غلام قوم کو آزادی کا خواب دیا، اور سوئی امت کو بیداری کی صدا دی۔ شاعر مشرق، حکیم الامت، وہ مردِ دانا جس نے غلام قوم کو بتایا کہ اندھیروں کے بعد سویرا ہے، اور مایوسی کے بعد امید کا سورج طلوع ہوتا ہے مگر ہر بار ایک آواز، ایک خواب، ایک ولولہ ہمیں اٹھاتا رہا۔ وہ آواز، وہ خواب، وہ ولولہ تھا اقبال کا پیغام:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کا یہ پیغام آج بھی صدیوں کے فاصلے طے کر کے ہمیں جھنجھوڑتا ہے۔ یہ صرف شعر نہیں بلکہ ایک فلسفہ ہے، یہ ایک صدا ہے، ایک دعوت ہے، اور ایک امید کا چراغ ہے جو مایوسی کی گھنی راتوں میں روشنی دیتا ہے جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہماری زمین و قوم بظاہر برباد لگے لیکن اگر اس پر ایمان اور عمل کی بارش ہو جائے تو یہی مٹی گلزار بن جاتی ہے۔

اقبال نے اپنے شعر میں مایوسی اور امید کا فرق بڑا واضح طور پر بیان کیا ہے۔ اس لئے قرآن کہتا ہے:

وَلَا تَيْئَسُوا مِنْ رَوْحِ اللَّهِ، إِنَّهُ لَا يَيْئَسُ مِنْ رَوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْكَافِرُونَ

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، مایوس تو صرف کافر ہی ہوتے ہیں۔ اور اقبال نے قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے کہا:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور یعنی مایوسی ایمان کے منافی ہے۔ اقبال نے بھی یہی بتایا مایوسی ایک زہر ہے، موت ہے۔ مایوس شخص عمل چھوڑ دیتا ہے، خواب دیکھنا چھوڑ دیتا ہے، امید ایمان کی علامت ہے۔ امید زندگی ہے۔ پرندہ انڈہ دینے کے بعد امید کے ساتھ گھونسلہ بناتا ہے، کسان بیج ڈال کر امید کے ساتھ پانی دیتا ہے۔ اگر اُمید نہ ہو تو زندگی رک جائے۔ اقبال کا ایمان اس حقیقت پر تھا کہ امت وقتی زوال کا شکار ہو سکتی ہے، لیکن اگر اس کے اندر ایمان، خودی اور عمل کا چراغ روشن ہو جائے تو یہ امت دوبارہ عروج پاسکتی ہے۔

ایسے دیکھتے ہیں کہ اقبال کشتِ ویراں کی تعبیر سے کیا مراد ہے:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

تو کشتِ ویراں سے مراد صرف کھیت یا زمین نہیں، بلکہ پوری امتِ مسلمہ کی اجتماعی حالت ہے۔ یہ استعارہ تین سطحوں پر سمجھا جاسکتا ہے:

پہلا مرحلہ انفرادی سطح پر کشت ویراں ہے۔ انسان کا دل و دماغ جب خوابِ غفلت میں ڈوبا ہو۔ جب اندر سے انسان خالی ہو جائے۔ نہ مقصد ہو، نہ عزم، نہ خودی۔ یہ بھی ایک ویراں کھیت ہے، جس میں بیج تو ہیں لیکن پانی اور نگہداشت نہ ہونے کے باعث کچھ نہیں اگ رہا۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ہر فرد اپنی خودی کو پہچانے، اپنے دل کو ایمان کے پانی سے سیراب کرے، تاکہ یہ بنجر زمین دوبارہ زرخیز ہو جائے۔ اس لئے اقبال نے فرمایا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

اس استعارہ کی دوسری سطح پر اجتماعی سطح پر کشت ویراں کی طرف توجہ دلائی ہے کہ غلام قوم، جو اپنی پہچان کھو بیٹھی ہو۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں علم کی روشنی بجھ جائے، اتحاد ختم ہو جائے، اور لوگ دوسروں کے فیصلوں کے محتاج بن جائیں۔ یہ ہے اجتماعی کشت ویراں۔

اقبال کا وزن صرف برصغیر پاکستان تک محدود نہ تھا۔ وہ امتِ مسلمہ کے اتحاد کے قائل تھے۔ جب وہ کشت ویراں کی بات کرتے ہیں تو ان کی نظر صرف ایک قوم پر نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا پر تھی، جو استعماری طاقتوں کے ہاتھوں تقسیم ہو چکی تھی کیونکہ اقبال نے اپنے زمانے میں تین بڑے صدمے دیکھے، اقبال نے اپنی آنکھوں سے ترکِ خلافت ختم ہونے کا زخم جھپلا، عربوں اور اسلامی دنیا پر سامراج کا قبضہ، ایران، افغانستان اور برصغیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔۔۔ قوم ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی، یہ سب اقبال کی نظر میں کشت ویراں تھے لیکن اقبال نے حوصلہ نہ ہارا۔ اسی سوچ کے تحت اقبال نے کہا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے

نیل کے ساحل سے لے کر تاجناب کا شجر

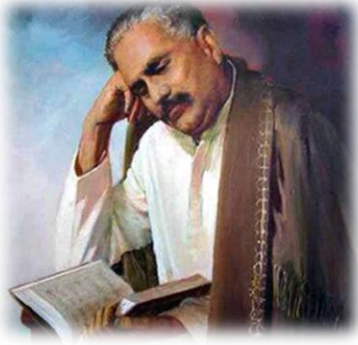
اقبال بالکل ناامید نہیں تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان اپنی جڑوں کو پہچان لیں، اپنے ایمان، علم اور اتحاد کے ذریعے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ امت دوبارہ عروج حاصل کر سکتی ہے۔ اقبال نے حوصلہ نہ ہارا۔ وہ فرماتے ہیں:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستار

لیکن اقبال نے کہا یہ وقتی ویرانی ہے۔ اس امت کی اصل زمین بڑی زرخیز ہے۔ اگر اس پر ایمان، علم اور عمل کا پانی برسے تو یہ دوبارہ سنبھل سکتی ہے۔ یہی پیغام تھا کہ اگر ایک ایک فرد اپنی خودی پہچان لے تو پوری قوم کا نقشہ بدل سکتا ہے۔

اس شعر کا اہم اور تیسرا استعارہ پاکستان اور امتِ مسلمہ کے تناظر میں کشت ویراں کا جائزہ لیں تو آج ہمارے ملک اور امت کی حالت غلامی، انتشار، جہالت اور بے بسی کا شکار کشت ویران کی طرح ہے۔ کیا ہم نہیں دیکھ رہے کہ اندرونی خلفشار، کرپشن، تعلیمی پسماندگی اور بیرونی دباؤ نے ہماری کشتِ زندگی کو دبوچ رکھا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہماری زمین بنجر ہو گئی ہے لیکن اقبال یاد دلاتے ہیں۔ یہ بنجر زمین اصل میں بنجر نہیں ہے، بس اس میں نم نہیں رہا۔ یہ نم کیا ہے؟ ایمان کا نم، علم کا نم، قربانی کا نم، اتحاد و غیرت کا نم، خودی کا نم، قربانی کا نم، علم و عمل کا نم۔ جب یہ 8 عناصر اس مٹی کو مل جائیں گے تو یہی بنجر کھیت دوبارہ اہلہانے لگے گا۔



تاریخ شاہد ہے جب مسلمان اندلس میں داخل ہوئے تو ایک چھوٹی سی قوم تھی، مگر اپنے ایمان اور علم سے صدیوں تک یورپ کو قیادت دی۔ جب صلاح الدین ایوبی نے حوصلہ دکھایا تو بیت المقدس آزاد ہوا۔ جب سرسید احمد خان نے تعلیم کی شمع جلائی، تو تاریخ شاہد ہے کہ غلام قوم کے نوجوان شعور حاصل کرنے لگے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ کسی نے کشت ویراں میں نم پیدا کیا۔ اقبال نے ایک اور خواب دیکھا۔ پاکستان کا خواب، 1930ء کے خطبہ الہ آباد میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کیلئے ایک الگ وطن ہونا چاہیے۔ اس وقت لوگ ہنسے، مذاق اڑایا، کہا یہ ممکن نہیں لیکن اقبال کا ایمان کہتا تھا "نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے" اور دیکھتے ہی دیکھتے وہی خواب قائد اعظم کی قیادت میں حقیقت بن گیا۔ اقبال نے سب سے زیادہ امید نوجوانوں سے باندھی۔ وہ بار بار کہتے ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

یعنی نوجوان کی منزل زمین پر ختم نہیں ہوتی، اس کے سامنے آسمان بھی چھوٹے ہیں۔ اقبال نوجوانوں کو شاہین کہہ کر مخاطب کرتے رہے کیونکہ شاہین بلندی پر رہتا ہے، تیز نظر رکھتا ہے، اور دوسروں کے باسی شکار پر قناعت نہیں کرتا۔ اگر نوجوان اپنی خودی پہچان لیں، وقت ضائع نہ کریں، تعلیم و ہنر حاصل کریں تو یہی ویران کشت سبزہ زار بن سکتا ہے یعنی نوجوانوں کے سامنے امکانات کی دنیا ہے۔ وہ غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، مگر اگر اپنی خودی کو پہچان لیں تو پوری دنیا ان کے قدموں میں ہو سکتی ہے۔ اقبال کے نزدیک خودی اپنی اصل پہچان، ایمان قوت کا سرچشمہ اور عشق رسول ﷺ ہی اصل زندگی ہے۔

اقبال کی کشت ویراں سے ناامید نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے ایک خواب دیکھا۔ ایک آزاد مملکت کا خواب، جہاں مسلمان اپنی تہذیب اور ایمان کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ وہ خواب بعد میں پاکستان کی صورت میں حقیقت بنا۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ ایک شاعر نے اپنی قوم کو مایوسی سے نکالا اور بتایا کہ تمہاری مٹی زرخیز ہے، بس تمہیں اپنی صلاحیت پہچانی ہے۔ لیکن آج پھر حالات کچھ ویسے ہی ہیں۔ سیاسی انتشار، معاشی بحران، بیرونی دباؤ، اور اندرونی کمزوریاں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک بار پھر ہماری کشت ویراں ہو گئی ہو لیکن اگر اقبال آج ہوتے تو یہی کہتے: نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشت ویراں سے۔

یقیناً پاکستان آج مسائل کا شکار ہے، لیکن اگر یہ قوم ایمان اور محنت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہو تو کوئی طاقت ہمیں جھکا نہیں سکتی لیکن اگر ہم اقبال کے پیغام کو سمجھ لیں تو ہمیں پھر سے یقین ہو گا کہ یہ سر زمین بڑی زرخیز ہے۔ دراصل کشت ویراں کی ایک بڑی وجہ علم سے دوری ہے۔ اندلس کا زوال اس وقت شروع ہوا جب مسلمان کتاب اور تحقیق چھوڑ بیٹھے۔ اقبال نے اسی لئے کہا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا

لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

آج پاکستان انتشار، سیاسی فحشاء، معاشی بحران، اور بیرونی دباؤ کا شکار ہے۔ عوام مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں، کچھ لوگ تو یہ کہنے لگے ہیں کہ اس ملک کا مستقبل نہیں ہے۔ ایسے میں اقبال کا یہ شعر عوام کو یہ یقین دلاتا ہے کہ یہ مٹی بنیادی طور پر بخر نہیں ہے۔ یہ قوم اپنی اصل میں بڑی زرخیز اور باصلاحیت

ہے۔ صرف ذرا غم کی ضرورت ہے۔ یعنی ایمان، دیانت، قربانی، اور قومی وحدت کا غم۔ مایوس نہ ہوں، یہ ملک بحران سے نکل سکتا ہے، بس ہمیں اپنی صفوں کو درست کرنا ہوگا، اپنے اندر سے خود غرضی ختم کرنی ہوگی اور اجتماعی طور پر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرنا ہوگا یعنی عوام اگر اپنی ذمہ داری پہچان لیں تو وہ خود اپنی تقدیر لکھ سکتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ موجودہ مشکلات سے نکلنے کیلئے ہمیں کیا کرنے کی ضرورت ہے؟ اس سوال کا صحیح اور بروقت جواب ہی ہماری اصل قوت ہے اور وہ ہے ایمان اور قرآن سے وابستگی اور اخلاص کے ساتھ جڑنا، علم و تحقیق میں آگے بڑھنا۔ نوجوانوں کو مقصد اور شعور دینا اپنے وسائل پر اعتماد کرنا اور اتحاد و یکجہتی کا دامن مضبوطی سے پکڑنا، اتحاد و اتفاق پیدا کرنا، محنت اور قربانی کے جذبے کو بیدار کرنا کیونکہ یہی خواص ہی ہماری نوجوان نسل کا مستقبل ہیں۔ تفرقہ ہمیشہ شکست لاتا ہے۔ اور باغ محنت کے بغیر نہیں اگتا۔ ہی وہ ذرا غم ہے جو اس مٹی کو گلزار بنا سکتی ہے۔

اقبال کا پیغام آج بھی زندہ ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ اگر خودی کو بیدار کر لو تو تقدیر بھی تمہارے قدم چومے گی۔ لہذا مایوسی کے اندھیروں میں نہ ڈوبو۔ مایوسی کفر ہے۔ یہ قوم زندہ ہے، یہ زمین زرخیز ہے، یہ مٹی معجزے پیدا کر سکتی ہے۔ بس ہمیں اپنے اندر کا غم تلاش کرنا ہے۔ اللہ کرے کہ ہم اس پیغام پر عمل کریں، اپنی قوم کو سنواریں، اور دنیا کو دکھادیں کہ مسلمان کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اقبال کا عملی پیغام یہ ہے کہ ایمان کے غم سے دلوں کو تر کرو۔ علم کے غم سے ذہنوں کو بیدار کرو۔ قربانی کے غم سے قوم کو اٹھاؤ۔ اتحاد کے غم سے سرزمین کو گلزار بنا دو۔ اگر ہم پاکستان کے موجودہ سیاسی حالات اور مسلم دنیا کے اتحاد کے تناظر میں دیکھیں، تو یہ ایک جامع اور انقلابی پیغام بن جاتا ہے۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ ویرانی مستقل نہیں ہوتی۔ زمین ویران ہو سکتی ہے لیکن زمین کی زرخیزی ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح امت بظاہر کمزور ہو سکتی ہے، مگر اس کی صلاحیت، ایمان اور تاریخ اسے دوبارہ زندہ کر سکتی ہے۔ اسی لئے اقبال ہمیں یاد دلاتے ہیں: ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

اقبال کا وزن صرف برصغیر یا پاکستان تک محدود نہ تھا۔ وہ امت مسلمہ کے اتحاد کے قائل تھے۔ جب وہ کشت ویراں کی بات کرتے ہیں تو ان کی نظر صرف ایک قوم پر نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا پر تھی، جو استعماری طاقتوں کے ہاتھوں تقسیم ہو چکی تھی۔ یہ سب اقبال کی نظر میں کشت ویراں تھے لیکن وہ ناامید نہیں تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان اپنی جڑوں کو پہچان لیں، اپنے ایمان، علم اور اتحاد کے ذریعے اٹھ کھڑے ہوں تو یہ امت دوبارہ عروج حاصل کر سکتی ہے۔ اقبال کا پاکستان اور عالم اسلام دونوں کیلئے آج بھی پیغام ہے۔ پاکستانی عوام کیلئے کہ مایوسی کو چھوڑ کر اپنی اجتماعی قوت پر یقین کریں۔ سیاسی انتشار عارضی ہے، لیکن اگر عوام میں بیداری آگئی تو یہ ملک دوبارہ ترقی کر سکتا ہے۔

عالم اسلام کیلئے۔۔۔۔۔ مسلمان ممالک اگر تفرقہ، لسانیت اور قوم پرستی چھوڑ کر ایک امت کی طرح سوچیں تو دنیا کی کوئی طاقت ان کے وسائل، ان کی سرزمین اور ان کے مستقبل کو برباد نہیں کر سکتی۔ اقبال کے نزدیک یہ شعر ایک یقین اور امید کا منشور ہے۔ وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ہماری مشکلات عارضی ہیں، ہماری زمین اور ہماری امت زرخیز ہے، صرف اتحاد، ایمان اور عمل کا غم چاہیے۔ اقبال کا یہ شعر صرف ایک شاعر کی پکار نہیں، یہ ہماری تقدیر کا آئینہ ہے۔ یہ یاد دہانی ہے کہ یہ سرزمین کبھی بخر نہیں ہو سکتی، یہ قوم کبھی مردہ نہیں ہو سکتی۔ اس مٹی کو بس غم چاہیے، ایمان، اتحاد، قربانی اور علم کا غم۔ اگر آج ہم نے یہ غم پیدا کر لیا تو یہی پاکستان روشنی کا مینار بنے گا اور یہی امر دوبارہ سر بلند ہوگی۔ ورنہ تاریخ وہی فیصلہ سنائے گی جو قوموں کیلئے لکھا گیا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ" اللہ نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو خود بدلنے کا خیال نہ ہو!

آؤ عزم کریں کہ ہم اقبال کی ناامیدی کو امید میں بدلیں گے، ویرانی کو گلزار بنائیں گے، اور دنیا کو دکھادیں گے کہ یہ قوم زندہ ہے، جاگ رہی ہے، اور اٹھنے کو تیار ہے۔ تاریخ میں وہی قومیں زندہ رہتی ہیں جو خواب دیکھتی ہیں اور پھر ان خوابوں کو حقیقت بنانے کیلئے لڑتی ہیں۔ اقبال نے ہمارے ہی بارے میں کہا تھا کہ ہمارے بازو میں وہ طاقت ہے جس سے تقدیریں بدلتی ہیں، تمہارے قدم میں وہ جرات ہے جس سے زمانے کے نقشے پلٹ جاتے ہیں۔ آج یہ سرزمین، یہ پاکستان، تمہیں پکار رہا ہے۔ مایوسی کے اندھیروں میں ڈوبے لوگ شاید تھک گئے ہوں، لیکن اقبال کا شاہین کبھی نہیں تھکتا، وہ آج بھی اعلان کر رہا ہے "نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے"۔

سیاسی انتشار، کرپشن، معاشی غلامی، اور عالمی سازشوں کی زنجیریں۔ آج یہ کشتِ ویراں ہمارے سامنے ہے لیکن یہ مٹی بخر نہیں ہے۔ یہی زمین ہے جس نے بدرواح کے جانباز پیدا کیے، یہی قوم ہے جس نے کشمیر اور کارگل کے محاذ پر قربانیاں دیں۔ بس اس مٹی کو ہمارے خون کا نم چاہیے، ہماری غیرت کا، ہمارے علم کا، ہماری یکجہتی کا نم۔ جب یہ نم آجائے گا تو یہ کھیت سنسان نہیں رہیں گے بلکہ سرسبز انقلاب آگے گا۔ اقبال کا خواب صرف پاکستان تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے کہا تھا: نوجوانوں! تم صرف پاکستان کے محافظ نہیں، تم پوری امت کے سپاہی ہو۔ تمہارا اتحاد، صرف اس وطن کو نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو زندہ کرے گا۔

نوجوانو! یہ وقت آرام کا نہیں، یہ وقت انقلاب کا ہے۔ مایوسی کو دل سے نکال دو، غلامی کی زنجیروں کو توڑ دو، اور اپنے سینوں میں امید کا دیباچہ لادو۔

یاد رکھو: یہی مٹی دوبارہ گلزار بنے گی، یہی سرزمین ایک نئی تاریخ لکھے گی اور وہ تاریخ تمہارے قدموں سے لکھی جائے گی۔

اٹھو! آگے بڑھو کیونکہ اقبال آج بھی تمہیں آواز دے رہا ہے

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

قدس کی گواہی اور پاکستان کا اصولی امتحان

آج ہم ایک ایسے دور آزمائش میں کھڑے ہیں جس کا وزن تاریخ کے ترازو پر تولنے سے ہلکا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے اوراق پر بعض زخم ایسے ثبت ہو جاتے ہیں جو وقت کی گرد سے مٹتے نہیں بلکہ ہر صدی کے ساتھ اور نمایاں ہو جاتے ہیں۔ فلسطین کا قضیہ بھی انہی میں سے ایک ہے۔ وہی ارض مقدس جہاں انبیائے کرام کے قدموں کی برکتیں ہیں، جہاں قبلہ اول کی تقدیس ہے، اور جہاں آج بھی ظلم کی تیز دھار معصوم بچوں کے لہو کو بہا رہی ہے۔ بیت المقدس کی فضاؤں میں اذان کی صدا گونجتی ہے، مگر توپ و تفنگ کے شور نے اُسے دبانے کی کوشش کی ہے۔ فلسطین کی ویرانی صرف ایک جغرافیائی خلاؤں کا نام نہیں، وہ ہمارے ایمان کی تابانی ہے، ہماری تاریخ کا نحیف سا چراغ ہے اور ہماری امت کی آنکھوں میں بہہ جانے والا ایک پاکیزہ خون ہے۔ بیت المقدس کی دھول میں ہمارے انبیائے کرام کے نقش قدم جڑے ہیں، اور اسی دھرتی پر ہر اذان میں تاریخ نے اپنا نام لکھ رکھا ہے۔

پاکستان کی تاریخ بھی دراصل اسی شعور کی آئینہ دار ہے۔ قائد اعظم کے الفاظ آج بھی ہمارے لیے چراغِ راہ ہیں کہ "جب تک فلسطینیوں کو اُن کا حق نہیں ملتا، ہم تسلیم کرنے کا جرم برداشت نہیں کریں گے"۔ یہ الفاظ محض ایک سیاسی اعلان نہیں بلکہ امت مسلمہ کے درد کی ترجمانی ہیں۔ یہ الفاظ محض بیانِ موقع نہیں، بلکہ ایک سیاسی و ایمانی ضابطہ حیات ہیں۔ ایک عہدِ ضمیر جو ہمارے بزرگوں نے برقرار رکھا۔ آج اگر ہم امن کی آغوش میں قدم رکھنا چاہتے ہیں تو پہلے انصاف کی بنیاد رکھنی ہوگی؛ انصاف کے بغیر امن، پتھروں پر کھڑی ایک عمارت ہے جو ہلتے ہی گر جائے گی۔

دنیا کی سیاسی بساط پر بعض قدر و قضا کے ایسے فیصلے ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ مٹتے نہیں بلکہ مزید گہرے ہو جاتے ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ انہی قضایا میں سے ہے۔ سات دہائیوں سے زائد عرصہ گزر گیا مگر خونِ ناحق کی بارشیں اور بمباری کی کڑک ابھی تک جاری ہے۔ اس پس منظر میں جب امریکی صدر ٹرمپ نے 20 نکاتی امن منصوبہ پیش کیا تو دنیا نے اسے حیرت و تذبذب کے ساتھ دیکھا۔ پاکستان نے اس منصوبے کا خیر مقدم کیا مگر ساتھ ہی اپنے تاریخی موقف یعنی "دوریاستی حل" کو بھی خطے کے امن کی بنیاد قرار دیا۔ یہ خیر مقدمی کلمات محض سفارتی آداب نہیں تھے، بلکہ ایک پیچیدہ سیاسی کھیل کی جھلک بھی تھے۔

آج عالمی طاقتیں امن کے نام پر نقشے اور نئے منصوبے لیکر آئیں ہیں جس کی لکیریں شہداء کے خون، ماؤں کی اجڑی کوکھ اور جوان بیٹوں کی لاشوں کے اوپر کھینچی گئی ہیں، تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ منصوبے واقعی انصاف کی بنیاد پر ہیں یا پھر کمزور قوموں کی قربانی پر کھڑے کیے گئے ہیں؟ کیا ان نقوش میں مظلوم کا چہرہ دکھائی دیتا ہے؟ یا پھر یہ وہی تختِ دوش ہے جس پر کمزور قومیں بٹھ کر اپنی آزادی گنوا بیٹھی ہیں؟ ہمیں اپنے اصولوں کو یاد رکھنا ہوگا، اپنی عوام کی آواز سننی ہوگی، اور اپنی تاریخ کا احتساب کرنا ہوگا۔ ہم امن کے دشمن نہیں؛ ہم انصاف کے غلام ہیں۔ اور جب انصاف ہو گا تو امن خود بہ خود جنم لے گا۔ ورنہ خیر مقدمی بیانات تاریخ کا امید کو کاٹ دیں گے۔

ٹرمپ نے نیتن یاہو کے ہمراہ منصوبے کا اعلان کیا۔ مشترکہ پریس کانفرنس میں پیش کیا گیا منصوبہ دراصل امریکی قیادت کے اس موقف کی جھلک ہے کہ خطے کا امن صرف اسرائیل اور فلسطین کے تنازع کو کسی "فارمولے" کے ذریعے حل کرنے سے ممکن ہے۔ مگر واشنگٹن کی پالیسی میں اسرائیلی مفادات کا جھکاؤ کھل کر سامنے آتا ہے، جو اس منصوبے کی غیر جانبداری پر سوالیہ نشان کھڑا کرتا ہے۔ بظاہر اس منصوبے کا مقصد غزہ میں فوری جنگ بندی اور مشرق وسطیٰ میں امن کا قیام تھا۔ پاکستان نے ایک امکانی امن کی پیش رفت اور اسے ایک امید کی کرن سمجھتے ہوئے خیر مقدم کیا اور اس

اعتراف میں دوریاستی حل کو خطے میں دیرپا امن کے حصول کی لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ یہ خیر مقدمی جذبہ رسمی نہیں بلکہ مفہومی اعترافِ امکان ہے مگر ناقدین کے نزدیک اسی کے ساتھ عوامی و نظریاتی تحفظات کا شور بھی بلند ہوا ہے۔ وزیراعظم شہباز شریف اور فوجی قیادت نے اس کی حمایت میں بیانات بھی دیے، جبکہ وزیر خارجہ اسحاق ڈار نے اعلان کیا کہ اسلامی ممالک مشترکہ امن فورس تشکیل دیں گے۔ اس اعلان نے ایک طرف امن کی امید جگائی مگر دوسری طرف یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ آیا پاکستان اپنے تاریخی موقف سے پیچھے ہٹ رہا ہے یا نہیں۔

ٹرمپ نے خاص طور پر شہباز شریف اور فیلڈ مارشل عاصم منیر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ابتدا سے ہی اس منصوبے کی حمایت میں ہیں؛ اس سلسلے میں شہباز شریف کا "ایکس" پر پیغام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ یہ بیان پاکستان کو امریکی پالیسی کے قریب دکھانے کی ایک حکمت ہو سکتا ہے۔ اسحاق ڈار نے بھی اسلام آباد میں اعلان کیا ہے کہ آٹھ اسلامی ممالک مجوزہ منصوبے کے تحت ایک امن فورس تعینات کریں گے اور پاکستان بھی اس ضمن میں باضابطہ فیصلہ کرے گا۔ ایک ایسا اعلان جو سرعام غور و خوض اور عوامی بحث کا موجب بن گیا ہے۔ یہ نقطہ نہ صرف سفارتی اہمیت رکھتا ہے بلکہ پاکستان کیلئے عملی ذمہ داری کا بوجھ بھی بڑھاتا ہے۔

پاکستان کیلئے مسئلہ فلسطین محض ایک سفارتی قضیہ نہیں بلکہ ایک نظریاتی معاملہ ہے۔ قیام پاکستان کے آغاز سے ہی قائد اعظم کا مشہور اعلان — کہ جب تک فلسطینی حقوق بحال نہیں ہوتے، پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا — آج بھی پاکستانی پالیسی کا فکری ضامن ہے۔ یہ نہ محض تاریخی حوالہ ہے بلکہ عوامی جذبات کا آئینہ بھی ہے، جو کسی بھی حکومتی فیصلے میں 'قابلِ عمل معیار' کے طور پر سامنے آتا ہے۔ قائد اعظم کا یہ واضح موقف آج بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی کی اساس ہے۔ دفتر خارجہ کے بیانات ہمیشہ اسی تسلسل کو دہراتے ہیں کہ فلسطین کی ایک آزاد اور خود مختار ریاست، جس کی بنیاد 1967ء سے قبل کی سرحدوں پر ہو، اور جس کا دار الحکومت القدس الشریف ہو۔ یہ موقف محض الفاظ نہیں بلکہ پاکستان کی اسلامی شناخت اور عوامی جذبات کا عکاس ہے۔

دو سالہ بمباری کے بعد امن کی کوئی بھی کرن غزہ کے عوام کیلئے امید ہے، لیکن جب پاکستان نے ٹرمپ کے امن منصوبے کی حمایت کی تو عوامی سطح پر یہ سوال گونج رہا ہے کہ کہیں یہ خیر مقدم "اصولی موقف" سے انحراف تو نہیں؟ کیا پاکستان نے فلسطین کے بارے میں اپنے روایتی اور تاریخی اصولی موقف میں تبدیلی اختیار کر لی ہے؟ اس خوف کے پیچھے عوامی جذبات کا دباؤ اور ماضی کی مستقل پالیسی کا تسلسل ہے۔ یہ تضاد سیاست اور عوامی رائے کے بیچ خلیج کو نمایاں کرتا ہے۔

عوامی جذبات کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سوشل میڈیا پر سوال گونجنے لگا کہ وزیراعظم نے عوام کو اعتماد میں لیے بغیر یہ فیصلہ کیسے کیا؟ مسلم ممالک کے مشترکہ اعلامیہ کو بھی "سرینڈر" قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ اس میں مشرقی یروشلم اور فلسطینی ریاست کا ذکر تک نہیں۔ سوال یہ کہ آیا خیر مقدم کرنا ہی تسلیمِ باطنی ہے یا محض تعمیری مذاکراتی اقدام؟ یہ تشویش عوامی جذبات اور خارجہ پالیسی کے مابین اک دائمی تنازع کی مانند دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان نے ہمیشہ فلسطین کی "حق خود ارادیت" کی تحریک کو جائز قرار دیا ہے۔ یہ موقف نہ صرف اخلاقی ہے بلکہ نظریاتی بنیاد پر بھی قائم ہے اور اس مسئلے کی اہمیت پاکستان کے ماضی کی خارجہ پالیسی کے تاریخی سوتوں میں ہے۔ ریاست پاکستان نے بارہا اعلان کیا کہ وہ 1967ء سے قبل کی سرحدوں پر مبنی ایک خود مختار و متصل فلسطینی ریاست کے قیام کا حامی ہے، جس کا دار الحکومت القدس الشریف ہو گا۔ یہ موقف قائد اعظم کے صریح کلام کے مترادف بھی

سمجھا جاتا رہا ہے جب تک فلسطینیوں کے حقوق مکمل طور پر تسلیم نہ ہوں، اسرائیل کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس موقف کی جڑیں قرار دادِ لاہور کے اسلامی شعور اور جناح کے بیانات میں ملتی ہیں۔

جون 1967ء میں اسرائیل نے مصر، اردن اور شام کے ساتھ چھ روزہ جنگ میں غزہ، مغربی کنارہ، مشرقی یروشلم اور گولان کی پہاڑیاں اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس جنگ کے بعد اسرائیل کی حدود تین گنا بڑھ گئیں۔ مغربی کنارہ اور غزہ وہ علاقے ہیں جو آج تک تنازعے کی جڑ بنے ہوئے ہیں۔ اقوام متحدہ اور عالمی برادری نے اسرائیل کے ان علاقوں پر قبضے کو قانونی حیثیت نہیں دی، مگر امریکا کے حالیہ فیصلوں (یروشلم کو دارالحکومت ماننا، گولان کی پہاڑیوں کو اسرائیل کا حصہ تسلیم کرنا) نے مسئلے کو مزید پیچیدہ کر دیا۔ پاکستان امریکی کو ہمیشہ "یکطرفہ، غیر منصفانہ اور بین الاقوامی قانون کے منافی" قرار دیتا رہا ہے۔ پاکستان نے اب تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا اور بار بار واضح کر رہا ہے کہ امن کی حمایت اور اسرائیل کو تسلیم کرنا دو الگ معاملات ہیں۔ یہ اصولی فیصلہ پاکستان کے عوامی، مذہبی اور نظریاتی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ جنگ بندی، یرغالیوں کی رہائی اور انسانی امداد کی فراہمی وقتی اقدامات ہیں، مگر اسرائیل کو تسلیم کرنا ایک بنیادی پالیسی تبدیلی ہوگی۔ اور پاکستان ایسی تبدیلی پر آمادہ نہیں۔ تسلیمیت کا مطلب محض سفارتی تعلق نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اعتراف بھی ہے۔ جب تک فلسطینی ریاست قائم نہیں ہوتی، یہ تسلیم ایک "سیاسی خودکشی" کے مترادف ہے۔ جنگ بندی، یرغالیوں کی رہائی اور انسانی امداد کی فراہمی وقتی اقدامات ہیں، مگر اسرائیل کو تسلیم کرنا ایک بنیادی پالیسی تبدیلی ہوگی۔ اور پاکستان ایسی تبدیلی پر آمادہ نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وزیر خارجہ نے کہا "پاکستان کی پالیسی بڑی واضح ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔" یہ بیان دراصل عوامی اعتماد بحال کرنے کی کوشش تھی۔ پاکستان کی روایتاً پالیسی یہ رہی ہے کہ فلسطین کے منصفانہ حل تک اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا مگر دوریاستی اصول کے تحت "فلسطینی ریاست کے تسلیم" کا مطلب یہ بھی بنتا ہے کہ دیر بعد اسرائیل کو بالواسطہ طور پر قبولیت نصیب ہو سکتی ہے۔ یہاں فرق مفہوم و فرق طریقہ وارد ہوتا ہے کیا پاکستان کا مطلب اسرائیل کی بذات خود تسلیم ہے یا فلسطینی ریاست کے تسلیم کے بعد ایک بالواسطہ تعلق قائم ہو سکتا ہے؟

یہ سوال ہر پاکستانی کے ذہن میں ہے۔ 20 نکاتی منصوبے میں فلسطین کی آزاد ریاست کا ذکر ہے لیکن اسرائیل کی حیثیت کے بارے میں خاموشی یا ابہام ہے۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کیلئے یہ ایک نازک توازن ہے کہ وہ امن کا خیر مقدم کرے مگر اسرائیل کی "براہ راست تسلیمیت" کی طرف نہ بڑھے۔ پاکستان میں فلسطین کا مسئلہ مذہبی و جذباتی حیثیت رکھتا ہے۔ عوام اسے محض سفارت کاری نہیں بلکہ ایمان اور ضمیر کا مسئلہ سمجھتے ہیں۔ مذہبی جماعتیں کھل کر اسرائیل کو ناجائز قرار دیتی ہیں اور بعض تو دوریاستی حل کی بھی مخالفت کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومتیں کسی بڑے فیصلے سے پہلے ہچکچاہٹ کا شکار رہتی ہیں۔

یہ سوال نہایت سنگین اور معروضی ہے۔ 20 نکاتی منصوبے میں کہیں واضح طور پر "بغیر کسی الحاق کے فلسطینی ریاست کی تشکیل" کا ہے؛ اس طرح کا بیان بذات خود تنازع کو کم کرنے کی نیت رکھتا ہے مگر پاکستان کے مدارِ عمل میں عوامی و نظریاتی تقاضے، مذہبی جماعتوں کی حساسیت، اور بین الاقوامی حقوق قلبی کی پاسداری شامل ہے۔ اس لیے صرف پلان کی منظوری کو تسلیم رسمی سمجھ لینا قبل از وقت ہو گا۔

پاکستانی دفتر خارجہ کی سرکاری سائٹ پر موجود موقف — کہ پاکستان ایک خود مختار فلسطینی ریاست کے قیام جس کا دارالحکومت القدس ہو گا — اس امر کی تائید کرتا ہے کہ سرکاری پالیسی میں تاحال اصل موقف برقرار ہے؛ مگر عملی مذاکرات میں بیانات خیر مقدم اور عملی شرائط دو الگ جہتیں ہیں۔ یہ

موقف سفارتی زبان میں "ریاستی وعدہ" ہے۔ چنانچہ ہر حکومت، خواہ کسی بھی جماعت کی ہو، اسی تسلسل کو دہراتی رہی ہے۔ پاکستان واضح کر رہا ہے کہ امن کی حمایت اور اسرائیل کی تسلیمیت دو مختلف باتیں ہیں۔ ابھی اصل ہدف غزہ میں جنگ بندی اور انسانی ہمدردی کی بحالی ہے۔

امریکی منصوبے کے تحت حماس کو کہا گیا کہ وہ 72 گھنٹوں میں یرغمالیوں کو رہا کرے، بدلے میں اسرائیل کارروائیاں روک دے گا۔ یہ تجویز وقتی سکون تو لاسکتی ہے مگر مستقل امن کی ضمانت نہیں دیتی۔ ناقدین کے مطابق اس منصوبے کا اصل مقصد حماس پر دباؤ ڈالنا ہے تاکہ اسرائیل کو سیاسی برتری ملے۔ جب اسلام آباد میں اسحاق ڈار سے سوال کیا گیا کہ کیا پاکستان نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے یا نہیں، تو ان کا جواب یہ تھا کہ پاکستان کی پالیسی بڑی واضح ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اس بیان سے ایک سیاسی تسلسل کی تصویر بنتی ہے کہ مذاکراتی باب کھلا رکھنا بھی حکمت عملی کی چلک کا حصہ ہے۔ سیاست میں ایسے بیانات اکثر "ڈیک کنٹرول" کے طور پر دیے جاتے ہیں۔

پاکستان کیلئے اصل سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح "امن کی حمایت" اور "اصولی موقف" کے درمیان توازن قائم کرے۔ اگر وہ منصوبے کی حمایت کرتا ہے تو اسرائیل کی تسلیمیت کا خدشہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ مخالفت کرتا ہے تو عالمی سطح پر تنہا پڑ سکتا ہے۔ اسی لئے پاکستان کا موجودہ موقف یہی ہے کہ فلسطینی ریاست کا قیام لازمی ہے، سرحدیں 1967ء سے پہلے والی ہوں، اور القدس دارالحکومت ہو۔ یہ موقف اقوام متحدہ کی قراردادوں اور مسلم دنیا کے تاریخی مطالبات سے ہم آہنگ ہے۔ پاکستان کا ماننا یہ ہے کہ یہ تاریخ و جغرافیہ کا ایک واضح نقطہ حوالہ ہے۔ اسی حوالہ سے بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کی قراردادیں بھی جڑی ہیں، اور پاکستان اس نقطہ نظر کو اقوام متحدہ و اسلامی تعاون تنظیم کی قراردادوں کے مطابق حل تنازعہ کیلئے بنیاد سمجھتا ہے۔

پاکستان میں عوامی سطح پر یہ خوف پیدا ہوا کہ حکومت عالمی دباؤ میں آکر اسرائیل کو تسلیم کر لے گی۔ سیاسی جماعتیں اس معاملے پر ابہام کا شکار ہیں کیونکہ عوامی جذبات مذہبی بنیادوں پر سخت اور واضح ہیں۔ پاکستان میں فلسطین کا مسئلہ مذہبی حساسیت سے جڑا ہے۔ عوام اسے محض "خارجہ پالیسی" نہیں بلکہ "ایمان کا حصہ" سمجھتے ہیں۔ اسی لئے حکومتیں اس معاملے پر دو ٹوک فیصلے سے گریز کرتی ہیں۔ تاہم اسرائیل پر پاکستان کی پالیسی "نا قابل تبدیلی" ہے۔ اس کو کشمیر اور ایٹمی پروگرام کی طرح ایک "ریڈ لائن" سمجھا جاتا ہے۔

ممکن ہے کہ یہ منصوبہ دراصل حماس کو دباؤ میں لانے کی چال ہو۔ یرغمالیوں کی رہائی کے بعد اسرائیل اپنی کارروائیاں جاری رکھ سکتا ہے۔ اس سے منصوبے کی نیت پر سوال اٹھتا ہے۔ بعض ماہرین نے اسے "مسلم دنیا کی کمزوری" کہا ہے۔ اگر اس میں القدس یا فلسطینی ریاست کا ذکر نہیں تو یہ فلسطینی عوام کے ساتھ نا انصافی ہے۔ مسلم ممالک کے مشترکہ اعلامیے میں فلسطینی ریاست اور مشرقی یروشلم کا ذکر نہ ہونا "سرینڈر" ہے۔ یہ تنقید پاکستان کی عوامی تشویش کو بڑھا رہی ہے۔ خدشہ ہے کہ منصوبہ عرب و مسلم ممالک کی جانب سے حماس پر دباؤ ڈالنے اور یرغمالیوں کی رہائی کے بعد فلسطینی عوام کے خلاف اسرائیلی عسکری کارروائیوں کی راہ ہموار کر سکتا ہے؛ اس لیے امن کے نام پر صرف وقتی توقف کو حقیقی امن کے مترادف نہ سمجھا جائے۔ حقیقی امن تبھی ممکن ہے جب انصاف اور خود ارادیت کے تقاضے پورے ہوں۔

پاکستان کی طرف سے منصوبے کی حامی خبروں کے بعد چند واضح اثرات ابھرے (1) عوامی سطح پر جذباتی ردِ عمل اور مذہبی جماعتوں کی تنگ نظری، (2) سیاسی جماعتوں میں ابہام، (3) سوشل میڈیا پر شدید تنقید اور (4) بعض سفارتی حلقوں کی تشویش کہ یہ قدم تاریخی موقف میں موڑ ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ سب ایک خیال عام کے گرد گھومتے ہیں کہ سیاسی فیصلے عوامی اعتماد کے بغیر اختیار کرنا نقصان دہ ہو گا۔ تاہم مشترکہ مسلم بیانیہ "سرینڈر" کے



مترادف ہے، اگر اس اعلان میں مشرقی یروشلم اور فلسطینی ریاست کا واضح ذکر نہیں تو یہ مفاہمت نامہ کمزور ہے۔ منصوبہ دراصل حماس پر دباؤ ڈال کر یرغمالیوں کی رہائی لینے کی چال ہے، اور اس کے بعد اسرائیل کی عسکری کارروائیاں جاری رہ سکتی ہیں۔ مسلم دنیا میں یگانگت کے نام پر کئے گئے بیانات بھی بعض اوقات داخلی دباؤ و مفادات کی تابعداری میں کمزور پڑ سکتے ہیں۔ بظاہر یہ منصوبہ "خطرناک" اور "مکارانہ" قرار دیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں مسئلہ فلسطین ایک جذباتی قضیہ ہے، بعض مذہبی جماعتیں نہ صرف اسرائیل کی قانونی حیثیت تسلیم نہیں کرتیں بلکہ دوریاستی حل کی حمایت بھی نہیں کرتیں؛ ایسے میں سیاسی جماعتیں عوامی مزاج کے مطابق متذبذب رہتی ہیں۔ سوال یہ کہ حکومت کس طرح عوام کا اعتماد بحال کرے گی، اور کیا وہ اس فیصلے کو قومی سطح پر پیش کر کے اکثریتی حمایت حاصل کر پائے گی؟

یہ واضح رہے کہ امن کی کوششیں (جنگ بندی، یرغمالیوں کی رہائی، ہنگامی انسانی امداد) اور کسی ریاست کی تسلیمیت دو مختلف ادوار و امور ہیں۔ پاکستانی موقف کے مطابق اسرائیل کو تسلیم کرنا اور فلسطین میں قیام امن و الگ شے ہیں؛ اس لمحے مسئلہ غزہ میں جنگ بندی کو اولین ترجیح ہے۔ مگر طویل المدت پالیسی موقف پر عوامی اتفاق ناگزیر ہو گا۔

اسرائیل کے معاملے میں پاکستان کی پالیسی "کوئی حکومت یا وزیراعظم تبدیل نہیں کر سکتا"۔ یہ دعویٰ ملک کے آئین خارجی اور قومی جذبات کا عکاس ہے، اسے قابل قبول بنانے کیلئے اخلاقی طاقت اور دلیل، عوامی جواز اور بین الاقوامی توازن کی ضرورت ہو گی۔ پاکستان دوریاستی حل کو فلسطین کے حق میں نہیں دیکھتا ہے، اسرائیل کی براہ راست حمایت کے طور پر نہیں۔ اس فرق کو عوامی سطح پر واضح کرنا ضروری ہے تاکہ ابہام نہ پھیلے مگر اس کا مطلب ہرگز کہ پاکستان بلا واسطہ اسرائیل کو فوراً تسلیم کر لے گا۔ دوریاستی حل دراصل فلسطینی حق خود ارادیت کی ضمانت اور انتقامی تسلط کے خاتمے کی جانب قدم ہے۔ یہ مقصد طویل مگر اخلاقی بنیاد پر واجب ہے۔

سیاسی و مذہبی جماعتوں کی تقاریر نے اس امر کو مزید تقویت دی ہے کہ پاکستانی پاکستان میں عوامی رائے فلسطین کے حق میں بہت دو ٹوک اور واضح ہے؛ عوام کسی ایسے امن منصوبے کو قبول نہیں کریں گے جس میں اسرائیلی لیڈر شپ کو جنگی جرائم پر معاف کر دیا جائے، وہ عوامی قبولیت حاصل نہ کرے گا۔ یہی جذبات حکومت پر دباؤ بڑھاتے ہیں۔ اس لیے حکومتی اقدامات کو عوامی مشاورت اور پارلیمانی شمولیت سے گزرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔

پاکستانی حکومت پر سوشل میڈیا اور عوامی حلقوں کی جانب سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ وزیراعظم نے عوام کو اعتماد میں لئے بغیر ٹرمپ کے منصوبے کا خیر مقدم کیسے کیا؟ وزیراعظم کو عوام کو اعتماد میں لیے بغیر کوئی حق نہیں کہ وہ امریکی منصوبے کی حمایت کریں۔ یہ سوال پاکستان میں جمہوریت کے اصولی ڈھانچے سے جڑا ہے۔ یہ سوالی آوازیں ظاہر کرتی ہیں کہ ریاست خارجی پالیسی میں پارلیمان، عوام اور معتبر علمی حلقوں کی رائے لازمی ہونی چاہئے۔ کسی بھی قومی موقف کی قابل قبولیت اسی وقت ممکن ہے جب وہ داخلی اجتماعی ضمانت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ یہ سوال حکمرانی میں شفافیت کی کمی کو ظاہر

کرتا ہے۔ شفافیت، قومی مفادات کی واضح نمائندگی اور پارلیمانی بحث ایسے تقاضے ہیں جن کا احترام لازمی ہے تاکہ کوئی فیصلہ عوامی مجوزہ قدروں سے متصادم نہ ہو۔

کیا امت مرحلی ہے؟“ جیسے سوال عوامی غصے اور مایوسی کی عکاسی کرتے ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ مسلمانوں کیلئے مذہبی و جذباتی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے جذباتی نعروں میں وہ غم و غضب جھلکتا ہے جو تاریخی مظالم کے سامنے انسانی ضمیر کو جنجھوڑتا ہے۔ یہ جذباتی فریادیں ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ بین الاقوامی سیاست میں انسانیت کی صدا کبھی محض استدلال نہیں رہنی چاہئے۔ اصول، اخلاق اور انصاف ہی مطمئن انصاف کی بنیاد ہیں۔

کئی مذہبی جماعتیں یہ کہتی ہیں کہ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت کسی قوم کو یہ حق ہے کہ اگر اس کی زمین پر قبضہ ہو تو وہ مسلح جدوجہد کر سکتی ہے۔ پاکستان میں اس نظریے کی موجودگی سیاسی موقف کو مزید پیچیدہ کرتی ہے، خاص طور پر جب حکومتیں عوامی رضا کے بغیر کسی اہم سفارتی موڑ اختیار کریں۔ یہ موقف پاکستان کیلئے سفارتی مشکلات بڑھا دیتا ہے کیونکہ عالمی سطح پر مسلح مزاحمت کو اکثر دہشتگردی قرار دیا جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم عالمی طاقتوں کے اس غلط موقف کو مانتے ہوئے اپنے جائز حقوق کا مطالبہ اور اس کیلئے کوششیں ترک کر دیں تاکہ ان کی جارحیت کو تو قانونی جواز مل جائے اور یہاں اپنے حق کیلئے قربانیوں کو دہشتگردی کے پلڑے میں ڈالنے کے خوف سے ہم دستبردار ہو جائیں۔

امن منصوبے میں حماس کو یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے جنگ بندی کی پیشکش کی گئی ہے مگر یہ پیشکش وقتی ہے اور مستقل امن کی ضمانت نہیں دیتی۔ ٹرمپ اور نیٹن یاہو نے ایک نئے امن منصوبے پر اتفاق ظاہر کیا اور حماس کو ہدف قبولیت میں آنے کی تنبیہ کی؛ منصوبے کے تحت حماس کو ابتدائی طور پر 72 گھنٹوں میں 20 زندہ یرغمالیوں اور درجنوں یرغمالیوں کی باقیات اسرائیل کو حوالے کرنے کا کہا گیا، جس کے بدلے غزہ میں فوجی کارروائیوں کو روکنے کی پیشکش رکھی گئی اور اس کے ساتھ ٹرمپ نے یہ دہمکی بھی دے ڈالی کہ اگر حماس اس کا یہ حکم نہیں مانتی تو اسرائیل سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو جائے۔ کیا گزشتہ دو برس سے زندہ اسرائیل کو حماس اور غزہ کے باشندوں کو قتل کرنے کا لائنس نہیں ملا ہوا جس کیلئے امریکا کا ہی عطا کردہ خوفناک اسلحہ استعمال ہو رہا ہے۔ تاہم حماس کی طرف سے اس دہمکی پر عملدرآمد کیلئے کئی عملی اور اخلاقی اعتراضات باقی ہیں۔

پاکستان کیلئے اصل امتحان یہی ہے کہ وہ "امن کی حمایت" اور "اصولی موقف" کے درمیان توازن برقرار رکھے۔ دوریاستی حل کی بنیاد پر فلسطینی ریاست کی حمایت پاکستان کیلئے ناگزیر ہے، مگر اسرائیل کی براہ راست تسلیمیت فی الحال ممکن نہیں۔ اس توازن کو برقرار رکھنا ہی پاکستان کی سفارت کاری کا اصل امتحان ہے۔

پاکستانی پالیسی کی بنیاد آج بھی وہی ہے جو قائد اعظم نے رکھی تھی، انصاف پر مبنی حل، فلسطینی عوام کے حق خود ارادیت کی حمایت، اور اسرائیل کی غیر قانونی جارحیت کا انکار۔ امن منصوبوں کو خوش آمدید کہنا سفارتی آداب کا حصہ ہے، مگر اسرائیل کی تسلیمیت ایک ایسی لکیر ہے جسے پاکستان عبور نہیں کر سکتا۔ حقیقی امن تبھی ممکن ہے جب انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ امن کے نام پر فلسطینی عوام کے حقوق کو پس پشت ڈال دینا "سفارت کاری" تو کہلا سکتا ہے، مگر یہ "انصاف" نہیں کہلا سکتا۔ پاکستان کیلئے یہی سب سے بڑا امتحان ہے کہ وہ اپنی پالیسی کو وقت کے تقاضوں کے مطابق لچکدار بھی رکھے اور اصولوں پر قائم بھی۔

اس مشکل موجودہ مرحلے میں (1) جنگ بندی اور انسانی امداد کو اولین ترجیح دی جائے، (2) کسی بھی طویل المدت سیاسی فیصلے سے قبل قومی مشاورت اور پارلیمانی منظوری ضروری ہے، (3) پاکستان کا تاریخی موقف — جو 1967ء کی سرحدوں اور القدس الشریف کے باضابطہ موقف پر قائم ہے — بطور بنیاد محفوظ رہے، اور (4) بین الاقوامی سطح پر منصفانہ، شفاف اور حقوق بین الاقوامی کے مطابق حل تلاش کیا جائے۔ مختصر اُمن کی تلاش میں انصاف کو قربان نہ کیا جائے — یہی وہ اخلاقی اور سیاسی اصول ہیں جو کسی بھی ریاست کو آئندہ رہنمائی دے سکتا ہے۔

یہ رپورٹ جہاں حقائق کو چونچ ماری کے بغیر منظم کرتی ہے، وہاں اس میں وہ تہذیبی لمس بھی رکھا گیا ہے جو فکری تمکنت، سیاست کی زبان شائستگی اور اسلامی استدلال سے مستفاد ہے۔ تاریخ ایک آئینہ ہے؛ آئینہ صرف چہرہ نہیں دکھاتا بلکہ اس روشنی کی شدت اور زاویہ بھی بتاتا ہے جس سے حقیقت کے رنگ ابھر کر آتے ہیں۔ پاکستان کیلئے سب سے مطلوبہ راہ وہی ہے جس میں قومی عزت، بین الاقوامی قانون، اور انسانی ہمدردی تینوں برابر وقعت رکھتے ہوں۔

اب وقت کا امتحان ہے۔ تاریخ ہم سے سوال کر رہی ہے کیا ہم اپنی بنیادوں سے ہٹ کر چلیں گے یا پھر عدل و انصاف کے اُس چراغ کو روشن رکھیں گے جسے ہمارے اکابر نے جلایا تھا؟ فلسطین کے معصوم بچے، زخمی ماؤں کے آنسو اور شہیدوں کا لہو ہم سے یہی تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے اصولوں پر قائم رہیں۔ پاکستان کا اصل وقار یہی ہے کہ وہ ظلم کے آگے جھکے نہیں بلکہ حق کی گواہی دے۔ اسرائیل کی جارحیت کو تسلیم کرنا محض ایک سیاسی فیصلہ نہیں، بلکہ یہ تاریخ سے انحراف ہو گا۔ امن اگر انصاف کے بغیر آئے تو وہ محض دھوکہ ہے۔ یقیناً پاکستان کو سفارت کاری کی نزاکتوں کو دیکھنا ہو گا مگر اس کی اساس ہمیشہ وہی ہو جو قرآن نے سکھائی ہے: وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَيَمَسَّكُمُ النَّارُ، ظالموں کی طرف نہ جھکو، ورنہ آگ تمہیں چھو لے گی۔

ہم نے سن رکھا ہے، ہم نے دیکھا ہے، اور ہم نے محسوس بھی کیا ہے — ہر آنسو، ہر فریاد، ہر بانجھ مٹی کی داستاں ہمارے ضمیر کے سینے پر ایک گہرا نشان چھوڑ گئی ہے۔ امت مسلمہ کی سربلندی اس میں ہے کہ وہ مظلوم کے ساتھ کھڑی رہے، نہ کہ ظالم کے زور پر خاموشی اختیار کرے۔ قرآن کریم ہمیں یاد دلاتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ اِخْوَةٌ — بیشک مومن آپس میں بھائی ہیں۔ (الحجرات)

اگر ہم بھائیوں کو چھوڑ کر مفادات کی سوئی کے پیچھے بھاگیں تو ہم اپنا ایمان اور اپنا وقار دونوں کھودیں گے۔

میں اپنے تمام قارئین سے کہنا چاہتا ہوں: آئیں، ہم پارلیمنٹ کی معتبر مسند پر غور و فکر کریں، عوامی مشاورت کو فروغ دیں، اور ایک واضح قومی پالیسی بنائیں جو نہ محض بین الاقوامی توازن کا تقاضا پورا کرے بلکہ ہمارے عوامی ضمیر اور اسلامی اصولوں کی بھی پاسداری کرے۔ جنگ بندی کو فوری ترجیح دیں، انسانی امداد پہنچائیں، — مگر یاد رکھیں کہ کسی بھی ڈھنگ کا امن جب تک منصفانہ حقوق کو یقینی نہ بنائے، وہ پائیدار نہیں ہو گا۔ ان تاریخی اور آزمائش کے وقت قوم کو یہ اعزاز بخش دیں کہ ہم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی، مظلوم کے ساتھ کھڑے رہے، اور اپنے اصولوں کو سچ راستے میں فروخت نہیں کیا۔ تاریخ ہمارے بارے میں پوچھے گی تو ہمیں شرمندہ نہیں ہونا چاہیے — ہمیں فخر ہونا چاہیے کہ ہم نے انصاف کو ترجیح دی۔

ختم کلام سے پہلے عرض عاجزانہ یہ ہے پاکستان کی عزت و شرافت، امت مسلمہ کی بقاء اور انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم نہ صرف امن کے خدو خال طے کریں بلکہ انصاف کے دامن کو کبھی نہ چھوڑیں۔ آئیں، ہم ایک آواز بن کر کہیں کہ انصاف کے بغیر امن قبول نہیں۔ یہی پیغام ہے کہ پاکستان ظلم کے ساتھ نہیں، مظلوم کے ساتھ کھڑا ہو اور یہی پیغام ہماری نسلوں کو دینا ہے کہ "قدس کی آزادی" محض فلسطینیوں کی جدوجہد نہیں، بلکہ پوری امت

مسلمہ کی غیرت و حمیت کا امتحان ہے۔

آئیے آج ہم متحد ہو کر اعلان کریں پاکستان انصاف کے ساتھ، مظلوم کے ساتھ، اور اصولوں کے ساتھ کھڑا رہے گا۔ ہم عالمی مفاہمت میں اپنا کردار کریں گے مگر اپنی بنیادی قدروں کو قربان نہیں کریں گے۔ اللہ ہمیں ہدایت دے، ہمیں صوابدید اور حکمت عطا فرمائے، اور مظلوموں کو جلد نجات عطا کرے۔

بروز جمعرات 22 جمادی الاول 1447ھ 13 نومبر 2025ء

امن یا فریب؟ پاک بھارت کشیدگی اور امریکی کردار

پاکستان کے بچے تلے جواب جنوبی ایشیا میں حالیہ پاک بھارت کشیدگی نے ایک بار پھر خطے کو ایٹمی جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ بھارت کی جارحیت اور نے دنیا کو مجبور کیا کہ وہ اس تنازعے کی سنگینی کو سمجھے۔ اگرچہ امریکا نے ابتدا میں لا تعلقی کا مظاہرہ کیا مگر حالات کی سنگینی نے اسے مداخلت پر مجبور کر دیا۔ 14 فروری 2019ء کو پلوامہ حملے میں 40 بھارتی اہلکار ہلاک ہوئے۔ بھارت نے فوراً پاکستان پر الزام لگایا اور پلوامہ حملے کے بعد بغیر ثبوت بالا کوٹ پر حملہ کر کے جنگ کو ہوا دی۔ 26 فروری کو بھارت نے بالا کوٹ میں فضائی حملے کا دعویٰ کیا جو درحقیقت ایک خالی پہاڑی پر تھا اور یہ حملہ محض درختوں پر بم گرانے تک محدود رہا۔ اس کے رد عمل میں 27 فروری کو پاکستان نے مؤثر جوابی کارروائی کرتے ہوئے دو بھارتی طیارے مار گرائے اور ایک پائلٹ گرفتار پائلٹ ابھینندن کو انسانی ہمدردی اور امن کے جذبے کے تحت رہا کیا گیا، جسے دنیا بھر میں سراہا گیا۔ پاکستان نے گرفتار پائلٹ کو گرفتار کر لیا۔ ابھینندن کی رہائی کے ساتھ ایک سنجیدہ، بالغ اور ذمہ دار ریاست ہونے کا ثبوت دیا۔ بھارتی جنگی بیانیہ اور فضائی ناکامی نے اس کے عالمی امیج کو متاثر کیا۔ اس واقعے نے نہ صرف بھارت کی عسکری صلاحیت پر سوال اٹھائے بلکہ عالمی سطح پر پاکستان کی مدبرانہ حکمت عملی کو سراہا گیا۔

ابتدائی طور پر امریکی صدر اور وزیر خارجہ نے جنگ سے لا تعلقی ظاہر کی۔ لیکن جب بھارت کو جوابی ضرب پڑی، تو امریکا نے فوری جنگ بندی کا عمل شروع کر دیا۔ اس کا مطلب امریکا کا اصل ہدف جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن برقرار رکھنا ہے۔ نہ کہ اصولی ثالثی۔ بھارت کی فوجی کمزوری اور سی پیک پر امریکی مفادات نے امریکا کو مداخلت پر مجبور کیا۔

یاد رہے کہ ٹرمپ نے کشیدگی کے آغاز پر انتہائی مضحکہ خیز انداز میں کہا تھا کہ یہ دونوں ممالک صدیوں سے لڑ رہے ہیں، ہمیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ امریکی وزیر خارجہ پومپےو نے بھی شروع میں لا تعلقی ظاہر کی۔ پاکستانی جوابی کارروائی کے فوری بعد امریکی پالیسی میں اچانک تبدیلی آگئی اور امریکا فوری طور پر سرگرم ہو گیا۔ جیسے ہی بھارت کو فوجی و سفارتی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، امریکا کی پالیسی یکایک تبدیل ہو گئی۔ امریکی سفارت کار فوری طور پر متحرک ہو گئے، سیز فائر کی کوششیں ہوئیں، اور خود ٹرمپ نے مذاکرات اور کشمیر پر ثالثی کی پیشکش کر دی۔ ٹوئٹر پر "سیز فائر" کا اعلان امریکی خارجہ پالیسی کی سفارتی شرمندگی کی علامت تھا۔

یہ عمل کئی سوالات کو جنم دیتا ہے۔ کیا امریکا ثالث ہے یا بھارت کا سہارا؟ اگر بھارت غالب ہوتا تو کیا امریکا اتنا سرگرم ہوتا؟ بھارت کو جب شکست ہوئی تو امریکا ثالثی کیلئے میدان میں اترا۔ اگر بھارت غالب ہوتا تو امریکا خاموش تماشائی بنا رہتا۔ بھارت نہ صرف پاکستان کے ہاتھوں فضائی شکست سے دوچار ہوا، بلکہ لداخ میں بھی چین کے ساتھ تصادم میں اپنی کمزوری دکھا چکا ہے۔ 2020ء میں بھارت اور چین کے درمیان "ایل اے سی" پر تصادم ہوا، جس میں بھارت کو علاقائی نقصان اٹھانا پڑا۔ بھارتی وزیر دفاع راج ناتھ نے خود پارلیمان میں اعتراف کیا کہ چین نے لداخ کے کئی ہزار مربع کلومیٹر علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھارت کا سی پیک کو سبوتاژ کرنے کا منصوبہ بھی چین اور پاکستان کی شراکت داری کے سامنے ناکام ہو چکا ہے۔ بھارت کی زمینی حقیقت کمزور ہو چکی ہے۔ یاد رہے کہ بھارت کا گلگت کو لداخ سے توڑنے کا منصوبہ (جیسے سیانچن گلشیشیر کنٹرول) چین اور پاکستان کی مشترکہ حکمت عملی کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ سی پیک کی کامیابی نے بھارت کو علاقائی اثرات سے دوچار کیا ہوا ہے بلکہ ان ناکامیوں نے بھارت کی فوجی

ساکھ کو بھی متاثر کیا ہے، جس سے امریکا میں یہ سوال اٹھا کہ کیا بھارت واقعی چین کے خلاف "کوآڈ" کا مضبوط اتحادی بن سکتا ہے۔ مودی حکومت کی کمزوریوں کو امریکا کیلئے تشویش کا باعث قرار دیا جا رہا ہے۔

تو کیا یہ ثالثی دراصل بھارت کو فیس سیونگ مہیا کرنے کی کوشش تھی؟ کیا امریکا واقعی کشمیر کے مسئلے کو سنجیدگی سے حل کرنا چاہتا ہے یا محض جیو پالیٹیکل مقاصد حاصل کرنا اس کا ہدف ہے؟ دراصل یہ ثابت ہو گیا کہ امریکا کی ثالثی دراصل مودی حکومت کو فیس سیونگ دینے کی کوشش تھی۔ اسی لئے یہ حقیقت ہے کہ سیز فائر کا ٹوکٹر پر اعلان، مودی حکومت کیلئے فیس سیونگ کا راستہ بنایا گیا۔

سیز فائر کے بعد تیزی کے ساتھ اس بیانیے کو تقویت دی جا رہی ہے کہ امریکا کی مداخلت کا بنیادی مقصد ایٹمی جنگ اور خطے کے عدم استحکام کو روکنا تھا، نہ کہ صرف بھارت یا پاکستان کی فوجی پوزیشن۔ تاہم، بھارت کی کمزوریاں امریکا کیلئے تشویش کا باعث ہیں، کیونکہ وہ چین کے خلاف اپنی حکمت عملی کیلئے بھارت پر انحصار کرتا ہے۔ اگر بھارت طاقتور ہوتا، تو شاید امریکا کی سفارتی کوششیں یکساں نہ ہوتیں، لیکن ان کا لہجہ اور طریقہ کار مختلف ہو سکتا تھا۔

ٹرمپ نے کئی مواقع پر کشمیر پر ثالثی کی خواہش کا اظہار کیا ہے، جس کی سب سے نمایاں مثال 2019 میں ان کا دعویٰ تھا کہ "مودی نے مجھے کشمیر پر ثالث بننے کو کہا تھا۔" تاہم، بھارت نے فوری طور پر اس دعوے کو مسترد کر دیا تھا۔ اب ٹرمپ کی طرف سے دوبارہ غیر جانبدار جگہ پر مذاکرات کی بات اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کی صداقت کو سمجھنے کیلئے درج ذیل نکات اہم ہیں:

بھارت ہمیشہ سے کشمیر کو اپنا "اندرونی معاملہ" قرار دیتا آیا ہے اور کسی بھی تیسرے فریق کی مداخلت کو مسترد کرتا ہے۔ 2019 میں کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے کے بعد یہ موقف مزید سخت ہو گیا ہے۔ سیز فائر کروانے میں امریکا کا یہ مفاد بھی ہو سکتا ہے کہ ٹرمپ کی پیشکش کا تعلق امریکا کی خطے میں اپنی سفارتی موجودگی بڑھانے اور چین کے اثرات کو کم کرنے کی کوششوں سے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ، ٹرمپ اپنی خارجہ پالیسی کو "امن کے ایجنڈے" کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کی سیاسی میرٹ کو تقویت ملے۔

ادھر پاکستان نے ہمیشہ کشمیر پر ثالثی کا خیر مقدم کیا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے تحت کشمیر کے عوام کو حق خود ارادیت دیا جانا چاہیے۔ تاہم ٹرمپ کی پیشکش زیادہ تر "علامتی" ہے۔ بھارت کی مخالفت اور امریکا کی موجودہ انتظامیہ کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اس پر عملدرآمد کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا امریکا بھارت کو فوجی طور پر دوبارہ مضبوط ہونے کا موقع دے رہا ہے؟ اس کا جواب خطے کی جیو پالیٹکس اور امریکا-چین کشمکش میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لہذا چین کے ہاتھوں اور پاکستان کے ساتھ گذشتہ جھڑپوں میں بھارت کی فوجی کمزوریاں اور اس کی کارکردگی پر سوالات اٹھے ہیں۔ امریکا کیلئے یہ تشویش کا باعث ہے کہ کوآڈ میں بھارت کا کردار کمزور نہ ہو جائے۔

امریکا چاہتا ہے کہ بھارت چین کے خلاف اپنی محاذ آرائی برقرار رکھے، اس لیے ممکن ہے کہ وہ بھارت کو فوجی اور معاشی مدد دے کر اسے "بحال" کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تاہم، یہ بات واضح ہے کہ پاکستان کے ساتھ کھلی جنگ بھارت کیلئے تباہ کن ہوگی، کیونکہ دونوں ممالک ایٹمی طاقت ہیں۔ تاہم اس وقت یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ امریکا کی جنگ بندی کی سفارش کا مقصد صرف "وقت خریدنے" سے زیادہ خطے کو ایٹمی تصادم سے بچانا تھا۔ امریکی مداخلت کی

ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ امریکی پالیسی کا بنیادی مقصد جنوبی ایشیا میں اپنے استحکام اور چین کے بڑھتے اثرات کو محدود کرنا ہے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان کشیدگی، خاص طور پر ایٹمی جنگ کے خطرات، امریکا کیلئے بڑا خطرہ ہیں کیونکہ دونوں ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں، اور ایٹمی تصادم کی صورت میں خطے کے ساتھ عالمی معیشت اور سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہوں گے۔

پاکستان چین کا اہم اتحادی ہے، اور امریکا چاہتا ہے کہ بھارت کو "کوڈ" کے ذریعے چین کے خلاف ایک توازن کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اگر بھارت فوجی یا سیاسی طور پر کمزور پڑا، تو یہ امریکی مفادات کیلئے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ جنگ کی صورت میں خطے میں امریکی اتحادیوں جیسے سعودی عرب، یو اے ای کے مفادات متاثر ہو سکتے تھے۔

عالمی تجزیہ نگاروں اور عالمی دفاعی تجزیہ نگاروں کے نقطہ نظر کے مطابق بھارت کی فوجی اور سفارتی (جیسے لداخ میں چین سے ہار، کشمیر پالیسی پر تنقید) نے اسے امریکا کے اعتماد میں کمی کا باعث تو ضرور بنی ہیں۔ کوڈ میں بھارت کا کردار اہم ہے، لیکن اگر وہ چین کے خلاف مؤثر ثابت نہیں ہوتا، تو امریکا اپنی حکمت عملی تبدیل کر سکتا ہے۔ سی پیک کی کامیابی اور چین۔ پاکستان اتحاد نے خطے کے طاقت کے توازن کو تبدیل کر دیا ہے، جس کے تحت بھارت کو دفاعی طور پر زیادہ محتاط رہنا پڑ رہا ہے۔

اب میڈیا میں امریکی مداخلت سے سیز فائر کیلئے کئی جواز پیش کئے جا رہے ہیں کہ اگر بھارت جنگ میں بالادست ہوتا، اور پاکستان کی شکست سے چین براہ راست مداخلت کر سکتا تھا، جو امریکا کیلئے خطرناک ہوتا۔ کسی بھی فریق کی فیصلہ کن فتح ایٹمی ہتھیاروں کے تصادم کی وجہ بن جاتی۔ ایک اور امریکی وجہ یہ بھی بتائی جا رہی ہے کہ بھارت کی بالادستی سے خطے میں چین کا اثر کم ہو جاتا لیکن پاکستان کے عدم استحکام سے دہشتگردی جیسے مسائل بڑھ سکتے تھے جس سے

اس خطے میں امریکا کیلئے لامتناہی مشکلات کا دروازہ کھل جاتا جبکہ امریکا اور اس کے اتحادی یوکرین میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں اور ٹرمپ کی کوشش ہے کہ کسی طرح یوکرین کی جنگ اپنے انجام کو پہنچے تاکہ روس سے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر خطے سے چین کے اثر کو روکنے کی کوشش کی جائے جو کہ ممکن نہیں۔ امریکا کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کی بنیاد پر ہی مداخلت کرتا ہے۔

ٹرمپ نے اپنے حالیہ دورہ سعودی عرب، قطر اور یو اے ای کے دوران بارہا پاک بھارت کے درمیان سیز فائر کا کریڈٹ لیتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ جلد ہی دونوں ممالک کسی غیر جانبدار جگہ پر اپنے جاری مسائل بشمول مسئلہ کشمیر پر مذاکرات کریں گے۔ اب ضروری ہو گیا کہ پاکستان اپنی مکمل سفارتی تیاری کے ساتھ اپنے مضبوط اور تاریخی دلائل کے ساتھ اپنا مقدمہ لڑے اور مذاکرات سے پہلے پوری قوم کو اعتماد میں بھی لیا جائے۔ پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس کے علاوہ قوم کے ساتھ خطاب میں واضح کیا جائے کہ ان مذاکرات پر کس ایجنڈے پر بات ہوگی تاکہ قوم کا اعتماد آپ کی پشت پر ہو۔

یاد رکھیں کہ مذاکرات سے قبل پاکستان کو کئی چیلنجز کا سامنا کرنے کا بھی اندیشہ ہے جس میں سب سے پہلے بھارت ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کشمیر کو اپنا "اندرونی معاملہ" بتاتے ہوئے اس مسئلے پر بات چیت سے انکار کر سکتا ہے۔ اس صورت میں پاکستان کیلئے ضروری ہے کہ مذاکرات سے پہلے چین، ترکی، اور اسلامی ممالک (سعودی عرب، یو اے ای، قطر) کی حمایت سے بھارت پر بین الاقوامی دباؤ بڑھائے۔

پاکستان کو امریکا کے دوغلے رویے سے بھی خبردار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ امریکا بیک وقت بھارت کو فوجی اتحاد (کوآڈ) اور پاکستان کو دہشتگردی کے خلاف اتحادی سمجھتا ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ چین اور روس کے ساتھ تعلقات کو مضبوط کرے تاکہ امریکا کے یکطرفہ اثرات کو متوازن کیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان کو کشمیری عوام کی آواز کو عالمی سطح پر اٹھانے کیلئے سوشل میڈیا اور بین الاقوامی میڈیا کو استعمال کرنا چاہیے۔

یقیناً وزارتِ خارجہ آئندہ ہونے والے مذاکرات کیلئے اپنے ایجنڈے کی نوک پلک سنوار رہے ہوں گے تاہم آئندہ مذاکرات کیلئے پانچ ترجیحی نکات کو شامل کرنا از حد ضروری ہے۔ پاکستان کے مذاکراتی ایجنڈا میں کلیدی نکات اور دلائل میں تنازعہ کشمیر بنیادی نقطہ ہونا چاہئے۔ پاکستان کا مضبوط قانونی موقف اقوام متحدہ کی قراردادیں ہیں جن پر عملدرآمد کو ضروری بنایا جائے۔ ڈائلاگ ایجنڈا کی وضاحت کیلئے ضروری ہے کہ مذاکرات کا آغاز صرف اسی صورت میں ہو جب بھارت کشمیر کی متنازع حیثیت تسلیم کرے، معاشی یا تجارتی موضوعات کو بعد میں شامل کیا جائے۔ اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کا لائحہ عمل طے کیا جائے اور ایل اوسی پر جنگ بندی کی مستقل نگرانی کا مطالبہ کیا جائے اور خلاف ورزی کرنے والے کے احتساب کیلئے اصول وضع کئے جائیں۔



1948ء اور 1949ء کی قراردادیں کشمیریوں کے حق خودارادیت کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرارداد 47، 51 اور دیگر قراردادیں جن پر بھارت اور پاکستان دونوں نے ان پر دستخط کیے ہیں اور پانچ عالمی طاقتیں اس معاہدے کی ضامن بھی ہیں۔ بھارت نے 5 / اگست 2019ء کو آرٹیکل 370 اے اور آرٹیکل 35 کو منسوخ کر کے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی جس سے اس نے کشمیریوں

سے خود مختاری چھین لی جو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی بھی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے اصولوں اور چوتھے جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی ہے۔ بین الاقوامی رد عمل کے طور پر او آئی سی، ہیومن رائٹس واچ، ایمنسٹی انٹرنیشنل نے جہاں انتہائی تشویش کا اظہار کیا وہاں یورپی پارلیمنٹ میں بھی اس معاملے پر کئی بار بحث ہو چکی ہے۔

پاکستان کو سفارتی حکمت عملی کے تحت ایک مکمل لائحہ عمل تیار کرنا ہو گا جس میں مسئلہ کشمیر کیلئے اقوام متحدہ میں مسلسل آواز اٹھانی چاہئے اور عالمی ضامن طاقتوں کی توجہ اس پر مبذول کرواتے ہوئے معاہدہ پر عملدرآمد کیلئے ان کی ذمہ داریوں کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ دوسرا او آئی سی اور دیگر مسلم تنظیموں کو دوبارہ متحرک کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ یورپی یونین اور امریکی پارلیمانز کو کشمیر کے بارے میں بریفنگ دیکر اس خطے کی ایٹمی فلیش پوائنٹ پر توجہ دلائی جائے۔ پاکستان عالمی سطح پر یو این جنرل اسمبلی، او آئی سی، ہیومن رائٹس کمیشن میں مسئلہ کشمیر کی مستقل پیروی کرے۔ علاوہ ازیں پاکستان کو یہ واضح کرنا ہو گا کہ کشمیر کی آزادی کی تحریک کو دہشتگردی کے ساتھ جوڑنا بھارت کی جانب سے ایک "ڈائورژن" ہے۔

کشمیر میڈیا سیل کو فعال کیا جائے، تاکہ عالمی میڈیا میں پاکستانی موقف اجاگر ہو۔ اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر بھارت پر سفارتی اور معاشی دباؤ بڑھایا جائے۔ او آئی سی اور دیگر مسلم تنظیموں کی طرف سے کشمیری مظالم پر مشترکہ بیان جاری کروایا جائے اور یہود و ہنود کی تمام مصنوعات کے بائیکاٹ کی مہم چلائی جائے بالخصوص اوور سیز پاکستانیوں اور مسلم کمیونٹی کو اس طرف بھرپور راغب کیا جائے۔

اس کے ساتھ میڈیا کو مکمل طور پر استعمال میں لاتے ہوئے دستاویزی فلمیں، بین الاقوامی میڈیا میں اشتہارات کا بندوبست کیا جائے۔ سوشل میڈیا مہم، انفلوئنسرز کو انگیج کر کے پاکستان کے موقف کی تشہیر کی جائے تاکہ اقوام عالم میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں آگہی وادراک کی فضا پیدا ہو۔ یاد رہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادیں تاحال موجود ہیں اور بھارت بھی ان پر دستخط کر چکا ہے۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل، او آئی سی اور عالمی انسانی حقوق کمیشن نے کشمیر کی صورت حال پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ دنیا بھر کی کشمیری مظالم کو میڈیا، انسانی حقوق تنظیموں، اور ڈپلومیسی کے ذریعے جان چکی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ عالمی میڈیا کی رپورٹس اور مضبوط شواہد کے ساتھ کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالیوں کا معاملہ ضرور اٹھایا جائے کیونکہ عالمی میڈیا میں بھارتی قابض فوج کی طرف سے انسانی حقوق کی پامالیوں کی درجنوں رپورٹس موجود ہیں جس میں مضبوط شواہد کے ساتھ اب تک ایک لاکھ سے زائد کشمیریوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ مظلوم کشمیری عوام کی اصل کہانی کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے کیلئے بھارتی قابض افواج کے مظالم کی سینکڑوں سچی کہانیوں کی تشہیر کیلئے بین الاقوامی میڈیا کا استعمال کیا جائے۔ خود بھارتی صحافی کشمیر میں اجتماعی قبروں کا انکشاف کر چکے ہیں۔ اب تک ہزاروں نوجوانوں کو گھروں سے اٹھا کر غائب کر دیا گیا ہے اور اب ان کے والدین اور ان کے لواحقین پر بھی منہ بند رکھنے کیلئے تشدد سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہزاروں کشمیری نوجوان ماورائے عدالت قتل، حراست اور تشدد کا شکار ہیں۔ انسانی حقوق کی بین الاقوامی تنظیمیں ہیومن رائٹس واچ، ایمنسٹی انٹرنیشنل، اور اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے مسلسل ان زیادتیوں پر رپورٹس جاری کر چکے ہیں۔

وزارت خارجہ ایک "کشمیر ایڈووکیسی ڈیسک" بنائے جو عالمی سفارت خانوں کو مسلسل مواد فراہم کرے۔ کشمیر پر ایک بین الاقوامی دستاویزی فلم تیار کی جائے اور عالمی اداروں کو بھیجی جائے۔ اسلامی ممالک میں بھارت کے مظالم کے خلاف عوامی بیداری مہم چلائی جائے۔

تیسرا اہم نکتہ یقیناً سندھ طاس معاہدہ کی خلاف ورزی پر اٹھانے کی ضرورت ہے۔ 1960ء میں عالمی بینک کی ثالثی سے ہونے والے اس معاہدے کے تحت تین مشرقی دریا بھارت کے اور تین مغربی دریا پاکستان کے حصے میں آئے۔ اسے چھیڑنے سے پاکستان کے اصولی موقف میں کمزوری آسکتی ہے۔ حالیہ برسوں میں بھارت کی آبی پالیسی اور ڈیمز کی تعمیر نے اس معاہدے کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔ پاکستان کو یہ معاہدہ چھیڑے بغیر عالمی عدالت انصاف اور ثالثی عدالتوں میں بھارتی خلاف ورزیوں کو اٹھانا چاہیے۔ بھارت کی طرف سے آبی جارحیت جیسے منصوبے (کشن گڑگا، بگلیہار ڈیمز اور رتلے ڈیم) جیسی اسکیمیں اس معاہدے کی خلاف ورزی کے مترادف ہیں۔ پاکستان کو ثبوتوں کے ساتھ یہ واضح کرنا ہو گا کہ بھارت نے سندھ طاس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جموں و کشمیر میں ڈیمز اور پن بجلی منصوبے بنائے ہیں، جس سے پاکستان کے پانی کے حقوق متاثر ہو رہے ہیں۔

پاکستان کو اس معاہدے کے عمل درآمد کی ضمانتوں پر اصرار کرنا چاہیے۔ عالمی بینک یا اقوام متحدہ جیسے اداروں سے درخواست کرنا کہ وہ بھارت کی جانب سے معاہدے کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کریں۔ بھارت کے ڈیمز سے نہ صرف پانی کی کمی بلکہ سیلابوں اور ماحولیاتی تباہی کا خطرہ بھی ہے، جسے عالمی میڈیا میں اٹھانا ضروری ہے اور ہندوستان سے آئندہ اس کی خلاف ورزیوں پر عالمی پابندیوں کا مطالبہ کرنا چاہئے۔

چوتھا نکتہ کنٹرول لائن پر اقوام متحدہ کے مبصر گروپس کی واپسی کا مطالبہ کرنا چاہئے جس کے بارے میں اقوام متحدہ کی قرارداد موجود ہے۔ پاکستان کو اس کی فعال موجودگی کا مطالبہ کرنا چاہیے جس کو بھارت قبول نہیں کرتا۔ حقیقی امن اسی وقت ممکن ہے جب انصاف کی بنیاد پر فیصلے کیے جائیں۔ پاکستان اگر سفارتی سطح پر موثر، منظم اور مسلسل کوشش کرے، تو مسئلہ کشمیر عالمی ضمیر کو جھنجھوڑ سکتا ہے۔ بھارت کی کمزوری اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی

موجودگی پاکستان کو ایک قانونی اور اخلاقی برتری فراہم کرتی ہے۔ تاہم عالمی برادری کا دوہرا معیار اور مفادات پر مبنی فیصلے اصل رکاوٹ ہیں۔ پاکستان کو امن کی خواہش اور عزت نفس اور اصولوں کی پاسداری کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے قدم اٹھانا ہو گا۔

پانچواں نکتہ جنگی قیدیوں اور لائن آف کنٹرول پر گولہ باری کے مضبوط شواہد کے ساتھ اس کی روک تھام کیلئے ایک نیا معاہدہ مرتب کرنا ہو گا جس میں جینیوا کنونشن کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر عملدرآمد کیلئے اصول و ضوابط طے کر کے اس کی خلاف ورزی کرنے والے کیلئے عالمی عدالت سے فوری سزا کے طور پر عالمی پابندیوں کا اطلاق ہونا چاہئے۔

پاکستان کو ثابت کرنا ہو گا کہ سی پیک خطے کی معاشی ترقی کیلئے اہم ہے، اور بھارت اسے ناکام بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ جس طرح سندھ طاس معاہدہ پاکستان کی زرعی زندگی کا ضامن ہے، ایسے ہی سی پیک کی اہمیت پاکستان کیلئے ہے اور اس پر بھی کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

ٹرمپ کی ثالثی کی پیشکش زیادہ تر "علامتی" ہے، لیکن پاکستان کیلئے یہ موقع ہے کہ وہ کشمیر کو بین الاقوامی ایجنڈے پر لانے کیلئے سفارتی محاذ کھولے۔ سندھ طاس معاہدے کو دوبارہ کھولنے کی بجائے، پاکستان کو بھارت کی خلاف ورزیوں کو اجاگر کرنا چاہیے۔ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کو بنیاد بنا کر، پاکستان کو ترکی، چین، اور دیگر دوست ممالک کی حمایت سے ایک مربوط مہم چلائے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ کشمیر کے عوامی حقوق کو کبھی پیچھے نہ رکھے، کیونکہ یہی اس کا سب سے مضبوط اخلاقی اور قانونی موقف ہے۔

امریکا کی مداخلت، ثالثی کی آڑ میں اپنے مفادات کا تحفظ ہے۔ پاکستان کو اس بار محتاط مگر جرأت مند انداز میں مذاکرات کی میز پر آنا ہو گا، کیونکہ تاریخ گواہ ہے کہ کمزور موقف کے ساتھ مذاکرات، کمزور فیصلے جنم دیتے ہیں۔ پاکستان کو اپنا موقف مضبوط قانونی دلائل، عوامی حمایت، میڈیا کی طاقت اور اسلامی ممالک کے اتحاد کے ذریعے پوری دنیا میں اجاگر کرنا ہو گا۔ اگر ان سفارشات پر مکمل عملدرآمد کیا گیا تو جس طرح رب العزت نے آپریشن بنیان المرصوص میں کامیابی اور فتح نصیب فرمائی ہے، اسی طرح ان کامیابیوں کا سلسلہ اور دراز ہوتا چلا جائے گا، ان شاء اللہ۔

اقبال اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ

ملتِ اسلامیہ کی بیداری کے تناظر میں بلوچستان کے موجودہ حالات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ، وَعَلٰی اٰلِهِمْ وَاصْحَابِهِمْ اَجْمَعِيْنَ۔
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ سَمِيعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔
(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا)
(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سیدھی بات کہو۔)

محترم صدرِ محفل، معزز اساتذہ کرام، صاحبانِ علم و دانش، اور دنیائے اقبالیات کے جلیل القدر محققین
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یہ لمحہ فکری مسرت کا ہے کہ آج بلوچستان کی علمی فضا میں — جہاں پہاڑوں کی سنگینی دلوں کی غیرت سے ہم آہنگ ہے — ہم اس مفکرِ ملت کو یاد کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جس نے غلام ذہنوں میں آزادی کے خواب جگائے، اور جس کی صدائے دروں آج بھی ملتِ اسلامیہ کے قافلے کو منزل کی طرف بلاتی ہے۔ اپنی گفتگو کے آغاز میں سورہ الاحزاب کی آیت نمبر 70 پڑھنے کی جو توفیق ملی، یہ آیت دراصل اقبالؒ کے فلسفہ خودی کی قرآنی اساس ہے۔ وہ اسی پیغام کو اپنی پوری فکر کا محور بناتے ہیں۔ آج جب ہم اقبالؒ کی یاد منانے کو جمع ہیں، تو یہ محض تعظیمِ ماضی نہیں بلکہ احیائے حال کا عہد ہے۔ اقبالؒ وہ چراغ ہیں جنہوں نے قرآن کو فکر کا منبع اور ایمان کو انسان کا سرمایہ قرار دیا۔ اقبال کا فکری جہان، ان کا فلسفہ دراصل قرآن ہی کی تفسیرِ جدید ہے۔ وہ کہتے ہیں

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جَدّتِ کردار

اقبالؒ کی شخصیت ایک فرد نہیں، ایک عہد ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور صاحبِ وحی کی تعلیمات کے نقیب بھی۔ فلسفہ بھی ان کا میدان ہے اور فقہِ حیات بھی ان کی میراث۔ ان کی فکر میں قرآن کا نور، تاریخ کا شعور، اور عمل کا زور یکجا ہے۔ ان کا کلام حقیقت میں قرآنِ حکیم کی ترجمانی ہے، اور وہ خود اپنی شاعری کو دعوتِ عمل سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ کی ذات کثیر الجہات تھی۔ وہ شاعر بھی تھے، فلسفی بھی، مفسرِ قرآن بھی اور سیاسی مدبر بھی۔ ان کی فکر کا منبع قرآن تھا اور ان کا نصب العین انسانِ کامل کی تخلیق۔ ان کی نظر میں مومن وہ ہے جو زمین پر خدا کی حجت بن کر جیتا ہے، جو بندگی میں آزادی تلاش کرتا ہے، اور جو خودی کے آئینے میں اپنا خالق پہچانتا ہے۔ اقبالؒ نے انسانی فکر کو بندگی کے دائرے میں آزادیِ شعور عطا کی۔ ان کا پیغام صرف شاعری نہیں بلکہ ایک تہذیبی انقلاب کی صدا تھا۔ یہ آیت دراصل قرآنِ حکیم کی فکری اساس کا خلاصہ ہے۔ جو ہمیں اقبالؒ کے کلام، فلسفے اور سوانح میں جاہِ جا ملتی ہے۔ اقبالؒ نے یہی پیغام اپنے عہد کی مردہ روحوں میں پھونکا کہ ایمان جمود نہیں، حرکت ہے؛ اور امت کی بیداری خوفِ خدا اور استبازی میں پنہاں ہے، اور علم و عمل کی آمیزش سے ممکن ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ وہ نادر روزگار شخصیت ہیں جنہوں نے قرآن کے پیغام کو نہ صرف سمجھا بلکہ اسے انسانی شعور کے نئے دور میں منتقل کیا۔ وہ مفکر بھی تھے، مفسرِ قرآن بھی، فلسفی بھی تھے اور مدبرِ ملت بھی؛ ادیب بھی، شاعر بھی، اور رہنما بھی۔ ان کی ذات میں مذہب، فلسفہ، سیاست اور ادب کا ایسا حسین

امتراج ملتا ہے جو اسلامی تہذیب کے کسی دوسرے مفکر میں نظر نہیں آتا۔ اقبالؒ کا کہنا تھا:

میری نوائے دورگی کو شاعری نہ سمجھ

کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

یعنی وہ اپنی شاعری کو محض فن نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ایک فکری جہاد، ایک دعوتِ عمل اور قرآنی تفہیم کا تسلسل تصور کرتے تھے۔ اقبالؒ کا پیغام جہاں انسان، مومن اور ملت کے لیے ہے وہاں اقبالؒ کی تعلیمات انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ انسان کے باطن میں جو چراغِ خودی جلتا ہے، اقبالؒ نے اسی کو ملت کی روشنی قرار دیا۔ وہ مردِ مومن کو قرآن کا عملی پیکر سمجھتے ہیں جس کی نگاہ خود شناس ہو، جس کا عمل خالص ہو، اور جو اپنے خالق سے براہِ راست رشتہ رکھتا ہو۔

اقبالؒ کا مردِ کامل، کسی فرقے یا خطے کا نمائندہ نہیں بلکہ پوری انسانیت کا معمار ہے۔ وہ انسان کو غفلت کی نیند سے بیدار کرتا ہے اور یاد دلاتا ہے کہ اسلام ایک زندہ اور متحرک دین ہے، جو ہر دور میں نشاۃ ثانیہ یعنی تجدیدِ حیات کا مطالبہ کرتا ہے۔

بیسویں صدی کا پہلا نصف ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن دور تھا۔ انگریز سامراج نے سیاسی غلامی کی زنجیر ڈالی، ہندو اکثریت نے اکثریتی جبر کی دیوار کھڑی کی، اور مسلمان باپوسی و خوف کے اندھیروں میں گم ہو گئے۔ علم کے مراکز ویران، قیادت منتشر، اور ملت کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اقبالؒ کی آواز بجلی کی کڑک کی مانند ابھری۔ انہوں نے غلامی کے سناٹے میں خودی کا نعرہ بلند کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ اگر وہ اپنی اصل پہچان بھول گئے، تو نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ پوری دنیا میں امتِ مسلمہ کے وجود پر سوال اٹھ جائے گا۔

اقبالؒ نے اندلس کے زوال، ہسپانیہ کے الیہ، اور مسلمانوں کی تاریخ سے عبرت دلاتے ہوئے کہا کہ اگر قومیں خودی کھودیں تو سلطنتیں بھی ریت کا محل بن جاتی ہیں۔ اقبالؒ کا فکری انقلاب وطنیت کا بت شکنی پر مبنی تھا۔ اقبالؒ نے سب سے پہلے قومیت کے خول کو توڑا۔ اس دور میں وطنیت کا بت مسلمانوں کے ذہنوں پر مسلط کیا جا رہا تھا۔ اقبالؒ نے اعلان کیا کہ مسلمان کی شناخت وطن سے نہیں، ایمان سے ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سبب سے وطن ہے

جو پیرِ ہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ آواز تھی جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اقبالؒ نے ان کے اندر نئی روح پھونکی، ان میں فکری خود اعتمادی اور سیاسی شعور پیدا کیا۔

ان کی شاعری نے مسلمانوں کے دلوں میں زندگی کی تڑپ اور حرکت کی آرزو جگائی۔ شاعرِ مشرق بطورِ مصلحِ قوم، اقبالؒ کی شاعری میں ایک ایسی روحانی توانائی ہے جو دلوں میں یقینِ محکم، عملِ پیہم، اور محبتِ فاتحِ عالم پیدا کرتی ہے۔

ایک بلبل ہے کہ محوِ ترنم ہے اب تک

اس کے سینے میں نغموں کا تلاطم ہے اب تک

اقبالؒ کی آواز وقت کی گرد میں بھی زندہ ہے، کیونکہ ان کی فکر قرآن سے جڑی اور عمل سے بندھی ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ایمان محض عقیدہ نہیں، بلکہ عمل کا محرک اور قوتِ تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

جب ملتِ اسلامیہ کے سیاسی قائدین انتشار کا شکار تھے، جب کانگریسی مسلمان وطنیت کے فریب میں مبتلا تھے، تب اقبالؒ نے مسلم لیگ کے فکری محور کو درست سمت دکھائی۔ انہوں نے نہرو فارمولے اور مخلوط انتخابات کی مخالفت کی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی سیاسی موت ہے۔

قائدِ اعظمؒ نے اقبالؒ کے بارے میں کہا تھا وہ میرے دوست، میرے رہنما اور میرے فلسفی ہیں۔ مسلم لیگ کے تاریک ترین ادوار میں وہ چٹان کی طرح استقامت سے ڈٹے رہے، یہی استقامت دراصل اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی روح ہے کہ جب باطل ہر سمت سے حملہ کرے تو مومن اپنے نظریے سے ایک انچ پیچھے نہ ہٹے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اقبالؒ کا خواب تھا۔ نشاۃ ثانیہ محض مذہبی بیداری نہیں، بلکہ ایک عالمی فکری انقلاب کا عنوان ہے۔ اقبالؒ نے اس تصور کو اسلامی فکر کی تجدید کے طور پر پیش کیا، ایسی تجدید جو قرآن کے بنیادی اصولوں پر استوار ہو، لیکن زمانے کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کرے۔ ان کی نظر میں اسلام کوئی ماضی کی یاد نہیں، بلکہ مستقبل کی قوتِ محرکہ ہے۔ اسی لئے اقبالؒ نے کہا: اسلام ایک پیغامِ عمل ہے، مذہب نہیں بلکہ ایک انقلابی تحریک ہے۔

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اقبالؒ نے تین بنیادیں بیان کیں جو حقیقت میں سورہ العصر کی تشریح ہے۔

خودی کی بیداری۔۔ انسان اپنی ذات کو پہچانے

عمل صالح۔۔ ایمان کو حرکت میں بدلے

اجتماعی عدل۔۔ امت کے نظامِ حیات کو عدل پر استوار کرے۔

یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر مستقبل کا اسلامی معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔

اقبالؒ کا خواب صرف برصغیر تک محدود نہ تھا۔ اقبالؒ کا عالمی وژن۔ ایران، افغانستان، اور عالمِ اسلام تک محو پرواز تھا۔ ان کی نگاہیں افغانستان کے پہاڑوں، ایران کے افکار، اور ترک و عرب کے میدانوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اگر مسلمان اپنی فکری خودی نہ پہچانیں تو وہ نہ صرف سیاسی بلکہ روحانی غلامی کے شکنجے میں جکڑ جائیں گے۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری سے وطنیت کے بت توڑے اور امت کے تصور کو زندہ کیا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تاجنک کا شجر

یہ محض شعر نہیں، ایک قرآنی صدا ہے کہ امت ایک جسم ہے، جس کا دکھ اور سکون ایک ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اگر مسلمان اپنی قومی خودی برقرار رکھیں، تو کوئی طاقت انہیں محکوم نہیں بنا سکتی۔ اقبالؒ کے سیاسی نظریے کی بنیاد قرآن کی مساوات، عدل اور خودی کے اصولوں پر تھی۔ 1908ء سے 1938ء تک وہ مسلسل قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی فکر کا عروج 1930ء کے الہ آباد خطبے میں ظاہر ہوا۔ یہ خطبہ محض سیاسی تقریر نہیں بلکہ وحی الہی کی تفسیر تھی کہ ایک ایسی ملت جو ایمان کی بنیاد پر بنی ہو، وہ کسی دوسری اکثریت کی مرہونِ منت نہیں، جہاں انہوں نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان ایک آزاد ریاست میں اپنی زندگی قرآن کے مطابق بسر کریں۔ یہ اعلان دراصل ایک قرآنی تصورِ امت کی تجدید تھا۔

اقبالؒ نے اسلام کو وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک مسلمان اپنے مابین تفرقے اور قومیت کے بت نہیں توڑیں گے، انہوں نے کہا کہ جب تک مسلمان اپنے مابین تفرقے اور قومیت کے بت نہیں توڑیں گے، تب تک نشاۃ ثانیہ کا سورج طلوع نہیں ہو سکتا۔

اقبالؑ نے جب چاروں طرف سے مخالفت دیکھی، انگریز، ہندو، اور بعض نام نہاد مسلمان رہنما سب نے انہیں دبانے کی کوشش کی، تب بھی وہ اپنے نظریے سے پیچھے نہ ہٹے۔ مگر اقبالؑ قرآنی مردِ مومن کی تصویر بن گئے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: **الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا الْكُفْرَ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا أَحْسَبُنا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ**: لوگوں نے کہا، سب تمہارے خلاف جمع ہو گئے ہیں، ان سے ڈرو۔ مگر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور کہا ہمیں اللہ کافی ہے، وہ بہترین کارساز ہے۔

اسی استقامت پر قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کہا تھا: اقبالؑ میرے رہنما اور میرے فلسفی ہیں۔ وہ چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔ علامہ اقبالؑ اتحاد و اتفاق کو امت کا اثاثہ سمجھتے تھے۔ اقبالؑ کے خواب کو قائدِ اعظمؑ نے تعبیر دی۔ جب جناح لندن میں گوشہ نشین تھے، اقبالؑ کے خطوط ان کے دل میں ذمہ داری اور قیادت کا شعلہ دوبارہ روشن کرتے رہے۔ اقبالؑ نے جناحؒ کو مخاطب کر کے لکھا: مسلمانوں کی نجات صرف اسی میں ہے کہ وہ اپنی سیاست کو دینی اصولوں پر قائم کریں۔ یوں ایک مفکر اور ایک قائد — دونوں مل کر امت کے دوبارہ بننے۔ ایک نے خواب دیکھا، دوسرے نے حقیقت میں ڈھالا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ملت نے اپنی شناخت حاصل کی، اور برصغیر کے مسلمانوں نے قرآن کی روشنی میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ آج جب ہم بلوچستان کے اس علمی و فکری اجتماع میں جمع ہیں، تو اقبالؑ کے اس پیغام کی گونج ہمیں جھنجھوڑتی ہے:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بلوچستان کی سرزمین، جس نے ہمیشہ علم، غیرت اور اخوت کو سینے سے لگائے رکھا، آج اسی پیغام اتحاد کی محتاج ہے۔ فرقہ واریت، لسانی تقسیم، اور سیاسی انتشار اسی وقت مٹ سکتا ہے جب ہم اقبالؑ کے اس اصول کو سینے سے لگائیں۔ اقبالؑ نے فرمایا:

تو را زِ کنِ فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا

اے مردِ مسلمان! تیری حیثیت اس عالم رنگ و بو میں قدرت کے ایک راز کی سی ہے۔ تیرے لیے یہ امر لازم ہے کہ اپنی حقیقت و تشخص سے آگہی حاصل کر لے اور خدائے ذوالجلال کے احکامات کی ترجمانی کرتے ہوئے خودی کی حکمت سے آشنائی حاصل کر لے۔

آج جب ہم بلوچستان کی سرزمین پر یہ کانفرنس منعقد کر رہے ہیں — وہ خطہ جہاں غیرت، علم اور ایثار کی روایات ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں — ہمیں اقبالؑ کی تعلیمات کو اپنے موجودہ حالات پر منطبق کرنا ہو گا۔ بلوچستان کے سیاسی اور سماجی مسائل کا حل کسی بیرونی طاقت کے ایجنڈے میں نہیں، بلکہ اقبالؑ کی اس تعلیم میں ہے جو قرآن سے پھوٹی ہے۔ اگر ہم قرآن اور اقبالؑ کی فکر کو اپنی اجتماعی زندگی میں نافذ کریں تو بکھرے ہوئے دل جڑ سکتے ہیں، محرومی خوشحالی میں بدل سکتی ہے، اور بلوچستان علم و عمل کا محور بن سکتا ہے۔ یہ اقبالؑ کا ہی پیغام ہے کہ سیاسی اختلاف کو فکری وحدت میں ڈھالا جائے، اور ملت کے رشتے کو جغرافیے کے نہیں بلکہ ایمان اور قرآن کے رشتے سے جوڑا جائے۔

بلوچستان کے موجودہ حالات میں اقبالؑ کی تعلیمات

آج جب ہم بلوچستان کی طرف دیکھتے ہیں جہاں سیاسی بے چینی، سماجی اضطراب، اور محرومی کی فضا چھائی ہوئی ہے تو اقبالؑ کی آواز ایک نئی تازگی کے ساتھ سنائی دیتی ہے۔ اقبالؑ کا پیغام ہمیں بتاتا ہے کہ اصلاح قوم کے اندر سے شروع ہوتی ہے، نہ کہ بیرونی نظاموں سے۔ جب تک دلوں میں خودی کی شمع نہیں

جلتی، تب تک سیاست میں استقامت پیدا نہیں ہوتی۔ بلوچستان کے نوجوانوں کے لیے اقبالؒ کا پیغام یہ ہے کہ تعلیم کو ہتھیار بناؤ، عمل کو عادت بناؤ، اور وحدت کو شعار بناؤ۔ اقبالؒ کے نزدیک انقلاب بندوق سے نہیں، بلکہ فکر، علم اور کردار سے آتا ہے۔

اگر بلوچستان کے فرزند اپنی ذات میں خودی کی آگ روشن کر لیں، تو یہی خاک زر خیز نئی نشاۃ ثانیہ کا آغاز بن سکتی ہے۔ اقبالؒ کی فکر محض ماضی کا سرمایہ نہیں، بلکہ حال کی راہ اور مستقبل کا نقشہ ہے۔ ان کی تعلیمات میں امت کے اتحاد کا پیغام ہے، ان کے فلسفے میں انسان کی آزادی کا جلال ہے، اور ان کے خواب میں اسلامی تہذیب کی تجدید کا جمال ہے۔ آج جب ہم اپنے گرد فکری زوال، سماجی انحطاط اور اخلاقی انتشار دیکھتے ہیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ اقبالؒ کی نشاۃ ثانیہ اب بھی ہم سے عمل، عزم، اور ایمان کی التجا کر رہی ہے۔

اے خالقِ ارض و سما، اے رب محمد مصطفیٰ ﷺ

ہم تیرے شکر گزار ہیں کہ تُو نے ہمیں اقبالؒ کی فکر سے فیضیاب کیا، جس نے ہمیں خودی کی پہچان اور امت کی وحدت کا درس دیا۔ اے اللہ ہمیں وہ نگاہ عطا کر جو اقبالؒ کو عطا فرمائی تھی، ہمیں وہ دل دے جو ایمان سے روشن ہو، اور وہ ہاتھ دے جو عملِ صالح سے معمور ہو۔ اے رب کائنات بلوچستان اور پاکستان کے ہر گوشے کو امن، علم، عدل اور وحدت کا گہوارہ بنا دے۔ ہمیں اختلاف کی بجائے اتحاد کی راہ دکھا، اور ہمیں اپنے دین کی سربلندی کے لیے فکرِ اقبال اور عملِ مصطفیٰ ﷺ کی پیروی کی توفیق دے۔ آمین، ثم آمین۔

(عالمی اقبال کانفرنس زیر اہتمام تعمیر نو ٹرسٹ کوئٹہ بلوچستان)

"سرزمین بلوچستان اور فکرِ اقبال" — امت کے عہدِ نو کی بشارت"

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ، وَنُسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهِ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ شَرِّهِ وَأَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَيِّئَاتٍ مِنْ يَهْدِيهِ اللَّهُ فَلَا مَضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ ﷺ تَسْلِيمًا كَثِيرًا۔ اَعُوذُ بِاللَّهِ سَمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ قُلْ إِنْ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔۔۔ صَدَقَ اللَّهُ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلِلْ عُقْدَةً مِنْ لِسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي۔ رَبَّنَا اقْبَلْ مَنَانِكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتَبَّ عَلَيْنَا إِنْكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ آمِينَ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ

کروڑوں حمد و ثنا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات پر اور کروڑوں درود خاتم النبیین ﷺ کی ذاتِ گرامی پر اما بعد: اللہ نے ابھی جو سورہ الانعام کی آیت نمبر 162 پڑھنے کی جو توفیق عطا فرمائی اس کا ترجمہ یوں ہے: کہہ دو بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔"

یہ آیت حقیقتِ خودی کی قرآنی تفسیر ہے۔

— یہ انسان کے پورے وجود کو اللہ کی بندگی میں سمونے کی دعوت ہے

وہی بندگی جسے اقبالؒ نے خودی کا سرچشمہ اور ملتِ اسلامیہ کی اصل قوت قرار دیا۔

میرے انتہائی معزز دوستوں، بھائیوں اور عزیزوں

آج مجھے "سرزمین بلوچستان اور فکرِ اقبال" — امت کے عہدِ نو کی بشارت" کے بارے میں کہنے کا حکم ہوا ہے جس میں آج ہم حکیم الامت کی روح کو گرما دینے اور وطن عزیز کے اہم خطہ بلوچستان تک کے سفر کا تذکرہ کریں گے ان شاء اللہ

زندگی کی متاعِ عزیز کیا ہے؟ روپیہ پیسہ، زر و جواہر، زمینیں اور جائیداد، منصب، جاہ و جلال، ناموری، واہ واہ، داد و تحسین، صلہ و ستائش، بیوی، یار و دوست.... کیا یہی ہے زندگی کی متاعِ عزیز! تو پھر نظریہ کیا ہے، اصول کیا ہے، حق و صداقت کیا ہے، دار و رسن کیا ہے، شہادت — بچے عزیز و اقرباء، محبت کیا ہے، عشق کیا ہے، بے غرضی کیا ہے، جاں نثاری کیا ہے، مرثنا کیا ہے؟؟؟ بتائیے پھر یہ سب کیا ہیں؟ کسے کہتے ہیں متاعِ عزیز؟ کیا انکار متاعِ عزیز نہیں ہے؟ جبر کے سامنے انکار، فرعونیت کا انکار، صلہ کا انکار، سودے بازی سے انکار، دولتِ بے بہا کا انکار، باطل کا انکار، سر جھکانے سے انکار، ظلم و جبر کا انکار، رب کی حاکمیت کے سوا سب کا انکار..... انکار متاعِ عزیز نہیں ہے تو پھر کیا ہے انکار؟ انکار اور یکسر انکار، پورے شعور کے ساتھ انکار۔ کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں..... مجسم انکار..... باطل کے سامنے، طاغوت کے سامنے، رب کے باغیوں کے سامنے، نفس پرستوں کے سامنے، دنیائے حرص و تحریص کے سامنے، دھوکے کے سامنے، بے وفائی کے سامنے، خدائی لہجے میں بات کرنے والوں کے سامنے..... انکار اور یکسر انکار..... پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ انکار۔ بس انکار۔

دلیل چاہے کتنی بھی مضبوط ہو، رب کے سامنے کیا حیثیت رکھتی ہے! بس انکار، لیکن انکار اپنے نفس کو خوش کرنے کیلئے نہیں، نفس کو خوش کرنے کیلئے انکار انکار بلیس ہے۔ اپنے رب کیلئے انکار..... یہی ہے اصل اور کچھ نہیں۔ نہیں مانیں گے کسی کی بھی۔ کسی طاقت کی، کسی بھی نظامِ باطل کی..... نہیں مانیں گے چاہے لاکھ دلیلیں دو۔ بس مانیں گے تو صرف ربِ اعلیٰ کی، بس اسی کی اور کسی کی بھی نہیں۔ یہی توحید ہے اور ہے کیا توحید!

میرا دین تو شروع ہی انکار سے ہوتا ہے یعنی لاسے۔ پہلے انکار کی منزل ہے پھر تسلیم کی۔ میں انکار کیے بغیر تسلیم کیسے کر سکتا ہوں! اگر میں انکار نہ کروں اور تسلیم بھی کروں تو یہ منافقت ہے، کھلا تضاد ہے جو قابل قبول نہیں۔ ملاوٹ نہیں خالص درکار ہے بالکل خالص..... چاہے ذرہ ہی ہو۔ ملاوٹ شدہ پہاڑ درکار نہیں ہے۔ یہی ہے اخلاص اور کیا ہے!

توحید تو یہ ہے کہ خدا خود حشر میں کہہ دے

یہ بندہ دُعا عالم سے خفا میرے لئے ہے

انکار روحِ اسلام ہے۔ انکار روحِ حسینیت ہے۔ انکار..... جا، نہیں مانیں گے۔ تمہارے دھوکے تمہیں مبارک، ہمارا سچ ہمیں۔ انکار لکھنے میں بہت آسان ہے۔ پنج حرفی لفظ بہت آسان ہے لکھنا، کرنا بہت مشکل ہے۔ جان لیوا ہے، بہت نقصان دہ، بہت قربانی چاہتا ہے۔ خود سے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ ساتھ اپنا انکار بھی، نہیں اپنی بھی نہیں مانوں گا۔ بہت مشکل ہے یہ بہت کٹھن منزل۔ معرکہ خیر و شر کیا ہے؟ معرکہ حق و باطل کیا ہے؟ یہی تو ہے، حق کا دینا خیر، باطل کا ساتھ دینا شر۔ رب کے سامنے تسلیم خیر اور ابلیس کا پیر و کار بننا شر۔ معرکہ خیر و شر یہی ہے۔ بس یہی ہے۔ پورے عالم میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ ہوتا رہے گا۔ نہیں رکے گا یہ معرکہ۔ کر بلا کا درس کیا ہے؟ جنگ بدر کیا ہے؟ معرکہ احد میں دندانِ مبارک شہید ہو گئے، چچا حمزہ کے ٹکڑے کر دیئے گئے، بلک بلک کر رو دیئے لیکن سر تشکر سے جھک گئے کہ یہی اللہ کی مرضی، جہاد کیا ہے؟ یہی ہے بس۔ سب کا درس ایک ہے: بس انکار۔ انکار کرو تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ خاندانِ ثار کرنا پڑتا ہے۔ سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ آگ و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ خاک آلود ہونا پڑتا ہے۔ اپنی خواہشات کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ تیز دھار پر سے گزرنا پڑتا ہے۔ لاشے اٹھانے پڑتے ہیں۔ جب شعور کے ساتھ انکار ہو تو ہر لاشہ اٹھاتے ہوئے یقین بڑھتا ہے۔ چنگلی آتی ہے۔ ربِّ اعلیٰ کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

انکار جتنی شدت اختیار کرتا چلا جائے انقلاب اسی شدت سے نمودار ہوتا ہے اور پھر ہمارا مسئلہ نتائج نہیں کارزارِ خیر و شر میں اپنا کام سرانجام دینا ہے۔ ایسے ویسے چونکہ چنانچہ لیکن و یکن نہیں، یکسر انکار۔ رب پر کامل یقین کے ساتھ باطل کا انکار۔ طاغوت کا انکار۔ خون رنگ لاتا ہے، پھر انقلاب آتا ہے۔ کب رکا تھا معرکہ حق و باطل! نہیں رکے گا یہ معرکہ خیر و شر۔ بس غالب وہی رہیں گے جو اپنے رب کے ساتھ جڑے رہیں گے۔ پورے یقین کے ساتھ، پوری سرشاری کے ساتھ۔ انکار روحِ دین ہے، باطل کا انکار۔ طاغوت کی ہر شکل کا انکار، یکسر انکار کوئی مصالحت نہیں، بالکل بھی نہیں۔ قربانی ہی قربانی، سرشاری ہی سرشاری!

سرشاری اسے ہی کہتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے لاشے اٹھانا اور پھر آوازِ بلند سے رب کی کبریائی بیان کرنا۔ یہی ہے دین، اور ہے ہی کیا! اسے کہتے ہیں اپنی نذر پوری کرنا۔ اپنے دعوے کی صداقت کو مجسم کر دینا لیکن یہ ہے بہت مشکل، توفیق پر ہے یہ۔ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا اور رب سے التجا کرنا کہ قبول کر لیجیے ہماری قربانی اور پھر یقین کی منزل پر پہنچ کر پکارنا: **قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ**، کہہ دو بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے۔ "رب کیلئے خالص۔ باطل ہمیشہ سے گھمنڈی ہوتا ہے، دوھوکے کا شکار!

انتہائی واجب الاحترام دوستوں، بھائیوں! اس ساری تمہید کے بعد جس پر عزم شخصیت کا چہرہ مبارک نظر آتا ہے تو بے اختیار دل سے ان کا نام نامی مصوّر

پاکستان جناب علامہ اقبالؒ کا نکلتا ہے جن کو خراج تحسین پیش کرنے کیلئے ہم سب آج یہاں موجود ہیں۔ میں کس منہ سے اپنے اس مرشد کا شکر یہ ادا کروں، جن کا کلام ہمیشہ مشکل وقت میں بھولا ہوا سبق یاد دل دیتا ہے۔ جب بھی دل بہت بے چین ہوتا ہے تو ان کے کلام و فرمودات سے ہمیشہ کی طرح دانش و حکمت کے ایسے موتی جھڑتے ہیں کہ اداس روح تک سرشار ہو جاتی ہے اور ہر مرتبہ تنگ دامن کا معاملہ بھی آن کھڑا ہوتا ہے۔ اب منوں مٹی تلے بادشاہی مسجد اور لاہور قلعہ کے وسط میں اللہ کے ہاں اپنی دائمی منزل پر اپنی وفاداریوں کے صلے میں یقیناً جنت میں بیٹھے اپنی جاودانی کامیابی پر مسرور ہوں گے۔

مجھے جب میرے بہت ہی محترم برادر م جناب حافظ عبد الباسط صاحب نے اس اہم کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی، کوئٹہ کے اس سرد موسم میں جناب حضرت علامہ اقبالؒ سے محبت کرنے والے اقبال شناسوں کے جمع ہونے کی نوید سنائی گئی، بتایا گیا کہ صدی کے اس نامور مجاہد آزادی کے اس وژن کو دوبارہ دہرانے کا تذکرہ ہو گا تو یقین کریں کہ ایک عرصے کے بعد پھوٹی سحر اچھی لگی، صبح نور کی تازگی دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی، اور سجدہ شکر ادا کیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ روح کا سارا آلام دھل گیا ہے اور اب روٹھے ہوئے الفاظ ایک دفعہ پھر ایک قطار میں مسکراتے کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں، پھر سے ہمد، ہمدرد اور غمگسار، بڑھ کر گلے ملنے کیلئے متمنی، جو نہی میرے بیانے نے محبت سے بازو پھیلائے فوراً بغیر کسی تاخیر کے برچھی کی طرح سینے میں اتر گئے کہ آج اقبالؒ کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اور کیوں آج اقبالؒ پر ایسے گھناؤنے اور بے ہودہ الزامات لگانے کی جسارت ہو رہی ہے۔

علامہ اقبال جنہوں نے اس کارزار میں قدم رکھنے سے قبل اپنے رب سے یہ عہد کیا: قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَ نُسُكِيْ وَ مَحْيَايَ وَ مَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبادت، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ برصغیر کی تقسیم جیسی زمینی حقیقت کے بعد اب تاریخ کو جھٹلانے یا ان حقیقی خاکوں میں جھوٹ و بدینتی کا رنگ بھر کر تاریخی واقعات کی شکل بگاڑ کر نئی نسل کو گمراہ کر کے اقبالؒ سے بدظن کرنے کی کوشش ایسے ہی ہے جیسے چاند پر تھوکا واپس اپنے منہ پر گرتا ہے۔ 78 سال گزرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر اقبالؒ پر نہرو کے اس بے جا الزام کو کیوں دہرایا جا رہا ہے کہ "اقبالؒ اپنی زندگی کے آخری دور میں سوشلزم کے زیر اثر تصور پاکستان سے دستبردار ہو گئے تھے"۔ کیا ان الزامات سے زمینی حقائق بدل سکتے ہیں کہ دوبارہ ایسا اکھنڈ بھارت قائم جائے جہاں ہر روز کشمیر اور گجرات جیسی قیامتیں مسلمانوں پر ڈھائی جائیں!

اقبالؒ جنہوں نے پاکستان جیسی ریاست کا خواب دیکھا، ان کو اس الزام میں آخر کیوں ملوث کیا جا رہا ہے؟ اور آج بالخصوص ممی کی جنگ میں بدترین ہزیمت اٹھانے کے بعد بھارت میں ایسا بے ڈھنگا راگ کیوں سنائی دے رہا ہے؟ پھر بھارتی بہارا انتخابات سے قبل تو اتر سے اس جھوٹ کو پھیلانے کی کیا وجہ ہے کہ سرحد پارٹی وی پر بیٹھے دانشوروں کی سڑاند بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ آئیے تاریخ کے جھروکوں سے حقائق کی دنیا میں جھانکتے ہیں:

آج کا زمانہ وہ ہے جب امت مسلمہ کی وحدت شیرازے کی طرح بکھر چکی ہے۔ طاقت کے مراکز مغرب کے ہاتھ میں، ذرائع ابلاغ اور معیشت کے اعصاب عالمی سرمایہ داروں کے قبضے میں، اور سیاسی فیصلے سامراجی ایجنڈوں کے تابع ہیں۔ پاکستان، جو اسلام کی پہلی ایٹمی قوت ہے، اس کے خلاف ایک منظم بین الاقوامی منصوبہ بندی جاری ہے۔ اسرائیلی وزیراعظم نیتن یاہو بارہا اپنے بیانات میں پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو ختم کرنے کی خواہش ظاہر کر چکا



ہے۔

لیکن یہاں اقبالؒ کا پیغام خودی ہمیں راستہ دکھاتا ہے۔ لیکن اقبالؒ کی نگاہ میں قوموں کی قوت نہ توپ و تفنگ سے آتی ہے، نہ معاہدوں سے، بلکہ ایمان کی حرارت اور خودی کی بلندی سے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر مسلمان اپنی خودی پہچان لے، تو دنیا کی کوئی طاقت اسے محکوم نہیں بنا سکتی۔

اقبالؒ کا یہ فلسفہ دراصل خوف کے مقابلے میں ایمان کی جرات ہے۔ آج جب عالمی طاقتیں پاکستان کو اس کی قوتِ دفاع سے محروم کرنے کے منصوبے بناتی ہیں، تو ہمیں اقبالؒ کے اس پیغام کو عملی صورت دینا ہوگی کہ خودی ایمان کا ہتھیار ہے اور ایمان کسی ایسی طاقت سے زیادہ موثر قوت ہے۔ اقبالؒ نے فرمایا تھا

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

یہی وہ ولولہ ہے جو پاکستان کو ناقابلِ تسخیر بنا سکتا ہے۔

حالیہ ایام میں برصغیر کی تاریخ نے ایک اور بھڑکتی ہوئی داستان رقم کی۔ مئی 2025 کی پاک بھارت جنگ، جس میں بھارت کو اسرائیلی پشت پناہی حاصل تھی، اس کی خاکستر میں کئی حقیقتیں چھپی ہیں۔ بھارت کو نہ صرف فوجی سطح پر ہزیمت ہوئی بلکہ اس کے عسکری غرور نے اس کی سیاست کو بھی کمزور کر دیا۔ تاہم، امن کے نام پر امریکا کی ثالثی سے جنگ بندی ہوئی، اور اب مودی حکومت ایک بار پھر سر کریک کے محاذ پر جنگی مشقوں کے ذریعے نفسیاتی دباؤ قائم کرنا چاہتی ہے۔ اس تناظر میں بلوچستان، جو پاکستان کی جغرافیائی ریڑھ کی ہڈی ہے، خاص طور پر استقامت و بیداری کا متقاضی ہے۔

مئی 2025 کی پاک-بھارت جنگ کے بعد بلوچستان کے نوجوانوں سے اقبالؒ کا یہ اہم پیغام ضرور پہنچانا چاہتا ہوں کہ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بلوچ قوم میں غیرت، حمیت، اور قربانی کا وصف ازل سے موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اقبالؒ کے فلسفہ خودی کو بلوچ نسلوں کے ذہن و

کردار میں پیوست کیا جائے۔ اقبالؒ کا مردِ مومن وہ ہے جو طاقت کو امانت اور قوم کو ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ دشمن کے حملے سے نہیں ڈرتا، بلکہ اپنے

ایمان کی قوت سے مقابلہ کرتا ہے۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق

جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

آج پاکستان کے خلاف بھارتی عزائم کے مقابلے میں ہمیں سیاسی شعور، فکری اتحاد، اور قومی خود اعتمادی کی ضرورت ہے۔ وہی تین عناصر جو اقبالؒ کے

فلسفہ حیات کی بنیاد ہیں۔ بلوچستان کے لیے اقبالؒ کا پیغام یہی ہے کہ یہ خطہ محض معدنی خزان کا گہوارہ نہیں، بلکہ اسلامی غیرت، دفاعی شعور، اور فکری

استقلال کی علامت ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک قومیں تنہی زندہ رہتی ہیں جب ان کے دلوں میں دین کی حرارت زندہ ہو۔

نائن ایون کے بعد کی دنیا میں پاکستان کے سامنے ایک نئی آزمائش کھڑی کی گئی۔ پرویز مشرف کے دور میں امریکا نے دھمکی دی: ہمارا ساتھ دو ورنہ تمہیں پتھر کے دور میں پہنچا دیں گے۔ پاکستان نے مجبوری میں اس جنگ میں شمولیت اختیار کی، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان خود میدان جنگ بن گیا، امریکا نے انڈیا کو سول ایٹی معاہدہ دے کر نوازا، اور افغانستان میں اسے دہشت گردی کی راہداری فراہم کی۔ جو طالبان کل سوویت یونین کے خلاف مزاحمت کے ہیرو تھے، انہی کو پاکستان کے خلاف استعمال کیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اقبالؒ کی فکرِ نشاۃ ثانیہ ہمیں ایک نئی سمت دکھا سکتی تھی، وہی فکر جو کہتی ہے کہ اسلام کی بقا اخوت، خودداری، اور اتحادِ ملت میں ہے، نہ کہ مغرب کی خوشنودی میں۔

ایک نظم میں اقبالؒ افغان عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو جاننے کے لیے اپنی سر زمین اور سر زمین میں تلاش کریں:

قیمت شمشاد خود نشا ختی

سرود گیر ابلند انداختی

مثل نی خود دراز خود کردی تھی

برنوائی دیگر ان دل می نمی

ای گدا ای ریزہ ای از خوان غیر

جنس خود می جویی از دکان غیر

تجھے اپنی ہی لکڑی کی قیمت معلوم نہیں تھی، تو نے دوسرے کا دیودار اٹھایا۔ اپنے سرکنڈوں کی طرح تم نے بھی اپنا دل دوسروں کی موسیقی پر خالی کر دیا ہے۔ تم ایک معمولی بھکاری ہو، مختلف قسم کی دکان سے کھانا مانگتے ہو۔

یہی اقبالؒ کا نوحہ ہے اور یہی ان کی پکار کہ مسلمان اگر اپنی روحانی خودی کو فراموش کر دے تو سیاسی خود مختاری بھی مٹ جاتی ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبالؒ کے تصورِ امت کو اپنی خارجہ پالیسی، تعلیمی نظام، اور سماجی اصلاحات میں سمودیں۔ اقبالؒ کا نشاۃ ثانیہ دراصل اسلامی شعور کی از سر نو بیداری ہے جہاں انسان صرف ریاست کا شہری نہیں، بلکہ امت کا سپاہی ہوتا ہے۔

بلوچستان، جو افغانستان کے دروازے پر ہے، اسی فکری جدوجہد کا محوری خطہ بن سکتا ہے۔ اگر یہاں کے نوجوان اقبالؒ کے اس پیغام کو سمجھ لیں کہ اسلام کہ اسلام صرف عبادت نہیں، بلکہ عمل، عدل، اور قیادت کا نام ہے۔ علامہ اقبالؒ کا خواب صرف ماضی کی داستان نہیں، بلکہ مستقبل کی راہ ہے۔ انہوں نے جس نشاۃ ثانیہ کا خواب دیکھا، وہ اب بھی ہم سے مخاطب ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک امتِ مسلمہ کی نجات قرآن کی طرف رجوع، خودی کی بیداری، اور اتحادِ ملت میں ہے۔ اگر ہم خودی کی حفاظت کرنا سیکھ لیں تو عالم رنگ و بو میں ہماری داستان کسی اور رنگ سے سنائی جائے گی۔ آج جب عالمی طاقتیں پاکستان کے گرد حصار بن رہی ہیں، بلوچستان میں فتنہ و انتشار کے بیج بو رہی ہیں، اور امتِ مسلمہ کو قومی، لسانی، اور فکری بنیادوں پر تقسیم کر رہی ہیں، تو ہمیں اقبالؒ کی آواز پر لبیک کہنا ہو گا کہ مومن اپنی تقدیر کا خود خالق ہے، اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ اسی دن شروع ہوگی جب امت اپنی خودی کو پہچان لے گی۔

مجھے بطور ایک کشمیری نژاد پاکستانی کو اپنے قائد کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں جہاں انہوں نے جس کشمیر کو پاکستان کی شہرہ رگ قرار دیا تھا، اور مجھے افغانستان کے ملا عمر کے بھی وہ الفاظ یاد آرہے ہیں جو انہوں نے پاکستانی وفد کے استقبال میں کہے تھے: کہ ہم افغان قیامت تک پاکستان کے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتے، آپ کا جہاں پسینہ گرے گا وہاں ہمارا خون بہے گا۔ اس کے علاوہ انہوں نے مقبوضہ کشمیر کے مجبور و مقہور بھائیوں کو بھی یہ پیغام دیا تھا کہ ہم جلد آپ کو ہندو کے ظلم و ستم سے آزادی دلوانے کیلئے آئیں گے کہ یہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ اس وقت ملا ہیبت 20 سال کا نوجوان اور ان کا بیٹا ملا یعقوب، افغانستان کا وزیر دفاع 5 سال کی عمر میں اپنے والد کے اس خطاب کی گونج کو کیسے بھلا سکیں گے؟

اس بے حسی کو دیکھتے ہوئے مجھے تاریخ کا اہم واقعہ یاد آرہا ہے، عبرت کیلئے دہرا ناچا ہوتا ہوں:

اندلس کا جلیل القدر حکمران درباریوں کے ساتھ نو تعمیر محل میں نمودار ہوا جس میں سونے کا قبہ جگمگا رہا تھا۔ جب دوسرے داد دے چکے تو قاضی سعید کی طرف متوجہ ہوا "بادشاہ تم پر شیطان سوار ہے قاضی نے کہا کہ سونے سے عمارتیں نہیں بنائی جاتی" آسمان اور زمین کے درمیان ایک سناٹا تھا اور دل تھے جو خوف اور اندیشوں سے دھڑک رہے تھے۔ جب بادشاہ کی آواز ابھری "سعید کو لوگ بے سبب ہسپانیہ کا ضمیر نہیں کہتے، قبہ گرا دیا جائے۔"

مجھے ایک اور بہت ہی اہم واقعہ یاد آگیا: جب کوفہ ایک بار پھر فتح ہونے پر مختار ثقفی کا سر کاٹ کر مصعب ابن زبیر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے فرمان جاری کیا کہ جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ دربار میں بیٹھا ایک بوڑھا مسکرایا تو مصعب نے انتہائی غصے سے دریافت کیا: کیوں ہنستا ہے بڑھے؟ اس بوڑھے نے کہا: ماضی یاد آگیا، حال سامنے ہے، مستقبل آدھا دکھائی دے رہا ہے۔ مصعب نے حکم دیا کہ تفصیل سے بتاؤ۔ بوڑھے شخص نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا: کیا تم سن سکو گے؟ اگر ہمت ہے تو غور سے سنو: یہی دربار تھا۔ عبید اللہ ابن زیاد تخت پر بیٹھا تھا۔ حسین ابن علی کا سر لایا گیا۔ ابن زیاد نے کہا جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم نے جشن منایا۔ ایک بار پھر یہی دربار تھا، جس مختار ثقفی کا سر تیرے قدموں میں پڑا ہے، یہ اسی تخت پر بیٹھا تھا جہاں اس وقت تو بیٹھا ہوا ہے۔ ابن زیاد کا سر کاٹ کر لایا گیا تو مختار ثقفی نے فرمان جاری کیا، جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم نے جشن منایا۔ آج وہی دربار ہے اور اسی تخت پر تو براجمان ہے۔ مختار ثقفی کا سر لایا گیا ہے، تیرا حکم ہے جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا۔ ہم آج بھی جشن منائیں گے۔ کل بھی یہی دربار ہوگا، یہ تو نہیں جانتا کہ تخت پر کون بیٹھا ہوگا لیکن اتنا پتہ ہے کہ سر تیرا ہوگا اور فرمان جاری کیا جائے گا، جشن مناؤ، دشمن اسلام مارا گیا اور ہم جشن منائیں گے۔

بوڑھے کی پیشگوئی کے عین مطابق کوفہ کے دربار میں عبدالملک بن مروان کے سامنے مصعب بن زبیر کا سر پیش کیا گیا اور اس نے جشن منانے کا حکم دیا۔ کسی نے بوڑھے کی بات کا عبدالملک بن مروان کے سامنے ذکر کیا تو عبدالملک بن مروان نے فوراً دربار کی عمارت کو گرانے اور دربار کو کوفہ کے کسی دور دراز علاقے میں تعمیر کرنے کا حکم دے دیا۔ اب اگلا جشن بھی ہوگا، سب کو معلوم ہے لیکن اگلی بار "سر" کس کا ہوگا لیکن یہ پتہ نہیں، کب اور کیوں؟

تو کیا ہم بحیثیت قوم چاہے کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے ہوں، صرف جشن مناتے رہیں گے؟ کیا ہم سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اگر رکھتے ہیں تو پھر سوچتے کیوں نہیں؟ اندھی تقلید کوئی ہم سے سیکھے؟ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں چوری اور کرپشن پر کوئی اعتراض نہیں، بس چور اور کرپٹ ہماری مرضی کا ہو۔ لگتا ہے کہ اس قوم کو اب کسی عبدالملک کی تلاش ہے جو اس عمارت کو گرا کر نئی عمارت کی تعمیر کا حکم دے یعنی موجودہ نظام کو مکمل طور پر تبدیل کر دے گا۔ یقین کیجئے کہ جس دن ہم نے علامہ اقبال کی تعلیمات پر خلوص دل سے عمل کرنے کی ٹھان لی تو صرف بلوچستان ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں ایک انقلاب آجائے گا، ان شاء اللہ

پاکستان میں جاری سیاست کا جو تماشا جاری ہے، اس کا انجام بھی شاندار کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ سیاسی ایوانوں میں کیا ہوتا ہے؟ عدلیہ کے فیصلے کس طرح ہوتے ہیں؟ کل کلاں کیا ہو گا، یہ تو وقت ہی فیصلہ کرے گا لیکن میں یہاں آپ کو اپنے ہاں کی ایک مثال دیکر بیرون ملک پاکستانیوں کے دل کی ترجمانی کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کا ایک عام رواج ہے کہ اگر بہو کسی طاقتور خاندان یا قبیلے سے ہو تو وہ اپنے سسرال میں بڑی عزت اور راحت اور رعب و دبدبے کے ساتھ زندگی گزارتی ہے کیونکہ سسرال والوں کو اس کے خاندان کی طاقت کا بھرپور احساس ہوتا ہے اور وہ اس بچی کے ناروا سلوک کے سامنے بھی خاموش رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں لیکن اگر وہ بہو کمزور اور بے بس کی بیٹی ہو تو اس کے گریہ و ہستی کے تمام گن بھی اس کے عیوب بنا کر اسے کمتری کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ یقین کریں کہ بیرون ملک رہنے والے بھی آپ کی ان بچیوں جیسے ہیں، اگر آپ یہاں مضبوط ہوں گے تو ہماری عزت میں وہاں اضافہ ہو گا اور اگر آپ یہاں کمزور ہیں تو اس دنیا میں کمزور کیلئے اب کوئی جگہ نہیں بچی۔

مجھے آپ اجازت دیں کہ میں یہاں قائد اعظم محمد علی جناحؒ کے وہ الفاظ دہرا دوں جو انہوں نے حضرت اقبالؒ کے متعلق فرمائے:

شعراء اقوام میں جان پیدا کرتے ہیں، ملٹن، شیکسپیر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمات کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے۔ اسے جب شیکسپیر اور دولت برطانیہ میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا "میں شیکسپیر پر کسی قیمت نہیں دوں گا۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے، لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اگر اقبال اور سلطنت میں کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آجائے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا۔ جناب مرشد! آپ تو اپنے کردار اور عمل کے ساتھ جاوداں ہو گئے اور اپنے پیچھے آنے والوں کو ایک ایسا راستہ دکھا گئے جہاں جان بھی چلی جائے تو یہ سودہ مہنگا نہیں۔ جناب حکیم الامت! آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ کا تذکرہ ہمیشہ ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلاتا رہے گا۔

میں آپ سب دوستوں اور بھائیوں کا بہت ممنون ہوں کہ آپ نے بڑے صبر سے میری اس ساری گفتگو کو سنا۔ یقین کریں کہ میرے لئے آج کے لمحات اس لئے بہت مشکل اور حد درجہ جذباتی تھے کہ مجھے اس عظیم المرتبت مہمان ہستی علامہ اقبالؒ کے متعلق آپ دوستوں سے سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان کے حق میں ہماری گواہی قبول فرمائے۔۔۔ اللھم آمین۔۔۔

سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ۔

(تمیز نوٹرسٹ کوئٹہ بلوچستان کے زیر اہتمام تین روزہ عالمی اقبال کانفرنس میں 18 نومبر 2025ء کو صدارتی خطاب)

آج کے دور میں پاکستانی خواتین کے لیے علامہ اقبال کا پیغام

— عالمی کانفرنس برائے فکرِ اقبال میں پیش کردہ لیکچر —

خواتین و حضرات، معزز اہل دانش، اربابِ فکر و فن، اور افکارِ اقبال کے والہانہ طالب علموں السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آج ہمارا موضوع نہ صرف فکری ہے، بلکہ عملی عملیت کا محور بھی ہے۔ مجھے اپنی آج کی گفتگو میں "آج کے دور میں بلوچستان کی خواتین کے لیے علامہ اقبال کا پیغام، اور ان کا پاکستان-بلوچستان کی ترقی میں حصہ کی بابت اپنی معروضات پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں صرف اقبالِ فکر کی روشنی میں ایک مفصل تحقیقی جائزہ پیش کروں گا کہ بلوچستان کی معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حقیقتوں کی روشنی میں پاکستانی عورت، خصوصاً بلوچ عورت، اقبال کے تصور خودی اور تعمیرِ ملت میں کیسے فعالیت اختیار کر سکتی ہے۔

آج ہم ایک ایسے موضوع پر جمع ہیں جو بظاہر محض فکری نہ سہی، بلکہ ایک پوری تہذیب کی تشکیل اور ایک اُمت کے دستِ ہنر کی آزمائش رکھتا ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنا گویا تاریخ کے دروازوں پر دستک دینا، ادب کی رفعتوں میں سانس لینا، اور تہذیبی شعور کے آئینے میں اپنے آج کا جائزہ لینا ہے۔

اقبال، جنہیں ”برصغیر کی دھڑکن“ اور ملتِ اسلامیہ کے ”دیدہ بینا“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، محض شاعر نہیں۔ ایک تہذیبی محرک، ایک فکری معمار، اور ایک خودی کی شمع ہیں جو زمانوں تک اپنے نور سے نسلوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ صورتِ اقبال میں عورت صرف گھر کی زینت نہیں، بلکہ خودی کی وہ شمع ہے جو قوم کی تقدیر روشن کرتی ہے۔ اقبال نے عورت میں خودی کی وہ قوت دیکھی ہے جو نہ صرف اس کی ذاتی شناخت کو مستحکم کرتی ہے بلکہ اس کے ذریعے گھر، اجتماع، اور ملت کی تعمیر ممکن ہوتی ہے۔ وہ عورت کو تربیت کا واسطہ سمجھتے ہیں، چاہے دینی تربیت ہو، اخلاقی ہو یا فکری، تاکہ وہ ایک زندہ، باشعور اور باوقار شخصیت بن کر سامنے آئے۔

اگر تمثیلات کی زبان اپنائیں تو ایسے کہا جاسکتا ہے کہ اقبال عورت کو ”ذاتِ مطہر کے باغ میں کھلنے والا مہتاب“ سمجھتے ہیں، وہ روشنی ہے، نرم ہے مگر محیط ہے، نہ صرف گھر کی محافل کو سنوارتی ہے بلکہ اجتماعی فضا کو معطر کرتی ہے۔ اسی طرح فکری و ادبی اسلوب میں، عورت کا تصور وہ ”آفتابِ استعارہ“ ہے جو روشنی پھیلاتا ہے اور خودی کی کرن بن کر قوم کے اندر امید جگاتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں عورت کوئی حاشیہ نہیں، بلکہ پوری تمہید ہے؛ وہ ”نورِ بصیرت“ بھی ہے اور ”تابندہ ستارہ“ بھی۔ کبھی فاطمہ الزہراء کی صورت میں عفت و وقار کا مینار، تو کبھی بہادر خواتین اسلام کی مثال میں عزم و یقین کا استعارہ۔ اقبال نے عورت کو وہ مرتبہ دیا ہے جس میں تخلیق بھی ہے، تربیت

: بھی، اور تمدن کی بنیاد بھی۔ وہ فرماتے ہیں

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

یہ ایک جملے میں تہذیبی و سماجی حقیقت کا وہ خلاصہ ہے جسے فہم کی آنکھ نہ سمجھے تو زمانہ تاریک ہو جائے۔ عورت وہ چراغ ہے جس کی روشنی سے گھر، معاشرہ، قوم، سب جگمگاتے ہیں۔ لیکن اقبال کا عورت کا تصور محض گھریلو ذمہ داریوں کا بیان نہیں بلکہ شعورِ خودی کے ساتھ فعال، تعلیم یافتہ اور عزت نفس سے سرشار کردار کا نام ہے۔

اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی قومیں اٹھیں ہیں، ان کے پیچھے ایک تربیت یافتہ، باوقار اور روشن فکر نسل نسواں کھڑی رہی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جب عورت کا دامن بلند ہو، تو قوم کی پیشانی بھی اُجلی ہو جاتی ہے۔ اقبال بھی انہی تاریخی معنویتوں کے علمبردار ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ خواتین محض گھر کی زینت نہیں، قوم کی اُمید ہیں، محض فرد نہیں، ملت کا کردار ہیں۔ اسی لیے اقبال نے عورت کے مقام کو نبوی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا، وہ تعلیم جو عورت کو عزت دیتی ہے، شعور بخشتی ہے، اور اسے وہ ”خودی“ عطا کرتی ہے جس کے بغیر نہ فرد بنتا ہے اور نہ قوم۔

پاکستان محض ایک جغرافیہ نہ تھا۔ یہ ایک نظریہ تھا۔ اور اس نظریے کا معمار جسے ہم اقبال کے نام سے جانتے ہیں، عورت کو قومی تعمیر کی پہچان سمجھتے تھے۔ وہ ”ملتِ بیضا“ کی جس تصویر کا ذکر کرتے ہیں، اس میں خواتین کا کردار محوری ہے، حاشیہ نہیں۔ اسلام کا تصور عورت دراصل ”خاندانی نظام کی حفاظت“ اور ”سماجی ذمہ داریوں کے توازن“ کا نام ہے۔ عورت کو پابند کرنے کے لیے نہیں، باعزت بنانے کے لیے۔ پاکستان بھی اسی توازن کا نام ہے جہاں عورت تعلیم یافتہ ہو، بااخلاق ہو، باوقار ہو، اور معاشرتی تعمیر میں بھرپور معاون ہو۔

عصرِ حاضر کی پاکستانی عورت کئی محاذوں پر آزمائش سے دوچار ہے۔ ٹیکنالوجی کی برق رفتار یلغار، روایات کی بدلتی ہوئی قدریں، اقتصادی مشکلات، سماجی دباؤ، غلط فہمیاں، کمزور تعلیمی ڈھانچہ، یہ سب ہیں۔ مگر اقبال ان سب کا جواب ایک جملے میں دیتے ہیں: اندازِ فکر بدل دو، تقدیر بدل جائے گی۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ عورت ہمت سے کام لے، خود کو پہچانے، اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنی منزل کو اپنی محنت سے تراشے یہ پیغام محض شاعرانہ نہیں، عملی خاکہ ہے۔

اقبال نے عورت کے لیے سب سے پہلے ”تعلیم“ کی بات کی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عورت پڑھ جائے تو نسلِ تعلیم یافتہ ہو جاتی ہے۔ تعلیم عورت کو خود اعتماد بناتی ہے، باشعور کرتی ہے، اور گھر سے لے کر ریاست تک ہر سطح پر فیصلہ سازی میں اس کا کردار بڑھاتی ہے۔ تعلیم صرف دنیاوی نہیں، دینی بھی ہو۔ اقبال کے نزدیک عورت وہ ہے جو ایمان، حیا، وقار اور خودی کی امین ہو۔ یہ وہ قوت ہے جو معاشرے کو اخلاقی بنیادیں فراہم کرتی ہے۔

آج کی دنیا میں جہاں معاشی دباؤ موجود ہے، وہاں عورت کا معاشی کردار اہم ہو گیا ہے۔ اقبال معاشی سرگرمیوں کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ عورت کا کردار باوقار ہو، اس کی نسوانیت محفوظ رہے، اور اس کا عمل معاشرے کو سنوارتا چلے۔ اقبال نے عورت کو تربیتِ اولاد میں مرکزی کردار دیا۔ وہ جانتے تھے کہ بچے ماں کی گود میں وہی رنگ جذب کرتے ہیں جو قوم کی شخصیت بن جاتے ہیں۔ یہ وہ قیادت ہے جو قوموں کی تقدیریں رقم کرتی ہے۔

جدید ریاستیں نصف آبادی کے بغیر ترقی نہیں کر سکتیں۔ اقبال چاہتے تھے کہ عورت سیاست، پارلیمان، خارجہ پالیسی، سماجی اصلاح، اور قومی فلاح کے ہر میدان میں اپنی قابلیت دکھائے مگر اسلامی تہذیبی رہنمائی کے ساتھ۔ یہ توازن ہماری تاریخ کی شان بھی ہے اور ہمارا مستقبل بھی۔



اقبال کی شاعری میں ”خودی“ وہ چراغ ہے جو ظلمت کو ختم کرتی ہے۔ جب خودی عورت کے دل میں اترتی ہے تو وہ باوقار بنتی ہے، صاحبِ نظر بنتی ہے، صاحبِ کردار بنتی ہے، اور صاحبِ منزل بنتی ہے۔ آج کی پاکستانی عورت کے لیے یہ پیغام ہے کہ وہ خود کو معمولی نہ سمجھے۔ بلکہ وہ ایک ایسی مضبوط قوت ہے جو ہماری بنیاد کا اہم حصہ ہے اور وہ آئندہ نسلوں کی محافظ اور معمار ہے۔

عورت کے تہذیبی کردار کا ذکر کیا جائے تو عورت کی شخصیت میں ”آفتابِ معرفت“ اور ”مہتابِ محبت“ یکساں جھلکتا ہے۔ وہ گھر کی خاموش عبادت گاہ بھی ہے اور معاشرت کی روشن منڈیروں پر جلتا ہوا چراغ بھی۔ عورت قوم کی وہ آنکھ ہے۔ جو کھلی رہے تو قوم جاگتی رہتی ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی عورت قوم کی ”بصیرت“ ہے۔ اس کی تربیت، اس کا وقار، اس کا تہذیبی شعور، سب اسی سے وابستہ ہے۔ اور جہاں تک شائستگی عورت کی ادبی شناخت کا تعلق ہے تو عورت کی تحریر، اس کے کردار اور اس کی ادبی فطانت کا زمانہ معترف ہے۔ اور یہی باحیا عورت زبان کی پاکیزگی کی نگہبان ہے۔ اقبال اسی زبان کی لطافت میں عورت کو علمی اور تہذیبی وقار عطا کرتے ہیں۔ پاکستانی عورت کے لیے اقبال کا پیغام یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے فکری ورثے کی محافظ ہو کہ یہی اس کی اصل طاقت ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں عورت ”خاندان کی امین“ اور ”معاشرتی توازن“ کی روح ہے۔ عورت اگر سنور جائے تو معاشرہ سنور جاتا ہے۔ اقبال کا بھی یہی زاویہ ہے لیکن وہ عورت کی شخصیت میں ”تحریک“ اور ”فعال کردار“ کا اضافہ کرتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ عورت تہذیب کی روشنی، زبان کی پاکیزگی، اخلاقی مرکزیت کا درجہ رکھتی ہے اور اقبال تو عورت کو خودی کا آفتاب عطا کرتے ہیں۔ یہ چاروں زاویے مل کر پاکستانی عورت کے مستقبل کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آج کی بالعموم پاکستانی اور بالخصوص بلوچستان کی عورت اقبال سے کیسے رہنمائی لے؟

جب ہم افغانستان سے ملحق و سرزمین بلوچستان کی زمینی ٹھوس حقیقت کی طرف دیکھتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عورت کے لیے فکری اور فزیکلی دونوں سطح پر چیلنجز کم نہیں ہیں۔ بلوچستان کم خواندگی کی شرح والے صوبوں میں ہے۔ تازہ رپورٹ کے مطابق، صوبے میں خواتین کا خواندگی تناسب بہت کم ہے۔ رپورٹ بتاتی ہے کہ صوبے کی خواتین میں مجموعی خواندگی صرف ۲۶٪ کے قریب ہے اور دیہی علاقوں میں بہت سی خواتین تعلیم سے محروم ہیں۔ اسی رپورٹ کے مطابق ۷۰٪ لڑکیاں اسکول چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ وہ بنیاد ہے جہاں اقبال کا پیغام خودی اور باادب فکر اہمیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ فکری شعور اور خودی کی وہ قوت ہے جو تعلیم کے راستے کو نہ صرف کھول سکتی ہے بلکہ اس سے ایک مستقل پیمانہ قائم کر سکتی ہے۔

اسی طرح بلوچستان میں ملک کے اور صوبوں کی طرح ماں، بچے جیسے سماجی مسائل بھی ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک لاکھ بچوں کی ولادت کے موقع پر

298 ماہانہ خالقِ حقیقی سے جا ملتی ہیں۔ اسی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ کنٹرول برائے ولادت ضروریات کا ۳۸٪ حصہ پورا نہیں ہوا۔ سماجی ساخت میں اب بھی روایتی طاقتوں کا اثر ہے، اور عورتوں کو انصاف حاصل کرنے میں رکاوٹیں درپیش ہیں۔ رپورٹ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ گھریلو تشدد اور صنفی بنیاد پر تشدد کا مسئلہ نمایاں ہے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جو ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اقبال کی خودی صرف فکری نعرہ نہیں، بلکہ عملی شعور کی بنیاد ہے عورت کو خود ادراک اور خود وقار دیا جائے تاکہ وہ نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بنا سکے بلکہ اپنے خاندان اور معاشرے کو تحفظ فراہم کرے۔

تیسرا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ بلوچستان میں عورتوں کی سیاسی شمولیت اور شرکت نہ صرف محدود ہے بلکہ بہت کم نمائندگی پائی جاتی ہے۔ رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ خواتین کی سرکاری ملازمت اور بااثر عہدوں پر نمائندگی بہت کم ہے۔

BCSW رپورٹ کے مطابق، بلوچستان میں خواتین کے ووٹر ٹرن آؤٹ نسبتاً کم ہے (مثلاً ۷۴.۳٪) اور ان کی سیاسی سرگرمی محدود ہے۔ تاہم، صوبائی حکومت کی جانب سے کچھ مثبت اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں حال ہی میں ”ویمن اکنامک ایمپاورمنٹ فنڈ“ قائم کیا گیا ہے تاکہ ہنرمند خواتین کو قرضے دیے جائیں اور کاروبار کا موقع ملے۔ قانونی مدد فراہم کرنے کے لیے لیگل ایڈڈیک اور جینڈر ڈیسک قائم کیے گئے ہیں۔ یہ تمام پہلو یہ واضح کرتے ہیں کہ بلوچستان کی عورت ترقی کی راہ میں ایک اہم ستون ہے، لیکن اسے رکاوٹوں کی زنجیروں سے آزاد ہونے کی راہ بھی درکار ہے۔

اگر ہم علامہ اقبالؒ کے ادبی اسلوب کی بات کریں تو وہ ہمیں سبق ملتا ہے کہ عورت کو وہ عزت اور مقام دینا چاہیے جس سے اس کی شخصیت نکھرے اور اس کی خودی مستحکم ہو۔ ان کے کلام میں ہمیں فکری تمکنت اور تہذیبی آہنگ ملتی ہے، جو تصورِ خودی کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اگر میں امتیازی لفاظی اور تمثیلات کا ذکر کروں تو عورت کا مقام صرف مادی نہیں بلکہ فکری اور اخلاقی ہے۔ اقبالؒ عورت کی کردار سازی اور خدمات کو اسلامی اخلاق اور سماجی عدل کی رو سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبالؒ کے فکری امتزاج میں وہ روح ہے جو بلوچستان کی عورت کو نہ صرف ایک مقام دیتی ہے بلکہ اقبالؒ عورت کو ایک عظیم الشان ذمہ داری کا حق دیتا ہے اور تہذیبی بیداری، خودی کی قوت، اور تعمیرِ ملت میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔

ان مشکلات کے حل کیلئے ضروری ہے کہ ہماری خواتین اپنے ایمان کو مضبوط کریں۔ تعلیم کو زیور نہیں، سرمایہ سمجھیں۔ اپنی خودی کو پہچانیں۔ وہی آپ کی اصل طاقت ہے۔ اپنی صلاحیتیں قوم کی خدمت کے لیے بروئے کار لائیں۔ اپنی نسوانی عظمت کا تحفظ کریں، اسے کمزوری نہ سمجھیں۔ ٹیکنالوجی، سائنس اور نئی دنیا کے تقاضوں کو سمجھیں۔ گھر، معاشرہ اور قوم تینوں محاذوں پر توازن قائم رکھیں۔

خواتین و حضرات!

اقبالؒ کا پیغام ہمیں صرف ماضی کی شاعری کا خوبصورت گوشہ نہیں دیتا، بلکہ آج کے بلوچستان کو روشنی کی راہ دکھاتا ہے۔ بلوچستان کی عورت، اگر وہ خودی کی روشنی کو سمجھ لے، تعلیم سے مزین ہو، اور پیش رفت کی آبیاری میں اپنا حصہ ڈالے، تو وہ نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتی ہے بلکہ پورے صوبے اور پورے پاکستان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ یہ ہمارا مشترکہ فریضہ ہے۔ پالیسی سازوں، اہل علم، مذہبی رہنماؤں اور عوام عام کا۔ کہ ہم اقبالؒ کے اس پیغام کو حقیقت میں تبدیل کریں۔ بلوچ خواتین وہ نہ ختم ہونے والی روشنی ہیں جن کی خودی اور عزت ہمیں ایک بہتر، منصف اور ترقی پسند بلوچستان کی ضمانت دے سکتی ہے۔ پاکستان کا مستقبل صرف مردوں کے ہاتھ میں نہیں، یہ ماؤں کی گودوں میں، بیٹیوں کی امیدوں میں اور بہنوں کی دعاؤں میں بھی پوشیدہ ہے۔

اقبال کا پیغام یہ ہے کہ پاکستانی عورت باوقار ہو، باشعور ہو، بیدار ہو اور تعمیرِ ملت کی راہ میں اپنا کردار نبھائے۔ قوموں کی تعمیر میں عورت کی شرکت محض ایک سماجی تقاضا نہیں یہ تاریخ کا اصول ہے۔ اقبال نے کہا تھا:

اگر ہو عشق تو ہے کافر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

آج ہماری پاکستانی عورت کو اسی عشق — عشقِ وطن، عشقِ دین، عشقِ کردار اور عشقِ خودی — کی ضرورت ہے۔ تبھی پاکستان وہ بن سکے گا جو اقبال کا خواب تھا، روشن، مضبوط، وقار سے بھرپور، اور اپنی تہذیب کا امین۔

اللہ کرے کہ ہماری نسلِ نو کی خواتین اقبال کے پیغام کو سمجھیں، اسے اپنائیں، اور پاکستان کی پیشانی پر وہ روشن صبح لکھیں جس کا وعدہ تاریخِ امتِ مسلمہ نے کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس راہ پر اور مزید بیداری کی توفیق دے، تاکہ ہم نہ صرف خواب دیکھیں بلکہ انہیں حقیقت میں ڈھال سکیں۔
والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔

(تعمیر نوٹرسٹ کوئٹہ بلوچستان کے زیر اہتمام تین روزہ عالمی اقبال کانفرنس میں 19 نومبر 2025ء کو کالج طالبات اور اساتذہ کو خطاب)

بروز اتوار 2 جمادی الثانی 1447ھ 23 نومبر 2025ء

ہمالیہ کی گھاٹیوں سے فولادی بھائیوں تک

یہ تاریخ کا ایک نادر باب ہے کہ جہاں کل تک ہندی چینی بھائی بھائی کی صدائیں گونج رہی تھیں، آج وہاں تمام موسموں کے فولادی بھائیوں کی داستان رقم ہو چکی ہے۔ یہ محض سیاسی تقرب کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وقت کی سویوں کے ساتھ رواں بین الاقوامی مفادات، خطے کی حرکیات، اور عالمی قوتوں کی چالوں کا وہ پیچیدہ تانا بانا تھا، جس نے دوا لیسے ممالک کو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اکھڑا کیا، جو اپنے خمیر میں یکسر مختلف، مگر اپنے مقاصد میں ہم آہنگ ہو گئے۔

ہمالیہ کی گھاٹیوں سے فولادی بھائیوں تک اور ہندی۔ چینی بھائی چارے سے چین۔ پاکستان اشتراک کی داستان کا ایک ایسا آغاز ہوا جس نے آسمانوں کی بلندیوں اور وسعتوں، سمندروں کی گہرائی سے بھی کہیں زیادہ کی مثالیں سچ ثابت کر دیں۔

دنیا کی سیاست میں کچھ تعلقات ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر حالات کے جبر سے بنتے ہیں، مگر وقت انہیں ایسی پائیداری عطا کرتا ہے کہ وہ نسلوں تک نظیر بن جاتے ہیں۔ چین اور پاکستان کے درمیان موجودہ تعلق کو اگر فولادی بھائی چارہ کہا جائے تو اس کی بنیاد صرف مشترکہ مفادات پر نہیں بلکہ اُس تاریخ پر ہے جو مغرب کی بچھائی ہوئی سرحدی بساط، سامراجی میراث، اور سرد جنگ کی سفارتی دھند سے جنم لیتی ہے۔ 1950ء کی دہائی کے آغاز میں بیجنگ کا دل دہلی پر مائل تھا مگر اگلی دہائی کے آتے آتے یہ دیوانگی سرد پڑ گئی، اور پاکستان، جو اُس وقت امریکا کا قریبی اتحادی تھا، چین کیلئے ایک غیر متوقع مگر موزوں رفیق بن گیا۔

مابعد نوآبادیاتی عہد میں جہاں نئی ریاستیں اپنی شناخت کیلئے کوشاں تھیں، وہیں چین، ایک عظیم الشان انقلابی تحریک کے بعد 1949 میں عوامی جمہوریہ کے طور پر ابھرا۔ بیجنگ کی اولین ترجیحات میں بھارت نمایاں تھا۔ پچاس کی دہائی کے افق پر اگر چین کی نظریں محبت و مفاہمت کے آئینے میں کسی چہرے کو تلاش کر رہی تھیں تو وہ چہرہ بھارت کا تھا، جس کے ساتھ پنچ شیل کے اصول اور افہام و تفہیم کی نوید سنائی جا رہی تھی۔ کمیونزم کی نئی حکومت بیجنگ میں منصفہ شہود پر آئی، تو اس نے امریکا کے مخالف کیمپ سے خود کو جوڑنے کیلئے سوویت اثر و نفوذ کے سائے میں بھارت کو زیادہ قابل اعتبار شراکت دار پایا۔ اس وقت تک بھارت غیر وابستہ تحریک کا علمبردار اور سوویت روس کیلئے ایک قابل اعتماد توازن تصور ہوتا تھا۔ چین اور بھارت نے پنچ شیل معاہدے (1954) پر دستخط کیے اور دنیا نے ایک نئے بھائی چارے کا جشن منایا۔

اس وقت کے اخبارات، جلسے، اور پالیسی بیانات ”ہندی چینی بھائی بھائی“ کے نعروں سے گونج اٹھے۔ چین نے اپنی سفارتی زبان میں پہلی بار ”ایشیا کی مشترکہ تقدیر“ کا تصور پیش کیا، جس میں بھارت کو ایک فطری ساتھی کی حیثیت دی گئی لیکن اندرون خانہ خاموشی سے ایک اور کہانی لکھ رہی تھی۔ اکسائی چن اور ارونا چل پر دیش پرانی برطانوی لکیریں جھوٹے جغرافیائی خوابوں کی بنیاد بن چکی تھیں۔ چین کے نزدیک یہ خطے تاریخی طور پر تبت یا سنکیانگ کا حصہ تھے، جبکہ بھارت انہیں کشمیر اور اپنے شمال مشرقی صوبے کا لازمی جزو گردانتا رہا۔

اُس وقت پاکستان امریکا کی جھولی میں تھا، سیٹو اور سنٹو کا وفادار رکن، اور اس کی خارجہ پالیسی میں امریکا کا سایہ ایسا محیط تھا جیسے صحرائیں کہیں دور دھند میں لپٹا ہوا سراپ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جلد ہی یہ منظر نامہ بدلنے والا تھا جب دوست دشمن ہو جائے گا اور دشمن دوست بن جائے گا اور ایک خواب کی تعبیر اور تعبیر کی بربادی کا سفر اس طرح شروع ہو جائے گا کہ ہندی چینی بھائی بھائی کا نعرہ لگانے والے ”بغل میں چھری اور منہ میں رام رام کہنے“ والوں کا اصلی چہرہ سامنے آجائے گا۔

پرانے محاورے ہیں کہ ”دنیا کوئی تعلق ابدی نہیں“ اور ”سیاست میں مستقل دشمنی یا دوستی کوئی شے نہیں، صرف مفادات مستقل ہوتے ہیں۔“ یہی وہ اصول ہے جس پر آنے والی دہائی نے مہر تصدیق ثبت کی۔ ہندی-چینی دوستی کی نرم چادر پر پہلی خراش 1959 کے بعد نمایاں ہوئی جب تبتی رہنما دلائی لاما نے بھارت میں پناہ لی۔ دلائی لاما کی بھارت میں پناہ گزینی، چین کیلئے سفارتی چوٹ تھی۔ اُس وقت چین کی قیادت نے محسوس کیا کہ جس بھارت کو وہ بھائی سمجھتا رہا، وہ درحقیقت اُس کے داخلی معاملات میں مداخلت کا مرتکب ہو منافق بن چکا ہے۔

اکسائی چین کا سرحدی تنازع، مکماہون لائن پر اختلاف، اروناچل پردیش پر چین کے دعوے—ان تمام قضیوں نے چین و بھارت تعلقات میں وہ دراڑ ڈالی جو اب بڑھتے ہوئے دیوار چین بن چکی ہے۔ اس کے بعد اچانک بھارت کی طرف سے سرحدی جھڑپیں معمول بن گئیں جو جلد ہی 1962 کی جنگ پر منبج ہوئی۔ اس مختصر مگر شدید جنگ نے ہندی-چینی بھائی چارے کی تدفین کر دی۔ اس جنگ نے جہاں نہ صرف برصغیر کے جغرافیائی توازن کو ہلا کر رکھ دیا، اور چین کے سیاسی مزاج کو بھی نئی جہت دی بلکہ ہمارے حکمران ایوب خان بھی امریکی دھوکے میں آکر پلیٹ میں پڑے کشمیر کو حاصل نہ کر سکے گویا ”لحوں کی خطا، صدیوں کی سزا“ میں تبدیل ہو گئی۔

یہی وہ ایک لمحہ تھا جب چین کو احساس ہوا کہ بھارت نہ صرف اس کے جغرافیائی مفادات کیلئے خطرہ بن چکا ہے بلکہ سرد جنگ کے تناظر میں امریکا سے بھی قریب ہوتا جا رہا ہے۔ یوں چین نے متبادل ساتھی کی تلاش میں پاکستان کی طرف رخ کیا۔ چین نے فیصلہ کر لیا کہ اگر بھارت غیر قابل اعتماد ہے، تو پاکستان، جس سے بھارت کی ازلی رقابت ہے، قابل غور دوست ہو سکتا ہے۔ اسی نکتے نے پاکستان اور چین دوستی کی سمت کا تعین کر دیا۔

یہاں سوال اٹھتا ہے کیا یہ دوستی چین کی پیش رفت تھی یا پاکستان کی سیاسی فہم و فراست کی بدولت؟ حقیقت یہ ہے کہ دونوں طرف سے یہ قربت تدریجاً، لیکن پختگی سے پروان چڑھی۔ پاکستان نے چین کو جلدی پہچان لیا—1951 میں پاکستان، چین کو تسلیم کرنے والا پہلا مسلم ملک بنا جس نے چین کو سفارتی طور پر تسلیم کیا تھا حالانکہ پاکستان سیٹو اور سنٹو جیسے امریکی معاہدوں کا رکن بننے کے باوجود، جنرل ایوب خان کی قیادت میں ایک ”متوازن خارجہ پالیسی“ کا آغاز ہوا، جس میں چین کو رفتہ رفتہ ایک اسٹریٹجک پارٹنر کے طور پر جگہ دی گئی۔ جلد ہی تجارت، ثقافت، سفارت، اور بالآخر عسکری و جغرافیائی اشتراک کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس کی گونج آج تک جاری ہے۔ اینڈریو سمال کی کتاب ”دی چائنہ پاکستان ایکسپریس، ایشیائی جیوپالیٹکس“ (چین پاکستان محور: ایشیا کی نئی جغرافیائی سیاست) میں یہی نکتہ اٹھایا گیا کہ 1950 کی دہائی میں بیجنگ کے خوابوں میں دہلی تھا لیکن حقیقت کی بیداری نے اسے اسلام آباد کی طرف مائل کر دیا۔

1963ء میں پاکستان اور چین کے درمیان سرحدی معاہدہ طے پایا، جس کے تحت پاکستان نے چین کو شکسگم ویلی (تقریباً 5,180 مربع کلومیٹر علاقہ) دیا، جو گلگت بلتستان اور سکیانگ کے درمیان واقع ہے۔ اس معاہدے نے جہاں چین کو ایک محفوظ زمینی راستہ فراہم کیا وہاں پاکستان کو ایک عظیم دوست طاقت کی قربت حاصل ہو گئی۔ گویا جہاں پاک چین اشتراک کی بنیادیں استوار ہونا شروع ہو گئیں وہاں یہ معاہدہ بھارت کیلئے چوکاٹ کا لگا ہوا تھا۔ اس وقت کی بھارتی حکومت نہ صرف اسے سفارتی جارحیت قرار دیا بلکہ پاکستان نے اس کو خطے میں ایک بڑی جغرافیائی تبدیلی کا آغاز بھی قرار دے دیا اور یوں انڈیا کیلئے پاک چین دوستی ایک مشترکہ دشمن قرار ٹھہری۔

1971 کے بعد اقوام متحدہ میں پاکستان نے چین کی نمائندگی کو تسلیم کروانے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ 1974 میں جب بھارت نے ایٹمی دھماکہ

کیا، چین نے نہ صرف اسے "عدم توازن" قرار دیا بلکہ پاکستان کے خدشات کو "جائز" کہا جس کے بعد چین نے پاکستان کے جوہری پروگرام کی بھی بالواسطہ معاونت کی۔

کشمیر—جہاں تین دیوتاؤں کے خواب ٹکراتے ہیں۔ کشمیر کا تنازع ہمیشہ پاکستان اور بھارت کے درمیان کشیدگی کی بنیاد سمجھا گیا لیکن جغرافیائی حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر اب ایک سہ فریقی الجھن بن چکا ہے اور اب چین بھی اس جھگڑے کا ایک اہم فریق بن چکا ہے۔ روئنگ شنگ گوؤ کے مطابق، کشمیر کا 45.62 فیصد حصہ بھارت، 35.15 فیصد پاکستان، اور 19.23 فیصد چین کے زیر انتظام ہے۔

میرامیکڈونلڈ اپنی کتاب "وائٹ ایز دی شراؤڈ" (کفن کی طرح سفید) میں لکھتی ہیں کہ آکسائی چین پر برطانوی سرحدی پالیسی کبھی واضح نہ تھی اور یہ خطہ برطانوی نقشوں میں بھی مبہم حیثیت رکھتا تھا۔ یہی ابہام آج بھی تینوں ممالک کے درمیان کشیدگی کا سبب ہے۔ میرامیکڈونلڈ اور روئنگ شنگ گوؤ جیسے ماہرین کی تحقیقات ہمیں بتاتی ہیں کہ کشمیر کا تنازع محض پاکستان اور بھارت تک محدود نہیں، بلکہ چین کی خطے میں موجودگی بھی اس کی جغرافیائی پیچیدگی کا لازمی حصہ ہے۔



چین کے قبضے میں موجود آکسائی چین، بھارت کے دعوے کے مطابق لداخ کا حصہ ہے۔ پاکستان کے زیر انتظام آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان، بھارت کے نقشے میں ابھی تک اس کے دعوے کا حصہ ہیں، جبکہ چین اروناچل پردیش کو 'تزانگنان'، یعنی جنوبی تبت کا حصہ گردانتا ہے۔ آئی ایس پی آر لیفٹیننٹ جنرل احمد شریف چودھری، اب کھلے عام کہتے ہیں کہ کشمیر "تین ملکوں"—بھارت، پاکستان، اور چین—کے درمیان ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے، جو مسئلہ فلسطین کی طرح عالمی ضمیر کی آزمائش بھی ہے اور اس اعتراف نے بین الاقوامی منظر نامے میں ایک نیازاویہ پیدا کر دیا ہے۔

19 ویں صدی میں جب برطانوی حکمران برصغیر میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے، اُن کی توجہ مشرقی سرحدوں کی بجائے تجارتی شاہراہوں اور داخلی اس قدرے سود محسوس ہوئیں کہ کئی متنازع خطوط—ارداغ—جانسن لائن، استحقاق پرمر کو زریہی—تبت، سنگیانگ اور لداخ کے بیچ کی بنجر وادیاں انہیں تو میکارٹنی—میکڈونلڈ لائن—تجویز ہوئیں، مگر بین الاقوامی حیثیت کبھی نہ پاسکیں۔ تاریخ کی دھند میں گم سرحدیں اپنا سراغ پانے کیلئے بے تاب ہو چکی ہیں

انگریزوں کی بے فکری اور سیاسی ابہام، ایک ایسی الجھی ہوئی میراث چھوڑ گئے جس کا خمیازہ آج تین ممالک بھگت رہے ہیں۔ چین، جس کی کمیونسٹ حکومت نے 1949 میں اقتدار سنبھالا، صاف کہہ چکی تھی کہ "ہمارے کسی عہدیدار نے کسی بھارتی نمائندے سے سرحد کا کوئی معاہدہ نہیں کیا، لہذا ہمارے لیے یہ لکیریں کاغذی حیثیت رکھتی ہیں۔"

جہاں مفادات باہم ہوں، وہاں نظریات پیچھے رہ جاتے ہیں۔ پاکستان اور چین کی دوستی کا آغاز نظریاتی ہم آہنگی سے نہیں ہوا بلکہ ایک ایسے سیاسی خلا میں ہوا جہاں بھارت کا سامراجی مزاج، امریکا کی محدود پالیسی اور سوویت یونین کا ابہام—تینوں نے راستہ ہموار کیا—یہ وہ دوستی تھی جو سیاست کی پگڈنڈی سے شروع ہو کر معیشت، دفاع، سفارت اور اب سی پیک جیسے بین الاقوامی منصوبوں تک جا پہنچی ہے۔ آج چین—پاکستان تعلقات سی پیک کی شکل میں

ایک نئی بلند ترین سطح پر پہنچ چکے ہیں۔ یہ 60 ارب ڈالر سے زائد کا منصوبہ، محض اقتصادی راہداری نہیں، بلکہ چین کی عالمی حکمت عملی بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کا مرکزی سنگ میل ہے۔ جو دنیا کا سب سے بڑا تجارتی اور تعمیراتی پراجیکٹ ہے جس پر ڈھائی ٹریلین ڈالر کی لاگت متوقع ہے اور یہ دنیا کے 52 ممالک کو ایک تجارتی لڑی میں پُر و کر رکھ دینے کا وہ پراجیکٹ ہے جس کا چین نے نہ صرف خواب دیکھا بلکہ عملی طور پر اس کی تعبیر کا فائدہ بھی اٹھانے کیلئے تیار ہے کہ اس نے برسوں پہلے یہ کہا تھا کہ دنیا کو طاقت سے نہیں بلکہ تجارتی دوستی کے ساتھ فتح کریں گے۔ پاکستان کیلئے بھی یہ اقتصادی بقاء، توانائی کا تسلسل اور علاقائی رسائی کا راستہ ہے، جبکہ چین کیلئے گوار سے خنجر اب تک کا زمینی راستہ، مشرق وسطیٰ اور افریقہ تک رسائی کی کلید ہے۔

تاریخ کا پیہر رکھنے والا نہیں، لیکن اس کے نشانات کبھی مٹتے نہیں۔ جو دوستی کبھی پنچ شیل کی بنیاد پر اٹھی تھی، وہ زمیں بوس ہوئی، اور جو مفاہمت، مفادات اور اخلاص کی فصل پر پروان چڑھی، وہ آج بھی قائم ہے۔ فولاد کی طرح مضبوط، اور موسموں کی طرح ہم آہنگ۔ ابتدا میں یہ سوال تھا کہ کیا چین نے پہل کی یا پاکستان نے؟ تو تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پہل ضرورت نے کی، قدم چین نے بڑھایا، اور دست تعاون پاکستان نے تھما۔ دشمن کا دشمن جب دوست بن جائے تو یہ سیاست کی سادہ حکمت کہلاتی ہے، مگر جب یہ دوستی دہائیوں تک قائم رہے، تو اسے تاریخ کی دانائی کہا جاتا ہے۔

چین اور پاکستان کا رشتہ اب مفادات سے کہیں آگے، نظریاتی ہم آہنگی اور جغرافیائی ہم نصیبی کا رشتہ بن چکا ہے۔ جس دوستی کی بنیاد سرحدی تبادلے پر رکھی گئی، آج وہ عالمی اسٹیج پر مشترکہ بیانیہ، دفاعی اشتراک، اور سفارتی ہم آہنگی میں ڈھل چکی ہے۔ اس طرح ایک نکتہ آغاز سے ایک نظریاتی ہم آہنگی تک کا یہ سفر فولادی دوستی میں تبدیل ہوا۔

اب سوال یہ ہے کہ اب اس خطے پاک چین دوستی نے مودی اور اس کے اتحادیوں کی رات کی نیندیں اور دن کا چین کیوں برباد کر دیا ہے؟ اس کی سب سے بڑی وجہ پہلے تو قوم پرست مودی اور آریس ایس کا وہ نظریہ ہے جو اکھنڈ بھارت بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں کہ جہاں جہاں بحر ہند کا ساحل لگتا ہے، وہ اکھنڈ بھارت کا حصہ ہے اور دوسری طرف گریٹر اسرائیل کا خواب جو اب ایک نقشے کی صورت میں نصف درجن مسلم مملکتوں کی سر زمین پر مشتمل ہو گا اور یہود و ہندو مملکتوں کی سرحدیں اپس میں مل جائیں گی اور سابقہ یہودی امریکی وزیر خارجہ سیکرٹری ہنری کیسنجر کا تخلیق کردہ ورلڈ آرڈر جیسا ناپاک منصوبہ معرض وجود میں آئے گا۔

یہ دنیا ہمیشہ سے طاقت کے ترازو میں تولی جاتی رہی ہے۔ کبھی سلطنتوں کے خیمے لہراتے تھے، اب کرسی کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ ماضی میں بھی بادشاہوں نے اپنی رعایا کو "جنت نشین" کہا، اور آج جمہوریت کے علم بردار انہیں "قوم پرست" کہہ کر جھانسنے دیتے ہیں۔ مگر کھیل وہی ہے، مہرے بدل گئے ہیں، چالیں باقی ہیں۔

"سیاست کا بازار آج بھی گرم ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ تلواروں کی جگہ اب ٹی وی اسکرینوں پر نعرے گونجتے ہیں۔" اب جنگ کا نیا چہرہ وجود میں آچکا ہے۔ بارود سے زیادہ بیانیہ کی گونج سنائی دے رہی ہے۔ مکار مودی نے اپنی راج نیت کو مستقل کرنے کیلئے ملکی میڈیا کو اپنے دام میں پھانسنے کیلئے ملکی خزانے کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ان کو خرید لیا ہے کہ اب یہ ساری دنیا میں "گودی میڈیا" (مودی کی گود میں) کے نام سے رسوا ہو رہا ہے۔

کہتے ہیں جنگ کبھی ختم نہیں ہوتی، صرف اس کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ آج کی جنگیں وہ نہیں رہیں جن میں سپاہی نیزے لیکر صف بندی کیا کرتے تھے۔ آج ہتھیار پہلے تیار ہوتے ہیں، پھر ان کیلئے محاذ تراشے جاتے ہیں۔ ہتھیاروں کی منڈی اب صرف میدان جنگ نہیں، سیاسی میدان کا آلہ بن چکی ہے۔ ملٹری

انڈسٹریل کمپلیکس، وہ آکٹوپس ہے جس کی ہر شاخ کسی نہ کسی قوم کے بٹ، کسی نہ کسی جوان کی جان، اور کسی نہ کسی ماں کے بیٹے سے چٹی ہوتی ہے۔ یہ جنگی مافیادہ درندہ ہے جو جنگ سے نہیں جیتا، جنگ کے نام پر جیتا ہے۔ میرے ایک انتہائی محترم انگریز دانشور دوست کا یہ فقرہ اکثر مجھے یاد رہتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور جنگی مافیہ ہے جس کی مرضی سے دنیا کی حکومتیں ٹوٹی اور قائم ہوتی ہیں۔

اگر سیاست کسی عظمت کا نام ہے تو پھر اسے جھوٹ کے کاندھوں پر کیوں سوار کیا جاتا ہے؟ مودی جیسے قائدین کیلئے "نیشنل ازم" ایک مقدس لبادہ ہے، جس کے نیچے وہ اپنے اقتدار کے ناپاک ارادوں کو چھپاتے ہیں۔ مکار ہندو سیاست کا گرو چانکیہ کی سیاست کا یہ پہلا اصول ہے کہ جب معاشی گراف نیچے جائے، تو جنگی گراف بلند کر دو۔ مودی اس کا بہت بڑا پیروکار ہے جو اسی اصول پر کام کرتے ہوئے اپنے اقتدار کو دوام دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ مودی جانتا ہے کہ بیروزگاری کے مارے ہوئے، تعلیم سے محروم، صحت سے مایوس لوگ اگر سوچنے لگیں، تو حکومت کے تانے بانے بکھر جائیں۔ اس لیے ان کے سامنے ایک نیا دشمن کھڑا کرو۔ کبھی پاکستان، کبھی چین، کبھی نیپال۔ بس دشمن رہے، تاکہ سوال نہ رہے۔

اسی لئے مودی اپنے سیاسی گرو چانکیہ کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے "آتش سیاست میں سلگتی جتنا کیلئے جنگ، اقتدار اور میڈیا کی سہ رخی تثلیث" کا بھرپور استعمال کر رہا ہے۔ اس نے ملک بھر کے میڈیا کو منہ مانگی قیمت پر خرید رکھا ہے اور جب بھی کوئی حکومتی کارکردگی پر سوال کرتا ہے تو یہ گودی میڈیا سوال کرنے والے کو غدار کہہ کر بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں:

جب کوئی نوجوان سوال کرے روزگار کہاں ہے؟ کوئی مائیں پوچھیں، ہسپتال کیوں خالی ہیں، کوئی مزدور فریاد کرے، روٹی کیوں مہنگی ہے؟ تو گودی میڈیا انہیں فوراً یاد دلاتا ہے ملک خطرے میں ہے! ملک بچے گا تو سب کچھ ملے گا۔

یہ میڈیا، جو کبھی خبر دیتا تھا، اب حکومت کی ترجمانی کرتا ہے۔ جنگی ترانے، حب الوطنی کے نعروں، اور مخالف آوازوں کو "غدار" کا تمغہ دینے والے ٹاک شوز اب سچ کے دروازے پر پہرہ دے رہے ہیں۔ سچ کہنے والوں کو "ٹکڑے ٹکڑے گینگ"، "شہریت کے غدار"، "یا" دلش دروہی" کہا جاتا ہے۔

جب کسی قوم کے پاس بھوک مٹانے کا وسیلہ نہ ہو، تو اسے قربانی کے جنگی گیت گانے پر لگا دو۔ "ہم بھوک پیاس برداشت کر لیں گے، مگر جھکیں گے نہیں!" — یہ نعرہ نہیں، مایوسی کا منشور ہے۔ مودی حکومت کہتی ہے، ملک رہے گا تو سب ہو گا مگر بھوک ننگی عوام کہتی ہے، ہم ہی نہیں ہیں۔ گویا مودی اپنے اقتدار کے دوام کیلئے اپنی جتنا کو قربانی کا نعرہ لگانے کیلئے مجبور کر رہا ہے لیکن عوام کی ٹھنڈے چولہے اب ایسے اقتدار کو آگ لگانے کیلئے بلبل رہے ہیں۔ قومی غیرت کا نعرہ خوبصورت ہے، مگر جب اس کی آڑ میں بنیادی حقوق کو کچلا جائے، تو یہ نعرہ ایک زنجیر بن جاتا ہے۔ یہ زنجیر عوام کے پاؤں میں، اور طاقت کے ایوانوں کی سیڑھی بن جاتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حکومت کی ذمہ داری صرف سرحدیں بچانا نہیں، انسانی حرمت، انصاف، تعلیم، صحت، اور معیشت کا قیام بھی ہے۔ قرآن ہمیں سکھاتا ہے:

"الَّذِي أَطْعَمَهُمْ مِنْ جُوعٍ وَ أَمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ"

(وہی رب جس نے انہیں بھوک سے نجات دی اور خوف سے امن دیا۔)

جب حکمران قوم کو نہ روٹی دے سکیں، نہ تحفظ، اور نہ سچ بولنے کی آزادی، تو وہ "حاکم" نہیں رہتے، بار امانت کے خائن بن جاتے ہیں۔

سیاست اگر خدمت ہے، تو سوالوں سے نہیں ڈرتی۔ اگر حکمرانی صداقت سے ہے، تو سچ بولنے والوں کو قید نہیں کیا جاتا۔ گودی میڈیا کا سہارا لیکر حکومت کو چلایا نہیں جاتا، یاد رکھیں! اگر حکومت نعرے سے چلتی ہے، تو پھر وہی قوم جھوٹ کا ایندھن بن جاتی ہے۔ عوام کو مہنگائی کے ہاتھوں بھوکا پیاسا رہنے پر

مجبور کر کے جو حکومتیں اتراتی ہیں، انہیں تاریخ کا نٹوں پر لٹا دیتی ہے۔ گودی میڈیا یہ جان لے کہ جہاں میڈیا اپنی جانبداری اور سچ بولنے کی قیمت وصول کر کے مصلحت کا، سیاست نعرے کا، اور عوام خاموشی کا شکار ہو چکی ہو تو وقت کا کوڑا میدان میں اپنا جوہر دکھانے پہنچ جاتا ہے اور یہ مکافاتِ عمل ہے کہ جب غریب کا بچہ بھوکا سوتا ہے، تو اس کے آنسو نظام کو بہا لے جاتے ہیں۔

پچھلی سات دہائیوں سے زائد بے گناہ کشمیریوں کے لاشے، جو ان بیوائیں، معصوم یتیم بچے اور اجتماعی قبریں اپنا حساب بے باق کرنے کیلئے ایسا تاریخی میدان سجانے والے ہیں، جہاں سے کسی بھی ظالم کیلئے راہِ فرار نہیں ہو گا۔

مودی جان لے کہ سچ وہی ہے جو وہاں کی مجبور و مقہور عوام کہہ رہی ہے، اور وہ سچ نہیں جو اقتدار کی گرفت میں گودی میڈیا کہہ رہا ہے۔

بروز منگل 4 جمادی الثانی 1447ھ 25 نومبر 2025ء

"حرفِ اقبال اور حسِ بلوچستان — ایک ملت، ایک خواب، ایک مشن"

(بیادِ اقبال ملتِ اسلامیہ کی بقاء، پاکستان کا دفاع، اور عصرِ حاضر کے تقاضے)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِ الْمُرْسَلِينَ، وَعَلٰی اٰلِهِمْ وَاصْحَابِهِمْ اَجْمَعِينَ۔
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔۔۔ سورۃ آل عمران، آیت 103

یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

یہ آیت دراصل امتِ مسلمہ کے وجودی فلسفے کا خلاصہ ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے اقبال کی فکر، نثر، اور بصیرت ایک نکتہٴ مرکز پر آکر ملتی ہیں۔ یہ آیت اتحادِ امت کی صدا بھی ہے، اور بیداریِ شعور کا منشور بھی۔ اقبال اسی پیغام کو اپنے شعری الہام میں یوں ڈھالتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تاجناب کا شجر

یہی وحدتِ آج ہماری فکری زندگی کا وہ گمشدہ راز ہے، جس کے بغیر نہ ایمان میں گرمی رہ سکتی ہے، نہ وطن میں سلامتی۔ یہی وہ صدا ہے جو صدیوں کے پردوں کو چیر کر آج بھی ملتِ اسلامیہ کے ضمیر کو جھنجھوڑتی ہے، اور اقبال کی روح اسے اپنے وجدانی آہنگ میں دہراتی ہے:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

یہ مصرعہ اقبال کا ایک سوال نہیں، ایک آئینہ ہے جس میں امتِ مسلمہ اپنی غفلت کا چہرہ دیکھ سکتی ہے۔ یہ محض شاعرانہ پکار نہیں بلکہ ایک عہدِ نو کی

اذان ہے، ایک ایسی صدا جو عقل کو بیدار کرتی ہے، ایمان کو حرارت بخشتی ہے، اور کردار کو صیقل کرتی ہے۔ اقبال نے نوجوانِ مسلم کو زمانے کے

ہنگاموں کا راہبر بنایا، محض مقلد نہیں بلکہ مجتہدِ عصر بنایا۔ فرماتے ہیں:

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زر خیز ہے ساقی

اے نوجوانِ مسلم! تو وہ چراغ ہے جو اگر بجھ جائے تو ملت کی تاریخ اندھیروں میں ڈوب جائے۔ تدبر کا مطلب صرف سوچنا نہیں بلکہ ایمان، عقل اور عمل

کی مثلث میں جینا ہے۔ کہا تو وارث ہے جسے قرآن نے خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ کہا مگر کیا ٹوٹنے کبھی غور کیا کہ خلافت کا مطلب صرف اقتدار نہیں بلکہ

ذمہ داری ہے؟ اقبال نے فرمایا:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتائیری رضا کیا ہے

یہی وہ تدبیر ہے جو قوموں کو بیدار کرتا ہے۔ علم میں توازن، کردار میں استقلال، اور عمل میں ایقان پیدا کرتا ہے۔ جمہور نہ تو زر سے ہے نہ سلطانی سے بلکہ

خلافت کی روحانی قوت سے ہے۔ یعنی امتوں کی بقا و دولت یا طاقت سے نہیں، بلکہ تدبیر اور روحانی شعور سے ہے۔ یہاں وہ نوجوانِ مسلم کو یہ پیغام دیتے ہیں

کہ آج جب دنیا فتنوں کے طوفان میں گھری ہے، جب میڈیا کے شور میں صداقت دب رہی ہے، جب سوشل میڈیا تمہارے شعور کو غفلت کے زہر سے

سیراب کر رہا ہے، تب اقبال تمہیں پکار کر سورہ الانبیاء کی آیت 104 کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اٹھ کہ یہ افلاک نہیں تیرے مقدر کے ستارے ہیں، تُو چاہے تو انہیں تدبیر سے اپنی مٹھی میں لے لے۔ تدبیر یعنی وہ شعور جو انسان کو وقتی جذبات سے نکال کر ابدی مقصد کی طرف لے جاتا ہے۔ اقبال کے نزدیک نوجوان صرف عمر کا نہیں، بلکہ فکر و ارادہ کا پیمانہ ہے۔ اسی لئے وہ فرماتے ہیں کہ:

جوانوں کو مری آہ سحر دے

پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پردے

خدا یا آرزو میری یہی ہے

مر انور بصیرت عام کر دے

آج کا نوجوان اگر اقبال کے پیغام کو سمجھ لے تو وہ قلم سے، علم سے، اور عزم سے اپنے زمانے کا روحانی مجاہد بن سکتا ہے۔

2025ء کی دنیا ایک نئے سیاسی تلاطم سے گزر رہی ہے۔ آج کی دنیا میں، خصوصاً مئی 2025ء کے بعد کے عالمی منظر نامے میں، جب پاکستان نے اپنے دفاع میں ہندوستان کی جارحیت کو پسپا کیا، تب سے سازشوں کا ایک نیا طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ مگر یہ پہلی بار نہیں کہ پاکستان کو گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ سرزمین پاک وہی امانت ہے جو لا الہ الا اللہ کے عہد پر بنی تھی، ایک نظریاتی ریاست ہے، کوئی عام جغرافیہ نہیں، پاکستان، جو امت مسلمہ کا قلعہ ہے، آج دشمنوں کی نظروں میں وہی مقام رکھتا ہے جو ماضی میں خلافت عثمانیہ رکھتی تھی۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے

کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

آج پاکستان اسی سحر کا استعارہ ہے۔

جب دشمن سازشوں کے خنجر تیز کرتے ہیں، تو ہمیں اقبال کی یہ صدا یاد آتی ہے کہ وہ مردِ درویش امت پر مصائب پر گھبرانے کی بجائے بندہ کو خدا کا راز داں بننے کی ترکیب بتا رہا ہے کہ ہمیں اس وقت اپنی بقا کے لیے سیاسی ہوش، فکری استقلال، اور قومی وحدت کی ضرورت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مودی کی ٹھکست کے بعد دنیا کے بہت سے طاقت ور گروہ ایک نئے منصوبے پر کار بند ہیں کہ اس مملکتِ خداداد کو کمزور کیا جائے، اسے اندر سے توڑا جائے، اور اس کی نظریاتی بنیادوں کو متزلزل کیا جائے۔ مودی کی جنگی سازشیں ہوں یا اس کے مغربی حلیفوں کی دوغلی پالیسیاں — ان کا جواب تلوار سے پہلے ایمان و اتحاد میں ہے۔ دراصل ہمارے عیار و مکار دشمن بھول جاتے ہیں کہ پاکستان کوئی حادثہ نہیں، بلکہ تقدیرِ الہی کی ایک تجلی ہے۔ یہ ملک لا الہ الا اللہ کے اعلان پر بنا ہے، اسے بددوق سے نہیں، عقیدے سے طاقت ملی ہے۔ اقبال نے جس خواب میں یہ ملک دیکھا، وہ دراصل امت کی بقا کا خواب تھا:

تُو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا تر جماں ہو جا

پاکستان کی عظمت صرف اس کے نیوکلیر اثاثوں میں نہیں، بلکہ اس کے روحانی اور نظریاتی تشخص میں ہے۔ ہمیں اپنی قوم کو یہ سمجھانا ہے کہ دفاعِ وطن فقط صرف توپ و تلوار سے نہیں ہوتا بلکہ فکر و خودی کے ہتھیار سے بھی لازم ہے۔ قرآن کہتا ہے



وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ
(اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے ہر ممکن قوت تیار رکھو)

یہ قوت علم کی بھی ہے، ایمان کی بھی، اتحاد کی بھی۔ اگر ہم نے خودی کھودی، تو ایٹم بم بھی ہمیں نہیں بچا سکتے۔
اقبال کے الفاظ میں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

— آج کی اس عالمی کانفرنس سے ہمیں یہ صدا بلند کرنی ہے

کہ پاکستان صرف ایک ریاست نہیں، بلکہ اسلامی تمدن کا دفاعی مورچہ ہے۔ ہم اگر بیدار رہے، تو کوئی طاقت ہمیں زیر نہیں کر سکتی۔ قرآن کہتا ہے
إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ

(یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اور اقبال نے اسی کی تفسیر کی

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

پس، آج اس عالمی کانفرنس سے ہمیں اپنے نوجوانوں کو یہ پیغام دینا ہے کہ پاکستان محض ایک ملک نہیں، بلکہ عصر حاضر میں اسلام کی عزت و وقار کی علامت ہے۔ جس کا دفاع تلوار سے پہلے تدبر، اتحاد، ایمان اور علم سے ہوتا ہے۔

اقبال کا آفاقی پیغام تو افغان بھائیوں کیلئے بھی ہے، پاکستان اور افغانستان دو جسم نہیں، ایک ہی روح کے دو سانچے ہیں۔ یہ دونوں خطے اسلامی غیرت، جہاد، اور عزتِ ایمان کے محور ہیں۔ یاد کریں جب داؤد کا تختہ الٹ کر چند افغان وطن فروشوں نے اپنی مدد کیلئے سوویت یونین کو افغانستان پر یلغار کی دعوت دی، تو پاکستان نے چالیس برس تک افغان بھائیوں کو اپنے دل میں جگہ دی۔ لاکھوں مہاجرین کو پناہ دی، ان کے زخموں پر مرہم رکھا۔ یہ سب صرف ہمسائیگی نہیں تھی، یہ ایمان کا رشتہ تھا۔

ذرا وہ زمانہ بھی یاد کریں کہ جب امریکانے نائن الیون کے موقع پر افغانستان میں جارحیت کی تو امریکانے جواب میں پاکستان کو پتھر کے دور میں بھیجنے کی دھمکی دیکر مجبور کیا کہ وہ اس کا ساتھ دے لیکن پاکستان نے اس کے باوجود اپنی میزبانی کا حق پورا ادا کیا اور آج تک ادا کر رہا ہے۔ اگر دشمن کی زبان میں امریکا کا ہماری سرزمین استعمال کرنے کا طعنہ دیا جا رہا ہے تو کیا وہ ہمارے مسلم برادر ملک قطر کا کردار بھی فراموش کر دیں گے جہاں باقاعدہ طور پر ان کو دفتر بنانے کی اجازت فراہم کی گئی اور امریکی انخلاء کا معاہدہ بھی دوحہ قطر میں ہوا جہاں امریکا کا سب سے بڑا فضائی اڈہ العیدید ہے جہاں سے افغانستان پر خطرناک فضائی حملے بھی کئے گئے۔ افغانستان سے امریکی انخلاء میں پاکستان کا تاریخی کردار تو آپ فراموش کر ہی رہے ہیں لیکن افغان دوستوں کو قطر سے کوئی شکایت نہیں اور آج ایک مرتبہ پھر انہوں نے دوحہ قطر کو ہی پاکستان کے ساتھ مصالحتی اور امن مذاکرات کیلئے منتخب کیا۔ اور افغانستان میں نیٹو فورسز میں ترک افوج بھی شامل تھی لیکن ترکی سے بھی ان کو کوئی گلہ نہیں۔۔۔ کیا وجہ ہے کہ لاکھوں افغان افراد کی میزبانی کے ساتھ ساتھ کئی عسکری رازدانی کے باوجود پاکستان سے ان کو گلہ ہے؟

اور آج لندن میں کئی میرے افغان دوستوں کو جب پتہ چلا کہ مجھے اقبال کی اس عالمی کانفرنس میں شمولیت کی سعادت مل رہی ہے تو انہوں نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ پیغام دیا اور گواہی دی کہ گزشتہ 40 برس سے پاکستان اپنے افغان بھائیوں کی میزبانی کر رہا ہے، ہم کیسے بھول جائیں کہ پاکستانی قوم نے اپنا رزق بانٹا، اپنے دروازے کھولے، اپنے شہروں کو پناہ گاہ بنایا۔ یہ صرف انسانی خدمت نہیں، بلکہ اسلامی اخوت کا وہ مظہر ہے جس کی دنیا بھر میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

کیا وہ بھول گئے جب ملا عمر نے کہا تھا کہ ہم قیامت تک پاکستان کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے، پاکستان کا جہاں پسینہ گرے گا، وہاں ہم اپنا خون بہائیں گے۔ اور مجھے بطور کشمیری ملا عمر کا وہ وجدانی خطبہ یاد ہے جب انہوں نے مظلوم، مجبور اور مقہور کشمیریوں کو پیغام دیا تھا کہ ہم جلد آپ کو ہندوستان کی ظالم قابض فورسز سے آزادی دلوانے کیلئے آئیں گے۔ ملا عمر کے تو یہ الفاظ تاریخ میں ایک عہد بن کر ثبت ہو گئے ہیں۔ اس وقت افغانستان کے موجودہ رہنماء ملا ہیبت 20 سال کے نوجوان اور افغانستان کا وزیر دفاع ملا یعقوب ان کا بیٹا پانچ سال کا ان کے پہلو میں بیٹھے یہ خطاب سن رہے تھے۔ مجھے یہ بتایا جائے کہ ملا متقی کے حالیہ دورہ ہند کے موقع پر ان کے پاکستان اور کشمیر کے بارے میں بیانات پر پاکستانیوں اور کشمیریوں کے دلوں پر جو گزری، سو گزری، ملا عمر کی روح تو عالم بالا میں تڑپ گئی ہوگی۔

مگر افسوس، آج وہی سرزمین جس نے کبھی روس کے مقابلے میں جب جہاد کیا، تو یہی پاکستان نے ان کے ساتھ ان کی پشت پر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح قربانیاں دے رہا تھا، لاکھوں افغانوں کو اپنی سرزمین پر پناہ دے رکھی تھی، ان کی عصمتوں کا اپنی جانوں پر کھیل کر پہرہ دے رہا تھا اور امریکی جارحیت کے دوران بھی پاکستانی قوم نے میزبانی اور قربانیوں سے دریغ نہیں کیا مگر آج وہی سرزمین، جو کبھی جہاد کی علامت تھی، ٹی ٹی پی کی پناہ گاہ بن چکی ہے۔ یہ زخم صرف سیاسی نہیں، اخلاقی اور ایمانی زوال کی علامت ہے۔

یعنی جب دین کو قوم پر قربان کیا جائے، تو ایمان کی روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ اے افغان مسلمان، اقبال تم سے کہتا ہے: تمہارے کوہ ہندوکش کے نیچے جو لہو بہہ رہا ہے، وہ اسلامی اخوت کا نہیں بلکہ امت کی تقسیم کا لہو ہے۔ آج یہی میزبان بڑی دلسوزی کے ساتھ سوال کر رہے ہیں کہ کیوں آپ کی سرزمین اب دشمنان اسلام کے لیے پناہ گاہ بن چکی ہے؟ ٹی ٹی پی فتنہ الحوارج اور بلوچستان میں فتنہ الہند جیسے گروہ، جو دراصل اسلام دشمن قوتوں کے آلہ کار ہیں، افغان سرزمین سے پاکستان پر حملے کرتے ہیں۔ اقبال اگر آج زندہ ہوتے، تو شاید یہی کہتے:

افغانیوں کی غیرت دیں کاہے یہ علاج

ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو

یہ شعر کوئی طعنہ نہیں، بلکہ دردمند کی صدائے بازگشت ہے۔ اقبال نے افغانوں میں اسلامی حریت کی روح دیکھی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ افغان اگر بیدار ہوں تو پوری امت بیدار ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ دشمن کے فریب میں آجائیں، تو ان کی تلوار اسلام کے بجائے اپنے ہی بھائی کے خون میں تر ہو جائے گی۔

بلوچستان سے، اس سرزمین وفا سے، افغان بھائیوں کو یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان تمہارا دشمن نہیں، تمہارا محافظ ہے۔ ہم تمہارے ایمان کے ساتھی ہیں، لیکن اگر تم نے اپنی زمین دشمنوں کے ہاتھ بیچ دی، تو تمہاری نسلیں تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ تمہاری غیرت اگر بیدار ہو جائے تو تمہارے پاس سب کچھ ہے، لیکن اگر تم نے خودی کھودی، تو سب کچھ خاک ہو جائے گا۔ قرآن کا حکم واضح ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ

(یقیناً مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)

پس اگر تم واقعی ایمان والے ہو، تو اپنی زمین کو باطل کے لیے استعمال نہ ہونے دو۔ تمہاری تلوار، تمہارا ایمان، تمہاری غیرت یہ سب تقاضہ کرتے ہیں کہ پاکستان کا اسی طرح ساتھ دو جیسا گزشتہ چالیس برسوں نے پاکستان نے تمہارا ساتھ دیا نہ کہ پاکستان کے ازلی دشمن مودی کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف سازشوں میں شریک کار بن کر دہشتگردی میں شامل ہوں اور اب دریائے کابل کے پانی کا رخ بدلنے کیلئے ڈیم بنانے کے منصوبے جاری ہیں جبکہ اقبال کی صدا تو یہ ہے کہ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے

نیل کے ساحل سے لے کر تاجنک کا شجر

یہی پیغام بلوچستان کی اس سرزمین سے تمہیں دیا جا رہا ہے کہ امت کا اتحاد، تمہارا اور ہمارا مشترک فریضہ ہے۔

میں آج اپنے غیور و بہادر بلوچستان کے عوام کے لیے اقبال کا پیغام عمل اور پیغام حیات لیکر آیا ہوں کہ بلوچستان پاکستان کی روح ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں سنگلاخ پہاڑوں میں وفا کے چراغ جلتے ہیں۔ جہاں قوم پرستی اسلام سے جدا نہیں بلکہ اس کی بقا کا حصہ ہے۔ اقبال کے نزدیک قومیت کا مفہوم جغرافیہ نہیں بلکہ ایمان کا رشتہ ہے۔ بلوچستان — جس کی مٹی میں تاریخ کی گونج، وفا کی خوشبو، اور غیرت کا وقار بسا ہوا ہے۔ بلوچستان — جس کی مٹی میں تاریخ کی گونج، وفا کی خوشبو، اور غیرت کا وقار بسا ہوا ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جو صدیوں سے اسلامی تمدن کے قلعے کا دروازہ رہا ہے۔ یہاں کے عوام نے ہمیشہ وفاداری، قربانی اور استقلال کی مثالیں قائم کیں۔ انہوں نے فرمایا

اسلام کے دامن میں بس اس کے سوا کیا ہے

ایک ضربِ یدِ الہی، ایک سجدہ شیری

بلوچستان کے عوام کو آج یہ پیغام دینا ہے کہ اسلام، پاکستان اور بلوچستان — یہ تینوں ایک مثلث کے تین زاویے ہیں۔ اگر ایک زاویہ ٹوٹے، تو مثلث منہدم ہو جاتی ہے۔

اے میرے بلوچ نوجوان دنیا تمہیں تمہاری پہچان سے محروم کرنا چاہتی ہے، تمہیں قبیلے کی تنگ دیوار میں قید کر کے قوم و ملت کے وسیع افق سے جدا کرنا چاہتی ہے۔ لیکن تمہاری اصل پہچان اقبال کے مطابق یہ ہے:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و پر پیدا

تم وہ دیدہ و رہو جس کے خواب میں پاکستان کی بقا ہے۔ تمہارے ایمان میں وہ حرارت ہے جو امت کی بیداری کا چراغ بن سکتی ہے۔ بلوچستان کے پہاڑوں سے جب وفا کی صدائیں اٹھتی ہیں، تو پوری امت کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے۔ لہذا اقبال کے شاہین کی طرح پرواز کرو، اور اپنی مٹی کے ساتھ وہی وفا کرو جو ایک سپاہی اپنے پرچم کے ساتھ کرتا ہے۔ اقبال نے اہل وطن کو یہی درس دیا تھا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

بلوچ قوم کے نوجوانوں سے میں کہتا ہوں

تم اقبال کے خواب کی تعبیر ہو۔ تمہارا کردار وہ بنیاد ہے جس پر پاکستان کا وقار قائم ہے۔ سی پیک ہو، قومی وحدت ہو، یاد دشمن کی سازشوں کا مقابلہ، بلوچ عوام نے ہمیشہ وفاداری کا پرچم بلند رکھا۔ اقبال کے الفاظ میں:

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے

گلیم بوذرو دلق او یس و چادر زہرا

اس شعر کی روح تمہیں خبردار کرتی ہے کہ اپنے وطن کے خزانوں کی حفاظت کرو۔ دشمن چاہتا ہے کہ تمہیں تمہارے ہی وسائل سے جدا کر دے، مگر اقبال کہتا ہے:

خودی کا سر نہاں لاِ اِلہِ اِلّا اللہ

خودی ہے تیغ، فساں لاِ اِلہِ اِلّا اللہ

بلوچستان کے فرزند وہی تمہارا سرمایہ ہے۔ تمہاری خودی، تمہارا ایمان، تمہاری وفا۔ اسی سے پاکستان کی تکمیل ہوتی ہے۔

آج کی اس کانفرنس سے یہ عہد اٹھنا چاہیے کہ ہم علم و تدبیر کو اپنا اصل ہتھیار بنائیں گے۔ پاکستان کی نظریاتی و جغرافیائی سرحدوں کا تحفظ کریں گے۔ امت مسلمہ کے اتحاد کو اپنی سیاست اور معاشرت کا محور بنائیں گے۔ نوجوان نسل کو اقبال کے فلسفہ خودی سے روشناس کرائیں گے اور دشمن کے فتنوں کا جواب علم، اخلاق اور کردار اور قرآن سے دیں گے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

(اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے)

اور اقبال نے فرمایا

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

یہی اس مجلس کا اصل پیغام ہے کہ اقبال صرف شاعر نہیں، مگر آرن کے فکری شارح ہیں۔ ان کا پیغام آج بھی اتنا ہی تازہ ہے جتنا ان کے دور میں تھا۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس پیغام کو اپنے دلوں میں زندہ کریں۔

آج کی اس عالمی کانفرنس سے ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم اقبال کے خواب کو شعور کا حصہ بنائیں گے۔

اسلامی دنیا کی بقا اب صرف نعرہ نہیں بلکہ عملی اتحاد، سائنسی ترقی، فکری بیداری اور روحانی تجدید کا تقاضا ہے۔

میرے انتہائی عزیز دوستوں اور بھائیو! اب وقت آگیا ہے کہ ہم شکوہ سے جواب شکوہ تک کا سفر طے کریں۔ غفلت سے بیداری کی طرف، تقلید سے اجتہاد کی طرف، کمزوری سے قوت کی طرف۔

آج کی میری تمام گزارشات اس عہد جدید کیلئے اقبال کے پیغام بیداری کا استعارہ ہے جو ہر مسلمان کے دل میں خودی کی ایک ایسی پکار کی شمع روشن کرتی ہے، اور کہتی ہے:

نہیں تیرا دشمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہین ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

میں آپ سب کا بہت ممنون ہوں کہ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں
اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ مَجْلِسَنَا هٰذَا مَجْلِسًا مَّبَارَكًا، مَغْفُوْرًا، مَشْهُوْدًا، وَاجْعَلْ خِتَامَهُ رَحْمَةً وَمَغْفِرَةً۔
اَللّٰهُمَّ احْفَظْ بِلَادَ الْاِسْلَامِ، وَخُصَّ مِنْهَا بِلَادَ الْبَاكِسْتَانِ، وَاحْفَظْ جُيُوْشَهُ وَشَعْبَهُ، وَوَحِّدْ صُفُوْفَ الْمُسْلِمِيْنَ۔
اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ۔
آمین، یا رب العلمین۔

(تعمیر نوٹرسٹ کوئٹہ بلوچستان کے زیر اہتمام تین روزہ عالمی اقبال کانفرنس میں 20 نومبر 2025ء کا لیکچر)

جمعۃ المبارک 7 جمادی الثانی 1447ھ 28 نومبر 2025ء

کابل سے کعبہ تک: ایک رشتہ، ایک آزمائش

تاریخ کے صفحات میں کچھ ابواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں وقت کی گرد بھی مٹا نہیں سکتی۔ پاک افغان رشتہ بھی انہی ابواب میں سے ایک ہے۔ یہ رشتہ مذہب، اخوت، قربت اور مشترکہ دکھوں کے سنگم سے بندھا ہوا ہے مگر افسوس، یہ برادرانہ داستان آج شکوؤں، زخموں اور بے یقینی میں لپیٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

1979ء میں جب روسی افواج نے افغانستان پر چڑھائی کی، تو پوری دنیا خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی مگر ایک ملک تھا۔ پاکستان۔ جس نے اپنے دروازے، دل اور دامن افغان بھائیوں کیلئے کھول دیے۔ 40 سال سے زیادہ عرصہ، پاکستان نے 50 لاکھ سے زائد افغان مہاجرین کو پناہ دی؛ اپنے شہروں، روزگار، زمین اور وسائل ان کے نام کر دیے۔

افغان جہاد کے دنوں میں پاکستان نے نہ صرف اپنی سلامتی کو داؤ پر لگایا بلکہ ایک سپریم مشن کے تحت اسلامی دنیا کی نمائندگی کا بوجھ بھی اٹھایا۔ لاکھوں پاکستانیوں نے جانیں قربان کیں، اور قوم نے اپنی معیشت پر بھاری بوجھ برداشت کیا۔ مگر مقصد ایک ہی تھا "افغان بھائیوں کو آزادی ملے، ان کی خود مختاری بحال ہو، اور روسی جارحیت کا باب بند ہو۔ یہ قربانی تاریخ کے کسی ترازو میں نہیں تولی جاسکتی۔

تاریخ کے اوراق میں کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو صرف ماضی نہیں بلکہ پوری قوم کے جذبات کے آئینہ دار بن جاتے ہیں۔ افغانستان اور پاکستان کا رشتہ انہی واقعات سے بنا ہے۔ وہ رشتہ جو ایمان، جہاد، قربانی اور برادرانہ اخوت کے دھاگوں سے پرویا گیا تھا۔ جب 1979ء میں روسی افواج نے افغانستان کی مقدس وادیوں پر اپنے ناپاک قدم دھرے، تو عالم اسلام خاموش تھا مگر پاکستان بیدار تھا۔ اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اپنی معیشت، اپنی سرحدیں، اپنا امن، بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کی خوشیاں بھی، صرف اس لیے کہ کابل آزاد ہو، افغان سر اٹھا کر جی سکیں، اور اسلام کا پرچم سرحدوں سے بلند ہو۔

چالیس برس ہونے کو آئے، پاکستان نے 50 لاکھ افغان مہاجرین کو اپنی گود میں جگہ دی، سینے سے لگایا، ان کیلئے اپنی زمین بانٹی، اپنے بازاروں کے در کھولے، اور اپنے لوگوں کے خون سے ان کے امن کی بنیاد رکھی۔ دنیا کے کسی اور ملک نے اتنا صبر، اتنی قربانی، اور اتنا خلوص نہیں دکھایا جتنا پاکستان نے دکھایا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ۔۔ بے شک تمام مومن آپس میں بھائی ہیں۔ (الحجرات: 10)

یہ آیت پاکستان کے ایمان کا اعلان بنی۔ اسی روح اخوت کے تحت پاکستان نے افغان دھڑوں کو باہم جوڑنے کی کوشش کی چاہے وہ پشاور کا اجلاس ہو، مکہ مکرمہ کا معاہدہ ہو، یا اسلام آباد کی کانفرنسیں، پاکستان ہمیشہ صلح کا سفیر اور امید کا پل بن کر سامنے آیا۔

1979ء میں سوویت انخلاء کے بعد (یا اس کے دوران) افغانستان میں مختلف مقامی دھڑوں نے ایک طویل جہادی عمل چلایا۔ ان دھڑوں میں نسلی، لسانی اور سیاسی اختلافات کی بنیاد پر کئی گروہ وجود میں آئے اور جب 1989-1992 کے بعد کابل سے سوویت حمایت یافتہ حکومت کی طاقت کم پڑی، تو اختلافات ظہور عام پر آئے اور سیاسی خلاء نے مسلح گروہوں کے درمیان طاقت کے عارضی کھیل کو جنم دیا۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب بظاہر "اتحاد جہاد" رفتہ

رفتہ خانہ جنگی اور اقتدار تک رسائی کی خانہ جنگی میں تبدیل ہو گیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب روسی افواج اپنی 10 سالہ جارحیت کے بعد 15 / فروری 1989ء کو پسپا ہوئیں تو پوری امت کی نظریں کابل پر تھیں۔ دنیائے سمجھا کہ اب افغانستان میں امن لوٹ آئے گا۔ افغان مجاہدین نے، جو ایک وقت میں ایک جھنڈے تلے لڑتے تھے، اقتدار کے سوال پر مکھڑنا شروع کیا۔ پاکستان نے، دل میں بے پناہ امید کے ساتھ، انہیں پھر سے اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔

سب سے معتبر اور دستاویزی معاہدہ جس کا حوالہ بین الاقوامی تاریخ اور پالیسی رپورٹریز میں ملتا ہے، وہ 24 / 26 اپریل 1992ء کا پشاور معاہدہ ہے جو مختلف مجاہدین / مسلح گروپوں کے مابین ایک عبوری انتظام قائم کرنے کیلئے طے پایا تھا۔ اسی امید کے ساتھ مختلف افغان جہادی تنظیمیں پشاور میں اکٹھی ہوئیں کہ اب جہاد کے ثمرات کو ضائع ہونے سے بچایا جاسکے۔ پشاور معاہدہ اسی امید کا نتیجہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ اقتدار کسی ایک گروہ کا نہیں ہوگا، بلکہ تمام مجاہدین مل کر ایک عبوری اسلامی حکومت تشکیل دیں گے۔ اور افغانستان کا نظام شورائی اور اسلامی بنیادوں پر قائم ہوگا۔

پھر وہ یاد گار لمحہ آیا جب اللہ کے گھر خانہ کعبہ کے سائے میں، افغان دھڑوں کے رہنما جمع ہوئے اور انہوں نے حلف اٹھایا کہ اب کبھی اقتدار کی خاطر خون نہیں بہائیں گے، وہ معاہدہ — چاہے علامتی یا حقیقی — اسلامی اتحاد کی آخری علامت تھا۔ مکہ مکرمہ کے مقدس ماحول میں، اللہ کے گھر کے سامنے، وعدہ کیا گیا کہ اب افغان ایک دوسرے کے خلاف نہیں لڑیں گے۔ اب افغانستان کے آسمان پر صرف امن کا پرچم لہرائے گا۔ اس میں عبوری صدارتی مدت، عبوری کونسل اور طاقت کی تقسیم کے خاکے طے کیے گئے؛ صبغت اللہ مجددی، برہان الدین ربانی اور احمد شاہ مسعود جیسے نام اس امید کے مرکز بنے۔ عبوری صدارتی مدت میں، احمد شاہ مسعود کو عبوری وزیر دفاع مقرر کیا گیا، اور صبغت اللہ مجددی / ربانی جیسے نام عبوری نقاط تسلسل کیلئے طے کیے گئے۔ یہ معاہدہ رسمی طور پر اس بات کی کوشش تھا کہ کمیونسٹ دور کے خاتمے کے بعد ایک مشترکہ عبوری انتظام قائم ہو سکے۔

مگر تاریخ نے دیکھا کہ وہ قسمیں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔ اقتدار کی ہوس، بیرونی اثرات، اور ذاتی مفادات نے اس مقدس وعدے کو پھر سے خون میں نہلا دیا۔ خانہ کعبہ میں لیا گیا عہد کابل کی گلیوں میں دفن ہو گیا۔ اقتدار کی ہوس، بیرونی مداخلت، نسلی تقسیم اور ذاتی مفادات نے ایک بار پھر وطن عزیز کو خون میں نہلا دیا۔ کابل کی گلیاں، جو کبھی جہاد کی کامیابی کی گواہ تھیں، خانہ جنگی کی خاک میں اٹ گئیں۔

افغان دھڑے ہمیشہ وقتی اتحاد اور وقتی مفادات کے گرد جمع ہوئے۔ جب بھی اقتدار کی کشمکش بڑھی، ہر وعدہ، ہر قسم اور ہر عہد طاقت کے دھوکے میں گم ہو گیا۔ دستاویزی ریکارڈ اور انسانی حقوق کی رپورٹس واضح کرتی ہیں کہ یہ معاہدہ بہت جلد عملی معنوں میں ناکام رہا۔ مختلف کمانڈر، نے طاقت کے حصول کیلئے اس معاہدے کی نفی کی یا مخالفت کی؛ نتیجتاً کابل میں مسلح جھڑپیں اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی، اور معاہدے کے نفاذ کے وعدے پس منظر میں رہ گئے۔ یہ سارے واقعات بعد ازاں ایک طویل اندرونی تنازع اور شہری جنگ کی شکل میں تبدیل ہو گئے۔

معاہدے کے ناکام ہونے کے کئی باہمی اور خارجی عوامل تھے؛ اہم شعبے یہ رہے کہ دھڑوں کا علاقائی مضبوط ہونا مجاہدین کے یکجہاسی پارٹی بنانے میں مانع رہا؛ ہر کمانڈر کا اپنا علاقائی و قبائلی اثر، وسائل اور حمایتی نیٹ ورک تھا۔ پھر باہمی عدم اعتماد اور مضبوط ذاتی مفادات کی بناء پر کئی رہنماؤں نے اقتدار کی مکمل طلب رکھی؛ اس نے فوراً نفاذ شدہ شیرنگ ایگریمنٹ کو نقصان پہنچایا۔ بیرونی مداخلت اور علاقائی اثر کار یعنی ایران، سعودی عرب، پاکستان، اور دیگر قوتوں کے حمایتی اثرات نے مصالحتی کوششوں کو پیچیدہ بنادیا؛ کچھ گروپوں کو بیرونی امداد اور پشت پناہی ملی جس نے داخلی بیلنس بدل دیا۔ مختلف



گروپوں کے پاس مواد، زمینی طاقت اور فنڈنگ تھی، اسلحہ، وسائل اور مسلح گروہ جس نے انہیں معاہدہ توڑ کر عملی طور پر قبضہ کی راہ اپنانے کے قابل بنادیا۔ ان عوامل کے نتیجے میں معاہدے رسمی طور پر تو مؤرخوں کے صفحات میں موجود رہے، مگر حقیقت میں گلی و محلہ میں خونریز مقابلے جاری رہے۔ اور ہر فریق نے دوسرے پر دھوکہ، قتل عام، اور وعدہ شکنی کے الزامات لگائے۔ انسانی حقوق رپورٹس نے بھی اسی کشاکش اور شہری آبادی پر ہونے والے مظالم کی نشاندہی کی ہے۔

زمینی حقائق یہ ہیں کہ تمام مجاہدین گروپ پشاور معاہدہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، فریقین کے بیانات اور الزام تراشی کا خوفناک منظر نامہ یوں سامنے آیا کہ ہر گروپ نے دوسروں کو معاہدہ توڑنے کی سرکردگی پر الزامات لگائے؛ خاص طور پر شہر کابل میں گھناؤنی لڑائیاں شروع ہوئیں۔ شیعہ و سنی محاذ، کابل کے مختلف اضلاع پر قبضے کی کوشش، اور شہری آبادی کو جو نقصان پہنچا، اس کا الزام ایک دوسرے پر لگایا گیا۔ مقامی اور بین الاقوامی مبصرین نے لکھا کہ الزامات اکثر حقیقت اور پریوینکٹ کے امتزاج تھے۔ فریقین اپنی نااہلی یا داخلی خلفشار چھپانے کیلئے سیاسی مہر لگاتے رہے، اور عوامی رائے کو اپنی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان نے دکھ سے دیکھا، وہ، جو سب کا خیر خواہ تھا، اب تماشائی بننے پر مجبور ہو گیا۔ اسلامی دنیا کے دیگر ممالک، جو کبھی افغان جہاد کے حامی تھے، اس انتشار سے افسردہ ہو کر خاموشی اختیار کر گئے مگر پاکستان؟ نہیں۔ وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ وہی زخمی ہاتھ، وہی تھکا ہوا دل، مگر وہ اب بھی افغان بھائیوں کی پشت پر کھڑا رہا، امن کے پیغامبر کی طرح، قربانی کے علمبردار کی طرح۔

یہاں تاریخی دامن کے اس سچ سے آنکھیں نہیں چرائی جاسکتیں کہ پاکستان وہ واحد ملک تھا جو افغان عوام کے دکھوں کا حصہ بنا رہا۔ پاکستان کے صبر، مستقل مزاجی اور افغانوں کے رویے کے باوجود دنیائے جب افغانستان سے منہ موڑا، تو پاکستان وہ واحد ملک تھا جس نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہم نے ان کیلئے اپنی معیشت کو قربان کیا، ان کے مہاجرین کو سنبھالا، ان کے زخمیوں کا علاج کیا، اور ان کے مستقبل کیلئے دعا کی مگر وقت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج وہی افغان قیادت، بھارت جیسے ازلی دشمن کے بہکاوے میں آکر، پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر رہی ہے۔ جن ہاتھوں نے پناہ دی، اب انہی پر شک کی انگلیاں اٹھ رہی ہیں۔ اور اس سب کے باوجود پاکستان کا رویہ وہی ہے بردباری، صبر اور امن کی خواہش۔

پاکستان نے اپنے زخموں کو چھپایا مگر افغان قیادت نے شاید یہ قربانیاں بھلا دیں۔ آج جب پاکستان دہشتگردی، معیشت اور سرحدی مسائل کے بھاری دباؤ میں ہے، تو اسی افغان سرزمین سے دشمنی کے تیر بر سائے جارہے ہیں۔ کبھی ٹی ٹی پی کے حملے، کبھی افغان حکومت کا خاموش تعاون، اور کبھی بھارت کے ساتھ سفارتی قربت پاکستان کیلئے ایک گہرا زخم ہیں۔ یہ کیسی نا قدری ہے کہ جس ملک نے چالیس برس افغان بھائیوں کیلئے ماں کی طرح سینہ کھولا، آج وہی ملک ان کے طعنوں کا نشانہ بن رہا ہے؟ کیا یہ اسلامی اخوت کا صلہ ہے؟ کیا خانہ کعبہ کے سامنے اٹھائی گئی قسمیں بھول گئیں؟ کیا تاریخی میزبانی، وہ قربانیاں، اور وہ اخلاص مٹی کے برابر بھی نہیں رہے؟

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلَامِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ"۔

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ (الانفال: 61)

پاکستان نے ہمیشہ اس قرآنی اصول پر عمل کیا کہ جنگ نہیں، امن بہتر ہے؛

اور اس وقت ایک تلخ مگر مشہور محاورہ تاریخ میں نقش ہوا—جو آج بھی افغان سیاست کی نفسیات بیان کرتا ہے:

”آپ افغانوں کو خرید نہیں سکتے، مگر ان کی خدمات کرایے پر لے سکتے ہیں۔“ یہ جملہ چاہے کسی نے کہا یا نہ کہا ہو، مگر اس میں ایک گہری سچائی چھپی ہے۔ یہ فقرہ اکثر عوامی محاورے یا مباحث میں ہلکی تبدیلیوں کے ساتھ آتا ہے، اور بعض سوشل پوسٹس یا اقوال مرکب میں کئی افغان رہنماؤں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر، صورتِ تعبیر اور نسبت کے بارے میں چند باتیں واضح کرنا ضروری ہیں:

یہ محاورہ / کہاوٹ بین الاقوامی اور استعماری تاریخ میں چلتی رہی۔ انگریز اور بعد کے بیرونی مداخلت کنندگان کے تجربات سے جڑا ایک عوامی محاورہ یہ رہا کہ قبیلوں یا مقامی جنگجوؤں کی وفاداری مستقل نہیں ہوتی؛ لہذا بیرونی حکومتیں انہیں "خرید" نہیں سکتیں، محض عارضی طور پر پیسے یا مدد دے کر "کرایے" پر سروس حاصل کر لیتی ہیں۔ کئی مغربی تجزیاتی مضامین اور تاریخ دان اس جملے کو حوالہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ کہاوٹ ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کرتی ہے—یعنی بیرونی طاقتیں وقتی مفاد کیلئے مقامی گروہوں کو مالی و عسکری مدد دیتی ہیں، مگر مستقل وفاداری اور ملکی مفاد کا حصول ان پیسوں سے ممکن نہیں۔ اس سہولت کرایے پر مبنی تعلق نے افغانستان میں متعدد ادوار میں جہادی کمانڈروں کو غلط طریقے سے مسلح کر کے طویل، غیر منظم تشدد کو ہوا دی۔ اور آج موجودہ طالبان رجیم نے بھارت کی گود میں بیٹھ کر ان کے ایجنڈے کو جو گلے لگایا ہے، ملا متقی کا دورہ ہند میں طالبان کے بانی اور روحانی رہنماء ملا عمر کے اقوال کے جس طرح پر نچے اڑائے ہیں، اس کے بعد کثرتِ اذہان تو اس کہاوٹ پر یقین کرنے لگے ہیں۔

افغان تاریخ ہمیں ایک سبق دیتی ہے کہ طاقت کے حصول کی جنگ میں ایمان، وعدے اور دوستی قربان ہو جاتے ہیں۔ وفاداری، بھائی چارے کے شگوفے باہمی احترام سے پھوٹتے ہیں، پاکستان کا شکوہ محض سیاسی نہیں، ایک جذباتی زخم ہے۔ مگر پاکستان آج بھی یہی کہتا ہے کہ امن کا راستہ جنگ سے نہیں، ہم نے افغان بھائیوں کو کبھی غیر نہیں سمجھا، مگر ان کے رویے نے ہمیں خود پر نظر ثانی پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ کابل یہ مانے کہ پاکستان دشمن نہیں، بلکہ وہ واحد ملک ہے جس نے ہر طوفان میں افغان قوم کا ہاتھ تھاما اور اگر آج افغانستان اپنی زمین بھارت جیسے ازلی دشمن کیلئے نرم گوشہ رکھے اور پاکستان کیلئے شک و شبہات تو یہ محض سیاسی غلطی نہیں، بلکہ اخوتِ اسلامی کے تصور پر ایک کاری ضرب ہے۔

چالیس برس کی قربانیاں، لاکھوں جانوں کی قیمت، اربوں روپے کی میزبانی، یہ سب پاکستان کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ ہم نے افغانوں کیلئے خون بھی بہایا اور ایشک بھی بہائے۔ ہم نے دنیا کے طعنوں کے باوجود ان کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور آج جب افغان قیادت بھارت کی بانہوں میں جا بیٹھی ہے، پاکستان کا دل زخمی ضرور ہے، مگر خالی نہیں۔ اس کے دل میں آج بھی امید کا چراغ جل رہا ہے۔ یہ چراغ آج بھی اپنے افغان بھائیوں سے کہتا ہے: ہم نے تمہیں کبھی دشمن نہیں سمجھا۔ ہم نے تمہیں اپنے دل کا حصہ جانا۔ اگر تم بھٹک گئے ہو تو ہم شکوہ ضرور کریں گے، مگر نفرت کبھی نہیں کریں گے۔ پاکستان آج بھی وہی ہے جو خانہ کعبہ کے سائے میں امن کی قسم کھانے والوں کو جوڑنے والا ملک تھا۔ جو تب بھی بھائیوں کے درمیان پل تھا، اور آج بھی ان کے بیچ امن، اخوت اور ایمان کا رشتہ بنائے رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کاش ایک دن تاریخ پھر وہی منظر دیکھے جب کابل کی فضاؤں میں توپوں کی گھن گرج نہیں، بلکہ اذانوں کی صدا گونجے۔ اور مکہ میں اٹھائی گئی قسم، افغانستان کے امن کی بنیاد بن جائے۔ بھائی چارے کا وہ خواب جو مجھ جیسے بے شمار افراد نے دیکھا ہے کاش ایک دن پھر وہی منظر لوٹ آئے جب افغان

مجاہدین خانہ کعبہ کے سائے میں حلف اٹھا رہے تھے، اور پاکستان ان کے پیچھے دعا گو تھا۔

کاش ایک دن دونوں برادر ممالک دوبارہ ایک دوسرے کو دشمنوں کی آنکھ سے نہیں، امتِ مسلمہ کے آئینے میں دیکھیں۔ افغانستان کو یاد رکھنا چاہیے کہ پاکستان کی قربانیاں تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ اور پاکستان کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اخوت کبھی یک طرفہ نہیں رہ سکتی۔ امن کی امید، شکوے کی چھن، اور بھائی چارے کا خواب — یہی ہماری کہانی ہے۔ یہی پیغام ہے، یہی خواب اور یہی پاکستان کی ابدی پکار۔

بروز سوموار 10 جمادی الثانی 1447ھ یکم دسمبر 2025ء